برکاتِ تصوّف و رُوحانیت کی تشریح سے مزین منفرد تذکرہ اولیائے کرام

اللہ لوگ

حضرت ابوالحسن علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش ؒ
حضرت سیّد عبدالقادر جیلانی المعروف غوث الاعظم پیرانِ پیر ؒ
حضرت شاہ حسین المعروف مادھو لال حسین ؒ
حضرت محمّد امیر المعروف میاں میر بالا پیر ؒ
حضرت محمّد باہو المعروف سلطان العارفین سلطان باہو ؒ
حضرت سیّد عبداللہ شاہ المعروف بابا بلھے شاہ ؒ

اختر حسین شیخ

طٰہٰ رحیم پبلیکیشنز حاصل پور
0300-9233714
0300-7853059

15186

گزارش

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد بندی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کیلئے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (ادارہ ناشر)

Marfat.com

نکاتِ تصوف و روحانیت کی تشریح سے مزین منفرد تذکرہ اولیائے کرام

اللہ لوگ

حضرت ابوالحسن علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ

حضرت سید عبدالقادر جیلانی المعروف غوث الاعظم پیران پیرؒ

حضرت شاہ حسین المعروف مادھو لعل حسینؒ

حضرت محمد امیر المعروف میاں میر بالا پیرؒ

حضرت محمد باہو المعروف سلطان العارفین سلطان باہوؒ

حضرت سید عبداللہ شاہ المعروف بابا بلھے شاہؒ

اختر حسین شیخ

ترتیب

امجد جاوید

طہٰ رحیم پبلیکیشنز حاصل پور

0300-7853059-9233714

Marfat.com

98213

© جملہ حقوق محفوظ ہیں

ایم اے فاروقی نے

لعل سٹار پریس لاہور سے چھپوا کر

طٰہٰ رحیم پبلیکیشنز

۱۶۰۔سی نزد پرانی ٹینکی حاصل پور

سے شائع کی۔

اسٹاکسٹ

☆......اقبال بک سنٹر جہانگیر پارک صدر کراچی :021-7211246

☆......عظیم اینڈ سنز معراج سنٹر اردو بازار لاہور :042-7231806

☆......مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور :042-7224228

☆......دار المطالعہ نزد پرانی ٹینکی حاصل پور منڈی :0696-42059

اس کے علاوہ ملک بھر کے ہر چھوٹے بڑے کتب خانے سے طلب فرمائیں

Marfat.com

فہرست

1	حضرت ابوالحسن علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ	13
2	حضرت سید عبدالقادر جیلانی المعروف غوث الاعظم پیران پیرؒ	95
3	حضرت شاہ حسین المعروف مادھولعل حسینؒ	177
4	حضرت محمد امیر المعروف میاں میر بالا پیرؒ	281
5	حضرت محمد باہو المعروف سلطان العارفین سلطان باہوؒ	355
6	حضرت سید عبداللہ شاہ المعروف بابا بلھے شاہؒ	431

اس کتاب میں اولیائے کرام کی ترتیب زمانہ کے مطابق رکھی گئی ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

فاتحین قلوب

برصغیر میں فاتحین کی آمد کا سلسلہ تواتر سے جاری رہا۔

یہ فاتحین کئی طرح کے تھے جنہوں نے اس خطے کی نہ صرف تاریخ بدلی بلکہ اس کے انداز واطوار تک بدل ڈالے۔ گہری نظر سے دیکھیں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ یہ فاتحین دو واضح گروہوں میں تقسیم ہیں۔ ایک وہ جن کی تگ ودو جسم فتح کرنے پر صرف ہوئی اور دوسرے وہ جنہوں نے دلوں کو تسخیر کیا۔

یوں تو جسم فتح کرنے والے فاتحین کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ دنیا کے بیشتر خطوں پر بے شمار وارد ہوئے اور انہوں نے اپنے خاص اثرات چھوڑے' جیسے برصغیر میں محمد بن قاسم سے پہلے کے فاتحین اور پھر بعد میں تین صدیاں گزرنے کے بعد محمود غزنوی کا پہلا حملہ' بلاشبہ محمود غزنوی تبلیغ اسلام کے لئے گنگا وسندھ کے میدانوں تک نہیں آیا تھا مگر اس سے ہوا یہ کہ تبلیغ اسلام کے لئے اس خطے کا دروازہ کھل گیا۔ معزالدین محمد غوری اور خاندان غلاماں نے اسلامی حکومت کے لئے بنیادیں گہری کیں۔ اس خطے نے التمش جیسے دانشمند حکمران' بلبن جیسے پرشکوہ' علاؤ دین خلجی جیسے منتظم' محمد تغلق جیسے مجتہد مزاج اور سکندر ی لودھی جیسے متوازن حکمران بھی دیکھے۔ مغل فرما

Marfat.com

رواؤں نے اسلامی سلطنت کو ایک نئی شان بخشی‘ ظہیر الدین بابر عزم و ہمت کا پیکر‘ نصیر الدین ہمایوں عزم و ہمت کا پہاڑ‘ جلال الدین اکبر سیاست و شجاعت کا فنکار‘ نور الدین جہانگیر عدل وانصاف کی مثال‘ شہاب الدین شاہجہان مغل اقتدار کا نقطہ کمال‘ اورا ورنگ زیب عالمگیر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار رہے ہیں۔ اسلامی علم و ثقافت لے کر آنے والے یہ سارے فرماں روا اپنی اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتے ہیں ان سب کا مطمع نظر اپنی سلطنت میں وسعت اور لوگوں کو مطیع کرنا رہا۔ اس لیئے ان سے بہت سارے احمقانہ افعال بھی سرزد ہوتے رہے۔ وہ شاید نہیں جانتے تھے یا کم از کم انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ جسم کو فتح کر لینے کی دھن نفرت کا باعث بنتی ہے۔ ان فرمارواؤں کی سیاسی حکمت عملی‘ جاہ طلبی کی تدبیریں اور وسعت سلطنت کی کوششوں سے کیا نتائج حاصل ہوئے؟ بحث اس سے نہیں۔ یہ بات بہر حال اپنی جگہ اہم ہے کہ انہوں نے برصغیر میں اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی‘ جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید مستحکم ہوتی چلی گئی۔

دوسرے فاتحین وہ تھے جنہوں نے اللہ کے اس دائمی پیغام کو لوگوں تک پہنچایا جو نبی رحمت‘ وجہ تخلیق کائنات‘ پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ کے ذریعے انسانوں کو دیا گیا۔ ان فاتحین نے اپنی ذات کو اہمیت نہیں دی بلکہ اس الوہی پیغام کا فروغ چاہا جس میں نجات اُخروی کا مژدہ تھا اور جس سے انسان‘ مقام انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے۔ محبتوں سے مامور اس پیغام دل پذیر نے دل جیت لئے۔ اس لئے یہ ”اللہ لوگ“ دلوں کے فاتحین قرار پائے۔

محبت اور نفرت کا منبع و مرکز دل ہی ہوا کرتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نفرتوں کے ردعمل میں جسم فتح کرنے والے اپنی جاہ و حشمت‘ جلال پادشاہی اور شان و شوکت سمیت اپنا نشان تک کھو گئے۔ جبکہ دنیاوی لحاظ سے یہ بے سرو سامان لوگ‘ محبتوں سے دلوں کو تسخیر کرنے والے فاتحین کا فیض آج بھی جاری و ساری ہے

”جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ“

یہ فاتحین قلوب اللہ لوگ ہی ہیں جنہوں نے ان اندھیروں کو دور کیا جو وقت اور حالات کے طالع آزما‘ انسانوں پر مسلط کرتے رہے۔ یہ تاریکی بھی کئی طرح کی تھی۔ انسان پر انسانوں کے ظلم کی تاریکی‘ ہوس زر اور جاہ طلبی سے دلوں پر چھائی تاریکی ہے بے جا علمی موشگافیوں سے پیدا ہو جانے والی ذہنی تاریکی۔ جس میں کچھ دکھائی نہ دینے کی بجائے‘ سجھائی نہیں دیتا۔ یہ اللہ لوگ

Marfat.com

پیغام حق کی روشنی لے کر اس تاریکی سے نبرد آزما ہوئے۔ راہ سلوک مشکل ترین راہ ہے۔ الہامی مذاہب کی بات تو الگ رہی، مصلحین کی تحریکوں کا لب لباب بھی یہی ہے۔ قادر مطلق تک پہنچنے کے ذرائع یوں ہو سکتے ہیں۔ ایک تو راہ یہ ہے کہ فراست علم سے خالق حقیقی کے بارے میں یقین کر لیا جائے پھر عمل کا یقین کر کے عشق کے ذریعے اللہ تک رسائی حاصل کی جائے۔ یہ ایک طویل ترین راہ ہے۔ جب کہ دوسرا راستہ راہ سلوک کا ہے۔ یہ راستہ دشوار ترین، مشکل ترین اور مختصر ترین گردانا گیا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو ان اللہ والوں نے اختیار کیا۔ ان کا مقصد رضا الٰہی کا حصول رہا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ٹھہرے۔ روشن راہوں کی نشان دہی صدقہ جاریہ ہے۔ جبکہ ان اللہ والوں نے انسان کو روشنیوں سے مزین راہ پر چلا دیا۔

اللہ جل شانہٗ کی ہدایت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اس کی ہدایت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی ہدایت الٰہی کی شدت طلب لے کر اللہ کے حضور جھک جاتا ہے تو پھر وہی اللہ کی ہدایت کے لئے چن لیا جاتا ہے۔ اسی کو توفیق کہتے ہیں جو مشروط ہے، طلب سے۔ طلب ہی سے عطا ہے اور عطا سے توفیق۔ ایک طرف اگر اللہ کی یہ شان بے نیازی ہے تو دوسری جانب اپنی رحمت بے کراں کے باعث انسانوں کے لئے انسانوں میں سے برگزیدہ لوگوں کو ایسے مقام پر فائز کیا جو انسانوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر اس روشن راستے پر لے آئے جو سیدھا اللہ کی طرف جاتا ہے۔

اندھیروں کی اقسام کو چاہے شمار نہ کیا جا سکے مگر نور ایک ہی ہے۔ ازلی وابدی نور جس کا عکس اس پوری کائنات میں دکھائی دے رہا ہے۔ عشق الٰہی اور محبت رسول اللہؐ سے معمور یہ اللہ لوگ اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر کے انسانوں کو صراط مستقیم پر لاتے رہے اور تاریخ ضلالت بدلنے میں مصروف رہے۔ یوں نہ صرف انہوں نے معاشرے کی سلوٹوں کو دور کیا بلکہ انسانوں کو امن وسکون سے رہنے کا درس بھی دیا اور یہ اللہ لوگ اس میں کامیاب ٹھہرے۔ کامیابی کی تعریف ہی یہی ہے کہ ''اس نے جدوجہد کی۔''

یہی اللہ لوگ ہیں جن کے در پر شہنشاہان وقت ہاتھ باندھے کھڑے رہنے پر نہ صرف مجبور ہوا کرتے تھے بلکہ اپنا اعزاز گردانتے تھے۔ جیسے شہنشاہ اورنگ زیب، حضرت سلطان باہوؒ کے لطف وکرم سے سرفراز ہوئے۔ حضرت بالا پیرؒ کے آستانہ پر شاہان وقت برہنہ پا حاضر ہوتے۔ نور

Marfat.com

دین جہانگیر' شہاب الدین' دارا شکوہ' نواب وزیر خان وغیرہ دست بدستہ حاضری دیتے۔ مغل شہنشاہ محمد شاہ' شاہ عنائت قادری شطاریؒ کے در پر حاضری دیتا۔ اکبر اعظم اور شہزادہ سلیم کے علاوہ خواتین حرم و وزراء و امراء شیخ ابو الفضل' خواجہ دولت خان' شیخ عبدالرحمٰن' خان خاناں' جعفر بیگ' شہباز کنبوہ اور تان سین وغیرہ' حضرت مادھو لال حسینؒ کے ارادت مند تھے۔

آخر ان دنیاوی بے سروسامان لوگوں کے پاس ایسا کون سا خزانہ تھا جس کی طلب' ان دنیا پرستوں کو کشاں کشاں ان کے در پر لے آتی تھی؟ وہ ہے فقر۔! اگرچہ فقر کا مفہوم تو فقیر و گداگری ہے' تنگدستی و بے کسی ہے لیکن ایک فقر وہ ہے جو بندے کو بندوں کی عنایت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ جس کے متعلق نبی رحمت' ہادی برحقؐ نے فرمایا ''الفقر فخری'' یعنی فقر میرا فخر ہے

یہ اللہ لوگ اللہ پر یقین کامل اور محبت رسولؐ کے باعث ذہنی و قلبی اطمینان' ایمان کی مضبوطی' اتقی اور مادیت سے بے نیازی جیسی صفات سے بہرہ مند تھے۔ وہ سبب کی چاہ میں نہیں' مسبب الاسباب سے ناطہ جوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اللہ لوگ مسلک محبت سے سرفراز ہوتے ہیں جسے ''راہ عشق'' کہا جاتا ہے جو رضائے الٰہی کے حصول کے لئے مشکل ترین' دشوار ترین اور مختصر ترین راستہ ہے۔ جیسے قرآن عظیم میں فرمایا گیا۔

''والذین امنو اشد حبا للہ''

''ایمان والوں کو اللہ جل شانہٗ سے شدید محبت ہوتی ہے''

یہ شدید محبت حضرت جنید بغدادیؒ کے نزدیک یوں ہے کہ

''المحبۃ دخول صفات المحبوب علی البدل من صفات المحب''

محبت یہ ہے کہ محبّ کی ساری صفات محو ہو جائیں اور محبوبی صفات اس میں آ جائیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ

المحبتہ حجاب بین المحب والمحبوب
فاذا فنی المحب عن لمحبہ وصل بالمحبوب

محبت تو خود محب و محبوب کے درمیان پردہ ہے۔ جب محب محبت سے فنا ہو جاتا ہے تو محبوب میں واصل ہو جاتا ہے

روحانیت کے رنگ میں رنگے لفظوں' عقیدت کے جذب سے معمور اور تصوف کے

Marfat.com

انداز دلبرانہ سے لبریز ان اللہ لوگ بزرگ ہستیوں کا تذکرہ جناب اختر حسین شیخ نے پورے جذب وخلوص سے کیا ہے۔ جس سے وہی سماں پیدا ہوتا ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے اخلاص، دل سے نکلا ہوا ایک اصلاحی اور روحانی لفظ ہے جو فساد کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے میں ٹھنڈے پانی کا کام کرتا ہے اور بے چینیوں اور تلخیوں کو دور کر کے زندگی کو خوشگواریت میں بدل دیتا ہے۔ یہ صلاحیت بھی اللہ جل شانہ، نبی رحمتؐ کے صدقے اپنے خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے، جن پر اس کی خاص رحمت اور خاص نظرِ کرم ہوتی ہے۔ جناب اختر حسین شیخ نے ان بزرگ ہستیوں کا تذکرہ کر کے مسائل کے گرداب میں پھنسی ہوئی قوم کے لیئے مژدہ جانفزا سنایا ہے۔ ان کے ہاں اولیائے کرام کا ذکر محض ایک رسم نہیں رہ جاتا بلکہ وہ زندگی کی ایک بنیادی ضرورت روح کی غذا اور فطرت انسانی کا خاصہ بن جاتا ہے۔

فروغ محبت کے لئے محبتوں اور محبت کرنے والوں کا ذکر تقاضہ وقت ہے۔ اس لئے کہ محبت کا جذبہ، نفرت کے جذبوں سے بہر حال بدرجہ بہتر قرار دیا گیا ہے اور دیا جاتا رہے گا۔ جناب اختر حسین شیخ ضرورت وقت سے بخوبی آگاہ ہیں انہوں نے جس دلنوازی سے حب اختیاری و حب غیر اختیاری کو بیان کیا ہے یہ انہی کا خاصہ ہے۔ حب غیر اختیاری کیا ہے؟ بھلے لگنے والے چہروں اور زندگی کی لذتوں سے پیار، مثلاً وہ فلاں کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی شریعت میں کوئی وقعت نہیں۔ لیکن اس کے برعکس حب اختیاری نام ہے اس محبت کا جو انسان سوچ سمجھ کر اختیار کرے اور ظاہر ہے اسی سوچی سمجھی محبت میں ہر قدم پر مشکلات و مصائب موجود ہوتے ہیں جیسے کہ جدالانبیاء حضرت ابراہیمؑ نے سورج اور ستاروں کو دیکھ کر اس کا اظہار کیا کہ یہ معبود ہو سکتے ہیں مگر ان اجرام فلکی کو غروب ہوتے دیکھ کر اظہار بے قراری فرمایا کہ یہ معبود نہیں ہو سکتے ہیں انہوں نے سوچ سمجھ کر حب اختیاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور پھر آتش نمرود ان کی منتظر ہوئی۔ بقول حکیم الامت ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشا لب بام ابھی

حب اختیاری ہی راہ عشق ہے، یہی وہ راستہ ہے جسے جناب اختر حسین شیخ نے اپنانے کی تلقین کی ہے۔ یہ تلقین اسی محبت کے رموز کو وضاحت سے بیان کرنے کے بعد کی گئی ہے

Marfat.com

ان کے تذکرہ اولیائے کرام میں مسائل تصوف کی بڑی آسان تشریح بھی موجود ہے اور یہی وصف ان کی انفرادیت بھی ہے۔ جو پہلے کہیں نظر نہیں آئی۔

یہ فیضان نظر ہی ہے کہ میں جناب اختر حسین شیخ کے اس تذکرہ اولیاء کو "اللہ لوگ" کے عنوان سے ترتیب دے کر بانصیب ہونے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ورنہ "ایں سعادت بزور بازو نیست"

امجد جاوید

Marfat.com

اللہ لوگ

حضرت ابوالحسن علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ

Marfat.com

۴۷۱ ھجری میں برصغیر کو رشدوھدایت سے منور کرنے والے آفتاب عالمتاب 'سید ابوالحسن علی ھجویری الجلابیؒ المعروف داتا گنج بخش نے نہ صرف دلوں کی سلطنتوں کو تسخیر کیا بلکہ اس سرزمین پر چھائی بصارت وبصیرت کی اس شب سیاہ کے پرخچے اڑا دیئے جس کی تاریکی سے انسانیت لب مرگ تھی. آپ کی مساعی جمیلہ سے ظلمت کدہ ھند کے ان تمام" متون" کی بنیادیں ھل گئیں. جنھوں نے انسانوں کو غلام بنانے کا عزم صمیم کر رکھا تھا. سلسلہ جنیدیہ کے پیشوائے طریقت' زینت اوتاد' شیخ ابوالفضل محمد بن الحسن ختلیؒ سے فیض یافتہ ولئی وقت کی تصنیف'ھر مکتبہ فکر سے پذیرائی یافتہ برصغیر میں اسلامی تصوف کی پھلی اور مکمل کتاب" کشف المحجوب" صدقہ جاریہ کا مقام رکھتی ھے. آپؒ اسوہ حسنہؐ کا عملی نمونہ تھے' جن کے فیوض وبرکات کا منبع ومرکز لاھور رھا. جھاں سے نابغہ روز ھستیوں نے فیض پایا اور آج بھی آستانہ ھجویریہ وہ سرچشمہ فیض ھے جھاں سے عوام وخاص یکساں مستفیض ھوئے ھیں.

Marfat.com

فیض عالم

مسافر کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ دمشق سے غزنی اور غزنی سے لاہور تک کا یہ سفر بڑا طویل اور تھکا دینے والا تھا جو رہ عشق کے مسافر نے اپنے دو ساتھیوں کی ہمراہی میں طے کیا تھا۔ اس دور کے سفر کا عصر حاضر کی مسافت سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج تو مسافروں کو کانچ کے بنے ہوئی نازک ظروف کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے۔ جب کہ اس دور میں قدم قدم پر دشواریاں حائل ہوا کرتیں تھیں۔ چونکہ یہ لمبا سفر رضائے محبوب کی خاطر کیا گیا تھا لہذا مسافر نے ہر صعوبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ سفر منفرد نوعیت کا حامل تھا تو مسافر بھی دست وفا پر دل سجا کر پیش کرنے کی ہمت کا مالک تھا۔ اجنبی سرزمین پر ایک اور دشواری اس کی راہ میں حائل ہوئی تھی۔ سورج صف لپیٹ کر غروب ہو چکا تھا اور غبار شام کے اترتے ہی شہر پناہ کے دروازے بند کئے جا چکے تھے۔ یہی اس پر آشوب زمانے کا دستور تھا۔ دوران سفر ایک الجھن سی ضرور تھی جس نے مسافر کو سپرد اضطراب کئے رکھا تھا۔ اس اجنبی شہر لاہور میں اس کا پیر بھائی پہلے ہی رشد و ہدایت کی شمع فروزاں کئے بیٹھا تھا لہذا محبوب مرشد کا حکم نا قابل فہم سا تھا۔

''حضور! ایک میان میں دو تلواریں؟ ایک ریاست میں دو حکمران' بات سمجھ میں نہیں آ ر

Marfat.com

ہی" ایک ساتھی حرف مدعا زبان پر لانے سے باز نہ رہ سکا۔

"عزیزم! یہ ریاست دل کی ریاست ہے" مسافر نے تسلی آمیز لہجے میں فرمایا "اس میں دو کیا دس حکمران بھی سما سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ریاست دل میں حکمرانوں کی حیثیت' دودھ سے لبالب بھرے کٹورے میں گلاب کے پھول جیسی ہوتی ہے۔ نقل مکانی کے اس حکم کو ایک اور انداز سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔"

دونوں ساتھی سوالیہ نگاہوں سے مسافر کے رخ روشن کو بغور دیکھنے لگے کیونکہ وہ مسافر ان کا ہم سفر ہی نہیں رہنما بھی تھا۔

"تاریکی اگر حد سے تجاوز کر جائے تو بیک وقت دو چراغ روشن کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں" راہنما نے ساتھیوں کی تسلی تو کر دی مگر اس کا اپنا دل مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ محبوب مرشد کا حکم سفر اب بھی اس کیلئے نا قابل فہم سا تھا۔ اپنے اندر کو مطمئن کرنا بڑا ہی دشوار مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ وہ شب تاریک رہ عشق کے مسافر نے فصیل شہر کے باہر بسر کی اور طلوع آفتاب کے بعد مرشد کے حکم سفر میں پوشیدہ حکمت آشکار ہوئی۔

غم واندوز کی تصویر بنے چند افراد' کسی مقدس ہستی کا جنازہ لئے فصیل شہر کے مشرقی حصے سے باہر آ رہے تھے۔

"عزیزان گرامی! یہ کس ہستی کا سفر آخرت ہے؟" مسافر نے بصد احترام دریافت فرمایا۔

"جناب! ہمارے سروں سے آج ابر رحمت کا سایہ اٹھ گیا" ایک شخص نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا "آج اس بستی کا روشن ترین چراغ گل ہوا۔ یہ جنازہ ولی وقت میراں حسین زنجانیؒ کا ہے۔"

مسافر تو بس دھک سے رہ گیا۔ اس نے بغور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور چشم تصور میں مرشد سے آخری ملاقات کا سارا نقشہ پھر گیا۔ ان کا سرزمین لاہور کی جانب حکم سفر' اپنا استفسار' ان کی مسکراہٹ بھری خاموشی پھر لیت ولعل سے گریز کی ہدایت ساری باتیں سمجھ میں آتی چلی گئیں۔

برصغیر کے افق پر طلوع ہونے والا یہ آفتاب عالمتاب سید ابوالحسن بن عثمان بن علی ہجویری الجلابی کی ذات بابرکات تھی جنہیں عرف عام میں داتا گنج بخش کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کے دو ساتھی سید احمد حمادی سرخسی اور شیخ ابوسعید ہجویری تھے۔ یہ عہد غزنوی خاندان میں سلطان

Marfat.com

مسعود بن محمود غزنوی کا تھا۔ ۴۳۱ھ میں سید علی ہجویری نے سرزمین لاہور میں قدم رنجہ فرمایا تو برصغیر دور تاریکی میں مبتلا تھا۔ اس گہری تاریکی کی مناسبت سے کوئی ایسا ہی روشن چراغ مطلوب تھا جو شب سیاہ کے پرخچے اڑا سکے۔ بیت الجن دمشق میں زینت اوتاد شیخ ابوالفضل محمد بن الحسن ختلیؒ نے اپنے ہونہار شاگرد رشید علی ہجویری سے ارشاد فرمایا ''عزیزم! سرزمین لاہور کی جانب کوچ کر جاؤ۔''

حضور! وہاں تو برادر بزرگ حسین زنجانیؒ شمع ہدایت روشن کیے بیٹھے ہیں مجھ ناچیز کی کیا ضرورت آن پڑی؟'' سید موصوف نے بصد احترام سوال کیا۔

''عزیزم! یہ لیت ولعل کا موقع محل نہیں۔ رخت سفر باندھو اور کوچ کر جاؤ'' مرشد نے متبسم لہجے میں فرمایا۔

یہاں اس مکالمت کی وجہ سے پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب دینا بے حد ضروری ہے جو کج فہمی کی بناء پر ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ سید علی ہجویریؒ سے عقیدت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس گفتگو کی تشریح کر دی جائے۔ مرشد کے ہر حکم کی بجا آوری مرید کا فرض منصبی ہے اور رہے گا۔ رہ سلوک میں سر تسلیم خم کرنے ہی سے سربلندی نصیب ہوتی ہے تو پھر اس تناظر میں سید موصوف نے سوال کیوں کیا؟ کیا واقعی لیت ولعل سے کام لیا جا رہا تھا یا حقیقت کچھ اور تھی۔ جو ہستی رہ سلوک میں فنافی الشیخ ہونے کا حوصلہ رکھتی ہو جو اندوہ وفا کی کتاب میں نئے باب کا اضافہ کرنے والی ہو۔ اس کی زبان پر ''کیوں اور کیسے'' واقعی مناسب معلوم نہیں ہوتا مگر اس کی گہرائی میں اتریں تو وضاحت ہو جاتی ہے اور سید موصوف کا سوال نامناسب معلوم نہیں ہوتا۔

پہلی بات جو گرہ میں باندھنے والی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے سے باخبر صرف اور صرف ذات باری تعالیٰ ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ وہ ذات مائل بہ کرم ہو کر مخلوق کو جتنا اور جس قدر چاہے علم عطا کر دیتی ہے۔ کائنات کی سب سے بڑی الہامی کتاب قرآن اس علم کو بھی ''قلیل'' گردانتی ہے۔ گویا ولی، غوث، قطب ابدال، غرض ہر نوع کی مخلوق کا علم، خالق کی عطا کے تابع ہوتا ہے اور کسی ایک مقام پر مخلوق ''بے خبر'' ضرور ہوتی ہے۔ بے خبری نہ عیب ہے نہ گناہ۔ اس انسانی صفت کے خلاف بڑی بڑی ہستیوں نے جدوجہد کی جو ہر لحاظ سے جائز قرار دی جا سکتی ہے۔ تجسس کو دور کر کے اطمینان قلب کا حصول تو سنت ابراہیمی ہے   یہ راستہ تو جد انبیاء نے دکھایا تھا۔

''میرے معبود! ذرا چشم تماشا کی تسکین تو فرما، تو کیسے مردے کو زندہ کر دیتا ہے؟ خلیل

Marfat.com

اللہ حرف مدعا زبان پر لائے۔

''کیا تجھے یقین نہیں کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں؟'' خالق نے پوچھا۔

''میرے معبود! ایسی تو کوئی بات نہیں' میں تیغ ایمانی کا قائل تو ہوں مگر اب اس سے گھائل بھی ہو کر اطمینان قلب کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں'' سیدنا ابراہیمؑ نے جواب دیا۔ ثابت ہوا کہ اطمینان قلب کی خاطر تجسس سے بھرپور سوال نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوتا ہے۔ یہ سیدھا سادھا طلب اور عطا کا معاملہ ہے۔ شدت طلب جتنی زیادہ ہوگی' سوال اتنا ہی تجسس سے بھرپور ہو گا۔ یہ حقیقت کبھی بھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ ایسے سوالات وجہ عدم ایمان یا ایمان کی کمزوری نہیں ہوا کرتے بلکہ ایمان کے درجات میں بلندی یا پختگی مطلوب ہوا کرتی ہے۔ کائنات کی بلند ترین اور بہترین الہامی کتاب سے تو اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ کلیم اللہ بھی تو حرف مدعا زبان پر لے آئے تھے۔ وہ تو حسن مطلق کے دیدار کے متمنی ہو بیٹھے تھے...... یہ الگ بات ''لن ترانی'' جیسا جواب ملا...... بد بخت سے بد بخت انسان بھی ایمان پیغمبری میں کمزوری کی جانب اشارے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس مکالمت سے ایک اور حقیقت کا انکشاف بھی ہوتا ہے کہ جواب دینا مسئول کی صوابدید پر منحصر ہوا کرتا ہے۔ مسئول جو بہر حال سوالی سے بلند درجے پر فائز ہوتا ہے' سوالی کی بہتری کو مد نظر رکھتے ہوئے معروضی حالات کے تناظر میں جواب عطا فرماتا ہے...... دمشق میں ابوالحسن ختلیؒ نے سوالی کو لیت و لعل سے گریز کی تلقین ہی مناسب سمجھی۔ دوسری بات جو موصوف کے پیش نظر تھی وہ برصغیر پر چھائی ہوئی ادبار کی گھٹاؤں کیلئے مناسب ترین روشن چراغ کا انتخاب تھا۔ گویا اس تاریکی کی مناسبت سے کسی ایسے سنگ آفتاب کی اشد ضرورت تھی جس کے آنے سے شب سیاہی مانند آئینہ بکھر کر رہ جائے۔ اس دور میں وہ ذات علی ہجویریؒ ہی ہو سکتی تھی۔ اندھیرا بے مثال تھا تو چراغ بھی لاجواب ثابت ہوا۔

ایک اندھیرا وہ ہوتا ہے جس میں کچھ دکھائی نہیں دیتا اسے بصارت کی تاریکی کہتے ہیں دوسری نوعیت کا اندھیرا وہ ہوتا ہے جس میں کچھ بھائی نہیں دیتا اسے بصیرت کا اندھیرا کہا جاتا ہے۔ برصغیر بصارت و بصیرت دونوں اقسام کے اندھیروں میں ڈوب چکا تھا۔ یہ بات البتہ تشریح طلب ہے اور ان معروضی حالات کی وضاحت' جب علی ہجویریؒ کا لاہور میں ورود ہوا ہماری تحریر کا موضوع ہے...... وہ ساعت سیار بڑی ہی مبارک' بڑی ہی خوش بخت' تھی جب محمود غزنوی نے اپنے اسپ تازی کی لگامیں سوئے ہند موڑیں۔ ''ہوتی آئی ہے کہ لوگ اچھوں کو برا کہتے ہیں'' کے

Marfat.com

مصداق لوگوں نے اپنے اپنے ظرف و شرف کے مطابق اسے مرد و فا کیش کو عجیب و غریب الزامات سے نوازا۔ لٹیرا، ڈاکو، سیم و زر کا تمنائی اور جانے کیا کیا۔ بیگانوں کے ساتھ ساتھ چند اپنے بھی اس گروہ ملامت میں پیش پیش نظر آتے ہیں مگر صداقت پسند نقادوں کے نزدیک ایسے "لقمانوں" کا تعلق تر لقمے اور محققوں کا حقہ نوشوں سے ہونا چاہیے جو کج نظری کے طفیل بے پر کی ہانکتے ہیں۔ محمود غزنوی بصارت و بصیرت کی تاریکیوں کے خلاف علم بلند کرنے والا وہ مجاہد تھا جس نے سرزمین ہند کو نخل صداقت بونے کے لئے ہموار کیا۔ اس سچائی سے البتہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس نخل صداقت کو سینچنے اور پروان چڑھانے والے زیادہ تر صوفیائے کرام تھے۔ اس نیک سرشت گروہ میں سید علی ہجویری سرفہرست دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سچائی کے علمبردار شمشیر و سناں کی زبان کے برعکس ہمدردی و خیر خواہی کی زبان سے گفتگو فرماتے تھے جو دلوں کی سلطنتیں تسخیر کرنے کا تیر بہ ہدف نسخہ ہے۔ سنت نبویؐ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے سید ہجویریؒ نے خلق خدا کے اندر کی سلطنت تسخیر کی ...... محمود غزنوی کے حملے بھی فہم و فراست کے دائرے میں آتے تھے کہ زمین کو ہموار کرنے کے لئے سختی سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔ مزدور کی تخریب ہی تعمیر قصر کی پہلی کوشش ہوا کرتی ہے۔ بنیادیں کھودنے اور تعمیر و آرائش کے باقی مراحل میں جو واضح فرق موجود ہوتا ہے وہی افواج غزنوی اور گروہ صوفیاء میں تصور کیا جانا چاہیے۔ دونوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ برصغیر کا شمالی مغربی حصہ یا شمالی ہند ہی، بیرونی تہذیبوں کی گزرگاہ رہا ہے۔ گویا ہر تہذیب کی یلغار موجودہ پاکستان کے راستے ہند پر ہوتی رہی۔ ہر تہذیب جب مقامی تہذیب سے ٹکرائی تو دونوں کو اتصال سے ایک نئی تہذیب جنم پذیر ہوئی۔ یہ تو تھی ایک کلیے قاعدے کی بات۔ برصغیر میں یہ عمل ذرا مختلف طریقے سے ہوتا رہا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو انکشاف ہوگا کہ برصغیر ہر تہذیب کیلئے کان نمک ثابت ہوا۔ آریائی تہذیب نے اپنا رنگ جمایا، ساسانی، یونانی تہذیبیں بھی حملہ آور ہوئیں اور اپنے اپنے رنگ دکھا کر برصغیر میں دم توڑ کے رہ گئیں۔ البتہ ایک اسلامی تہذیب ایسی سخت جاں ثابت ہوئی جس نے اپنا الگ تشخص، ہر مقام پر قائم رکھا اور اسی طرح دو قومی نظریہ معرض وجود میں آیا۔ اسلامی تہذیب کا ارتقا کن مراحل سے گزرا اور سید علی ہجویریؒ کی مساعی جمیلہ کا اس میں کس قدر اہم کردار تھا اس کی تفصیل میں جانے سے پیشتر "تہذیب" کی تشریح پیش خدمت ہے۔

سادہ الفاظ میں تہذیب سماجی اقدار کے نظام کا نام ہے یعنی System of social values گویا تہذیب جغرافیائی یا سیاسی حقیقت سے الگ ایک سماجی حقیقت

Marfat.com

ہے۔ ریاست کی جغرافیائی سرحدیں بہ آسانی بدل جاتی ہیں مگر قومی تہذیب کی سرحدیں اتنی جلدی نہیں بدلا کرتیں۔ انگریزی زبان میں اس وحدت کیلئے لفظ ''کلچر'' مستعمل ہے جو لاطینی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی' زراعت کا عمل' کھیتی باڑی' ریشم کے کیڑوں کی افزائش نسل وغیرہ۔

بنیادی لحاظ سے ''تہذیب'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مفہوم پودوں کی تراش خراش ہے تاکہ ان سے نئی کونپلیں پھوٹ سکیں۔ یہی لفظ جب فارسی میں آیا تو اس کا مفہوم ہوا ''پاک و درس کردن و اصلاح نمودن'' اردو میں عام طور یہ لفظ ''شائستگی'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے...... پنجابی میں ''رہتل بہتل'' دو الفاظ تہذیب کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ دیگر ممالک کی طرح برصغیر میں بھی مختلف تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوتا رہا۔ مقامی طور بھی اصلاحی تحریکیں جنم لیتی رہیں مگر اہل ہوس کے ہاتھوں ہر رفائی تحریک رفتہ رفتہ معاشرے اور عوام الناس کے لئے وبال جاں بنتی گئی۔ یہی وہ حالات ہیں جن کو ہم نے بصیرت کا اندھیرا قرار دیا اور ان حالات ہی میں اجالے کی تمنا کی جاتی ہے۔

کرہ ارض پر امن وسکون سے زندگی بسر کرنا ہر ذی روح کا سہانا خواب رہا ہے۔ اسکے حکماء' رہنمائیاں تجویز کرتے رہے ہیں۔ الہامی مذاہب کے نکات نظر کے مطابق یہ رہنمائی اوپر سے یعنی منجانب اللہ آتی رہی ہے مگر اہل ہوس ابتدائے آفرینش ہی سے ان روحانی و دنیاوی رہنماؤں کی مخالفت میں اپنی ربوبیت کا اعلان کرتے رہے اس لئے کہ ہر مصلح عدل وانصاف کا داعی رہا ہے۔ مادہ پرست حکماء بھی خلوص نیت سے اصلاح معاشرہ میں کوشاں رہے ہیں مگر اپنے گروہ کو دوسروں سے برتر ثابت کرنے میں ایسے ایسے قوانین تراش لیا کرتے تھے جو دوسروں کو حق تلفی کا جواز مہیا کرنے میں لاجواب ہوا کرتے تھے۔ ان ہی قوانین کو اہل ہوس نے مذہب کا مقام عطا کیا اور حتی الامکان معاشرے کو پرسکون رکھنے کی سعی لاحاصل کرتے رہے جس قانون کی بنیاد ہی ناانصافی پر استوار ہو وہ کبھی بھی امن وسکون کا ضامن نہیں ہوسکتا اور یہاں دنیاوی رہنماؤں کا تو مطمع نظر ہی دوسروں کی حق تلفی ہوا کرتا تھا یہی کرہ ارض پر وجہ فساد رہی ہے اور شاید تاقیامت رہے۔ برصغیر میں بوجوہ یہ فساد عام ممالک کی نسبت زیادہ رہا ہے۔ ان وجوہات کو زیر بحث لانا اصل موضوع سے ناانصافی والی بات ہوگی۔

آریاؤں کی برصغیر میں آمد سے پہلے' سماجی اقدار کا وہ نظام جو شمالی ہند بلکہ پورے برصغیر میں رائج تھا۔ اس میں وادی سندھ کی تہذیب سرفہرست قرار دی جاسکتی ہے۔ دانش وروں کے بقول ہر ایسے سماجی نظام کی ترکیب چار عناصر پر استوار ہوتی ہے۔ کسی خطے کے طبعی

Marfat.com

حالات' انسانی گروہ کے زیرِ استعمال آلات ضرب و حرب و کھیتی باڑی' نظامِ فکر و احساس اور سماجی قدروں کی نوعیت' ان چار عناصر ترکیبی کے طفیل ہر تہذیب ترقی کی منازل طے کرتی رہی یا تنزل و جمود کا شکار ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔

وادی سندھ کی تہذیب مختصر الفاظ میں امن و آتشی کی تہذیب تھی۔ افزائش فصل و نسل کو وہ لوگ ہر چیز پر فوقیت دیتے تھے گویا یہی حیات انسانی کا محور تھا۔ روحانی رہنمائی کے فقدان کے نتیجے میں انسانی ذہن نے اپنی آسودگی کی خاطر چند قوانین بنا رکھے تھے جن کو وہ مذہبی حیثیت اور مقام عطا کرتے تھے۔ بنیادی طور پر معاشرہ ''مادری'' کہلاتا تھا یعنی عورت کا مقام و مرتبہ' تخلیق کا سرچشمہ ہونے کی بنا پر سب سے بلند تھا۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ لوگ ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' سے کئی قدم آگے بڑھ کر کارخانہ قدرت کو جسم انسانی کے حوالے سے دیکھنے کے عادی تھے۔ یعنی جس طرح مرد و زن کے ملاپ سے نئے وجود کی تخلیق ہوتی ہے اسی طرح کائنات کی دوسری اشیاء معرض وجود میں آتی ہیں۔ اس تخلیقی عمل میں چونکہ نسوانی وجود کا کردار زیادہ اہم ہوتا ہے لہٰذا وجود زن کا مقام ارفع و اعلیٰ قرار دیا گیا۔ یہی ''تنترک عقیدہ'' ہے اور سانکھیہ فلسفے کی بنیاد بھی اسی عقیدے پر ہے۔ (وادی سندھ میں محکمہ آثار قدیمہ کی کاوشوں سے جو ڈھیروں مورتیاں دستیاب ہوئی ہیں ان کے گہرے مطالعے کے بعد' ماہرین نے انہیں تنترک رسوم کی عکاسی قرار دیا) ''تنتر'' سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کا مفہوم 'پیدا کرنا' افزائش' پھیلانا وغیرہ ہے۔ اس فلسفے کی رو سے ساری کائنات' شکتی یعنی عورت اور بیروش یعنی مرد کے جنسی ہیجان کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی۔ بنابریں تنترک رسوم میں جسمانی حرکات اور وجود زن کے نقوش کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

سوانی (پوٹھوہار) کے قدیم ترین تہذیب کے متعلق البتہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس معاشرے میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش کا رواج نہیں تھا اور نہ وہ کسی مافوق الفطرت طاقت پر ایمان رکھتے تھے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک ''حضری'' معاشرہ تھا یعنی لوگ مل جل کر رہنے کو ترجیح دیتے تھے گویا وادی سندھ کی تہذیب یا جغرافیائی حدود کا احساس زندہ و بیدار تھا۔ آریاؤں سے پہلے کی یہ تہذیب کوئی دو ہزار پانچ سو برس پہلے عروج پر تھی۔ رفتہ رفتہ آریاؤں کی آمد سے نئے فساد کا آغاز ہوا......

آریہ کسی خاص نسل یا قوم کا نام نہیں۔ یہ وہ انسانی گروہ تھے جو خوارزم اور بخارا کی سر

Marfat.com

زمین پر خانہ بدوش ایسی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔انہوں نے دو ہزار ق م کے لگ بھگ اپنی چراہ گاہوں سے نکل کر وسطی ایشیا سے جنوب مغربی ایشیا کا رخ کیا۔ان خانہ بدوشوں کی زبان سنسکرت تھی اور سنسکرت میں بلند مرتبت اور آزاد انسان کو آریہ کہتے ہیں۔لہٰذا بھیڑ بکریاں پالنے والے یہ بدوی حضرات آریہ کہلائے۔ان کا معاشرہ ہندی معاشرے کے برعکس بدوی (یعنی حضری کے برعکس)ادھر ادھر نقل مکانی کرنے والا تھا۔دوسرا بنیادی فرق ان کے ہاں پدری نظام رائج تھا۔یعنی گھر اور قبیلے کا سربراہ عورت کی بجائے مرد کی ذات تھی۔ذات پات کی تمیز تو ان میں بھی نہیں تھی مگر معاشرہ تین طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔چھتری جدال وقتال کے ماہر'برہمن مذہبی رسوم ادا کرنے والے ویش یعنی صنعت وحرفت کے ماہرین۔ان طبقات میں نسلی امتیاز ہرگز نہیں تھا۔آپس میں شادی بیاہ جائز تھا۔خاندانی وحدت کو گراما اور گھر کے بزرگ کو ''گرامنی'' کہتے تھے۔(پنجابی کا گرائیں یا اردو زبان میں گھر' گھرانہ آریاؤں کے گراما اور گرامنی سے ملتے جلتے الفاظ ہیں)۔ان لوگوں کو بودوباش کا تقاضا تھا کہ مستقل عبادت گاہیں نہ بنائیں چنانچہ ان میں مورتی پوجا یا بت پرستی کا رواج بھی مفقود تھا۔یہ لوگ مظاہر قدرت کی پرستش کیا کرتے تھے۔ان کے پانچ دیوتا بڑے اہم تھے۔درونا (آسمان) اگنی (آگ) وایو (ہوا) مترا (سورج) اور اندرا (دیوتا جنگ)۔

یہ لوگ ہند میں بیک وقت وارد نہیں ہوئے بلکہ یہ سلسلہ کوئی ایک ہزار برس تک چلتا رہا پہلے آنے والے قبائل اور بعد میں آنے والوں میں جنگیں بھی ہوئیں۔یہ تماشا برصغیر میں جوبن پر رہا......ان کی چار کتب بڑی مشہور ہیں یعنی رگ وید' سام وید' اتھر وید' اور یدھر وید۔جن میں قدیم ترین کتاب رگ وید ہے جو 1500 قبل از مسیح سے 1200 قبل از مسیح لکھی گئی۔بدوی معاشرے کی بنا پر یہ لوگ حضری معاشرے کی بہ نسبت زیادہ جفاکش اور جنگجو تھے لہٰذا قدیم ہندی اقوام پر غالب آ گئے......حد یہ کہ بعد میں آنے والے قبائل نے اپنے پیش رو قبائل کو وسطی ہند یعنی گنگ و جمن کے علاقے میں دھکیل دیا۔ویدک تحریروں میں سات دریاؤں کی زمین ستلج' بیاس' راوی' چناب' جہلم' سندھ اور اٹک کو سپت سندھو دیش کہا گیا ہے......یہی سات دریاؤں کی زمین بعد میں پانچ دریاؤں کی زمین یعنی پنجاب کہلائی۔آریہ لوگ ریاست کو ''راشٹر'' کہتے تھے۔

بدوی طرز زندگی کو خیرباد کہہ کر جب یہ لوگ حضری طرز زندگی کی جانب لوٹے تو مقامی تہذیب کے ملاپ سے ان کے مذہبی عقائد میں زمین و آسمان کا فرق آ گیا۔پہلا فرق تو یہ ہوا کہ اندر دیوتا جو جنگ وجدل کا خدا تھا۔ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ان لوگوں نے شکتی دیوی' دھرتی ماتا

98213

Marfat.com

اور شیوا کی پوجا کا آغاز کر دیا۔ یہ عقیدہ مقامی تہذیب سے اپنایا گیا جس میں شکتی دیوی پردھان تھی......شیوا کو مہالنگم کے مقام پر فائز کر کے درگا' پاروتی اور ادما وغیرہا کو اس کی زوجیت میں دے دیا واضح رہے کہ یہ سب شکتی کے روپ تھے جو مقامی تہذیب نے اسے عطا کر رکھے تھے۔ اس طرح ہندی معاشرے میں بت پرستی کا رواج ہوا۔ مادری معاشرے کا نشان ہلال ہوا کرتا تھا جب کہ پدری معاشرے کی علامت سورج تھا۔ ہندوؤں کی تری مورتی کے تین چہرے یعنی برہما' وشنو اور شیوا جو گویا قوت واحدہ کے تین روپ ہیں۔ آسان الفاظ میں یہ تین چہرے تخلیق' تحفظ اور تخریب کی نمائندگی فرماتے ہیں۔

آریاؤں نے مرور زمانہ کے ساتھ اپنے پرانے دیوتاؤں درونا' وایو اور اندر کو یکسر بھلا دیا اور ان کی جگہ شیوا اور درگا کو مقام پرستش پر فائز کر دیا۔ اس کے بعد لنگ (عضو تناسل) اور بیل کی پوجا کا آغاز بھی ہو گیا۔ یہ مرد و زن کے ملاپ والا قدیم مقامی عقیدہ تھا جو آریاؤں نے اپنا لیا۔ بیل مردانہ تخلیقی قوت کی علامت تھا۔ وہ آزاد لوگ جو کسی دور میں مظاہر قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کیا کرتے تھے۔ اب درگا' شیوا' لنگ وغیرہ کے بت بنا کر ان کی پوجا کرنے لگے۔ برہموں نے اپنے تحفظ کی خاطر ذات پات کے نظام کی ترویج و ترقی میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ایک چوتھی ذات شودر کو اپنے معاشرتی نظام کا حصہ قرار دیا جسے برہما کے پاؤں کی میل سے تخلیق کیا گیا اور انسانیت کی تذلیل کا باب کھول دیا۔

انسانی بصیرت کا یہ اندھیرا کس قدر گھناؤنا تھا اس کا مزید جائزہ لینے سے پیشتر اس لنگ یا لنگم پوجا کی وضاحت اشد ضروری ہے۔ اندازہ تو لگایا جا سکے کہ آخر اس سرزمین کو روشن چراغ یا طلوع آفتاب کی کیا ضرورت تھی۔

شکتی دیوی اور شیوا یا شو کے ملاپ سے افزائش نسل و فصل کا ترجمان عقیدہ لنگ پوجا پہ منتج کیسے ہوا؟ اس کے متعلق ہندو پران (مذہبی کتب) میں ایک عجیب و غریب ہیجان انگیز کہانی مرقوم ہے۔ سمپردائے HINDU SECTS کے مولف پروفیسر بی بی رائے صاحب نے ہندوؤں کے مختلف فرقوں پر مدلل بحث کی ہے۔ لنگ پوجا کی تفصیل بقول رائے صاحب کچھ اس طرح ہے۔

''شو اور دیگر دیوتاؤں کی پوجا میں ایک بنیادی فرق موجود ہے۔ وہ یہ کہ شیو جی کی پوری مورتی نہیں بنائی جاتی محض ان کے لنگ (عضو تناسل) کو لوگ پوجتے ہیں۔ لنگ پران میں (وہ

Marfat.com

مذہبی کتب جن میں لنگ کی تفصیل درج ہے) دو طرح کے شو کا بیان ہے۔ النگ اور لنگ۔ النگ شو 'نرگن اور ا کرتا ہے۔ (نرگ' بمعنی ذات سرگن کا نقیض وہ ذات جو صفات انسانی سے مبرا اور منزہ صفات ربی' پرمیشور جو ست' رج اور تم' تینوں گنوں سے پاک ہے) پر لنگ شو جگت کا کارن ہے اور لنگ شو' النگ شو سے نکلا ہے۔ جگت کا کارن' بمعنی باعث تخلیق دنیا)

''لنگ کا مہمہ (عظمت بزرگی) ظاہر کرنے کیلئے لنگ پران میں یہ قصہ مرقوم ہے۔ پر لئے (دوسری دنیا پرلوک) کے سمندر میں ایک مرتبہ برہما اور وشنو میں سخت بحث ہو رہی تھی۔ برہما کہتا تھا کہ میں خلقت کا بانی ہوں اور وشنو کہتا تھا میں اس کا بانی ہوں۔ اس جھگڑے کو رفع کرنے کے لئے ایک نہایت حیرت افزا لنگ ظاہر ہوا جو فنا کرنے والی آگ کی مانند تھا اور جو ہزار ہا شعلوں کی مانند چھلک رہا تھا۔ اس لنگ کے نظارے سے برہما اور وشنو دونوں حیران و پریشان ہو گئے اور اس کے آدا اور انت (ابتدا و انتہا) ڈھونڈنے کے لئے' وشنو جی برہ روپ لے کر پاتال میں اتر گئے اور برہما' ہنس روپ لے کر اوپر کی طرف اڑے۔ پر نہ نیچے نہ اوپر اس لنگ کا آدا انت کہیں نہ ملا۔ سو دونوں پریشانی کی حالت میں واپس آئے اور اس لنگ کے آگے تھرتھرانے لگے۔ اتنے میں اچانک آکاش بانی ہوئی (فضا میں آواز گونجی) اوم......اوم اور لنگ کے پہلو میں اونکار کے تین حروف یعنی ا' و' م نظر آئے جس کا مطلب یہ ہے کہ لنگ ہی سرشٹی' ستھیتی اور ناش کا بانی ہے (یعنی تخلیق' تحفظ اور تخریب کا)

''اہل ہنود شو اور شکتی دونوں کو اکٹھے ایک جفتی علامت میں پوجتے ہیں یعنی شو لنگ کے نیچے ایک جونی (اندام نہانی) بناتے ہیں جس پر لنگ کھڑا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لنگ پران میں لکھا ہے کہ دیدی یعنی جونی مہا دیوی ہے اور لنگ خود مہیشور' سو اس لنگ اور جونی کی پوجا سے شو اور شکتی دونوں کی پوجا ہو جاتی ہے۔ لنگ ارجن تنتر میں لکھا ہے کہ شو اگر شکتی کے ساتھ ملا نہ رہے تو وہ مانند ایک مردہ کے ہے۔ شکتی کے ساتھ ملنے سے شو کرم کرتا ہے سو شکتی کے ساتھ شو لنگ کی پوجا ضروری ہے۔''

تنتر میں لنگ کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں۔ ایک اصلی اور دوسری نقلی۔ اصلی لنگ انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے نہیں ہوتے۔ یہ پتھر کے وہ ٹکڑے ہوتے ہیں جو موسموں کے تغیر و تبدل سے لمبوتری شکلیں اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ انہی اشکال کو انسانی کج نظری لنگ (اور وہ بھی شو کا) تصور کر لیتی ہے لنگ کی دوسری قسم انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کی تخلیق مٹی اور دھات وغیرہ سے کی جاتی ہے۔ سکند پران کے کاشی کھنڈ میں بارہ مشہور لنگوں کے نام درج ہیں جن

Marfat.com

کو جوتر لنگ کہتے ہیں ۔ان میں سے صرف ایک لنگ کو محمود غزنوی نے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا یعنی ''شوم ناتھ لنگ''

اس شرمناک فعل کی شدت کو کم کرنے کے لئے اہل ہنود نے تلاش بسیار کے بعد' دیگر ممالک میں لنگ پوجا والی رسم کو کھوج کر مفصل بیان کیا ہے ۔یعنی یہ رسم فلاں ملک اور فلاں خطہ ارض پر بھی جاری وساری رہی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اگر کسی فعل کا ارتکاب زیادہ لوگ کر رہے ہوں تو یہ اس کی سچائی کی دلیل ہرگز نہیں اور نہ اسے سودمند قرار دیا جاسکتا ہے ۔ برائی فیل بے زنجیر بن کر بھی رقص کرے تو وہ برائی ہی رہتی ہے ۔یہ تو وہی بات ہوئی کہ ہماری ناک کٹی ہوئی ہے تو کیا ہوا فلاں فلاں کی بھی تو کٹ چکی ہے ۔رائے صاحب سمپر دائے میں رقم طراز ہیں ۔

''بعض علماء کہتے ہیں کہ لنگ پوجا ہندوستان ہی میں نہیں زمانہ قدیم میں اس کا رواج دیگر ممالک میں بھی تھا ۔مثلاً ملک مصر میں بڑے معبود ''اسیرس'' کا لنگ بھی بکثرت پوجا جاتا تھا ۔ اسیرس دیوتا اور اس کی جورو آئسس دیوی کے ساتھ ہند کے شو اور شکتی کی بہت سی باتوں میں مشابہت پائی جاتی ہے ۔مثلاً شو کی شکتی بھگوتی کو بشوا روپنی قرار دیتے ہیں ۔مصری لوگ آئسس دیوی کو زمین کے ساتھ ہم وجود مانتے ہیں ۔تنتر میں شکتی کی علامت ایک مثلث ہے ۔اسی علامت کی حامل آئسس دیوی ہے ۔شو کا رخاص ناش کرنا ہے اور اسیرس دیوتا بھی فنا کرنے والا ہے ۔ شو کی سواری قابل تعظیم واکرام بیل ہے ۔اسیرس دیوتا کے اپیس نامی کالے سانڈ کو مصری پوجتے تھے ۔شو اور اسیرس دونوں کے سروں پر سانپ لپٹے ہوتے ہیں ۔شو کے ہاتھ میں ترشول ہوتا ہے 'اسیرس کا ہتھیار بھی اس نوعیت کا ہوا کرتا تھا ۔شو کا مقدس درخت بیل ہے ۔اسیرس کا درخت بھی اس سے ملتا جلتا تھا ۔شو کا خاص دھام کاشی ہے'اسیرس کا میمفس دونوں پر دودھ ڈالا جاتا ہے البتہ اسیرس کا رنگ سیاہ اور شو کا سفید ہے لیکن مہا کال شو کا رنگ بھی سیاہ ہوتا ہے ۔

''ملک یونان میں بھی لنگ پوجا کا رواج رہا ہے' اکثر شہروں کے مندر لنگ مورتیوں سے مزین ہوا کرتے تھے اور ان کے لئے جلسوں کا رواج بھی تھا ۔ بیکاس دیوتا کے لئے فیلی فوریا نامی جلسہ منعقد ہوا کرتا تھا ۔لوگ اسی انداز میں ناچا کرتے تھے جیسے بنگال میں چڑک پوجا کے موقع پر رقص ہوا کرتا تھا ۔(یونانی لوگ ستائش دیوی کے دوران جو کچھ کہا کرتے تھے وہ ناقابل اشاعت ہے)

حیران کن بات یہ ہے کہ لنگ پوجا میں رسومات کی ادائیگی کنواری کنیاؤں کے

Marfat.com

ہاتھوں افضل ترین گردانی جاتی تھی' کھل کرناچنے کا خوب خوب اہتمام ہوا کرتا تھا۔ انسانی گمراہی کی حد ہے نہ انتہا۔ بیکاس دیوتا کا لنگ تو خیر ایک سو بیس ہاتھ لمبا ہوا کرتا تھا مگر بابل اور ہندی اسوری دیوتاؤں کے لنگ تین تین سو ہاتھ لمبے ہوا کرتے تھے۔ ہنود کی ہر پوجا کے لئے پروہت کی موجودگی ضروری ہے مگر لنگ پوجا کیلئے ایسی کوئی شرط نہیں۔ مرد وزن کو لنگ پوجا کے مساوی حقوق حاصل ہوا کرتے تھے (اور آج بھی ہیں) خواتین شودوارے جا کر بیل کے پتے اور پانی چڑھایا کرتی تھیں یا اپنے گھروں میں گوشہ تنہائی میں خودساختہ لنگوں کی پوجا کرلیا کرتی تھیں۔

دکن میں شولنگ کی پرستش کی ہر نوع کی پوجا پر فوقیت حاصل تھی۔ ہندوؤں کا ایک فرقہ لنگایت' لنگونت یا جنگم کے نام سے مشہور تھا جس نے دیگر تمام دیوتاؤں کو پس پشت ڈال کر اس رسم کو اپنا اشعار بنایا۔ باسب نامی شخص نے اس فرقے کی تنظیم نو کی۔ جین مت کو نیست ونابود کر کے شیومت کو پھیلانے والا یہی شخص تھا۔ اس فرقے نے تو سورج دیوتا' اگنی پوجا' تیرتھ یاترا' گنگا جل' برہمن بھوجن ہر شے کا انکار کر دیا۔ مردوں کو سپرد چتا کرنے کے خلاف مہم چلائی اور تدفین کو رائج کیا چنانچہ رسم ستی میں چتا پر جلنے کی بجائے بیوہ کو زندہ درگور کیا جانے لگا۔ دکن میں شادی کی ایک رسم تو بڑی ہی واہیات قسم کی تھی۔ شادی شدہ عورت کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ بیاہ تو ایک شخص سے رچالے مگر گھر کسی دوسرے کا آباد کرے۔ یہ لوگ شمالی ہند میں بھی پائے جاتے تھے اور لاہور کے گردونواح میں بھی۔ اس علاقے میں سانڈوں کو سجا کر پھرنے والے لوگوں کا تعلق جنگم قبیلے سے ہوا کرتا تھا۔

ساسانی' یونانی حضرات بھی ہند میں وارد ہوئے تو اپنی رسومات ساتھ لے کر آئے۔ مگر ہندی رسم ورواج نے رفتہ رفتہ ان سب کو نگل لیا۔ کہیں کہیں بیرونی رسوم کے آثار ہندی معاشرے میں ضرور پائے جاتے تھے مگر بحیثیت مجموعی اب یہ معاشرہ خالص ہند آریائی تھا جو برہموں کے قبضہ قدرت میں تھا۔ شودر نچلی ذات کے لوگ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے۔ برہمن اور دیگر بلند مرتبت لوگوں پر ان کا سایہ پڑ جانا بھی ناقابل برداشت تھا البتہ ان کی محنت کا پھل اونچی ذات کے لوگوں کے لئے ہوا کرتا تھا۔ یہ لوگ گویا پیدائشی بدبخت قرار دیئے جاچکے تھے عجیب بات یہ ہے کہ برہموں نے اپنی مذہبی کتب کا بھی لحاظ نہ کیا اور اپنے من پسند قوانین کو رائج کر دیا۔ شریمد بھگوت گیتا ہنود کی مقدس ترین پستک ہے جس کا مطالعہ ہر سیدھی مت والے کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی اہمیت' اس کی تقدس کو کوئی ہندو نظر انداز کرنے کی جرات نہیں کر

Marfat.com

سکتا۔ یہ ان کی قدیم روحانی کتاب ہے۔ اصل میں یہ مذہبی کتاب ان اپدیشوں پر مشتمل ہے جو شری کرشن مہاراج نے پانڈوؤں کے سالار ارجن کو کوروکشیتر کے میدان میں مہابھارت کی جنگ کے وقت دیئے۔ گویا یہ بلند مرتبہ پستک مہابھارت کا خلاصہ ہے۔

سری کرشن نے اپنے اپدیش میں انسان، روح، خدا، بھگتی کی تفصیل بیان کر کے وصال خدا کا طریقہ بیان کیا ہے۔ انسانی فرائض میں شکلا کرم (عمل بے لوث) کو وصال کی پہلی شرط قرار دیا ہے۔ اس میں کل سات سو اشلوک ہیں۔ پرم آتما پرماتما یعنی خدا کی ہستی کے متعلق گیتا کا فیصلہ ہے کہ خدا موجود ہے بلکہ ''خدا ہی موجود ہے'' گویا گیتا وحدت وجودی کی تعلیم دیتی ہے۔ فطرت، نیچر، پرکرتی ہر شے ہر عالم میں اس کا نور وظہور ہے۔ ملاحظہ ہو پندرہواں ادھیائے اور بارہواں شلوک یعنی......

یہ سورج کی تابش مرا نور ہے
جہاں جس کے جلووں سے معمور ہے
تو آتش درخشاں مرے نور سے
رہے چاند رخشاں مرے نور ہے
جو ہر سمت پاتا ہے میرا ہی نور
مجھی میں جو ہر شے کا دیکھے ظہور
کبھی مجھ سے منہ موڑ سکتا نہیں
کبھی میں اسے چھوڑ سکتا نہیں
جو کثرت میں وحدت کا دیکھے سماں
جو پوجے مجھے ہوں میں سب میں عیاں

کائنات کی شیرازہ بندی اسی پرم آتما کے دم قدم سے ہے۔ وہ نابود ہو جائے تو سارا شیرازہ ہی بکھر کر رہ جائے۔

سن ارجن نہیں کچھ بھی میرے سوا
نہ ہے مجھ سے بڑھ کر کوئی دوسرا
پرو دیا ہے سب کچھ مرے تار میں
کہ ہیرے ہوں جیسے کسی ہار میں

Marfat.com

گیتا کے مطابق وہ آنکھ سے نہیں بلکہ آنکھ اس سے دیکھتی ہے' اسی طرح کان اس سے سنتے اور زبان قوت گویائی کا اظہار اسی کے طفیل کرتی ہے۔ وہ جان کی جان اور دل کی دھڑکن ہے گیتا کے انوسار سانکھیہ فلسفہ بھی غلط ہے۔ اس فلسفے کے مطابق دنیا کی ہر شے دو مختلف خود مختار ابدی عناصر سے معرض وجود میں آ گئی مگر گیتا وحدانیت کی تعلیم دیتی ہے سانکھیہ کہتا ہے کہ بے جان پر کرتی مادہ سے پیدا ہوئی اور جان دار پرش روح سے' مگر گیتا اس پر خط تنسیخ کھینچ دیتی ہے۔ اس کے مطابق مادہ اور روح ایک پرمیشور کا ظہور ہیں۔ اول الذکر خدا کی اپرا پرکرتی یعنی ادنیٰ فطرت ہے اور روح پرا پرکرتی یعنی اعلیٰ فطرت۔ پھر گیتا اس ادنیٰ فطرت کے آٹھ روپ دکھاتی ہے۔

اس کتاب کے 10 ویں ادھیائے کا 20 واں شلوک تو واقعی حیران کن ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ مذہب کے برہمن ٹھیکے داروں نے اپنی ہی تعلیم کا حلیہ کس انداز میں بگاڑا۔

سن ارجن میں ہوں آتما بالیقیں
جو ہے جانداروں کے دل میں مکیں
میں ہوں مثل جاں اہل جاں میں نہاں
میں اول میں آخر میں ہوں درمیاں
مری ذات ہے مالک کائنات
نہ اس کو ولادت نہ اس کو ممات
ازل سے تھی موجود ہستی مری
ازل سے تھی موجود ہستی تری

گیتا انسان کو مکتی یعنی نجات کے تین راستے دکھاتی ہے کرم مارگ (راہ عمل) بھگتی مارگ (راہ عشق) اور گیان مارگ (راہ عرفان)۔ ان پر ہر شخص چل کر مکتی حاصل کر سکتا ہے۔ ذات پات' ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی قید نہیں۔

سمجھ دل سے یہ بات کنتی کے لال
مرا بھگت پائے نہ ہرگز زوال
بشر پاپ کے پیٹ سے ہو کوئی
وہ ہو ویش شودر یا ہو استری
مجھے آسرا جب بنائے گا وہ

Marfat.com

تو اعلیٰ منازل پر جائے گا وہ

مگر سب سے عجیب بات یہ ہے کہ گیتا بت پرستی کے مخالفت کرتی ہے اور اصنام کے پجاریوں کو گمراہ قرار دیتی ہے۔ یہ اشعار بلا تبصرہ پیش خدمت ہیں۔

ہوا و ہوس سے جو مجبور ہیں
ہوئے گیان سے جن کے دل دور ہیں
نکالیں طبیعت سے پوجا کی ریت
کریں دوسرے دیوتاؤں سے پریت
منائیں جو پتروں کو پتروں تک آئیں
جو بھوتوں کو پوجیں وہ بھوتوں کو پائیں
صنم کے پجاری صنم سے ملیں
ہمارے پرستار ہم سے ملیں

گیانی کو جب عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو ہر ذی روح اس کیلئے مساوی درجے کا حامل ہوتا ہے یعنی چنڈال اور برہمن میں کوئی امتیاز نہیں۔ اصل عرفان یہی ہے کہ اونچ نیچ کا امتیاز مٹ جائے۔

جو گیانی ہے یکساں نظر اس کو آئے
وہ ہو کوئی کتا کہ ہاتھی کہ گائے
کوئی برہمن عالم و بردبار
کہ چنڈال ناپاک مردار خوار

یہ ہندو دھرم کا آغاز تھا۔ نہ بت پرستی نہ ذات پات کی تقسیم، عمل بے لوث کے تلقین البتہ ہر قدم پر کی گئی۔ حق تلفی مہاپاپ قرار دی گئی...... لیکن ہوا کیا؟ اس دھرم میں شرمناک رسوم در آئیں، انسانیت کے تذلیل کو مذہبی قوانین کا درجہ دیا گیا۔ ظلم و ستم کو شعار گردانا اور دستور مانا گیا۔ یہ بصیرت و بصارت اندھیرا نہیں تو اور کیا تھا؟ یہی وہ دور تھا جب ویدک مذہب کو برہمنوں نے برہمن مت میں تبدیل کر دیا۔ عوام الناس تو رہے ایک طرف عظیم الشان راجے مہاراجے بھی برہمنی شکنجے سے عاجز آ گئے اور اس سے نجات کی تمنا کرنے لگے۔ ان حالات کے نتیجے میں دو آوازیں بلند ہوئیں یعنی بدھ مت و جین مت...... بدھ مت کا بانی گوتم بدھ اور جین مت کا بانی مہاویر ہم عصر

Marfat.com

تھے۔ دونوں حضرات نے اپنے ظرف وشرف کے مطابق اصلاح معاشرہ کا بیڑا اٹھایا۔

موجودہ صوبہ بہار کی دکنی سرحد کے قریب کپل واستو کی راجدھانی تھی۔ جہاں ساکیہ قوم کا سربراہ سدھودن حکمران تھا۔ 563ء قبل از مسیح میں اس کے ہاں گوتم شہزادہ پیدا ہوا جو بڑا حساس اور دردمند دل کا مالک ثابت ہوا۔ یہ تھا تو راج کمار مگر اپنے مقام ومرتبے والی کوئی بات اس میں نہ تھی۔ معروضی حالات تو اس کے زخموں پر کچوکے ہی لگاتے رہتے۔ عدم مساوات' نا انصافی' انسانی دکھوں پر ہمیشہ سیر د اضطراب رہتا۔ اولاد کا دکھ بھرا چہرہ ہر ماں باپ کے لئے وجہ رنج والم ہوتا ہے۔ اس میں شاہ گدا کی کوئی قید نہیں۔ راجا سدھو نے بھی اپنی فہم فراست کے مطابق راجکمار کے دکھ کا مداوا کیا۔ اسے ایک حسین وجمیل دوشیزا ایشودھرا سے رشتہ ازدواج میں منسلک کردیا ...... گوتم کے ہاں ایک بیٹا بھی تولد ہوا مگر یہ ریشمی بندھن گوتم کو زیادہ دیر تک اسیر نہ رکھ سکا۔ ایک رات جب کہ وہ عمر عزیز کے 29ویں برس میں تھا' حسین وجمیل شریک حیات اور پھول سے بچے پہ نگاہ حسرت ڈالتے ہوئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ بے چین کونج سارے رشتے توڑ کر کسی اجنبی منزل کی جانب پرواز کر گئی۔

اس دشت نوردی کے عالم میں وہ بے قرار دل کے لئے تسکین کا متلاشی تھا مگر یہ جنس نایاب اسے نصیب نہ ہوسکی۔ آخر اس کی ملاقات ایک مہاتپسوی رشی الارا کلاما سے ہوئی۔ رشی نے آپ شدھ کے درس کا آغاز کیا مگر ویدوں کے اس خلاصے نے گوتم کو تسکین قلب سے محروم رکھا۔ راجکمار نے اپنے آپ کو ریاضت وعبادت کی چکی میں گویا پیس ڈالا۔ مسلسل فاقہ کشی سے وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ بس سلسلہ تار نفس بحال رہا مگر دل بے قرار کو قرار پھر بھی نہ آیا۔ پھر اس نے طویل سفر کی ٹھانی۔ دربدر خاک بسر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بھوک ستاتی دست طلب دراز کر کے آتش شکم بجھا لیتا۔ رات ہوتی تو کسی پیڑ تلے جا سوتا ''فرش زمین کا چھت آسمان کی'' والا معاملہ ہوگیا ...... گیا شہر کے قریب شوجاتا' نامی خاتون سے اس کی ملاقات ہوئی ...... راجکمار جانے کتنے دنوں کا بھوکا تھا۔ امیر وغریب انسان میں بغور دیکھا جائے تو فرق صرف ایک دو وقت کی روٹی ہی کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دونوں ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ شوجاتا بھی شاید گوتم ہی کے قبیل کی ہستی تھی۔ گداز دل انسانوں کو دوسروں کے دکھ کا احساس بہت جلد ہو جاتا ہے۔

''کیا کھو بیٹھے ہو جس کی تلاش میں یہ حالت بنا رکھی ہے؟'' شوجاتا نے ہمدردانہ لہجے میں دریافت کیا۔

Marfat.com

''دل کا سکون'' گوتم نے لرزیدہ لہجے میں جواب دیا'' انسانی دکھوں کا مداوا تلاش کرتا پھرتا ہوں۔''

''کس برتے پر؟ تمہاری فصیل جاں میں تو توانائی کی رمق تک نہیں۔'' خاتون نے گوتم کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا ''دکھوں کا مقابلہ ناتوانی سے نہیں کیا جاتا' پہلے اپنی توانائی بحال کرو۔ ٹھہرو میں تمہارے لئے بھوجن لاتی ہوں۔''

گوتم کے پاؤں تلے مضبوط شاخوں والی گھاس اگی ہوئی تھی اور وہ برہنہ پا تھا۔ پیپل کے قریبی درخت کی جانب اس نے پیش قدمی کی تو پاؤں' تندی نما شاخ میں الجھ گیا۔ اس طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ گوتم زمین پر منہ کے بل گرا...... اپنی ناتوانی کا احساس اس کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ شوجاتا اس کے لئے چاولوں کی کھیر لے کر آئی جسے گوتم نے دلی رغبت سے کھایا اور چھتناور درخت تلے اونگھنے لگا۔ اس نے اپنی حالت زار پر غور کیا۔ اسی ارتکاز کے دوران اسے ''گیان'' حاصل ہوا وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اب وہ گویا جاننے والا (عارف) تھا۔ گوتم بدھی والا یا گوتم بدھ۔ اب اسے اپنے عرفان کا پرچار کرنا تھا۔

گوتم نے اپنے پرچار کا آغاز بنارس کے قریب سارناتھ کے مقام پر ایک باغ سے کیا جو ہرن باغ کے نام سے مشہور تھا۔ گوتم کا انداز بیاں سیدھا سادہ دل نشیں قسم کا تھا۔ برہمنوں کی الجھی ہوئی مکارانہ باتوں کے بالکل برعکس لوگوں نے اس کی سچی پر خلوص باتیں سنیں تو بڑے متاثر ہوئے۔ پانچ آدمیوں نے اپنے تن من گوتم کے سپرد کئے' یہ بدھ مت کے اولین پیرو تھے۔ آج بھی اس واقعہ کی مناسبت سے بدھ مت کے ماننے والے پانچ کے عدد کو قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اس نئے مذہب میں داخل ہونے لگے۔ یہ برہمن مت کے خلاف گویا عملی احتجاج تھا۔

گوتم نے ساٹھ مخلص چیلے چن کر انہیں ''سنگھ'' کا نام دیا اور اس طرح اس کے سادہ سے دھرم کی ترویج و ترقی ہونے لگی۔ وہ کپل واستو بھی گیا اور اس کا بیٹا راہولا اب سیانا ہو چکا تھا۔ یشودھرا دل و جان سے انتظار میں تھی۔ بیوی اور بیٹے کو بھی اس نے اپنے دھرم میں شامل ہو جانے کی دعوت دی۔

''میری جان و دل کے مالک' میرا دھرم تو آپ ہیں۔'' یشودھرا نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا ''میں تو آپ کی ہم سفر ہوں لہٰذا میری منزل بھی وہی ہے جو آپ کی ہوگی۔''

Marfat.com

کپل واستو کے لوگ اس مت میں شامل ہو گئے پھر یہ مت مگدھ (بہار) میں پھیل گیا' برہمن مت کے برعکس گوتم کی تعلیم سیدھے سادے چار اصولوں پر مبنی تھی (1) دنیا دکھ نگری ہے (2) دکھوں کی وجہ انسانی خواہشات ہیں (3) ان خواہشات پر قابو پانے سے دکھ مٹ سکتے ہیں (4) ان خواہشات کو مارنے کے لئے اشٹانگ (Fold path) پر چلنا ضروری ہے

اشٹانگ کے آٹھ اصول ہیں (1) درست سمجھنا (2) سچا اعتقاد (3) نیک عمل (4) خوش گفتاری (5) پاکیزہ زندگی (6) نیک کوشش (7) درست سوچ (8) درست گیان

گوتم نہ صرف سینکڑوں دیوی دیوتاؤں پر خط تنسیخ کھینچ دیا بلکہ ذات پات کی غیر فطری تقسیم کو بھی پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راندہ درگاہ قسم کے لوگ جو برہمنی ظلم و ستم کے شکار ہو رہے تھے' گوتم کے گرد جمع ہونے لگے ڈوم' چنڈال' نائی' بڑھئی' جولاہے' غریب دہقان اس کے والا وشیدا ہو گئے۔ وہ اسی برس تک ان پسے ہوئے لوگوں کی دل جوئی کرتا رہا اور ان ہی میں رچ بس گیا..... تشی نگر کے مقام پر جب وہ فوت ہوا تو بدھ مت برصغیر میں چاروں طرف پھیل چکا تھا۔

اس دور میں صرف بدھ مت ہی نہیں' ایک محتاط اندازے کے مطابق کم و بیش ساٹھ عدد سماجی اصلاح کے نظریات پیش کئے گئے۔ ان میں بدھ مت کے بعد جین مت قابل ذکر ہے۔ یہ بھی برہمن سماج کے خلاف ایک زبردست تحریک تھی۔ اس کا بانی وردھمان مہاویر' وسالی (صوبہ بہار) کے راجا کا لخت جگر تھا۔ یہ شخص بھی گوتم کی طرح بے حد گداز دل کا مالک اور غور و فکر میں کھویا رہنے والا انسان تھا۔ راج پاٹ کو لات مار کر جنگلوں کا وسنیک ہوا اور سوامی پارشوناتھ کے چیلوں میں شریک ہو کر اس نے اپنے پیکر کو خاک کی تپسیا کی بھٹی میں جھونک دیا۔ یہ سلسلہ 12 برس پر محیط رہا۔ اس طویل مدت کے بعد اسے گیان کی روشنی دکھائی دی اور وہ ارہت اور جن بن گیا۔ (ارہت اور جن بمعنی سب پر غالب اور سب کچھ جاننے والا)۔

اس کے پیرو جینی کہلائے اور یہ مذہب جین مت کے نام سے مشہور ہوا۔ مہاویر جب بہتر برس کی عمر میں صوبہ بہار کے دارالحکومت راج گڑھی کے قریب' پاوا کے مقام پر فوت ہوا تو اسکے چیلوں کی تعداد چودہ ہزار کے قریب تھی۔ مہاویر کی آواز برہمن مت کے خلاف غیر معمولی نوعیت کی تھی گوتم اور مہاویر دونوں نے اہنسا پر مودھر (جان دار کو ایذا رسانی سے گریز) کی تعلیم دی' یہ ویدک جنگ جویانہ رجحان اور بلیدان کے برعکس تعلیم تھی جسے مہاویر نے انتہا تک پہنچا دیا چنانچہ

Marfat.com

جین مت کے پیرو سانس لینے کے دوران میں بھی اپنی ناک اور منہ کپڑے سے ڈھانپ کر رکھا کرتے تھے مبادا کہ ہوا میں محو پرواز جراثیم کی ہتیا ہو جائے۔

اس دور خرابی میں ان دو آوازوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی اس میدان میں اصلاح معاشرہ کی خاطر اترے۔ مثلاً اور کشیاپ تھا جو اس بات کا مدعی تھا کہ انسانی اعمال کا پاپ پن سے کوئی تعلق نہیں...... یہ سب برہمن مہاراج کے ڈھکوسلے ہیں۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار اجی ویکا' سانجیہ' پرسوا' ادکا' اتارا اور دوسرے بھگتوں نے کیا۔ ان سب میں قدر مشترک تھی ویدک تعلیم کی مخالفت' دیوی دیوتاؤں کا انکار' جنگ وجدل اور بلیدان (قربانی) سے نفرت کا اظہار اور اہنسا کا پرچار...... اس میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان اصلاحی تحریکوں میں کامیاب ترین گوتم کی تحریک تھی یعنی بدھ مت اور دوسرے نمبر پر جین مت تھا۔

مہاراجا اشوک (273 ق م سے 232 ق م) نے جب بدھ مت اختیار کیا تو یہ گویا راج مت بن گیا۔ خلق خدا حکمرانوں کے راستوں پر چلتی ہے کہ مصداق تیسری صدی ق م میں اسے بڑا عروج حاصل ہوا۔ اشوک کی کوششوں سے اس دھرم کا برصغیر سے باہر بھی پرچار کیا جو بڑا کامیاب رہا۔ رفتہ رفتہ برہمن لنگر لنگوٹ کس کر بدھ اور جین مت کے خلاف میدان میں کود گئے۔ ان کی خوش قسمتی کہ دوسری صدی عیسوی میں راجا کنشک کے عہد حکومت میں سنسکرت کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا۔ وہ اگرچہ بدھ مت کا سرگرم پیروکار تھا مگر سرکاری زبان ہونے کے ناتے جب سنسکرت کی ترویج وترقی ہوئی تو برہمن مت بھی دوبارہ ابھرنے لگا۔ بدھ مت کے عالم بھی سنسکرت اپنانے پر مجبور تھے پھر برہمنوں نے ایک داؤ آزمایا جس کا حریفوں کے پاس کوئی توڑ نہ تھا۔ انہوں بصد احترام گوتم بدھ کی مورتی کو مندروں کی زینت بنا کر اسے بھگوان کا اوتار تسلیم کیا۔

اب بدھ بھکشو عجیب وغریب الجھن کا شکار ہو گئے۔ ان کے لئے تو گوتم بدھ ہی سب کچھ تھا المختصر وہ برہمن کے اس داؤ سے چت ہو گئے اور گوتم کے چیلوں میں بت پرستی کا رواج ہو گیا یہ بدھ مت کے زوال کا آغاز تھا۔ اس داؤ کے علاوہ گپت خاندان کے راجاؤں نے جب ہندو مت قبول کیا تو رہی سہی کسر پوری ہو گئی...... عہد گپت خاندان کو ہندو مت کا سنہرا دور کہا جاتا ہے یعنی چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی۔

سمدر گپت کے عہد میں لنکا کے راجا نے گیا کے مقام پر مہاتما بدھ کی مورتی پرستش کے لئے رکھی۔ یہ مورتی سونے چاندی اور جواہرات سے بنائی گئی تھی جو بدھ یاتریوں کے خوابوں کی

Marfat.com

تعبیر تھی ...... کہتے ہیں جب لنکا کے راجا نے سمدر گپت سے اس کی اجازت طلب کی تو درباری برہمنوں نے گھی کے چراغ جلائے۔ اب گویا ان کا حریف چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔

ہندو دانش وروں نے ان الفاظ کا اظہار ہزار بار اور برملا کیا ہے کہ "ہم سے ہمالہ پہاڑ سے بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ ہمیں چاہئے تھا کہ اپنے مندروں میں امت مسلمہ کے راہنما حضرت محمد ﷺ کی مورتی بھی رکھ دیتے اور پھر دیکھتے کہ مسلمان اس داؤ سے کیسے بچ پاتے۔ ہم مسلمان کے دین کو میٹھی چھری سے ذبح کر کے انہیں اپنے دھرم میں شامل کر لیتے۔"

ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ برہمن نے ہم پر یہ داؤ نہیں آزمایا ورنہ نجانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ نفرت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر بناوٹی محبت کا وار بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ زہر سے بچا جا سکتا ہے لیکن زہر آلود شے دھوکا دے جاتی ہے۔

جین مت اور بدھ مت دونوں کا تشخص برہمن مت میں گم ہو کر رہ گیا۔ اس میں برہمنوں کی شاطرانہ چال کے ساتھ بدھ مت کے بھکشوؤں کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ مت جو سیدھا سادا انسانی مساوات کا علم بردار تھا' اہل ہوس کا شکار ہو گیا۔

وہ جو سنسار کو سروم دکھم (ہر سمت دکھ ہی دکھ) کا پرچار کیا کرتے تھے۔ سنسار کو سکھ سیج میں بدلنے کی حرکات کے مرتکب ہونے لگے۔ یعنی سکھ اپنی جھولی میں اور دکھ دوسروں کے کھاتے میں ڈالے جانے لگے۔ بدھ بھکشوؤں کے اسٹوپے تک عشرت کدوں میں تبدیل ہو گئے۔ وہ جو انسان کو طاقت' مال و دولت' عیش و عشرت' جنسی لذتوں کی ہوس سے گریز کی تلقین فرمایا کرتے تھے' خود ان میں مبتلا ہو گئے۔ گوتم کی تعلیم میں کسی مافوق الفطرت کی پوجا پاٹ کا کہیں تذکرہ نہیں تھا۔ بھگوان' برہما کا وجود تھا نہ آتما پرماتما نہ بیکنٹھ اور نرگ کا لیکن اب بدھ مت کے چیلے خود گوتم کی پوجا کرنے لگے۔ سیم و زر کے کھلونوں سے کھیلنے لگے۔ اشوک سے کنشک تک جس مت کی دھوم مچی رہی وہ اپنی موت آپ مر گیا۔

اشوک سے پہلے اس مت کے پیرو بھکشو (بھکاریوں) کی صورت میں خجل خوار ہوا کرتے تھے۔ اشوک نے ان کے لئے آٹھ عالی شان اسٹوپے بنوائے ٹیکسلا اسٹوپا "دھرم راجیکا" ان سب میں عظیم الشان درس گاہ کا مقام رکھتا تھا۔ اشوک نے ان اسٹوپوں میں شاکیہ منی کی پیدائش سے نروان تک اور نروان سے سفر آخرت تک کے تبرکات محفوظ کر دیئے ان کے مصارف کے لئے زمینیں وقف کر دیں۔ بھکشوؤں کے کھانے پینے کا تسلی بخش انتظام کیا مگر ہوا یہ کہ

Marfat.com

دھرم سیوکوں کو لالچ نے آ گھیرا۔گوتم کی پیدائش' نروان وغیرہ کے متعلق افسانوی انداز میں داستانیں لکھی گئیں۔عجیب وغریب رسوم معرض وجود میں آنے لگیں۔بھکشوؤں نے ان تبرکات کی یاترا کے ضابطے مرتب کئے۔اب وہ یاتریوں کی پرارتھنائیں مہاتما بدھ کے حضور پہنچانے کا واحد وسیلہ تھے۔

رفتہ رفتہ گوتم کے چیلوں کی بھی مورتیاں بننے لگیں۔چڑھاوے' نذرانے' منتیں ہر کام کے قاعدے وضع کئے گئے' دولت کے انبار تھے کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔اسٹوپاؤں کے گرد صنم تراشوں' زرگروں' کوزہ گروں' ساہوکاروں کے بازار کھل گئے۔چھومنتر کرنے والوں کے کاروبار چمکنے لگے بھکشو تو پنڈتوں کو بھی مات کر گئے۔برہموں کی مسرت دیدنی تھی۔آٹھویں صدی میں ہندومت کی تشکیل نو ہوئی۔شنکر اچاریہ جیسے دانش وروں نے ہندومت کے تن مردہ میں نئی روح پھونک دی۔فرسودہ رسومات کے اس مجموعے کا از سر نو طوطی بولنے لگا۔

شنکر اچاریہ نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر ہرمت کے عالموں کو چت کر دیا۔کھوٹے سکے ایسے چلے کہ سچائی کی قوت گویائی ہی چھن گئی۔سچائی اگر مطلق سچائی نہ ہو تو اس کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔بہرحال خلق خدا ایک بار پھر تہ سنگ آسیا ہوئی۔

یہ شنکر اچاریہ کون تھا اور اس نے کیا گل کھلایا؟ اس کی تفصیل بھی کم دلچسپ نہیں۔یہ بلا کا ذہین' حاضر جواب' جھوٹ کو سچ اور سیاہ کو سفید کر دکھلانے والا شخص مالا بار کا برہمن تھا جو ۷۸۸ء میں پیدا ہوا۔بتیس برس کی مختصری عمر میں تاریخ ہند کا سب سے عظیم چمتکار دکھا کر صفحہ ہستی سے غائب ہو گیا۔اس چرب زبان شخص کے مسلک میں مطلب برادری کی خاطر ہر حربہ جائز اور حیلہ وسیلہ روا تھا۔ہندو دھرم کی بد قسمتی تھی کہ یہ شخص زیادہ عرصہ جی نہ سکا مگر بتیس برس کی عمر ہی میں جو کارنامہ اس نے سرانجام دیا وہ ہندو اتہاس میں ناقابل فراموش ہے۔ہندو قوم شنکر اچاریہ کو شیو شنکر کا اوتار تسلیم کرتی ہے۔

کیرالا کے قریب چیدم برم ایک غیر معروف مقام پر شنکر اچاریہ پیدا ہوا۔اس کی ماں سری مہادیوی پرکشش نسوانی پیکر کی مالک تھی۔پنڈتانی کے مقابلے میں پنڈت جی ''ٹھنڈے مزاج'' کے انسان تھے جو اپنی مردانہ کمزوری سے واقف تھے۔مہادیوی نے جب اسے غیر معمولی بچے کو جنم دیا تو برادری میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں' مگر سری دیوی یا مہادیوی نے زبان خلق کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے بچے کی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ مبذول کر دی۔اس کے نتیجے میں برادری

Marfat.com

والوں نے اس گھرانے سے قطع تعلق کرلیا۔ ہندو مورخ کیرل اتپتی تو صاف الفاظ میں شنکراچاریہ کو نطفہ نا تحقیق لکھتا ہے۔ اس حقیقت سے کسی نے انکار نہیں کیا کہ سری دیوی کو برادری سے خارج کر دیا گیا تھا۔ سمپر دائے کا مصنف بی بی رائے صرف اس قدر کہتا ہے کہ ''بے راہ روی'' کا یہ الزام پنڈتوں نے جھوٹ لگایا ہوگا۔

بہر حال حسب دستور آٹھ برس کی عمر میں اس کے گلے میں جنیوڈالا گیا اور تعلیم و تربیت (ویدک تعلیم) کا آغاز کیا گیا۔ بچہ تو اپنے پنڈت پتا جی کے کان کترنے لگا۔ باپ نے تو اپنی شفقت سے اپنے سپوت کو محروم ہی رکھا مگر سری دیوی کی جان بچے میں تھی۔ بچے نے بھی اپنی ماتا کو اس کی کمزور یا منہ زور لمحے کے ہاتھوں شکست کھا جانے پر معاف کر دیا تھا اور پوری توجہ سے وید از بر کرنا زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ وہ ایسی ایسی موشگافیاں کرتا کہ اس کے اساتذہ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ بارہ برس کی عمر میں شنکراچاریہ کے پتا جی کا دہانت ہو گیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ اس المیے کا اس تعلیم پر الٹا اثر پڑا یعنی وہ مزید تن دہی سے تعلیم حاصل کرنے لگا۔ دھرم کے متعلق اس کا ایک اپنا نظریہ تھا۔ وہ مروجہ فرقوں سے ہرگز مطمئن نہیں تھا۔ چھوٹی سی عمر میں وہ ایک بڑا پنڈت بن گیا۔ ویدک تعلیم اختتام پذیر ہوئی تو وہ سنیاس کی جانب متوجہ ہوا مگر سری مہادیوی نے اس خیال کی سخت مخالفت کی۔ بیوہ کی تاریک زندگی میں مسرت کی ایک ہی تو کرن تھی۔ اس سے محروم ہونا وہ کیسے پسند کر سکتی تھی۔ اس مرحلے پر شنکراچاریہ نے اپنی زندگی بھر کے رویے کا اعلان کر دیا۔

''ماتا جی! آپ کی آگیا کے بغیر کوئی کام کرنا مہا پاپ سمجھتا ہوں'' ایک روز نوجوان نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''آپ مجھے آگیا دیں یہ میری اوشنا ہے۔''

''بیٹا جی اس منو کامنا کا پالن میرے بس میں نہیں'' سری دیوی نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

''ماتا جی۔ آپ خود مجھے سنیاس کی آگیا دیں گی بلکہ اس پر مجبور ہو جائیں گی'' شنکر نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا اس میں میری خوشی بھی شامل ہوگی؟''

''اوش ایسا ہی ہوگا؟''

''یہ شنکراچاریہ کا عجیب رویہ تھا۔ حصول مقصد کے لئے وہ ہر حربہ جائز سمجھتا ہی تھا مگر حربے کا استعمال وہ اتنی فراست سے کرتا کہ سب کو حیران کر دیتا۔ کہتے ہیں ''جہاں چاہ وہاں راہ'' یہ موقع اسے بہت جلد ہاتھ آ گیا۔ ایک روز وہ اپنی ماتا کے ہمراہ کسی آشنا کے گھرانے میں مدعو تھا۔

Marfat.com

واپسی پر موسلا دھار بارش کے سبب راستے میں حائل ندی باڑ پر آ گئی۔ ماں بیٹا پانی کا بہاؤ کم ہو جانے کا انتظار کرنے لگے۔

شنکر بغور پانی کا جائزہ لینے لگا اور اپنے ذہن میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔

''ماتا جی! آیئے ہم با آسانی اس پار جا سکتے ہیں'' اس نے بصد احترام کہا۔

''پانی کے بہاؤ سے مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔'' سری دیوی نے ندی کا جائزہ لیتے ہوئے تشویش ظاہر کی۔

''اس داس کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی خطرے سے خائف نہیں ہونا چاہیے'' شنکر نے دست بستہ عرض کی ''آپ کے چرنوں میں تو سورگ ہے' میں ان چرنوں کو خطرے میں کیسے ڈال سکتا ہوں؟''

سری دیوی احترام و محبت کے جھانسے میں آ گئی۔ جو کھچڑی شنکر کے ذہن میں پک رہی تھی اس کا تو دیوی جی کو سان گمان تک نہ تھا۔ دونوں پانی میں اترے اور دوسرے کنارے کی جانب قدم قدم چلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد پانی ان کے گلے گلے تک آ گیا۔

''شنکر بیٹا' اب کیا ہوگا؟ میں تو ڈوبنے لگی ہوں کوئی اپائے کرو۔''

''ماتا جی' گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں ابھی ایشور سے پراتھنا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں سلامتی سے پار لگا دے'' شنکر زیر لب بڑبڑانے لگا مگر پانی کے بہاؤ میں کمی واقع ہوتی تھی نہ ہوئی۔

''بیٹا جلدی کرو میں ڈوبنے لگی ہوں'' سری دیوی نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کہا

''وہ یوں ہے ماتا جی کہ میں پورے دھیان سے پرارتھنا نہیں کر پا رہا'' شنکر نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا ''میرے ذہن پر سنیاس لینے کا بھوت سوار ہے' آپ کی اچھیا کا پالن بھی میرا دھرم ہے۔ آ گیا مل جاتی تو پرارتھنا میرے من کی آواز ہوتی اور ایشور مجھے نراش نہ کرتے۔''

سری دیوی! اپنے لاڈلے کا مفہوم پا گئی۔ اس نے فوراً جواب دیا ''بیٹا جی! میں دل و جان سے تمہیں سنیاس لینے کی آ گیا دیتی ہوں۔ جب چاہو سنیاسی بن جاؤ۔''

شنکر نے لپک کر ماں کو اپنے کندھوں پر بٹھایا اور با آسانی دوسرے کنارے جا پہنچا۔

بات یہیں ختم نہیں ہوئی' دوسرے کنارے پہنچ کر اس نے با قاعدہ ماتھا ٹیک کر اپنی پوجا سمان ماتا کو

Marfat.com

ڈنڈوت کیا اور اسے تنہا چھوڑ کر اپنی راہ لی......

سنیاس لینے کے متعلق ایک اور روایت یہ ہے کہ وہ ماتا کی موت تک گھر میں رہا اور اس کے آنجہانی ہو جانے کے بعد جنگلوں کی طرف چل نکلا۔ سری دیوی کے کریا کرم کے متعلق البتہ وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شنکر اچاریہ کے عزیز و اقارب نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ چتا پھونکنے کے لئے آگ تک مہیا نہ کی۔ معاونت تو دور کی بات ہے۔ برادری کا یہ رویہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ سری دیوی واقعی زندگی کے کسی دور میں بے راہ روی کے رستے پر چلی ضرور تھی مگر اس کے لئے شنکر کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اپنی پیدائش میں ی فرد بشر کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

شنکر اچاریہ کے علمی کارناموں کے تذکرے سے پیشتر اس کی زندگی کا ایک عجیب و غریب واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو اس کی سوچ کا مکمل ترجمان ہے۔ وہ عموماً برہنہ پا گھوما کرتا تھا۔ ایک بار وہ مضبوط لمبی شاخوں والی گھاس کی جڑوں میں شکر بکھیر رہا تھا۔ اس کے ایک چیلے نے حیران ہو کر گرو کے اس عمل کی تشریح چاہی۔ کیوں کہ مہاراج دان پن کے ایسے کاموں میں وقت برباد نہیں کیا کرتے تھے۔

''گروجی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''میرا کوئی کام وچار سے خالی نہیں ہوتا' یہ تمہاری شکشا ہے'' شنکر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ مت سمجھو کہ مجھے کیڑے مکوڑوں سے پریم ہے یا میں چیونٹیوں پر دیا کی وجہ سے زمین پر شکر ڈال رہا ہوں کہ وہ انند سے بھوجن کر لیں۔ پرنتو یہ بھی سچ ہے کہ یہ میٹھا میں چیونٹیوں ہی کیلئے بکھیر رہا ہوں۔''

چیلا ہونقوں کی طرح گروجی کی جانب دیکھنے لگا وہ واقعی گرو دیو کی گفتگو اور ان کی اس حرکت کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔

''مورکھ! دھیان سے سن اور میرا یہ اپدیش پلے باندھ لے'' شنکر نے وضاحت کی ''ننگے پاؤں گھومنا مرد کے لئے اچھا ہوتا ہے اس لئے میں ننگے پاؤں رہتا ہوں۔ مگر پرنتو جلمی گھاس پاؤں میں الجھ الجھ کر میرا پینڈا کھوٹا کر دیتی ہے۔ اس واسطے یہ میری دشمن ہے۔ مجھے چیونٹیوں سے بھی کوئی ہمدردی نہیں مگر گھاس کی جڑوں میں مٹھاس کے کارن چیونٹیاں جڑوں پر ہلہ بولیں گی اور ان کو کھوکھلا کر دیں گی اس طرح وہ گھاس کی بیری بن جائیں گی۔ یاد رکھ بیری کا بیری

Marfat.com

اپنا دوست ہوتا ہے کیونکہ وہ تمہاری لڑائی لڑ رہا ہوتا ہے...... اس طرح چیونٹیوں کو گھاس کا بیری بنا رہا ہوں'' چیلا گرو کی ذہانت بھری باتوں پر عش عش کرنے لگا۔ یہ تھا شنکراچاریہ کا طرز استدلال ویدک تعلیم کے مطابق اس دور میں ہندو جاتی کے چار مشہور سمپر دائے تھا مگر شنکراچاریہ نے انہیں بہتر شاخوں میں تقسیم کر دیا۔ سنیاس گرہن کرنے کے بعد وہ ہند کے طول و عرض میں گھومنے لگا اور ویدک تعلیم میں مناسب ردوبدل کر کے اس نے ویدانت مت کی تشکیل کی اور پھر اس کی ترویج و ترقی میں دن رات ایک کر دیئے۔ موجودہ ہندو مت کی تشکیل اسی نے کی۔ ویدانت شاستر کو پھیلانے کے لئے اس نے چار مٹھ قائم کئے۔ لوگ اس کے جادو اثر بیان کے ایسے اسیر ہوئے کہ اسے اوتار ماننے اور گرداننے لگے۔ شمالی ہند سے ہوتا ہوا وہ کشمیر جا پہنچا...... جین مت' بدھ مت کے علاوہ ہر مخالف کو مناظروں میں شکست سے ہمکنار کرتا ہوا سرسوتی کے آسن پر براجمان ہو گیا۔

شنکراچاریہ جب کسی حریف دانش ور کو دعوت مناظرہ دیتا تو عجیب و غریب شرط عائد کر دیتا۔ اس کے رخت سفر میں ایک بہت بڑی کڑاہی ہوا کرتی تھی جو دہشت کی علامت بن گئی۔ مناظرے کے آغاز سے پیشتر اس کے چیلے آہنی کڑاہی کو چولہے پر چڑھا دیتے اور اسے گھی سے لبالب بھر دیتے' چولہے میں آگ دہکا دی جاتی' کھولتے ہوئے گھی کی جانب اشارہ کر کے شنکر مہاراج سنجیدگی سے اعلان فرماتے ''ہارنے والے کو اس کھولتے ہوئے گھی میں دھکیل دیا جائے گا۔''

حریف دانش ور حیران رہ جاتا۔ راہ فرار اختیار کرتا تو اپنے ساتھ اس کے دھرم کی بھی سبکی ہوتی۔ مجبوراً اسے سر دھڑ کی بازی لگانا پڑتی۔ اس طریقہ واردات سے شنکراچاریہ نے مخالف دھرم کے لاتعداد مخالفین کو ٹھکانے لگایا۔ اس عملی مظاہرے سے ہر دھرم کے علماء اس سے کنی کترانے لگے اس طرح ہندو مت کی ''صداقت'' کا سکہ بیٹھ گیا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے ایک چرب زبان وکیل بے گناہ کو تختہ دار تک لے جاتا ہے۔ اس طرح برصغیر میں ہندو مت کا طوطی بولنے لگا۔

ہندو تصوف کو شنکراچاریہ نے مرتب کر کے اسے ویدانت کا نام دیا گویا وہ ویدانت فلسفے کا بانی تھا۔ اس فلسفے کا اہم ترین باب وہ ہے جس میں شنکر ایشور کی ذات کے متعلق بحث کرتا ہے۔ بعد میں اس کے تشکیل دیئے ہوئے فرقے پر بھی ''شو پرستی'' کا رنگ غالب آ گیا۔ برصغیر میں دھومیں مچانے کے بعد کشمیر کے کیدار ناتھ مقام پر اسے موت نے آ لیا۔ اس وقت عمر عزیز کے 32 ویں برس میں تھا۔ بدھ مت کے علماء کا خیال ہے کہ ایک شاکیہ منی کے سچے بھکشو سے اس کا

Marfat.com

مقابلہ ہوا تھا اور وہ شکست سے دوچار ہو کر اپنی ہی تیار کردہ کڑاہی میں جل مرا۔

شنکر چاریہ کی تصانیف زیادہ تر بھاشیہ (تفاسیر) پر مشتمل ہیں۔ یہی وہ میدان ہے جس میں ایک زیرک انسان متن کو اپنی حسب منشا ڈھال سکتا ہے۔ ان تفاسیر میں ''شاریرک ممانسہ'' بڑی مشہور ہوئی اس کے علاوہ بھگوت گیتا بھاشیہ' گیارہ اپشند' اس کی ایک مختصر سی کتاب ''موہ مدگر'' اہل ہنود میں بڑی مقبول ہوئی جو درویشی کے موضوع پر ہے۔ اسی طرح درگاہ ماتا کی ستائش میں ''سوندایا لہری'' کو اہل ہنود نے الہامی کتب کا درجہ دیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ویدانت مت کے مطابق بت پرستی جائز نہیں مگر شنکراچاریہ یہاں بھی ڈنڈی مار گیا اور خود اپنے مت کی مت مار دی۔ یعنی خود اسے چیلوں نے اپنے گرو کے حکم سے مختلف مقامات پر شو اور وشنو کے بت بنوائے اور ان کی پوجا کا اہتمام کیا۔ ہندوؤں نے اپنے اس مہاپنڈت کو پہلے تو اوتار کا درجہ عطا کیا پھر اس کی کج روی کو بڑا خوبصورت رنگ دیا۔ یہ قصہ امروشتک (Amru Shatak) نامی کتاب میں بالتفصیل درج ہے۔ متن ملاحظہ ہو۔

شنکر مہاراج کو جنسی باتوں کا تجربہ نہیں تھا۔ راجا امرو کی حسین و جمیل رانی مدن سرنے شنکر موصوف کو اس موضوع پر بحث کی دعوت دی اور صاف شکست دے دی۔ شنکر کو اپنی شکست بڑی گراں گزری اور اپنی ناتجربہ کاری پر سخت شرمندہ ہوا۔ ''رانی جی ! اس بحث کو آخری مت سمجھو۔ کچھ عرصہ بعد ہماری بحث کے دوسرے دور کا آغاز ہوگا'' شنکر نے سنجیدگی سے اعلان کیا۔

''میں ہر گھڑی ہر جگہ' اس موضوع پر آپ سے بحث کرنے کو تیار ہوں'' رانی نے چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا۔ کچھ عرصہ بعد راجا امرو کا انتقال ہو گیا۔ شنکر مہاراج نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے پیکر خاکی کو چھوڑ کر راجا کے تن مردہ میں حلول ہو گیا۔ راجا کے دوبارہ جی اٹھنے پر رانی نے گھی کے چراغ جلائے اور دلی رغبت سے اپنے خاوند کی ''پذیرائی'' کرنے لگی۔ اس طرح سری شنکر نے جنسی موضوع پر عملی تعلیم حاصل کی۔ جب وہ اپنے تجربے میں کامل ہو گیا تو اس نے راجا کے جسم کو چھوڑ دیا اور اپنے پیکر میں ازسرنو واپس آ گیا۔

رانی جب راجا کے کریا کرم سے فارغ ہو گئی تو شنکر مہاراج نے اسے بحث کی دعوت دی اور اپنے علمی دلائل سے اسے چت کر دیا

اس کہانی میں جگہ جگہ ناقابل فہم قسم کے جھول ضرور ہوں گے مگر یہ کہانی شنکر مہاراج کے متعلق اہل ہنود کے جذبات اور اندھی عقیدت کی ترجمان ضرور ہے۔ ویدانت کے فلسفے کے مطالعہ

Marfat.com

سے ایک بات البتہ کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ شنکر اچاریہ نے اس بھگتی تحریک کا سنگ بنیاد رکھنے کی موہوم سی کوشش ضرور کی تھی جس کا آغاز تیرھویں صدی عیسوی میں سوامی رامانند نے کیا لیکن اس کی شخصیت کا تعصب بھرا پہلو اس کے فلسفیانہ خیالات سے لگا نہیں کھاتا۔

جہاں تک ہندومت کی ترویج کا تعلق ہے اس کے مقابلے میں وہ کسی مت کو برداشت نہیں کرتا تھا۔

کیا اسے ایک تاریخی اتفاق سمجھ لیا جائے کہ ہندومت کے احیا 9ویں صدی عیسوی کے آغاز سے بہت پہلے آٹھویں صدی عیسوی میں ہندوستان اسلامی تعلیم سے روشناس ہو چکا تھا۔ تعارف کا یہ سلسلہ محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے سے بہت پہلے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت سے باقاعدہ شروع ہوا تھا۔ ویسے تو ظہور اسلام سے صدیوں پہلے عرب تاجروں کے بحری جہاز تجارتی اغراض سے چین جاتے ہوئے سندھ پر بندرگاہوں میں قیام کیا کرتے تھے۔ تجارتی ضرورتوں کے تحت وہ مقامی زبان سے بھی آشنا ہو چکے تھے مگر یہ دور ہمارا موضوع نہیں، صرف یہ نشان دہی کافی ہے کہ عربی لوگ ظہور اسلام سے پیشتر چول، کلیان اور سوپارا میں آباد تھے۔

عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں حق و باطل کا تصفیہ ہوا۔ ایران و عراق کی سلطنتیں سر نگوں ہوئیں۔ خلافت کی سرحدیں ساحل مکران تک جا پہنچیں اس طرح عرب و ہند کے معاملات میں سیاسی عنصر شامل ہوا۔ عمان اور بحرین کا گورنر عثمان بن ابی العاص ثقفی ضرورت سے زیادہ جوشیلا ثابت ہوا۔ مرکز خلافت کی اجازت کے بغیر اس نے اپنے ہی جیسے جوشیلے فرد مغیرہ بن ابی العاص کی سرکردگی میں ایک بحری مہم دیبل کی جانب روانہ کی۔ سندھ پر راجا چچ کی حکمرانی تھی جس کا عہد حکومت 622ء سے 666ء تک ہے۔ 15 ہجری (637ء) میں مغیرہ کے مٹھی بھر جوان دیبل سے ٹکرائے اور مہم بری طرح ناکام ہوئی۔ اس مہم میں مغیرہ کو جان عزیز سے ہاتھ دھونا پڑے۔ عمر فاروقؓ کو خبر ہوئی تو انہوں نے ابوموسیٰ اشعری گورنر عراق اور عثمان بن ابی العاص کی بھر پور سرزنش کی اور آئندہ ایسی حرکات سے باز رہنے کا حکم دیا۔ جلال فاروقی نے باڑھ پہ آئی ہوئی ندی کو کناروں میں مقید کر دیا۔ مرکز کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ چھوٹے بڑے کو دم مارنے کی جرات نہ تھی۔

دور عثمانی میں خشکی کے راستے مہم جوئی کا جائزہ لیا گیا۔ مکران کا حاکم عبداللہ بن عامر بے دار مغز حکمران تھا۔ اس نے حالات کا جائزہ لے کر دربار خلافت میں رپورٹ پیش کی ''سندھ کا پانی میلا اور گدلا ہے۔ پھل کسیلے اور ترش۔ تھوڑی تعداد پر مشتمل لشکر بھیجا تو تباہی کا خدشہ ہے بڑے

Marfat.com

لشکر کے لئے سامان رسد دشوار ہوگا۔"

یہ ایک حقیقت پسندانہ رپورٹ تھی۔ حضرت عثمان غنی نے عبداللہ کو لشکر کشی کی اجازت نہ دی۔ امیر معاویہؓ کے دور میں سنان بن سلمہ نے جدوجہد کا آغاز کیا اور پیش قدمی کرتا ہوا مدھیہ (مغربی جیکب آباد) تک آ گیا مگر ایک سازش کا شکار ہو گیا۔ اس کے قتل کے بعد اموی فوج کو واپس جانا پڑا۔

694ء میں حجاج بن یوسف ثقفی عراق کے گورنر مقرر ہوا تو حالات نے نئی کروٹ بدلی وہ حجاج جس کے متعلق علمائے امت کا فیصلہ ہے کہ وہ شقی القلب اور جابر حکمران تھا اگر کسی امت کے سارے بدبختوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے میں صرف حجاج کو تو حجاج والا پلڑا جھک جائے گا۔ اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں مگر اسی حجاج نے دو ایسے کارنامے سرانجام دیئے کہ ساری امت مہر بہ لب ہو گئی.........یعنی قرآن حکیم پر اعراب لگوا کر تا قیامت آنے والے عجمی مسلمانوں پر احسان عظیم کر ڈالا اور سندھ کو سرنگوں کر کے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ چند مظلوم مسلمان قیدیوں کی صدائے "المدد یا حجاج" کے جواب میں یہ سخت گیر حکمران دھاڑتے ہوئے شیر کی طرح لبیک کہتا ہوا اٹھا اور سترہ سالہ نوجوان محمد بن قاسم کی زیر سر کردگی اس نے راجا چچ کے بیٹے راجا داہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ حجاج واقعی مجموعہ اضداد قسم کی شخصیت تھا۔ اس کی یہ مہم اگر سلیمان بن عبدالمالک کی ذاتی رنجش وکدورت کی نذر نہ ہوتی تو برصغیر کی تاریخ یقیناً کچھ اور ہی ہوتی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ حجاج کے وضع کردہ قوانین اور رائج کردہ اصول سندھی حکمرانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ جس حکمران نے بھی انحراف کیا وہ کہیں کا نہ رہا۔

یہ روشنی لاہور تک نہ پہنچ سکی اس سرزمین پر اجالا پہنچنے کی تفصیل سے پہلے خطہ لاہور کا تعارف بے حد ضروری ہے۔ برصغیر کی مجموعی کیفیت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لاہور ایک شہر ہی نہیں زمانہ قدیم سے سپت سندھ سات دریاؤں کی زمین کا دل ہے بلکہ شمالی ہند کے سیاسی خدوخال پر جس قدر لاہور اثر انداز ہوتا رہا کوئی اور شہر اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسے شمالی ہند کا دروازہ کہا گیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ مسلمان جب سرزمین پنجاب سے روشناس ہوئے تو ان کے لئے یہ سارا خطہ لاہور کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا گویا یہ ایک شہر ہوتے ہوئے بھی صوبے کے مقام ومرتبے پر فائز تھا۔ پورے برصغیر میں صرف دہلی کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ سیاسی تناظر میں اس کا مقابلہ کرے۔ لاتعداد شہنشاہوں کے دور میں یہ دوسرا پایہ تخت رہا۔ یہ ایک تاریخی

Marfat.com

حقیقت ہے کہ غزنوی خاندان سے لے کر آخری مغل شہنشاہ تک لاہور کا حکمران شہزادہ ہی تخت دہلی پر رونق افروز ہوتا اور لاہور کا صوبے دار دربار دہلی میں دیگر امراء میں بلند مرتبت قرار دیا جاتا۔

اہل ہنود کے بقول رام چندر جی کے سپوت لو نے اس شہر کی بنیاد رکھی اور اسے لو پور کا نام دیا۔رام چندر کے دوسرے بیٹے کشن نے کشور کے نام سے دوسرا شہر آباد کیا جو مرور زمانہ کے ساتھ قصور ہوا۔ایک دوسری روایت کے مطابق پانڈوؤں کی نسل میں سے راجہ پرتھکت نے اس شہر بے مثال کی داغ بیل ڈالی جسے لوہار چندر راجا نے از سر نو تعمیر کیا۔ہندوؤں کی معتبر کتاب ویش وبھاگ میں لاہور کا نام بہر حال لوپور ہی ہے۔ایک تیسری روایت میں لاہور کو دو الفاظ کا مرکب کہا گیا ہے یعنی لو...... آورنا (آورنا سنسکرت میں قلعہ کو کہتے ہیں) لو آورنا سے وقت نے اسے لو آور بنایا اور کثرت استعمال سے لہاور ہوا جو بگڑ یا سنور کر لاہور بنا۔روایات کی اس کھینچا تانی کو فہم و فراست کی نگاہ سے دیکھا جائے تو لوپور بہ آسانی لاہور بن جاتا ہے جیسے پرش پور پشاور بنا۔

اسلامی عہد کے قلمکاروں نے لاہور کو مختلف ناموں سے پکارا مثلاً لہور، لاہاور، لوہور، لاؤہور، لانہور وغیرہ ہم روایات کے دھند لکے سے نکل کر تاریخ کے اجالے میں نگاہ دوڑائیں تو دوسری صدی عیسوی میں تاریخ میواڑ ہماری راہنمائی کرتی ہے۔اس تاریخ میں لاہور کا ذکر صاف الفاظ میں آیا جب راجا کن سین لاہور سے ہجرت کر کے میواڑ میں جا آباد ہوا۔راجا کنک کو لاہور سے اتنا لگاؤ تھا کہ ریاست میواڑ میں بھی ایک لاہور معرض وجود میں آیا۔یہ جذباتی لگاؤ کی باتیں ہیں۔شہر اور لین (فرانس) کے باشندے جب ملک بدر کیے جانے کے بعد امریکہ میں جا بسے تو انہوں نے اورلین شہر بسایا۔راجا کنک کی ہجرت 144ء کا واقعہ ہے بہر حال روایات اور تاریخی شواہد سے یہ بات پایہ تکمیل تک ضرور پہنچتی ہے کہ لاہور ایک قدیم ترین شہر ہے جو نشیب و فراز سے گزرا۔کئی غارت گر ہاتھوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بھی بجائی اس کی قسمت میں غبار شام کی تاریکی بار ہا آئی اور بار ہا روشن اجلی صبحیں طلوع ہوئیں۔تخت دہلی کی جانب پیش قدمی کرنے والے صبا رفتار گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندا گیا۔خزاؤں کے زیر تسلط رہا اور بار ہا اس کی روٹھی ہوئی بہاریں واپس آئیں۔982ء تک یعنی محمود غزنوی کی فتح سے 39 برس پیشتر تک مورخین اسے خالص بت پرستوں کا شہر قرار دیتے ہیں۔روشنی کی کوئی ایک آدھ کرن کسی گوشے کونے میں ہو تو اسے قلمکار قابل توجہ نہیں گردانتے۔

حج بن بھندرا جسے ایک روایت میں لاہور کا بانی بھی کہا گیا ہے اس خطے کا حکمران تھا۔

Marfat.com

اس کا مسلک آفتاب پرستی تھا۔ اس کا راجکمار بھرت بھی آبائی مسلک کا پرجوش حامی تھا۔ بھرت نے ایک نفیس عبادت گاہ میں سورج کی مورتی رکھوائی جس کے متعلق افسانوی باتیں مشہور ہوئیں۔ اس سورج پرست نے لاہور پر 75 برس حکومت کی۔ جب اس کی عمر 99 برس کی ہوئی تو اس کا راجکمار تھنرت اپنے پتا جی کی طویل عمر سے اکتاہٹ کا شکار ہو گیا۔ پرانے خشک پتے گرنے کے بعد ہی نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں مگر یہاں خزاں رسیدہ پتہ تھا کہ گرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تھنرت عیش و عشرت کا دلدادہ تو تھا مگر عمر رسیدہ باپ کی موجودگی میں من مانی نہیں کر سکتا تھا۔ ہوس بے لگام ہوئی تو تھنرت نے شفیق باپ کی ہر مہربانی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے پابند سلاسل کر کے لاہور کے قلعے میں مقید کر دیا۔ ضعیف باپ کی کمر ہمت تو عرصہ دراز ہوا ٹوٹ چکی تھی وہ تو جوان بیٹے کو دیکھ دیکھ کر سانسوں کا تسلسل سنبھالے ہوئے تھا۔ باپ نے بیٹے کو صرف اس قدر کہا ''میرے ہونہار سپوت مجھے اتنی ہی تکلیف پہنچاؤ جتنی خود میں برداشت کرنے کی ہمت ہو''

''پتا جی میں تو بہت کچھ برداشت کر سکتا ہوں'' تھنرت نے زہریلی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''یہ تو وقت ہی بتائے گا'' باپ نے سر جھکا کر کہا۔

تھنرت نے تخت لاہور پر بیٹھتے ہی گنبد سر کا استعمال ختم کر دیا اور اپنی سلطنت میں وسعت کے خواب دیکھنے لگا۔ دریائے چناب کے اس پار کا علاقہ تا کیشر' راجا جے پال کی عمل داری میں تھا۔ آ بیل مجھے مار کے مصداق تھنرت نے اپنے لشکر کو آراستہ کیا اور جہلم تک کا علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی خاطر طبل جنگ بجا دیا۔ دریائے چناب کو عبور کر کے جب تا کیشر کی سرزمین پر اس نے قدم رکھا تو حیران و ششدرہ گیا۔ کیل کانٹے سے لیس ایک لشکر جرار اس کے سواگت کو سامنے کھڑا تھا۔ تھنرت کی فوج کے حرکت میں آتے ہی راجا جے پال کو خبر ہو گئی اور اس نے اپنے بیٹے انند پال کی زیر کمان یہ ٹڈی دل فوج حریف کی مزاج پرسی کو بھیجی تھی۔ فرار کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ انند پال کے لشکر میں برہمنوں کا ایک خاص گروہ تھا جو بھیانک انداز میں نقارے بجایا کرتا تھا۔ یہ راجا جے پال کا امتیازی نشان تھا۔ طلوع آفتاب کی پہلی کرن کے ساتھ جب نقارے پر چوٹ پڑی تو لاہوری لشکر کے ہوش اڑ گئے۔ سب کی زبانوں پر ایک ہی فقرہ تھا ''جے پال آ گیا...... جے پال آ گیا......ادھر انند پال نے یلغار کا حکم دیا اس کی ٹڈی دل فوج لاہوری لشکر کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگی۔ تھنرت کا لشکر تو بے یقینی کی دیوار کا نقشہ پیش کر رہا تھا جو

Marfat.com

آزمائش کے وقت ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہے۔دوپہر سے پہلے پہلے جنگ کا فیصلہ ہو گیا تھمرت کی فوج سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھی۔انند پال نے حریف کو گرفتار کیا اور دریائے چناب کو عبور کر کے حریف کے گھر تک آ پہنچا۔

''مہاراج! آپ نے ہم سے ٹکر لینے کی یہ کیا حماقت کی؟'' انند پال نے لاہور پہنچ کر طنز بھری مسکراہٹ سے پوچھا۔

''جب برے دن آتے ہیں تو عقل جاتی رہتی ہے'' تھمرت نے شدت خجالت سے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے جواب دیا۔لاہور کے بارسوخ پنڈت جو پستھان کہلاتے تھے' آپس کی اس چپقلش کو بنظر حقارت دیکھ رہے تھے کہ غزنی سے اٹھنے والے طوفان سب کی نگاہوں میں تھا۔ وہ وقت نفاق کا نہیں اتفاق کا تھا لہٰذا دین دھرم کے نام پر سب نے بیک زبان انند پال سے درخواست کی کہ ''مہاراج! اس مورکھ کی خطا معاف کر دی جائے۔''

ادھر تھمرت نے بھی ملتجی لہجے میں تاعمر وفا کا یقین دلایا۔انند پال نے سیاسی مصلحت کے پیش نظر بھاری تاوان کے عوض تھمرت کی جان بخش دی۔اسے خلعت بھی عطا کی اور از سر نو اسے لاہور کا راجا بنایا۔تھمرت نے تاوان جنگ کی ہامی تو بھر لی مگر سب کچھ ادا کر کے تہی دست ہو جانے کے بعد بھی وہ مطلوبہ رقم پوری نہ کر سکا۔اس طرح اہل لاہور کو جرمانے کی رقم ادا کرنا پڑی یہاں سے ایک نئی کہانی کا آغاز ہوا۔تھمرت نے عذاب کا جو بیج بویا تھا وہ توقع سے بہت پہلے پھوٹ نکلا۔راجا بھرت' زندان میں زندگی کے دن پورے کر چکا تھا۔تھمرت کا لاڈلا بیٹا چندرت باپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔اسے اپنے دادا کا پابند سلاسل ہونا یاد تھا۔اس نے بھرے دربار میں اپنے پتا کو سرزنش کی ''آپ نے کس برتے پر راجے پال سے ٹکر لی تھی؟ طوق رسوائی زیب گلو کرنے سے بہتر تھا کہ آپ سر کٹوا دیتے۔''

ادھر عوام الناس زر جرمانہ ادا کرنے کے غم میں بھرے بیٹھے تھے۔سب نے چندرت کی ہاں میں ہاں ملائی۔باپ نے گرج کر راج کمار کو خاموش ہو جانے کی تلقین کی مگر بیٹا بھی پورا انتظام کئے بیٹھا تھا۔''آپ حکمرانی کے اہل نہیں'' چندرت نے اپنے حواریوں کو اشارہ کیا۔راج سنگھاسن کے پائے ہل گئے۔چندرت نے اپنے باپ کو اسی انداز میں اور اسی قلعے میں قید کر دیا جہاں اس کے دادا نے زندگی کے دن پورے کئے تھے۔فلک کج رفتار اس مکافات عمل کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔اب چندرت لاہور کی قسمت کا مالک و مختار تھا۔

Marfat.com

راجا جے پال کو خبر ہوئی تو وہ آتش زیر پا ہو گیا۔ ''حضرت ہمارا وفادار تھا'' اس نے گرج کر کہا ''ہم اسے قید میں ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔''

''آپ کا ہر حکم بجالانا دھرم ہے'' انند پال نے سعادت مندی سے کہا۔

''لشکر تیار کرو اور لاہور کی اینٹ سے اینٹ بجادو'' جے پال نے حکم دیا۔ ''چندرت کو گرفتار کرتے ہی موت کے گھاٹ اتار دو اور شہر لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں اپنا اہلکار مقرر کرو'' راجا جے پال نے اپنے بیٹے اور سیناپتی کو حکم دیا۔

انند پال ایک بار پھر لشکر جرار لے کر عازم لاہور ہوا۔ اس نے ساموتلہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ ادھر چندرت بھی لاؤ لشکر کے ہمراہ لاہور سے نکلا۔ دونوں نے فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو چندرت نے انند پال سے سوال کیا ''مہاراج! یہ شتر بے مہار کی طرح منہ اٹھائے ہمارے علاقے میں گھس آنے کا مطلب؟''۔

''ایک ناخلف کپوت کو اس کے اعمال کی سزا دینا'' انند پال نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میرا باپ احمق تھا جو بغیر کسی جواز کے غیروں پر حملہ کر بیٹھا''۔ چندرت نے وضاحت کی ''وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ اس وقت فوج کے پاس جنگ کا کوئی مقصد نہ تھا۔ سربراہ کی ہوس ملک گیری کوئی مقصد نہیں ہوتا لہٰذا فوج بے دلی سے لڑی اور پٹ گئی مگر آپ تو احمقوں کے بھی سردار دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کے پاس اس حملے کا کوئی جواز نہیں لہٰذا اپنی موت کو آواز نہ دیں''

''جواز ہے اور بہت بڑا'' انند پال نے حریف کی ہرزہ سرائی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''مجھے اپنے پتا جی کی اچھیا کا پالن کرنا ہے اور ان کا حکم ہے کہ تمہیں سزا دی جائے۔ میں تمہاری طرح اولاد ناخلف نہیں۔ تم نے اپنے باپ کی تذلیل کر کے اپنے راہ میں کانٹے بو لئے جس طرح تمہارے باپ نے اپنی راہ میں کانٹے بوئے تھے اور ذلیل و رسوا ہوا تھا''

چندرت چرب زبان ہونے کے ساتھ ساتھ مکار بھی تھا اس نے حریف کے سیناپتی کو دغا و فریب سے گرفتار کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا مگر انند پال بھی رزم و بزم دیدہ سپہ سالار تھا۔ چندرت نے حسب منصوبہ ایک خاص اشارہ کیا۔ اس کی فوج سے چار مستعد جوان انند پال پر جھپٹے مگر انند پال نے اس کا بھی توڑ سوچ رکھا تھا۔ ادھر چندرت کی فوج سے چار جوان میدان میں کودے ادھر سے آٹھ سپاہی برق اجل بن کر ان کے سر پر گرے۔ انند پال کے سیوکوں نے چندرت کے حواریوں کا کام تمام کر دیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ چندرت نے اپنے ہی سپاہیوں کو

Marfat.com

لتاڑنا شروع کر دیا گویا اس بزدلانہ حرکت میں اس کی منشا شامل نہیں تھی۔

''ہم آپ کو سوچنے کا موقع دیتے ہیں'' انند پال نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ''خلق خدا کا خون بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لاہور ہمارے حوالے کر دیں۔''

چندرت کو طاقت کا توازن حریف کے حق میں دکھائی دے رہا تھا لہٰذا اس نے جنگ کی بجائے فراست و سیاست سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور کچھ مہلت طلب کی جو انند پال نے بخوشی عطا کر دی۔ دونوں لشکر اپنے اپنے پڑاؤ میں واپس آ گئے۔ چندرت نے روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے انند پال کے قتل کا منصوبہ بنایا جس کی بھنک انند پال کے کانوں میں پڑی تو اس نے بھی حریف کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ ''اب حریف کو میدان جنگ میں نہیں بساط سیاست پر مات ہو گی'' اس نے اپنے لشکر میں سے پانچوں سو وفاداروں کو ہدایت کی کہ وہ چندرت کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھیں اور موقع ملتے ہی اسے گرفتار کر کے لے آئیں۔ کامیابی کی صورت میں سب کو مالا مال کر دیا جائے گا۔ انعام کے لالچ نے ''وفا'' کو مزید تقویت بخشی۔ ادھر شومئی تقدیر سے ایک روز چندرت کو شکار کھیلنے کا شوق چرایا اور وہ تکمیل شوق میں شکار کھیلتے کھیلتے اپنے پڑاؤ سے دور نکل گیا۔ یہ سراسر حماقت تھی۔ انند پال کے وفادار تو پہلے ہی گھات لگائے بیٹھے تھے انہوں نے موقع پا کر اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ چندرت کے مٹھی بھر ساتھیوں نے مقابلہ کیا مگر بے دلی سے ....

انند پال نے حریف کو پابہ زنجیر کر کے اپنے باپ کی خدمت میں بھیج دیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ چندرت کا عہد حکومت 9 برس پر محیط ہے۔ حکومت ہاتھ سے نکلی تو چندرت کے دونوں بیٹے راہ فرار اختیار کر کے والئی جالندھر کے ہاں پناہ گزین ہوئے۔ یہ اس سال کا واقعہ ہے جب عباسی خلیفہ القادر باللہ نے محمود غزنوی کو خلعت فاخرہ سے نوازا تھا اور عراق، خوارزم، نیمروز، خراسان کے علاوہ ہند کے مفتوحہ علاقوں پر اس کی حکومت تسلیم کر لی تھی، یعنی 389ھ بمطابق 998ء۔ یہ علاقے القادر باللہ نے فتح نہیں کیے تھے بلکہ محمود غزنوی کے زور بازو کا نتیجہ تھے۔ خلیفہ نے صرف مہر خلافت ثبت کی تھی۔ اس زمانے میں سلطنت لاہور دریائے بیاس سے دریائے چناب تک پھیلی ہوئی تھی۔ چناب کے اس پار راجا جے پال کی وسیع و عریض حکومت تھی۔ اب جے پال کی حکومت مشرقی حد دریائے بیاس قرار پائی اور لاہور نے جے پال خاندان کے سارے خسارے پورے کر دیئے۔ وہ خسارے جو جے پال کو محمود غزنوی سے ٹکرانے کے نتیجے میں ہوئے تھے۔

Marfat.com

داستان میں مزید پیش رفت سے پیشتر جے پال کا تعارف پیش خدمت ہے۔اس کی ذات کے متعلق مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہر حال وہ برہمن نہیں پنجاب کا راجپوت بھٹی تھا۔لہٰذا اسے برہمن شاہی خاندان کا فرد کہنا غلط ہے۔البتہ ہندوشاہی کہنے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ وہ متعصب ہندو ضرور تھا۔ ہندوشاہی خاندان کی وسیع سلطنت ملتان سے دریائے چناب کا مغربی علاقہ' کابل قندھار تک پھیلی ہوئی تھی مگر وہ غزنی میں سبکتگین کی طاقت سے مرعوب تھا۔ سبکتگین نے اپنی سیاسی بصیرت سے افغان قوم کی تشکیل دی تو ہندوشاہی خاندان کے سر پر منڈلانے والا خطرہ اور بھی دہشت ناک ہو گیا۔ جے پال بن اشت پال 960ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے اس خطرے کا تدارک کرنے کی ٹھانی۔ ہندوشاہی خاندان کے ہاتھ سے کابل قندھار نکل جانے کے باوجود شہر کابل ابھی تک ان کے زیر تسلط تھا۔ جے پال نے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے کی خاطر پنجاب کے جنگ جو قبائل اکٹھے کیے۔ گوالیار قنوج اور کالنجر کے راجگان کو''دھرم یدھ'' کا واسطہ دیا اور ایک ٹڈی دل لشکر لے کر غزنی پر چڑھ دوڑا۔ وادی لمغان میں افغان اور ہندوشاہی افواج میں خونریز معرکہ آرائی ہوئی جس میں سبکتگین کامیاب و کامران رہا۔ محمود اس معرکے میں اپنے باپ کے ہم رکاب تھا۔ غزنی کے گرد و پیش کا سارا علاقہ' اور زر کثیر تاوان جنگ ادا کرنے کے بعد جے پال معافی کا خواستگار ہوا۔ سبکتگین نے اپنے بیٹے کی منشا کے خلاف راجا کو معاف کر دیا محمود غزنی اپنے حکمران باپ کو صرف مشورہ دے سکتا تھا جو اس نے دیا۔ جے پال اپنے علاقے گنوانے کے باوجود خسارے میں نہیں رہا۔ افغانیوں نے اوپر سے دھکیلا تو اس نے لاہور پر قبضہ کر لیا

محمود غزنوی کا اندازہ درست نکلا۔ راجا جے پال اپنی راجدھانی پہنچ کر تاوان جنگ ادا کرنے سے صاف مکر گیا۔ سبکتگین کو خبر ہوئی تو وہ آندھی طوفان کی طرح اپنے لشکر کے ہمراہ پشاور پہنچا۔ لاہور سے جے پال ایک لاکھ فوج لے کر میدان میں اترا مگر ستاروں نے پھر ایک بار بے وفائی کی اور جے پال کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح وادی لمغان سے دریائے سندھ تک کا سارا علاقہ جے پال لاہوری کے ہاتھ سے نکل گیا۔

997ء میں محمود غزنوی باپ کی وفات کے بعد برسر اقتدار آیا تو جے پال نے ایک بار پھر قسمت آزمانے کا ارادہ کیا 391ھ بمطابق 1001ء 27 نومبر کا دن تھا جب دونوں لشکر معرکہ آرا ہوئے ...... وہی میدان تھا' وہی حربے آزمائے گئے سر کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ بے

Marfat.com

سروں کے لاشے تڑپنے لگے۔ جے پال کی یہ آخری شکست تھی۔ پندرہ بیٹوں اور پوتوں سمیت وہ پابند سلاسل ہوا۔ اڑھائی لاکھ دینار ادا کر کے جاں بخشی کی درخواست کی جسے محمود غزنوی نے شرف قبولیت بخشا مگر اب اس کی راجپوتی انا جاگ اٹھی۔

کوئی نسبت کوئی رشتہ اس کا راستہ نہ روک سکا اور اس نے جیالوں کی طرح اپنے آپ کو دہکتی چتا کے حوالے کر دیا۔ کہتے ہیں لپکتے ہوئے شعلوں کا اس نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ اس کا یہ عمل ہندو ہونے کے باوجود اہل دل مسلمانوں کے ہاں قابل صد ستائش ٹھہرا۔ یہ اور بات ہے کہ زندہ جل مرنے کی رسم راجپوتوں میں رائج تھی۔

باپ نے اپنے آپ کو چتا کے سپرد کر دیا تو آنند پال تخت پر متمکن ہوا۔ اس وقت وہ لاہور کا گورنر تھا۔ اس کی گورنری کا آغاز 997ء فتح لاہور کے دن سے ہوا تھا۔ اس نے نندنہ کو اپنا پایہ تخت قرار دیا اور اپنے خاندان کی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنے کی تدابیر سوچنے لگا۔ سرفہرست مسئلہ طاقت کا حصول تھا جس پر اس نے بھرپور توجہ دی۔ اس زمانے میں ملتان کا حکمران داؤد قرامطی تھا جو محمود غزنوی کی توجہ کا مرکز تھا۔ پشاور کا علاقہ تا حال محمود غزنوی نے اپنی قلمرو میں شامل نہیں کیا تھا لہٰذا داؤد پر حملے کے لئے اس نے دریائے سندھ کو رازداری کے پیش نظر پشاور کے قریب سے عبور کرنا چاہا۔ محمود غزنوی نے آنند پال سے دریا عبور کرنے کی اجازت طلب کی مگر آنند پال کے تو ارادے ہی کچھ اور تھے۔ ادھر داؤد ملتانی نے اسے اکسایا اور وہ محمود غزنوی سے ٹکرانے پر تیار ہو گیا۔

پشاور کے قریب دونوں فوجیں آپس میں ٹکرائیں۔ آنندی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور آنند پال راہ فرار اختیار کر کے سودرہ کے جانب نکل گیا۔ محمود نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ کشمیر کی پہاڑیوں میں روپوش ہو گیا۔ محمود نے تعاقب ترک کر دیا اور غزنی لوٹ گیا۔ غزنی میں ترکوں نے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ لہٰذا اندرونی شورش کی جانب متوجہ ہونا آنند پال کے تعاقب سے زیادہ اہم تھا۔ اس دور خرابی میں اسے چومکھی لڑنا پڑ رہی تھی۔ اپنے ناراض، بیگانے ناخوش۔ اس مقام پر آنند پال کی زندگی کا عجیب رخ سامنے آیا۔ محمود جب بیم و رجا کی کشمکش میں مبتلا تھا تو آنند پال نے اپنی راجدھانی میں واپس آ چکا تھا۔ اس نے حریف کو بڑا منفرد خط لکھا جس کا متن یہ تھا:

عالی جاہ! آپ نے مجھے شکست سے ہمکنار کیا۔ اب سنا ہے آپ ترکوں سے جنگ میں مشغول ہیں۔ میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ مجھے شکست سے ہمکنار کرنے والا کسی دوسرے

Marfat.com

سے شکست کھا جائے۔ یہ میرے بھرم کا سوال ہے' لہٰذا میں سچے دل سے آپ کے دوش بدوش لڑنے کو تیار ہوں۔ جب آپ کا دشمن نیست و نابود ہو جائے تو ہم اپنے جھگڑے کا فیصلہ خود کر لیں گے۔''

اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ آنند پال کشادہ دل اور وسیع ظرف والا دشمن تھا کمینہ ہوتا تو محمود غزنوی کی مجبوری سے ضرور فائدہ اٹھاتا اور پیٹھ میں خنجر گھونپ دیتا۔ یہی راجپوتی انا تھی جس کی بنا پر جے پال رسم جوہر ادا کر کے پرائشچت (کفارہ ادا کرنا) پر مجبور ہوا۔

محمود نے اپنی مشکلات پر قابو پا لیا۔ ادھر آنند پال داغ شکست کو دھونے پر بے چین تھا اس نے ہندوستان کے تمام راجاؤں سے دھرم کا نام پر اپیل کی۔ ہند کے دھرم سیوک لبیک کہتے ہوئے اس کے گرد جمع ہوئے۔ ایک ناقابل شکست قسم کا ٹڈی دل لشکر اس کی راجدھانی میں حاضر ہو گیا۔ یہ 399ھ بمطابق 9-1008ء کا واقعہ ہے جسے تاریخ میں محمود کا ہند پر چھٹا حملہ یا فتح پنجاب کہتے ہیں۔ اس دور میں ہنود مسلمانوں کو ملیچھ یعنی نیچ اور حقیر قرار دے چکے تھے۔ یہ شودروں سے بھی نچلا درجہ تھا۔ شودروں کی ناگفتہ بہ حالت کے متعلق دنیا جانتی ہے۔ کالنجر' قنوج' اجین اور گوالیار کے مہاراجگان نے بطور خاص اس دھرم یدھ (جہاد) میں حصہ لیا کیوں کہ ان کو بخوبی علم تھا کہ آنند پال ان کی ڈھال بن رہا تھا اور ڈھال ٹوٹ جائے تو پیکر جاں پر وار روکنا پڑتا ہے جو حیات کش بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

اس دھرم یدھ میں ہندو خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کنیاؤں نے اپنے زیورات اتار کر نذر کیے۔ عمر رسیدہ خواتین نے سوت کات کات کر سپاہیوں کے عیش و آرام کا اہتمام کیا۔ اب فوج ظفر موج کی کمان میں آنند پال کے نوجوان راج کمار تری لوچھن پال کے ہاتھ میں تھی۔

''بیٹا! دشمن خود بخود جال میں آ رہا ہے'' آنند پال نے سیناپتی کو سمجھایا اس کے آگے ہم اور پیچھے دریا' بھاگ کر جائے گا کہاں؟''

چالیس روز تک دونوں فوجیں آمنے سامنے ڈٹی رہیں۔ ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک روز طلوع آفتاب سے ذرا پہلے پنجاب کے تین ہزار کھوکھروں نے جنگلی درندوں کی طرح مسلمانوں پر ہلہ بول دیا اور پہلے ہی ہلے میں چار ہزار مسلمانوں کے سر تن سے جدا کر دیے۔ یہ افتاد تو مسلمانوں کے سان و گمان میں بھی نہ تھی۔ تب دونوں فوجیں گتھم گتھا ہو

Marfat.com

گئیں۔محمود غزنوی کو اپنی شکست کے آثار صاف دکھائی دینے لگے۔وہ عین میدان جنگ میں شمشیر وسناں کے سائے تلے سربسجود ہو گیا۔پھر وہ اسپ تازی پر نئے عزم کے ساتھ سوار ہوا اور جاں نثاروں کے ہمراہ آگ اور خون کے سمندر میں کود گیا۔غیر متوقع طور پر ہندی سپاہ کے قدم اکھڑنے لگے۔آنند پال ایک فیل مست پر سوار تھا جو عین وقت پر دھوکا دے گیا۔میدان جنگ سے منہ موڑ کر ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ' ہندی سپاہ بھی حوصلہ ہار بیٹھی۔میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔آنند پال کے حشر کے متعلق دو آرا پائی جاتی ہیں۔ایک تو یہ کہ وہ کشمیر کی جانب روپوش ہو گیا اور تاحیات منظر عام پر نہیں آیا۔دوسری یہ کہ اس نے دل سے محمود غزنوی کو فاتح تسلیم کر لیا اور آخری دم تک خراج ادا کرتا رہا۔کشمیر میں روپوش ہو جانے والی رائے قرین قیاس اس لئے نہیں کہ وادی کشمیر پر اس دور کی ایک سفاک قسم کی شہوت پرست ویدارانی حکمران تھی۔ جس کا تعلق پروہ گپت خاندان سے تھا۔وادی کشمیر پر اس خاندان کا تاریک دور 922ء سے 1017 تک چھایا رہا۔اس خاندان کی ابتد پروہ گپت اور انتہا ویدارانی پر ہوئی۔اس دور کو عہد بے شرمی ہی کہا جا سکتا ہے۔

برصغیر کی سرزمین بہ شمولیت ننگ انسانیت کے مقام پر فائز ہو چکی تھی۔دور محمود غزنوی میں کشمیر کی حالت زار کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔کشپ میر کشیر یا کشمیر کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں صرف اس دور کی خرابی کی نشان دہی مطلوب ہے۔

922ء میں وادی کشمیر پر راجگان مالوہ کا راجا سنگرام دیو حکمرانی کر رہا تھا۔سنگرام دیو نابالغ ہونے کے ساتھ ساتھ ناتجربہ کار اور سادہ لوح قسم کا لڑکا تھا مگر اس کے دربار کا معزز وزیر پروہ گپت پرلے درجے کا مکار اور ہوس پرست انسان تھا۔ابلیسی ذہانت کا مالک ہونے کی بنا پر دربار میں اس کا طوطی بولتا تھا۔پہلے تو اس نے بے مثال منصوبہ بندی سے پانچ پرخلوص اور باوفا وزرا کو ٹھکانے لگایا۔ایک روز اپنے نابالغ ولی نعمت کو دریائے وتستا (جہلم) کی سیر کرانے لے گیا۔سنگرام کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ...... پروہ گپت اس کی جان کا دشمن ہے۔جب ہوش آیا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔پروہ نے سنگرام کی مشکیں کس کر اس کے سینے پر بھاری پتھر باندھا اور اسے دریائے جہلم کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

سنگرام کو دریا برد کرنے کے بعد پروہ گپت تخت کشمیر پر براجمان ہوا۔اس کی حیاسوز حرکات کی فہرست بڑی طویل ہے جس کی سزا اس کی نسل کو بھگتنی پڑی۔یہ عذاب کا زمانہ پچاس

Marfat.com

سال پانچ ماہ اور ایک دن پر محیط ہے۔ پروہ گپت تخت نشین ہوا تو گویا شیطان آزاد ہو گیا۔ بلا امتیاز ادنیٰ و اعلیٰ خلق خدا پر زمین تنگ ہو گئی کسی معزز فرد کی عزت محفوظ تھی نہ کسی پاک دامن دوشیزہ کی عصمت۔ پروہ گپت پر تو گویا جنسی بھوت سوار تھا۔ تیرہ عدد رانیوں کے جھرمٹ میں بھی وہ ہوس کا پجاری تھا۔ راجا یوشنکر (جسے اس نے زہر دے کر ہلاک کیا تھا) کی ایک بیوہ حسن و جمال میں لاثانی تھی۔ پروہ گپت اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا مگر بیوہ نے وصل کی ایک شرط عائد کر دی۔

''جب تک میرے سورگ باشی جیون ساتھی کی سمادھی اور اس سے ملحق مندر پایہ تکمیل تک نہ پہنچے میں ''ہاں'' نہیں کر سکتی'' اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر پروہ گپت نے یہ دونوں کام اپنے ہاتھ میں لئے اور بیگار پکڑے گئے ہزاروں مزدوروں کو دن رات کی مشقت کی چکی میں پیس کر دونوں عمارتیں تعمیر کروائیں۔ بیوہ نے ''سپردگی'' پر موت کو ترجیح دی اور شب وصال سے ایک روز پیشتر سولہ سنگار کر کے اپنے آپ کو چتا کے حوالے کر دیا۔ پروہ گپت کی تو گویا بنیاد ہی ہل گئی۔ جس انداز سے وہ دھتکارا گیا تھا' وہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا اور وہ شدت خجالت سے ایک سال تین ماہ بعد دنیا سے چلا گیا۔ کہتے ہیں شدت خجالت سے زیادہ اس کی بے اعتدالیوں نے اس کی جان لی۔

پروہ گپت کے بعد اس کا عیاش بیٹا کھیمہ گپت تخت پر بیٹھا تو وہ باپ سے بھی دو ہاتھ آگے کی چیز ثابت ہوا۔ وہ طوائفوں اور ہیجڑوں کا دلدادہ تھا۔ نسوانی لباس و زیورات پہن کر دربار سجاتا۔ اس نے رعایا پر اتنے ٹیکس عائد کر دیئے کہ خلق خدا کی کمر ہمت ٹوٹ گئی' درمیانہ طبقہ پس کے رہ گیا' سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔ بھانڈ سوانگ رچانے والے' ہیجڑوں اور طوائفوں کی بن آئی۔ اس نے قانوناً اپنے درباریوں کو نسوانی لباس پہننے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہوس پرست' ویدا رانی پر فریفتہ ہوا جو وادی کشمیر کی رسوا ترین حکمران بنی۔ پھلگن نامی وزیر نے بھی اپنی دختر نیک اختر پیش کی مگر اسے ویدا رانی جیسی ''قبولیت'' حاصل نہ ہو سکی۔ ظلم و ستم کے اس نمائندہ حکمران کو منفرد نوعیت کے شکار کا شوق تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر بلیوں کا شکار کھیلتا۔ بارہ مولا کے قریب ایک روز اپنے شوق کی تسکین کر رہا تھا کہ عجیب و غریب حادثہ پیش آیا۔ ایک خوفناک شکل و صورت کا گیدڑ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا جس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ راجا کا خوف سے برا حال ہو گیا۔ اسی دہشت نے اس کا کام تمام کر دیا۔

972ء میں کھیمہ گپت کا نابالغ بیٹا ابھی مینو ویدا رانی کی نگرانی میں تخت نشین ہوا۔ ویدا

Marfat.com

رانی نے چند برس تو صبر سے کام لیا مگر اپنا اصل رنگ دکھانا شروع کر دیا یہی وہ دور ہے جب راجہ جے پال سبکتگین کا آپس میں ٹکراؤ ہوا۔ ابھی منیو کے عہد حکومت میں سری نگر شہر میں آگ لگی اور مکمل شہر جل کر راکھ ہوا۔ یہ برائے نام راجہ فوت ہوا تو ویدارانی نے اپنے پوتے نندی گپت کو تخت پر بٹھایا اور حکومت کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں رکھی۔ غیر متوقع طور پر نندی گپت نے اپنی دادی پر نکتہ چینی شروع کر دی گویا ایک پیدل نے شہ کو للکارا۔ ویدارانی نے اپنے پوتے کو زہر دے کر کشمکش حیات سے آزاد کر دیا۔ یہی حشر اس نے اپنے دوسرے پوتے' تربھون گپت کا کیا' یعنی اس کے سر پر تاج سجایا۔ پوتے نے دادی کے منشاء کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

اس بار ویدارانی نے تربھون گپت کے شیر خوار بیٹے کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا۔ اس کا نام بھیمہ گپت تھا۔ ویدارانی کی عمر تو بھگوان سے لو لگانے کی تھی مگر ایک روز عجیب اتفاق ہوا۔ ایک مردانہ وجاہت کا گھبرو نوجوان گوجر رانی کے دربار میں ریاست پونچھ کا ایلچی بن کر آیا اسے دیکھ کر باسی کڑھی میں ابال آ گیا۔ ویدارانی تو بس مسلسل اسے قربان ہو جانے والی نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ پہلے تو درباریوں نے ان نگاہوں کو ''ممتا'' گردانا مگر نگاہِ ہوس کب چھپی رہ سکتی ہے؟

''نوجوان! ایک بار دربار سے باہر جاؤ اور پھر اسی قاتلانہ انداز میں چلتے ہوئے میرے سامنے آؤ'' ویدارانی نے عجیب و غریب حکم دیا۔ حکم تو حکم ہوتا ہے۔

پہلے تو نوجوان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر جب وہ بات کی تہہ تک پہنچا تو حیرت میں ڈوب گیا۔ اس انداز دلربائی پر ویدارانی مر مٹی اور دربار برخاست کر کے نوجوان کو گوشہ تنہائی میں لے گئی چند روز کی غیر حاضری کے بعد رانی ماتا نے دربار لگایا تو ایلچی نوجوان اس کا پتی بن چکا تھا۔ بھیمہ گپت نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی پردادی پر بڑا غصہ آیا مگر ویدارانی نے ایک ہی پھونک سے یہ چراغ بھی گل کر دیا اور خود کشمیر کے تخت پر بیٹھی۔ یہ 998ء کا ذکر ہے۔ اس رانی نے اٹھارہ برس مزید حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں بقول روایت' آنند پال نے کشمیر میں پناہ لی تھی۔

محمود غزنوی نے البتہ 1015ء میں اس پر حملہ ضرور کیا تھا۔ محمود غزنوی کے خیال میں کشمیر' پال خاندان کی جائے پناہ تھا اور وہ اس کا تدارک کرنا چاہتا تھا۔ حملے کی دوسری وجہ' خلق خدا کی دکھ بھری صدائیں اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی تھیں۔ بہر حال یہ مہم کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی ایک تو افغانی فوج راستہ بھول گئی' دوسری برف باری کا آغاز ہوا تو تمام راستے مسدود ہو گئے۔ فوج

Marfat.com

کے کئی سپاہی لقمہ اجل ہوئے اور محمود غزنوی کو یہ مہم ترک کرنا پڑی۔

آنند پال کے بعد اس کا جوشیلا بیٹا ترلوچھن پال تخت نشین ہوا تو اس نے محمود غزنوی کو خراج دینا بند کر دیا' لہٰذا ایک بار پھر میدان کارزار گرم ہوا۔ نندنہ کا یہ قلعہ محمود کی یلغار کا سامنا نہ کر سکا ترلوچھن نے قلعے کی حفاظت اپنے بیٹے بھیم پال' کو سونپی اور خود کشمیر کی جانب کوچ کر گیا۔ نندنہ کا قلعہ خوں ریز جنگ کے بعد سر ہوا۔

ترلوچھن کی معاونت کے لئے کشمیری لشکر دریائے جہلم کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ محمود نے اس کشمیری لشکر کو مار بھگایا۔ ترلوچھن کی کمر ہمت ٹوٹ چکی تھی اور کشمیری مددگار بھی بھاگ چکے تھے۔ آخر اس نے اپنی بچی کھچی طاقت سمیٹی اور لاہور کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ بھیم پال بھی باپ کی ڈھارس بندھاتا رہا۔

قیام لاہور کے دوران اگر یہ دونوں باپ بیٹے عقل سے کام لیتے تو شائد بچاؤ کی صورت پیدا ہو جاتی مگر وہ مسلسل محمود غزنوی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ مثلاً 410ھ بمطابق 1019ء انہوں نے والی کالنجر کی بھرپور امداد کی۔ آخر 412ھ یعنی 1021ء میں محمود غزنوی نے اپنے راستے کے یہ دونوں کانٹے ہٹا دیئے۔ ترلوچھن پال تو اجمیر کی طرف بھاگ چکا تھا اس کا نڈر بیٹا بھیم پال لاہور کا مالک ومختار تھا مگر وہ غزنوی سیلاب میں خشک تنکے کی طرح بہہ گیا اور لاہور کو سلطنت غزنویہ میں شامل کر لیا گیا۔ لاہور میں دو نائبین مقرر کئے گئے۔ ایک قاضی شہر (یا صوبے دار) دوسرا سپہ سالار

اندرونی انتظام و انصرام قاضی کا شعبہ ہوا کرتا تھا جب کہ سپہ سالار کے فرائض میں بیرونی معاملات ہوا کرتے تھے۔ دونوں صرف مرکز کو جواب دہ ہوتے تھے آپس میں دونوں گویا ہم مرتبہ تھے۔ یہ دستور سلطان مسعود بن محمود کے زمانے تک رہا۔

لاہور کا پہلا قاضی ابوالحسن علی المعروف قاضی شیراز تھا اور پہلا سالار عبداللہ قراتگین۔ اس کے بعد ابوالفتح وافغانی اور تیسرے نمبر پر ابوالفراج کرمانی' اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوا۔ قاضی شیراز مزاج سلطانی سے آشنا تھا۔ یہ آشنائی اس کی مقبولیت کا سبب تھی جس کی بنا پر وہ خود پسند اور مغرور ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کی کسی بھی سپہ سالار سے بن نہ پائی۔ اس طرح لاہور مسلسل عذاب میں رہا سپہ سالار کرمانی تک تو معاملہ کسی نہ کسی طرح چلتا ہی رہا مگر چوتھا سپہ سالار لاہور' اریارق تھا جو قاضی شیراز سے بھی زیادہ منہ زور ثابت ہوا۔ قاضی موصوف جو سپہ سالار کو اپنے سے کمتر سمجھنے کا

Marfat.com

عادی تھا' اریارق پر قابو نہ پا سکا۔

1030ء میں سلطان محمود غزنوی کے سفر آخرت اختیار کرنے کے بعد اس کا بیٹا محمد مختصر سی مدت کیلئے تخت نشین ہوا (یعنی صرف چھ ماہ) تو اریارق اس کے احکام کو بھی بالائے طاق رکھ کر اپنی من مانی کرتا رہا۔ لیکن جب محمود غزنوی کا دوسرا بیٹا مسعود تخت غزنی پر رونق افروز ہوا تو اس نے اریارق کے تمام کس بل نکال دیئے۔ اسے پابہ زنجیر کر کے غور بھیج دیا۔ ظلم و تعدی سے جمع کی ہوئی اس کی ساری دولت بحق سرکار ضبط کر لی۔ اس کی جگہ احمد نیالتگین کو تزک و احتشام سے نیا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔

لاہور کے مصائب کا پھر بھی ازالہ نہ ہو سکا۔ احمد نیالتگین اور قاضی شیراز نئے سرے سے سرد جنگ میں مصروف ہو گئے۔ لشکر سپہ سالار کا حامی تھا مگر قاضی نے مرکز کو یقین دلایا کہ نیالتگین پنجاب میں خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ مسعود نے قاضی شیراز کی باتوں میں آ کر اپنے ہی فرستادہ سپہ سالار پر بغاوت کا الزام لگا دیا اور اس کی سرکوبی کو ناتھ نامی ایک ہندو سالار کو بھیجا۔ نیالتگین کو خبر ہوئی تو وہ گویا ہتھے سے اکھڑ گیا اور شرارت کی جڑ قاضی شیراز کو سبق سکھانے کے لئے اپنی مہم کو ادھورا چھوڑ کر لاہور کی جانب لپکا۔ اس طرح آتش فساد بھڑک اٹھی۔ قاضی صاحب قلعہ بند ہو گئے۔ نیالتگین نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ بڑی واہیات صورت حال تھی۔ سلطان محمود غزنوی کو آنکھیں بند کیے ابھی دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ صرف چار برس اور اس کے جانشین یہ گل کھلا رہے تھے۔

محاصرے کے دوران ہی ناتھ لاہور پہنچ گیا مگر احمد نیالتگین نے مرکزی فوج کو مار بھگایا۔ اس کی جگہ ایک اور ہندو سالار تلک نے نیالتگین کی سرکوبی کا بیڑا اٹھایا جو ابھی تک قاضی صاحب کا محاصرہ کیے بیٹھا تھا۔ تلک نے نیالتگین پر قابو پا لیا اور اس کے ساتھیوں کو عبرت ناک سزا دی۔ نیالتگین کا سر کاٹ کر سلطان مسعود کی خدمت میں بھیج دیا۔ 1021ء سے 1037 تک لاہور میں فساد بپا رہا۔ آخر 1037ء میں سلطان محمود کا چہیتا غلام ایاز لاہور کا صوبے دار مقرر ہو کر آیا تو اہل لاہور نے سکھ کا سانس لیا۔ ایاز کا لاہور جیسے صوبے کا حاکم مقرر ہونا اچھوتوں یا شودروں کے لئے اس دور میں واقعی باعث حیرت تھا کیوں کہ رعایا ایاز کی ساری زندگی سے مکمل طور پر آشنا تھی۔

وہ ایک تہی دست غلام کی حیثیت سے محل میں آیا۔ محمود غزنوی نے اس میں پوشیدہ صلاحیتوں کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ رفتہ رفتہ وہ عروج کے اس مقام پر پہنچا کہ دنیا دنگ رہ

Marfat.com

گئی۔ یہ اسلامی اخوت و مساوات کا وہ روشن پہلو تھا جس میں بالا امتیاز ادنیٰ و اعلیٰ ہر فرد کیلئے عزت و توقیر کے مواقع موجود تھے۔ سب سے بڑی سفارش انسان کا نیک عمل اور اس کی صلاحیت مانی اور گردانی جاتی تھی۔ موروثی یا پیدائشی لحاظ سے کوئی نہ بدبخت کہلاتا تھا' نہ سوختہ ساماں۔ یہ اسلام یعنی دین فطرت کی بڑی موثر تبلیغ تھی۔ یہ گویا لاہور کے گردوپیش چھائے ہوئے گھٹاٹوپ اندھیرے میں روشنی کی بڑی جان پرور کرن تھی۔

ایاز سے پہلے محمود غزنوی کا نافذ کردہ قانون کہ ایک صوبے میں دو ہم مرتبہ حکمران ہونگے اور وہ صرف مرکز کو جواب دہ ہونگے۔ (یعنی قاضی اور سپہ سالار) وقتی ضرورت کے تحت بے شک ٹھیک تھا مگر مرکز کی گرفت کمزور ہوتے ہی یہ قانون باعث فساد بن چکا تھا' جیسا کہ سپہ سالار اریارق نے پر پرزے نکالے۔ قاضی شیراز کی ہوس جاہ و حشم کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مگر بنیادی فتور' قانون میں تھا۔ بہرکیف ایاز کی آمد سے اس نقصان کا ازالہ بھی ہوا اور تبلیغ دین بھی ہوئی۔ اس دور میں لاہور' شہر اور صوبہ دونوں حیثیتوں سے مشہور تھا۔ بحیثیت صوبہ اس کا اپنا پایہ تخت بھی تھا یعنی مندھوکور جو دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ اور اسی قلعے میں قاضی شیراز نے پناہ حاصل کی تھی۔

ایاز نے لاہور آتے ہی شہر کی دگرگوں حالت کی جانب توجہ مبذول کی۔ فساد مسلسل کی بنا پر نصف سے زیادہ عمارات نذر آتش ہو چکی تھیں' تین روز تک غزنوی افواج نے اس شہر کا حلیہ بگاڑا تھا۔ لوگ خوف و ہراس کا شکار تھے۔ ابن الوقت قسم کے حضرات دو گروہوں میں بٹ چکے تھے ایک گروہ قاضی شہر کی خوشنودی حاصل کرنے میں مصروف تھا اور دوسرا سپہ سالار کی۔ کدورتیں' نفرتیں عروج پر تھیں۔ ایاز نے امن و امان بحال کیا۔ پرانے شہر کی تعمیر نو کے ساتھ ساتھ موجودہ جگہ پر نیا شہر آباد کیا۔ قدیم شہر کا محل وقوع موجودہ اچھرے کی جانب تھا۔ لاہور کی تعمیر نو سید علی ہجویریؒ سے پہلے یعنی 432ھ میں پایہ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ سلطان مسعود غزنوی کے قتل کے بعد اس کے فرزند شہزادہ مجدد مودود نے لاہور پر حملہ کر دیا۔ شہزادہ مجدد 432ھ میں لاہور ہی میں قیام پذیر تھا۔ وہ قلعہ لاہور میں محصور ہو گیا۔ قلعہ لاہور کی موجودہ شکل و صورت مغل شہنشاہ اکبر کے عہد کی یادگار ہے جو ایاز کے بنائے ہوئے قلعے پر استوار ہوئی۔

ایاز اپنے نو تشکیل کردہ شہر لاہور میں دم آخر تک مقیم رہا اور اسی شہر میں وہ زیر زمین ابدی نیند سو یا ہوا ہے۔ چوک رنگ محل اندرون شاہ عالمی' بزاز ہٹہ کی جانب چند گز کے فاصلے پر ایک گم نام

Marfat.com

احاطے میں اس کا مدفن ہے۔محمود غزنوی کے جانشین پرلے درجے کے احمق ثابت ہوئے۔بہر حال جیسا کہ اشارتاً بیان کیا جا چکا ہے محمود نے دین فطرت کا بیج بونے کے لئے سرزمین برصغیر کو ہموار کیا ہند کی صورت حال تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔محمود نے ہند پر سترہ بار چڑھائی کی جسے نام نہاد سیکولر حضرات بنظر حقارت سے دیکھتے ہیں' مگر وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ سرزمین ہند پر چھائی ہوئی تاریک گھٹائیں کس قدر گھناؤنی تھیں اور یہ صورت حال کس شے کی متقاضی تھی۔

جب اس نے 26-1025ء میں سولہواں حملہ سومنات پر کیا تو وہاں کیا ہو رہا تھا؟ ہم صرف یاداشت تازہ کئے دیتے ہیں۔اس میں اہم ترین شے شوجی کا لنگ تھا جسے تمام دیوتاؤں پر فوقیت حاصل تھی۔لوگوں کا اعتقاد تھا کہ ہر روز فرد بشر کی روح' موت کے بعد اس مندر میں آ جاتی ہے۔مندر کی گھنٹیاں بیس من وزنی طلائی زنجیروں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ایک ہزار برہمن مندر کی آرائش و زیبائش پر متعین تھے۔مندر کے اخراجات کیلئے دس ہزار گاؤں وقف تھے۔ان تمام باتوں کو جو شخص چاہے نظر انداز کر دے مگر انسانیت کی توہین ایک اور انداز سے بھی ہو رہی تھی۔پانچ سو کے منتخب کنواری دیوداسیاں شولنگ کے سامنے رقص کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر مندر میں مقیم تھیں۔ان دیوداسیوں کے اضافی فرائض میں اس طلائی لنگ کو گنگا جل سے روزانہ اشنان کرانا بھی شامل تھا۔

سید علی ہجویریؒ کی آمد سے پہلے دین فطرت کی روشن کرنیں جو لاہور یا اس کے گرد و پیش کے ماحول کو منور کر چکی تھیں' ان کا تذکرہ بے حد ضروری ہے۔ان پاک ہستیوں میں سرفہرست ''بی بی پاک داماں'' ہیں جن کو بامر مجبوری سرزمین لاہور پر قدم رنجہ فرمانا پڑا۔

ایک روایت کے مطابق سید الشہداء حضرت امام حسینؑ سوئے کوفہ روانہ ہوئے تو اہل قافلہ میں بی بی حاج' بی بی تاج' حور بی بی' نور بی بی گوہر اور بی بی شہباز بھی تھیں۔حضرت امام حسینؑ نے ان چھ خواتین کو رخصت ہونے کو کہا اور وہ عازم لاہور ہوئیں۔یہاں انہوں نے راجوں کی بستی ٹھٹھی میں قیام کیا۔اجنبی سرزمین' ناآشنا لوگ' کوئی پرسان حال تھا نہ شناسا۔چند خدام البتہ ہمراہ تھے۔صنم کدوں میں ہل چل مچی تو ہندی جوتشیوں نے حساب لگا کر اعلان کیا کہ چند پاک ہستیاں اس سرزمین پر آ چکی ہیں۔اس علاقے پر راجا برماسترِی کی حکمرانی تھی جس کے راج کمار کا نام بکرما سہائے تھا۔ایک روایت میں راجا کا نام مہاویرن بھی آیا ہے۔راجا موصوف نے اپنے راجکمار کو

Marfat.com

ایلچی بنا کر ان خواتین کی خدمت میں بھیجا اور ان کو دربار میں طلب کیا مگر پردہ دار خواتین نے اس حاضری سے معذوری کا اظہار کیا۔ راج کمار کو بڑی مشکل کا سامنا ہو سکتا تھا۔ اس نے یہ مسئلہ خواتین کے گوش گزار کیا تو بی بی حاج نے اسے اپنے حضور طلب فرمایا اور نظر توجہ سے دیکھا۔ بکرما کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ اندر کی دنیا روشن ہو گئی۔ اس طرح اس نے دین فطرت کی روشنی کو قبول کیا۔ یہ ساکن جھیل میں پتھر پھینکنے والی بات تھی۔ راج سنگھاسن تھرتھرانے لگا۔ خواتین کی جائے قیام کے گرد لوگ آ جمع ہوئے۔ یہ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا والی بات تھی۔ خواتین اس قدر خائف ہوئیں کہ خدام کو انہوں نے لوٹ جانے کا اذن دیا اور خود سر بہ سجود ہو کر پردہ پوشی کی دعائیں مانگنے لگیں۔ صدق دل سے کی ہوئی دعائیں قبول ہوئیں۔ زمین میں وسیع و عریض شگاف نمودار ہوا اور ساری خواتین اس میں روپوش ہو گئیں۔ چار خدام اذن کے باوجود واپس نہیں گئے تھے یعنی حافظ ابوالفتح' ابوالفضل' ابوالمکارم اور عبداللہ۔ یہ حضرات بھی "مزار بی بی پاک داماناں" لاہور ہی میں مدفون ہیں ان کو بھی زمین نگل گئی تھی۔ یہ لاہور کے اندھیرے میں روشنی کی پہلی کرن تھی جو فوراً ہی بجھ گئی۔ آج اس کے آثار صرف ایک مزار کی صورت میں اس سرزمین پر موجود ہیں۔

جب خواتین زمین میں سما گئیں تو ان کی رداؤں کے پلو باہر رہ گئے۔ موجودہ قبور ان پلوؤں کی نشان دہی پر بنائی گئیں۔ راج کمار کا اسلامی نام محمد جمال تجویز ہوا تھا جو "بابا خاکی" کے نام سے مشہور رہا۔ بابا خاکی' بابو نامی سلیم ہیلہم جاٹ کی دختر سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا۔ یہ لڑکی اپاہج تھی مگر بابا خاکی کی زوجیت میں آنے کے بعد وہ بھلی چنگی ہو گئی۔ چند لوگ یہ دیکھ کر مسلمان بھی ہوئے۔ جمال کی اولاد ایک عرصے تک اس مزار کی مجاوری کرتی رہی ...... مسلمان ہونے والے رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے' چند ایک کے ناموں کا سراغ ملتا ہے مثلاً شیخ حاجی عزیز' شیخ داؤد وغیرہ...... امتداد زمانہ کے ساتھ سب نسیاً منسیاً ہو گئے۔ رہے نام اللہ کا۔

سید علی ہجویری کے ورود لاہور سے پہلے جو چراغ رشد و ہدایت یہاں روشن تھا' ان کا اسم گرامی شاہ حسین زنجانیؒ ہے۔ زنجان' اندجان اور سنجان خراسان کے مشہور قصبے ہیں۔ موصوف کا تعلق چونکہ قصبہ زنجان سے تھا لہٰذا زنجانی ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ آپ سید الشہداء امام حسینؓ کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے۔ حسینی خاندان کے چند افراد عراق میں قیام پذیر ہوئے۔ تیسری صدی ہجری میں امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد میں سے ابو جعفرؒ برقعی بغداد سے نقل مکانی کر کے زنجان میں آ بسے۔ موصوف شاہ حسین زنجانیؒ کے دادا تھے۔ 247ھ میں زنجان کے سید علی محمود کے ہاں

Marfat.com

مریم صغریٰ کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا جو راہ حق کا مینارہ نور ثابت ہوا۔ اس کا نام حسین تجویز کیا گیا۔ قصبے کے امام مسجد سے ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا مگر رفتہ رفتہ باطنی اسرار سے واقفیت کی تڑپ نے سپرد اضطراب کیا تو آستانہ ختلیؒ پر حاضر ہوئے اور جنیدیہ سلسلے کے ہو کر رہ گئے۔ یہ سلسلہ حیدر کرارؓ تک جا پہنچتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ راہ سلوک کے مسافر نے احکام شریعت ادا کرنے میں تسہل پسندی سے کام لیا ہوگا۔ حسین زنجانیؒ کا معمول تھا کہ اکثر نماز عشاء اور فجر ایک ہی وضو سے ادا کرتے۔ سجدوں کی لذت کے طفیل مرشد نے میراں کا لقب عطا کیا جو رموز ولایت میں ایک بلند مقام ہے۔

خرقہ ولایت حاصل کرنے کے بعد اندر کی روشنی دوچند ہوئی تو مرشد نے حکم دیا حسین بلاد ہند کی طرف کوچ کر جاؤ اور وہاں کی شب تاریک میں شمع ہدایت روشن کرو۔ تعمیل ارشاد میں حسینؒ واپس زنجان آ گئے اور مختصر سے قافلے کی صورت میں تبلیغی سفر کا آغاز کیا۔ یہ 375ھ کا واقعہ ہے حقیقی برادران یعقوب زنجانیؒ اور موسیٰ بھی شریک سفر تھے۔ یہ قافلہ ایک طویل مسافت طے کر کے قذوین، رے، سبز وار، نیشا پور، ہرات، کاکا خیل، جنجوعہ، مہمند، چھبہ، غزنی، کابل، جلال آباد، پشاور، گکھڑ کے مقامات سے ہوتا ہوا 387ھ میں لاہور پہنچا اور موجودہ شاہ عالم دروازے کے قریب چند روز کے لئے قیام پذیر ہوا۔ حب اختیاری کے گرفتار نے ظلمت شہر کا جائزہ لیا۔ یعقوبؒ کو جنوبی حصہ اور موسیٰ حتی کو دروازے کے گردونواح کا علاقہ عطا کیا اور خود ساحل دریا سے دور مشرقی علاقے میں بسیرا کیا۔ اسی سکونت درویش کی مناسبت سے وہ علاقہ آج ''چاہ میراں'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ جس نے نور ازل سے اپنی نسبت جوڑلی نام اسی کا زندہ رہا، سیم وزر کے پرستار، سگ دنیا کو دنیا والوں نے یکسر نظر انداز کیا اور درویشان بے ریا کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دی۔ پہلا کام جو حسین زنجانیؒ نے سرانجام دیا۔ وہ مقامی زبان سے مکمل آشنائی تھی۔ آپ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ بلند آواز میں چیخنے چنگھاڑنے سے کام نہیں بنے گا کیونکہ قرآنی الفاظ میں گدھے کی بلند آواز کو مکروہ کہا گیا ہے جو اہل دل کے نزدیک حرام کے زمرے میں آتی ہے۔ اوپر والا تو اندھیری رات میں پہاڑ کی چوٹی پر رینگنے والے کیڑے کے قدموں کی آواز بھی بخوبی سن سکتا ہے۔ لہٰذا حسین زنجانیؒ نے دل میں اتر جانے والے مدھم اور خوش گوار لہجے کو اپنایا۔ لاہور کی اکثریت سورج پرست تھی۔ آپ گلی کوچوں میں گھومتے رہتے اور پیغام حق کی دستک ہر مناسب گھر پر جا دیتے۔ بے شک بادی النظر میں یہ

Marfat.com

دیوانگی تھی مگر اہل جنوں ہی تو کارہائے نمایاں سرانجام دیتے آئے ہیں۔ عقل تو لب بام ہی رہ جاتی ہے۔ جیسے دو گھڑی تماشا کرنے والے تماشائی......

حسب توقع سورج دیوتا کے پرستار اٹھ کھڑے ہوئے "یہ دیوانہ تو سنجیدہ ہے۔ ہمارے دیوتا کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے۔" انہوں نے حسب روایت رکاوٹیں کھڑی کیں مگر حسینی لہجہ اتنا مدلل اتنا رسیلا ہوتا تھا کہ مخالفین آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے......بس کچھ نہ بن پڑا تو لونڈوں لپاڑیوں کو پیچھے لگا دیا۔ وہ آوازیں کستے' تالیاں پیٹتے اور سنگ زنی کرتے مگر رفتہ رفتہ پتھر میں جونک لگنے لگی۔ لوگوں کا رویہ ضرور بدلا لیکن تیس برس تک کوئی ایک شخص بھی آپ کی بات نہ سمجھ نہ سکا۔ جب مبلغ کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی تو مرشد نے بذریعہ کشف صرف جمعے والے دن تبلیغ کا حکم دیا۔ یہ سلسلہ مزید اکتالیس برس جاری رہا۔ کچھ لوگ بنیادی اصولوں سے واقف ہو کر مسلمان بھی ہوئے۔

اس ماحول میں تو بس چمتکاروں کا چرچا تھا۔ جادو ٹونے' ٹوٹکے اور دیگر خرافات ایمان وعقیدے میں شامل تھیں۔ ایک جمعے کو آپ حسب معمول دعوت حق دے رہے تھے کہ ایک نحیف و نزار سورج دیوتا کا عاشق چیخنے چلانے لگا "بند کرو یہ جھوٹی باتیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ان میں تاثیر کیوں نہیں؟ عاشق آفتاب نے دلیل پیش کی "میں دو برس سے کسی مرض میں مبتلا ہوں سورج دیوتا کی کرنوں سے مجھے سکون ملتا ہے کیونکہ وہ سچا ہے۔ تم سچے ہو تو میرا روگ دور کر کے دکھاؤ۔"

یہ گویا دعوت مبارزت تھی۔ درویش نے مسکرا کر اسے قریب آنے کا اشارہ کیا اور خلق خدا محو تماشا تھی۔

"میرے محترم بھائی! ہمارے مرشد اول رحمت دو عالم ﷺ کا فرمان ہے کہ خلاف عقل چمتکار کی باتیں ایمان کے زمرے میں نہیں آتیں اور نہ ہی یہ کوئی دلیل ہے۔" حسین زنجانی نے پوری توجہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو اسی دلیل سے قائل ہو سکتا ہوں۔ اس قابل ہو تو قائل کر لو ورنہ خاموش ہو جاؤ۔" مریض نے درشت لہجے میں کہا۔

"اچھا میرے بھائی! اگر ایسا ہی ہے تو ایک گلاس پانی لے آؤ۔" درویش نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان کی خدمت میں پانی پیش کیا گیا۔ درویش نے ایک گھونٹ پیا اور وہی پانی مریض کو پیش کر دیا "صرف ایک گھونٹ تم بھی بھر لو۔" اب درویش کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا "اس انسانی گروہ

Marfat.com

میں اگر کوئی اور مریض بھی موجود ہے تو اسے بھی ایک گھونٹ پلا دو اور میرے رب کی بارگاہ میں سر جھکا دو۔''

پانچ آدمیوں نے اسی گلاس میں سے ایک ایک گھونٹ بھرا۔ پانی جس حلق سے اترا پیکر خاک کے روگ دور کرتا چلا گیا۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات تھی۔ مریض شفایاب ہو چکے تھے۔ درویش کی یہ کرامت جنگل کی آگ بن کر شہر میں پھیل گئی۔ یہ بات ان لوگوں کے مزاج مطابق تھی۔ حسین زنجانیؒ کی صداقت کا چرچا گلی کوچوں میں ہونے لگا۔ وثوق سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے سورج پرست حلقہ بگوش اسلام ہوئے مگر کچھ لوگوں نے اسلام کی حقانیت کو صدق دل سے تسلیم ضرور کیا۔ یہی تو ایمان ہے۔ اس آغاز کے بعد سلسلہ چل نکلا۔

431ھ میں جس روز آپ کا وصال ہوا وہی حضرت علی ہجویریؒ کے لاہور میں وارد ہونے کا دن ہے۔ سورج ایک سمت غروب ہوتا ہے تو دوسری سمت میں طلوع ہو جاتا ہے بس کچھ ایسا ہی ہوا۔ یہ گیارہ شعبان کا دن تھا۔ صرف چند روز پیشتر طبیعت ناساز ہوئی تو ایک عقیدت مند رام چندر نے عرض کی ''حضور! میری خواہش ہے کہ آپ اب میرے غریب خانے کو رونق بخشیں۔''

''مگر عزیزم! ہمارا تو اب چل چلاؤ ہے۔'' حسین زنجانی نے مسکرا کر کہا ''محبوب سے وصال کا وقت قریب ہے۔''

''میری تمنا ہے کہ آپ کے سفر آخرت کا آغاز میرے غریب خانے سے ہو۔'' رام چندر نے بصد انکسار دلیل پیش کی۔ درویش نے اپنے عقیدت مند کی دل شکنی ناپسند فرمائی اور چپ چاپ موجودہ یکی دروازے کی اندرونی آبادی میں آ گئے (اس مکان کی نشان دہی کوشش کے باوجود نہیں ہو سکی) چنانچہ میراں حسین زنجانیؒ کا جنازہ اسی عقیدت مند رام چندر کے گھر سے اٹھا۔ یہ معاملات دل ہیں' انہیں دلائل خنجر سے مجروح نہیں کیا جاتا۔ بس ایسا ہی ہوا تھا۔ کیوں اور کیسے اس کا جواب کون دے؟ چوک نیلم سینما' چاہ میراں روڈ پر مشرق کی جانب جاتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی سڑک (دائیں جانب) سبز گنبد والے مزار کی جانب جاتی ہے۔ یہی زنجان میں پیدا ہونے والے حسینؒ کی آرام گاہ ہے۔

دوسری قابل ذکر ہستی جو سید علی ہجویریؒ سے پہلے لاہور میں موجود تھی اس کا نام اسمٰعیل شاہؒ بخاری ہے۔ مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔ یہ مبلغ دین محمود غزنوی کے عہد حکومت میں لاہور

Marfat.com

تشریف فرما ہوئے۔ وہ ہستی جس کی خوش کلامی و خوش خصالی کا خطہ لاہور میں 412ھ تک چرچا رہا ۔گلی گلی دھوم مچی رہی۔ وہ قلم کاروں کی تسہل پسندی کا شکار ہیں۔ حالات زندگی بے خبری کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اسے مصلحت ربی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ جب محمود غزنوی نے لاہور کو اپنی قلم رو میں شامل کیا تو صدائے حق کے علمبردار بھی اس کے ہمراہ تھے۔ شاہ اسمٰعیل بخاریؒ بھی اس گروہ میں شامل تھے۔ شہنشاہ نے اپنا فرض ادا کیا اور درویش بے ریا نے اپنا۔ درویش کار خیر میں مسلسل 36 برس مصروف رہے۔ گفتگو میں اتنی تاثیر تھی کہ ہر وعظ میں سینکڑوں لوگ گمراہی ترک کر کے ان کے دست حق پرست پر بیعت کرتے۔ لاکھوں احادیث زبانی یاد تھیں۔ قرآنی ذوق کا یہ عالم کہ منصۂ شہود پر آنے والی ہر تفسیر از بر تھی۔ حوالہ دیتے وقت صفحہ سطر تک کی نشان دہی فرما دیتے۔ ایک شمشیر براں تھی جو ردائے تاریکی کو لیر لیر کئے دیتی۔ کنہیا لال سے نور احمد چشتی تک تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شاہ اسمٰعیل بخاریؒ کا انداز بیان لاثانی و بے مثال تھا۔ مہتاب'' کے لفظ سے شاہ صاحبؒ کی تاریخ وفات (448ھ) نکلتی ہے۔ اس زمانے میں مغلیہ شان و شوکت کی عکاسی کرنے والی عمارات تعمیر کرنے کا رواج نہیں تھا لہٰذا مزار کی تعمیر سادہ انداز میں ہوئی۔ مزار پر گنبد تک نہیں تھا۔ البتہ ایک سرسبز و شاداب باغ جس کے گردو پیش وسیع و عریض اراضی تھی' مزار کے لئے وقف تھا۔ اس زمین کی حدود موجودہ مال روڈ کیتھڈرل سکول سے رومن کیتھولک گرجا گھر کے وسیع احاطے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ای پلومر اسٹور سے مزنگ جانے والی سڑک آخری حد تھی۔ مشرقی جانب حدود مزار' پانی والی پرانی کوٹھیوں تک پھیلی ہوئی تھیں جن کا آج نام و نشان تک نہیں ملتا۔ رفتہ رفتہ یہ ساری اراضی مزار کے متولی و مجاور بیچ کر ہڑپ کر گئے۔ علم دین کا سمندر درس و تدریس کے مینار نور اور محرم راز دروں کے مزار کی آج یہ کیفیت ہے کہ اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ بہرکیف' مال روڈ کی طرف جاتے ہوئے سکول کی عمارت کے ساتھ سڑک کے سیدھے ہاتھ' چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد پختہ اینٹوں کا مزار آتا ہے۔ یہ مزار گوشہ گمنامی میں نگاہوں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ہزاروں مسلمان پاگلوں کی طرح بھاگ دوڑ میں مصروف تربت درویش کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور سرزمین لاہور میں شجر صداقت کی آب یاری کرنے والے اس مبلغ کے حق میں دعائے خیر تک نہیں کرتے۔ مزار کے سرہانے چراغ دان ضرور موجود ہے مگر کوئی چراغ نہیں جلتا۔ شاید زمانے نے اس عظیم ہستی کو تہی دست اور مفلس سمجھ رکھا ہے یہی ایک جواز ہو سکتا ہے کیونکہ

Marfat.com

زمانہ لاکھ مروت سے کام لے پھر بھی
چراغ گور غریباں جلے جلے نہ جلے

لاہور کے پہلے مسلمان حکمران غلام ایاز کے بسائے ہوئے شہر لاہور کے یکی دروازے سے میراں حسین زنجانیؒ کا جنازہ آ رہا تھا اور سید علی ہجویریؒ کے سینے میں طوفان بپا تھا۔ مرشد کے حکم کی وضاحت ہو چکی تھی۔ خطہ لاہور کو مسلسل روشنی کی ضرورت تھی اور علی ہجویری وہ آفتاب تھا جو 11 شعبان 431ھ والے دن اس خطہ تاریک پر طلوع ہو رہا تھا۔

آفتاب سلوک نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا' احمد حمادی اور ابو سعید لپک کر شریک جنازہ ہوئے۔ درویش کا عقیدت مند سوختہ ساماں رام چندر جنازے کے پیچھے سرنگوں جا رہا تھا۔ آنکھ کے دریچوں سے گویا جان رس رس کر خارج ہو رہی تھی۔ سیدؒ نے بڑی رسان سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رام چندر نے اشک بار آنکھوں سے غم گسار کو دیکھا اور سیلاب کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''عزیزم! حوصلے سے کام لو۔ جو آیا ہے اسے آخر جانا ہے۔'' سید علی ہجویریؒ نے مرہم تسلی سے نوازا۔

''جناب مجھ پر جو بیت رہی ہے آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں تو لٹ گیا برباد ہو گیا۔'' رام چندر نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

سیدؒ نے نگہ التفات۔ سے نوازنے کے بعد صرف اس قدر کہا ''صبر کا دامن تھام لو گے تو لٹی ہوئی دولت مل جائے گی۔'' شاید طلسمی الفاظ تھے کہ اس سوختہ ساماں کو جیسے قرار سا آ گیا۔

''آپ کی اچھیا کا پالن کرنا ہی پڑے گا۔'' رام چندر نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ سیدؒ نے آداب جنازہ کے مطابق میت کو کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد کاندھا دیا۔ سرہانے۔ سے پائنی کی جانب آئے۔ بار ولایت برداشت کرنے کے بعد بستی کی جانب دیکھا اور زیر لب کہا ''ردائے لاہور تو جگہ جگہ سے تار تار ہے۔ رفو کا اتنا زیادہ کام؟'' واقعی جن کے مرتبے بلند ہوں ان کی آزمائشیں بھی سوا ہوتی ہیں۔'' حفظ مراتب'' کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔

سلطنت اسلامیہ انتشار کا شکار ہوئی تو آل سادات کے افراد دنیاوی حکمران کے شر سے بچنے کی خاطر دوسرے ممالک کی طرف ہجرت کر گئے۔ سادات عظام میں سے ایک گھرانہ غزنی آ بسا۔ دنیاوی جاہ وحشم سے محرومی کے باوجود سادات کا یہ گھرانہ علم وفضل کی دولت سے مالا

Marfat.com

مال تھا چنانچہ یہ خاندان غزنی میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سید عثمانؒ غزنی' کے ایک محلے جلاب کا وسنیک تھا جو قریبی محلے ہجویر کی ایک پابند صوم وصلوٰۃ خاتون سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا۔ سید عثمان کے ہاں اسی سیدزادی کے بطن سے 400ھ کے لگ بھگ ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام علی تجویز کیا گیا۔ گویا اس بچے کا تعلق جلاب اور ہجویر دونوں محلوں سے تھا۔ سید عثمان کا لخت جگر نور ہدایت کا سرچشمہ اور تاریکی ہند کے لئے آفتاب عالم تاب ثابت ہوا اور علی ہجویری جلابیؒ کے نام سے برصغیر میں مشہور ہوا۔ خلق خدا نے اسے داتا گنج بخش کہا۔

اس ولی وقت کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے امام حسنؓ سے جا ملتا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ بن عثمان بن علی بن عبدالرحمان' بن شاہ شجاع بن ابوالحسن بن حسن اصغر بن سید زید بن حضرت امام حسنؓ بن علی المرتضیٰؓ۔

حسب دستور بچے کو چار برس کی عمر میں حروف شناسی کے بعد تعلیم قرآن سے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ اہل خاندان کو یوں محسوس ہوا جیسے تشنہ لب کے ہونٹوں سے جام شیریں لگا دیا جائے۔ جیسے مچھلی کو ذخیرہ آب فراہم کر دیا جائے۔ جس کام میں دل کی رغبت اور روح کا میلان دونوں شامل ہو جائیں تو اس کی ہر دشواری دور ہو جاتی ہے۔ شدت طلب ایسے ہی رنگ دکھایا کرتی ہے۔ قرآنی تعلیم پایہ تکمیل تک پہنچی تو زبانوں پر عبور حاصل کرنے کا مسئلہ درپیش آیا۔ عربی' فارسی' کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کی گئی۔ پھر فقہ اور تفسیر کی باری آئی۔ علم کلام اور منطق کے بعد فلسفے کو زیر کیا گیا۔ یہ ایک لحاظ سے عمر عزیز میں آنے والی مہمات کو سر کرنے کی تربیت تھی۔ علوم کے سمندر میں غوطہ زن ہونا ضروری تھا تا کہ اس کا استعمال برمحل اور بروقت ہو سکے۔ دوسروں کی جہالت کے خلاف صرف اسی صورت میں برسرپیکار ہوا جا سکتا ہے جب اپنے اندر کا ہر گوشہ منور ہو۔ علوم ظاہری کی تکمیل نابغہ روزگار قسم کے اساتذہ نے کی۔ شیخ ابوالعباس احمد بن محمد اشقانی' شیخ ابوالقاسم گرگانی' احمد بن محمد قصاب' ابوعبداللہ محمد بن علی' جو تستانی کے نام سے مشہور ہیں۔ ابوسعید فضل اللہ بن محمد' مظفر بن احمد بن حمدان جو آسمان فلسفہ کے آفتاب عالمتاب تھے۔ ان کے علاوہ سید موصوف نے شیخ ابوالقاسم عبدالکریمؒ بن ہوازن القشیری کے آگے بھی زانوئے تلمذتہ کیا۔ ہر استاد نے کاتب تقدیر کی رضاجوئی کے لئے صدق دل سے شاگرد رشید کو علوم وفنون سے آراستہ پیراستہ کیا۔

Marfat.com

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد سید علی ہجویریؒ عہد اضطراب میں داخل ہوئے۔ کسی دست حق پرست کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے۔ شاہین اگر ابر پاروں کے اوپر محو پرواز ہو تو اسے زیر دام لانے کے لئے کسی ماہر صیاد کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور بلند پروازی میں سید موصوفؒ کے مقابل کوئی نہ تھا لہٰذا صیاد بھی کوئی بلند مرتبت ہونا چاہیے تھا۔ ملک شام کی سمت سے خوشگوار ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ اس طرح آپ نے شام کا سفر اختیار کیا جہاں سلسلہ جنیدیہ کے پیشوائے طریقت ابوالفضل محمد بن حسن بن ختلیؒ آپ کے منتظر تھے۔

محمد بن حسن ختلیؒ ؟ صاحب جاہ و جلال قسم کے درویش تھے۔ بحیثیت مجموعی شان جلالی مزاج پر غالب تھی۔ رسوم و قیود میں جکڑے ہوئے صوفیاء کو درشتی سے دھتکار دیتے تھے۔ بقول سید علی ہجویریؒ ان جیسی باہیبت شخصیت اس عہد میں کوئی اور نہ تھی ''دنیا کو دھتکارا جائے تو یہ سائے کی طرح پیچھا کرتی ہے'' کے مصداق ختلیؒ گوشہ تنہائی کی تلاش میں پہاڑوں کی جانب نکل جاتے مگر لوگ پھر بھی پیچھا نہ چھوڑتے۔ دلائل ولایت سے مسلح یہ درویش عموماً جبل لکام میں قیام پذیر ہوئے۔ یہ سلسلہ کوہ لبنان کا وہ حصہ ہے جو انطاکیہ کے قریب ہے۔ گوشہ نشینی کی تلاش والا سلسلہ ساٹھ برس پر محیط ہے۔ اس طویل جدو جہد کے بعد خلق خدا کے ذہنوں سے اپنا نام محو کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اہل نظر کے ہاں ان کی قدر و منزلت دگنی ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ سید علی ہجویریؒ نے غزنی سے شام تک کا سفر طے کیا۔ دکانیں تو ہر شہر کے کوچہ و بازار میں کھلی تھیں مگر جوہری کو کانچ کے ٹکڑے نہیں ہیروں کی تلاش تھی۔

سلسلہ جنیدیہ کے بزرگان حضرت بایزید بسطامیؒ اور ان کی اتباع کرنے والے مشائخ کے برعکس صحو (ہوش مندی) کو سکر (عالم مدہوشی) پر فوقیت دیتے تھے۔ بقول سید علی ہجویریؒ سکر بازیچہ اطفال کے مانند ہوتا ہے اور صحو مردان حق کا میدان فنا۔ شیخ ختلیؒ صحو کے مرد میدان تھے جو ان کے وسیع ظرف کی دلیل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سید موصوفؒ نے اس سلسلے کو پسند فرمایا۔ سلسلہ جنیدیہ میں شمولیت کی ایک اور بھی وجہ سمجھ میں آتی ہے یعنی یہ سلسلہ حضرت علیؓ تک جا پہنچتا ہے جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

محمد بن حسن ختلیؒ مرید شیخ ابوالحسن حصریؒ، حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت سری سقطیؒ، حضرت معروف کرخیؒ، حضرت داؤد طائیؒ، حضرت حبیب عجمیؒ، خواجہ حسن بصریؒ اور علی المرتضیٰؓ

Marfat.com

سید علی ہجویریؒ کی باطنی تربیت کا آغاز ہوا تو مرشد نے پہلا سبق دیا ''عزیزم! رزق کا استعمال دو وجوہات کی بنا پر جائز ہے۔ سلسلہ تارنفس بحال رکھنے اور یاد خدا کے لئے توانائی حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں۔ ہر فالتو لقمہ ہمارے مسلک میں حرام گردانا جاتا ہے زیادہ سونے سے پرہیز لازم ہے کہ یہ غفلت کی نشانی ہے۔ غفلت بھی ہمارے مسلک میں کبیرہ گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔ گناہ وثواب کا معیار عوام وخواص کے لئے مختلف ہوتا ہے۔ ایک عام فرد بشر جب تک گناہ کا ارتکاب نہ کرلے اس کا نامہ اعمال صاف رہتا ہے جب کہ نیک اعمال کی نیت کر لینے سے نامہ اعمال میں صفات کا اندراج شروع ہو جاتا ہے۔ خواص کے لئے یہ دستور نہیں ۔اس میدان میں مکروہات میں ملوث ہونا تو دور کی بات تسہل پسندی اور غفلت ہی سالک کو لے ڈوبتی ہے۔ تیسری شے گفتگو سے حتیٰ الامکان گریز۔ اس لئے کہ ''لو کلام الفضه الکسوت الذهب' 'اگر کلام چاندی ہے تو خاموشی اختیار کرلی جائے۔'' یہ کہہ کر مرشد نے مرید باصفا کی جانب بغور دیکھا اور کہا ''میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ تمہیں گفتگو کی اشد ضرورت پیش آئے گی۔''

اس درس کا متن مختصر الفاظ میں صرف یہ تھا کہ کم کھانا' کم سونا' گفتگو سے پرہیز...... جس تربیت کا آغاز اس انداز کا ہو اس کی انتہا کیا ہوگی' اس کا اندازہ صرف اہل دل ہی لگا سکتے ہیں۔ راہ سلوک کی منازل طے ہونے لگیں۔ ایک روز جب آپ کنج تنہائی میں محو مراقبہ تھے تو خیالات منتشر ہونے لگے' یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ آپ کو اس سے پہلے کبھی اس دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ ابلیس لعین کا پوشیدہ وار تھا۔ اتنے میں ایک نورانی صورت بزرگ اس ویرانے میں آتے دکھائی دیے۔ یہ چونکہ خلاف معمول بات تھی لہٰذا آپ بڑے حیران ہوئے۔

''علی' حیران ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم کچھ لینے نہیں دینے آئے ہیں۔'' بزرگ کے انداز تخاطب سے آپ اور بھی حیران ہوئے۔

''آپ کا تعارف ہو جاتا تو بندہ ناچیز کی الجھن دور ہو جاتی۔'' سید موصوفؒ نے بصد احترام کہا۔

یہ خضرؑ سے پہلی ملاقات تھی جو آخری ہرگز نہ رہی۔ خضرؑ نے رضائے الٰہی کے عین مطابق علوم باطنی تفویض کئے۔ سید موصوف کا انتشار ختم ہوگیا اور برسوں مہینوں کا سفر دنوں میں طے ہونے لگا۔ ملک شام ہی میں آپ کے ساتھ ایک بڑا خوش گوار واقعہ پیش آیا جو مراتبت کی بلندی کا پیش خیمہ تھا۔

Marfat.com

آپ رئیس العاشقین بلالؓ کے روضہ اطہر پر مصروف دعا تھے کہ اونگھنے لگے۔اس طرح تربت کے سرہانے سو گئے۔عالم خواب کا منظر اتنا خوشگوار تھا کہ آپ کا انگ انگ کیف وانبساط میں ڈوب گیا۔مکہ معظمہ کا ماحول تھا۔سید موصوفؒ مطاف میں حاضر تھے کہ رحمت دو عالم ﷺ باب شیبہ کی جانب سے تشریف لائے۔ایک عمر رسیدہ شخص ان کی بغل میں تھا۔یہ اندازہ بالکل ایسا تھا جیسے کوئی شفقت سے مجبور لاڈلے بچے کو بغل میں لیتا ہے۔علی ہجویریؒ نے لپک کر پائے رسول ﷺ کو بوسہ دیا اور ساتھ سوالیہ نگاہوں سے چہرہ پر انور کی جانب دیکھا۔حضور ﷺ امتی کا مفہوم پا گئے اور فرمایا ''یہ عمر رسیدہ شخص تمہارا امام یعنی امام ابو حنیفہؒ ہے۔''

خواب سے بیدار ہوئے تو مزار بلالؓ کا ماحول معطر پایا۔اس خواب سے علی ہجویریؒ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مقام ابو حنیفہؒ کی عظمت کو دوام حاصل ہے اور یہ اوصاف شرع کے قائم کرنے والے یعنی حضور پرنور ﷺ کے طفیل ہے۔چنانچہ آپ حنفی مسلک پر نہ صرف قائم رہے بلکہ اس کے پرجوش مبلغ بھی تھے۔آپ نے ایک نہایت لطیف نکتے کی بات کہی۔امام ابو حنیفہؒ کو جب سید موصوفؒ نے عالم رویا میں دیکھا تو وہ اپنے قدموں سے نہیں چل رہے بلکہ ان کے حامل اور رہبر خود حضور ﷺ تھے یعنی امام موصوف ''باقی الصفت'' نہیں تھے ورنہ اپنے چلنے والی صفت کا مظاہرہ ضرور کرتے (باقی الصفت'' اجتہادی امور میں مخطی ہوسکتا ہے یا مصیب۔چونکہ انہیں اٹھا کر چلنے والے خود حضور پرنور ﷺ تھے لہٰذا امام موصوفؒ اپنی صفات سے فانی اور صفات رسول ﷺ کے حوالے سے باقی ہوئے۔لہٰذا ان سے خطا کا صدور ممکن نہیں۔)

ہر پل، ہر گھڑی عشق الٰہی میں غرق رہتے' اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے' رَوٹ رَوٹ اسے یادوں میں بسانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نوعمری میں ہی مقام ولایت پر فائز ہوگئے اور مرشد نے خلافت عطا فرما کر خدمت دین کا حکم دیا۔اس طرح دور سیاحت کا آغاز ہوا۔اس سیاحت کے دوران مختلف مشائخ سے ملاقات ہوئی اور روحانی تقویت نصیب ہوتی رہی۔ایران' عراق' شام' ترکی' عرب' ماور النہر' آذربائیجان' خراسان' طبرستان' قہستان' کرمان اور خوزستان کے وسیع وعریض علاقوں میں گھومتے رہے۔اس سفر کی تفصیل رقم کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں۔دورہ لاہور سے پہلے پیش آنے والے دو ایک واقعات کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اہل دل حضرات سیم وزر کو پائے حقارت سے ٹھکراتے رہے ہیں۔یہی رویہ سید علی ہجویریؒ کا تھا۔قیام شام کے دوران میں کسی ضرورت مند نے دست سوال دراز کیا تو آپ نے

Marfat.com

اس کی حاجت خندہ پیشانی سے پوری کردی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر پیشہ ور گداگروں کے کانوں میں اس کی بھنک پڑی تو وہ مکھیوں کی طرح آپ کے گرد بھنبھنانے لگے۔ جو کچھ آپ کی ملکیت میں تھا سب کچھ حاجت روائی میں صرف ہو گیا۔ سائل کو خالی ہاتھ لوٹانا آپ کے بس میں نہ تھا۔ معاملہ اس حد تک جا پہنچا کہ قرض لے لے کر سائلوں کو عطا کرتے رہے۔ یہ شیطانی ہتھکنڈا تھا جس سے ابلیس لعین خیالات میں انتشار پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے وسائل کو نظر انداز کر کے خرچ کیا جائے تو مسائل پیدا ہوتے ہیں اور مقروض انسان یکسوئی سے نہ عبادت کر سکتا ہے نہ کچھ سوچ سکتا ہے۔ قرض خواہوں کے تقاضوں سے طبیعت بڑی مکدر ہوئی مگر کشادہ دستی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ بعض اوقات ایک عام سا آدمی بھی بڑی خاص بات کر جاتا ہے۔ اگر کوئی غیر معمولی بات' معمولی انسان کے منہ سے نکلے تو بات کی افادیت میں کمی واقع نہیں ہو جاتی۔ معمولی غوطہ خور سمندر کی تہہ سے قیمتی موتی نکال لائے تو وہ بہر حال موتی ہی رہتا ہے اور یہاں تو معاملہ ولی وقت کا تھا۔ اولیاء کی پریشانیاں دور کرنے کے لئے خالق کائنات نے جو بشری وسیلہ بنا رکھا ہے اسے 'صیر فی'' کہتے ہیں۔ اناۓ دوست کے مدنظر ایک 'صیر فی'' نے آپ سے ملاقات کی۔

''محترم کیا پریشانی ہے؟'' اس شخص نے دریافت کیا۔

''سائلوں کی حاجت روائی کرتے کرتے مقروض ہو چکا ہوں۔ عبادت میں لذت نہیں رہی''۔ سیدؒ نے اظہار تفکر کیا۔

''خیر الامور اوسطہا۔ بہترین امور میانہ روی کے ہوتے ہیں۔'' اس ہمدرد نے نکتے کی بات بیان کی۔

''مگر مجھ سے کسی کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔'' سیدؒ نے دل کی بات کہہ دی۔

''اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ آپ کوشش کر کے میانہ روی اختیار فرمائیں۔'' اس ہمدرد کی بات آپ نے پلے باندھ لی۔ سوائے عشق الٰہی کے ہر معاملے میں عمر بھر میانہ روی اختیار کئے رکھی۔

غزنی میں ایک چرب زبان ہندو فلسفی سے ٹکراؤ کا واقعہ پیش آیا جب عمر عزیز صرف اکیس برس تھی یعنی 421ھ میں۔ عہد محمود غزنی کے آخری ایام تھے۔ شنکر اچاریہ کی تعلیمات کے طفیل ہندومت کا احیاء ہو چکا تھا۔ ہندو برہمن سوائے اپنے کسی کی علمی فضیلت کا اعتراف کرنا مہا پاپ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی ملک تھا تو صرف ہند اور کسی کے پاس علم تھا تو بس ہندو

Marfat.com

فلسفی۔ان کے اذہان میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ ہندو برہمنوں کے علاوہ کوئی اور بھی ودیا ساگر (علم کا ساگر) ہوسکتا ہے اور اگر کوئی علمی موشگافی کر بیٹھتا ہے تو وہ بے ساختہ سوال کرنے کے عادی تھے کہ اتنی گہری بات آپ نے کس ہندو گرو سے سیکھی؟ یہ مناظرہ یا علمی مباحثہ سلطان محمود غزنوی کی موجودگی میں ہوا۔محمود غزنوی چونکہ سترہ بار ہندوانا کو چور چور کر چکا تھا' لہٰذا ان کے فلسفی اور دانش ور حملہ آور کے اس اقدام کو علمی میدان میں چیلنج کیا کرتے تھے۔مسئلہ جہاد زیر بحث تھا۔

''جس دین میں قتل جز و ایمان ہو وہ دین انسانیت کی فلاح کا مدعی کیسے ہوسکتا ہے؟'' ہندو فلسفی نے سوال کیا۔

''جس طرح تخریب کا رمز دور تعمیر کا معمار ہوتا ہے۔'' سید علی ہجویریؒ نے مختصراً مگر مدلل جواب دیا۔

''آپ کے پاس (بزعم خویش) اچھی چیز ہے وہ دوسروں پر زبردستی کیوں تھوپتے ہیں؟ بزور بازو تبلیغ دین دھرم کی خامیوں پر دلالت کرتی ہے۔'' بظاہر ہندو فلسفی کی بات صداقت پر مبنی دکھائی دیتی تھی۔

ہم دین کے معاملے میں زبردستی کے ہرگز قائل نہیں۔یہی ہمارے مرشد اول ﷺ کا فرمان ہے اور یہی خدائی حکم۔''

سیدؒ نے قرآنی آیت کی تشریح پیش کی تو ہندو فلسفی زیر لب مسکرانے لگا۔یہ وہی مسکراہٹ تھی جو پنچھی کو زیر دام آتے دیکھ کر صیاد کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگتی ہے

طلوع اسلام کے وقت سے آپ کے تین مطالبے چلے آ رہے ہیں۔'' فلسفی نے وضاحت کی۔''اور یہ مطالبے ہر جنگ سے پیشتر آپ کے اسلاف دہرایا کرتے تھے۔اول ہمارا دین قبول کرو۔دوئم جزیہ ادا کرو۔سوئم ورنہ جنگ کے تیار ہو جاؤ۔یہ زبردستی نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا اسی کا نام جہاد ہے؟''

فلسفی کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ حاضرین دنگ رہ گئے۔محمود غزنوی نے بھی بے چینی سے پہلو بدلا۔اس کا اپنا کردار ہدف بن رہا تھا اور بادی النظر میں بات سچ دکھائی دے رہی تھی مگر علی ہجویریؒ نے ایسا جواب دیا جو تا قیامت چرب زبانوں کا منہ بند کرنے کو کافی تھا' اور رہے گا۔

''ہر سچائی جو دل کی گہرائیوں میں بسیرا کر لے اظہار کا تقاضا کرتی ہے۔'' سید نے

Marfat.com

بڑے دھیمے لہجے میں آغاز کیا۔ ''انسان کی سب سے بڑی عدالت اس کے اپنے اندر کی عدالت ہوتی ہے۔ اگر انسان اپنی سچائی کا اظہار نہیں کرتا تو اندر کی عدالت اسے منافق قرار دے دیتی ہے یا تو وہ اس سچائی سے تائب ہو جائے یا پھر اسے دلائل سے منوائے۔''

''اور شمشیر آپ کے ہاں بڑی موثر دلیل ہے۔'' فلسفی نے مداخلت کی۔

''موثر نہیں' سب سے آخری۔ وہ اس لئے کہ پورے جسم میں ناسور پھیلنے سے پیکر خاک کا چھوٹا حصہ کاٹ دینا ہی مناسب ترین فیصلہ ہوا کرتا ہے۔ اگر حریف تلوار سونت کر میدان میں اتر آتا ہے تو اسے دلائل سے قائل نہیں کیا جا سکتا' گھائل کرنے کے بعد سینے سے ضرور لگایا جا سکتا ہے۔'' اب سید علی ہجویریؒ کا لہجہ بلند ہوتا جا رہا تھا ''ایک نادان بچہ رنگین شعلوں کی طرف لپکے تو اسے روکنے کیلئے سختی بھی کی جا سکتی ہے۔ ہمارے اسلاف دعوت حق اس لئے دیا کرتے تھے کہ حریف کو سینے سے لگا سکیں اور تاریخ شاہد ہے کہ دعوت قبول کرنے والے کا' ایک پل میں دعوت دینے والے سے مضبوط ترین رشتہ استوار ہو جایا کرتا تھا' ایک رشتہ جو اپنی ذات پر دوسرے کو ترجیح دینے کا سبق دیتا تھا اور اس کا زبانی نہیں عملی اظہار چاہتا تھا۔ اگر کوئی گروہ یا شخص اس دعوت کو جو دلیل اول ہوا کرتی تھی' رد کر دیتا تو اس کو نفسیاتی سزا دی جاتی۔ حکومت کا حق اس سے چھین لیا جاتا کیونکہ حکومت کا حق صرف انسانوں کو ہے۔ جو شخص چمکنے والے سورج کا انکار کر دے وہ حیوانی سطح پر گر جاتا ہے۔ بہت سی بھیڑیں جب اندھے کنوئیں میں گرنے لگیں تو چند ایک کو لاٹھی سے مار کر بھگا دینا عین دانش مندی ہے۔ سارے ریوڑ کی فلاح کے پیش نظر چند کو ہلاک بھی کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

''جزیہ دیتے وقت انسان کو ہر پل نچلی سطح پر گرنے کا احساس ہوتا رہے گا اور یہی احساس اسے سوچنے پر مجبور کرے گا اور یہی سوچ اسے راہ راست پر لے آئے گی۔ اگر وہ عمر بھر گمراہی میں مگن رہنے کا فیصلہ کر لے تو بھی خسارے والا سودا نہیں ہوگا۔ اس لئے گمراہی اس فرد یا چند افراد تک محدود رہے گی۔ اقتدار پر ایک گمراہ شخص فائز ہو جاتا ہے تو اپنی گمراہی کو پھیلانے کی صلاحیت کا مالک بن جاتا۔ وہ مجسم برائی کے سرچشمے کا روپ دھار لیتا ہے۔ عقل کا یہی تقاضا ہے کہ اسے قلع قمع کر دیا جائے۔ کسی شخص کو برائی پھیلانے کا کوئی حق نہیں خواہ وہ بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ یعنی برائی کو اصالتاً پھیلائے یا وکالتاً۔ ایک شخص آپ کے سینے سے لگنے کے لئے تیار نہیں' برائی پھیلانے کا حق طلب کرتا ہے' آپ کے نزدیک اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے؟'' علی

Marfat.com

ہجویریؒ نے یہ سوال کیا تو فلسفی تذبذب کا شکار ہوا۔

''آپ اس پل میری دعوت کو قبول کر لیں صدق دل سے آپ کو عمر بھر کے لئے سینے سے لگانے کو تیار ہوں۔''

درویش حقؒ نے پیش رفت جاری رکھی'' گلے ملنے کے بعد کسی کو گزند پہنچانا ہمارے لئے حرام اور ایک دوسرے کی صدق دل سے معاونت ہم پر فرض ہو جائے گی۔ کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں؟'' سید علی ہجویریؒ کے اس سوال پر فلسفی بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ہر مقام و مرتبے کا برہمن' مسلمان کو اچھوت سمجھتا تھا۔

''محترم! اسی غیر فطری رویے کو ہم انسانی سطح سے گرنے کا نام دیتے ہیں۔'' درویش نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا'' ہماری دعوت قبول کر کے ہمارے سینے سے لگ جائیں یا جزیہ ادا کر کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں۔ برائی پھیلانے کا حق طلب نہ کریں۔ ہمارے خلوص کا تو یہ بھی تقاضا ہے کہ اگر آپ خود کو گزند پہنچانے کی کوشش کریں تو ہم اس میں بھی مزاحمت کریں کیونکہ ہم کو خبر ہے کہ آپ بے خبر ہیں۔''

واضح ہو کہ اس مباحثے کے وقت سید علی ہجویریؒ کی عمر صرف اکیس برس تھی۔ اکتیس برس کی عمر میں جب آپ لاہور تشریف لائے تو آپ نے پیغام محبت سے خلق خدا کی تسخیر کی۔ فلسفی نے جہاد پر نکتہ چینی کی تھی۔ لہٰذا جز وایمان کا دفاع ضروری تھا۔ درویش اس حدیث سے بھی واقف تھا کہ جس دل میں جہاد کی تڑپ نہ ہو وہ ایمان سے خالی ہوتا ہے۔ اسی عقیدے کو تو غیر مسلم' سینہ مسلم سے خارج کر دینے کی سعی لاحاصل میں مبتلا رہے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ سچائی اور حقیقت مطلقہ کیا ہے؟ تو اس کو فلسفیانہ موشگافیوں سے الجھایا ضرور جا سکتا ہے۔ کامل یقین کا تقاضا یہی ہے کہ جس حقیقت پر ایمان ہو اس کی تشہیر کی جائے اور یہی سید علی ہجویریؒ کا عمر بھر رویہ رہا۔ اگر کوئی شخص ایک حقیقت کو تسلیم بھی کرتا ہے اور اسے دوسروں تک نہیں پہنچاتا تا کہ دوسرے بھی اس سے استفادہ کر کے اپنی عاقبت سنوار لیں تو وہ نہ صرف منافق بلکہ انسانیت دشمن بھی ہے۔ جب اس ہندو فلسفی سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ اپنے آبائی مزاج پر اتر آیا۔

''اگر آپ سچے ہیں تو کوئی کرامت دکھائیں۔ کوئی مافوق الفطرت عمل پیش کریں''، فلسفی نے کہا'' یا میں آپ کو چمتکار دکھاتا ہوں''

ہندو جوگی سنیاسی اس علم میں مہارت تامہ کے مالک تھے اور انہی شعبدوں کے طفیل خلق

Marfat.com

خدا کا ناطقہ بند کئے ہوئے تھے۔ سید موصوفؒ کے مسلک کے مطابق شعبدہ بازی شعائر ایمان میں جائز نہیں تھی۔

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' سید صاحبؒ نے سنجیدگی سے پوچھا ''کیا میں آپ کو پرندوں کی طرح ہوا میں اڑا کر دکھاؤں؟ سیم و زر کے پہاڑ پیش کروں؟ آپ کی ہتھیلی پر چمکتا ہوا سورج رکھ دوں؟'' اب آپ کا لہجہ شمشیر براں جیسا تھا۔ ''ایسی دلیل طلب فرما رہے ہیں جو کوئی دلیل ہی نہیں۔''

''ہمارے ہاں سچائی کا یہی معیار ہے۔'' فلسفی نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

''اگر آپ کو یہی پسند ہے تو بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں؟'' درویش نے پر جلال انداز میں کہا۔ تماشائی مہر بہ لب کسی انہونی کے منتظر تھے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جو اس نوعمر مبلغ کی شکست صاف دیکھ رہے تھے جو بہت بڑا دعویٰ کر رہا تھا۔ ہر فصیل جاں میں دل دھڑک رہا تھا اور ہر چشم تماشا محو انتظار تھی۔

''میں آپ کی ہتھیلی پر ''لدارس'' دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی پل۔'' ہندو چمتکار نے عجیب و غریب مطالبہ پیش کیا۔ ''لدارس'' نیپال میں پائے جانے والے منفرد نوعیت کے حامل شجر کا پھل ہوتا ہے جو نہایت قلیل مقدار میں شجر پر لگتا ہے۔ اس کا دانہ رنگین چمکتے موتی کی طرح ہوتا ہے ہندو عقیدے کے مطابق جس کی ملکیت میں لدارس ہو اس پر دولت کی لکشمی دیوی کی خاص نظر کرم ہوتی ہے۔ یہ پھل صرف چند روز کے لئے مخصوص موسم میں لگتا ہے۔

''یہ نہایت واہیات مطالبہ ہے۔'' محمود غزنوی مداخلت کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جو شمشیر کی دلیل مانتا اور گردانتا تھا ایک مبلغ کی متوقع شکست کیسے برداشت کر سکتا تھا!

''سلطان معظم' آپ مداخلت سے گریز کریں۔'' منصف نے محمود غزنوی کو ٹوکا ''نوجوان مبلغ دین چیلنج قبول کر چکا ہے اسے ''لدارس'' ہتھیلی پر دکھانا ہوگا ورنہ اسے کی شکست کا اعلان کر دیا جائے گا۔'' منصف نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

پھر وہ ہوا کہ خلق خدا دنگ رہ گئی۔ چشم فلک نے ایسا نظارہ کاہے کو دیکھا ہوگا! درویش نے دست حق پرست دراز کیا اور اس ہتھیلی پر ''لدارس'' چمک رہا تھا۔ اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ۔ تماشائیوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ ہندو حریف کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

Marfat.com

سید علی ہجویری الجلابیؒ نے سرزمین لاہور پر جس دور میں قدم رنجہ فرمایا شمالی ہند کے ان پر آشوب حالات کی تفصیل پیش کی جا چکی ہے۔ ملک ایاز شمالی ہند کے دل شہر لاہور کی از سر نو تعمیر کر چکا تھا اور دل کی بہترین کارکردگی جسم انسانی کی سلامتی کی دلیل ہوتی ہے۔ اسی طرح لاہور کی سلامتی اور امن و امان کو سارے خطے کا استحکام قرار دیا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے 1040ء والا یہ سال لاہور کی سیاسی بدبختی کا سال بھی تھا۔ اسی سال سلطان مسعود بن محمود غزنوی سلجوقی ترکوں سے شکست کھا کر عازم ہند ہوا۔ حسن ابدال کے قریب مارگلہ میں اس کے جاں نثار دستے نے بغاوت کی اور اسے پابند سلاسل ہو کر بصارت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مسعود نے اپنے سگے بھائی کی بصارت چھین لی تھی اب اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ محمود کے جانشین واقعی ناخلف ثابت ہوئے۔ اسی سیاسی انتشار کا اثر سرزمین پنجاب پر ہوا اور لاہور کو خطہ پنجاب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی شاید یہی وجہ تھی کہ سید علی ہجویریؒ کو لاہور آنا پڑا۔ بادشاہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا اور حسب توقع روٹی بوٹی کی تقسیم پر باہم دست و گریبان تھے حالات کا تقاضا تھا کہ خلق خدا کے دلوں کی تسخیر کی جائے شمشیر سے علاقے فتح ہوتے ہیں اور کلام نرم و نازک، دلائل اور براہان سے قلوب کو مسخر کیا جاتا ہے۔

برسبیل تذکرہ وادی کشمیر میں ویدا رانی کا انتقال ہو چکا تھا اور خاندان موہر کوٹ کا راجا سنگرام تخت پر متمکن تھا۔ یہ راجا داتا صاحبؒ کے ورود لاہور کے ایک برس بعد تک زندہ رہا۔ اسی راجا کے ہاں لاہور کا حاکم ترلوچن پال پناہ گزین ہوا تھا اور سنگرام راجا نے اپنے وزیر تونگ کو لشکر جرار دے کر محمود غزنوی کو سرکوبی کو بھیجا تھا مگر تونگ کو منہ کی کھانا پڑی تھی۔

فصیل شہر لاہور کے باہر جہاں موجودہ مزار ہے سید علی ہجویریؒ نے قیام کیا۔ درویش کو خلق خدا سے تھوڑا دور ہٹ کر مناسب روحانی علاج کا اہتمام کرتا تھا۔ کامیاب ارتکاز کے لئے گوشہ تنہائی شرط اول ہے۔ لاہور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے دین فطرت سے متعارف ہو چکا تھا۔ سلطان مسعود بن محمود کے دور تک کلمہ گو بھی یہاں آ چکے تھے۔ ان میں علماء قیل و قال بھی تھے، ہنرمند شعبدہ باز بھی۔ خیر و شر کی کشمکش ہر دور میں ہر جگہ موجود رہی ہے۔ اسی رطب و یابس کا نام زندگی ہے۔ قابل ذکر حضرات جن سے درویش خدا کی ملاقات ہوئی ان میں شیخ حسام الدین سر فہرست ہیں۔ شیخ صاحبؒ کا شمار اہل دل حضرات میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ سفر آخرت کی تیاری فرما رہے تھے۔ جب موصوفؒ ان سے ملاقات کرنے پہنچے تو شیخ صاحبؒ پر نزع کا عالم طاری تھا۔ سید

Marfat.com

صاحبؒ کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ آنکھیں جو ہمیشہ کیلئے بند ہونے والی تھیں۔

''میری جان! اتنا بوجھ کیسے اٹھاؤ گے؟'' شیخ حسام الدینؒ نے متفکر لہجے میں کہا'' گھٹا ٹوپ اندھیرا...... صاحبان اقتدار' ہوس میں گرفتار...... اب سارا بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے۔ میں تو کچھ بھی نہ کر سکا۔''

''ایسا نہ کہئے''...... درویش نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ سے جو کچھ بن پڑا آپ نے کیا' اس ناچیز سے جو ہو سکا کر گزرے گا۔ ہمارا کام صرف حکم بجا لانا ہے۔ کامیابی تو رب العزت کے ہاتھ میں ہے۔''

''میرے لئے دعا کرو کہ میرا انجام بخیر ہو۔'' پاک طینت بزرگ کو صرف انجام بخیر کی فکر تھی۔ سید علی ہجویریؒ نے دست دعا بلند کی تو 78 سالہ شیخ حسامؒ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

شہر سے باہر ویرانے میں علی ہجویریؒ جھنکاروں کے شہر میں حالات پر غور و فکر فرماتے رہے...... خلق خدا کی توجہ حاصل کرنے کے لئے حسب روایت اور رسم و رواج' عمل پیرا ہونے کا فیصلہ ہوا۔ چند روز بعد ایک عمر رسیدہ خاتون جائے قیام کے قریب سے گزری۔ اس کے سر پر دودھ بھری گاگر تھی۔ آپ نے بڑے احترام سے اسے اپنے قریب بٹھایا اور گفتگو کا آغاز کیا۔

''محترم خاتون' یہ دودھ کہاں لے جا رہی ہیں؟''

''رائے راجو کی نذر کرنے۔'' بڑھیا نے جواب دیا'' ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ اگر ہم اپنے مویشیوں کا دودھ راجو مہاراج کی نذر نہ کریں تو دودھیل جانوروں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے اور......'' بڑھیا کچھ کہتے کہتے مہر بہ لب ہو گئی۔

''کہئے خاتون کیا مسئلہ ہے؟'' درویش نے پوری توجہ سے مفلس خاتون کی الجھن دور کرنے کی کوشش کی۔

''اگر ہم دودھ کا نذرانہ پیش نہ کریں تو جانوروں کے تھنوں میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔''

''یہ سراسر ظلم ہے۔'' درویش نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''رائے راجو کو دودھ کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو سنا ہے شہر کا نائب حکمران ہے۔''

''بس جی! بندے کی ہوس تو کبھی پوری نہیں ہوتی۔ بڑھیا نے دکھ بھری داستان بیان کرنے کے بعد کہا۔ ہم غریبوں کے منہ کا نوالہ چھن جاتا ہے مگر کیا کریں مہاراج' مجبوری ہے۔''

Marfat.com

''دیکھو خاتون! آج یہ دودھ ہمیں دے جاؤ تمہارے مویشی اگر پہلے سے دگنا دودھ نہ دیں تو کل ہم سے دگنے دودھ کی قیمت وصول کر لینا'' درویش نے بڑھیا کی سمجھ کے عین مطابق بات کی......

دوسرے روز بڑھیا نہ صرف اپنے سر پر دودھ بھر گا گر اٹھا لائی بلکہ اس کے پیچھے گوالنوں گوالوں کی لمبی قطار چلی آ رہی تھی جو اپنے جانوروں کا دودھ دگنا کروانے کی تمنا لئے آستانہ درویش کی جانب امڈے چلے آ رہے تھے......ولئ وقت نے کسی آنے والے کو مایوس نہیں کیا۔ سب کا نذرانہ قبول کیا اور خلق خدا دامن میں خوشیاں سمیٹے واپس ہوئی۔ سید علی ہجویریؒ کی یہ قیام گاہ دریائے راوی کنارے تھی۔ (اس دور میں دریا کی گزرگاہ یہی ہوا کرتی تھی)۔ یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ کوئی مہا جوگی' بڑی کرنی والا درویش دریا کنارے ڈیرہ لگائے بیٹھا ہے اور خلق خدا کو فیض یاب کر رہا ہے۔ رائے راجو کو خبر ہوئی تو آتش زیر پا ہوا اور بھنا تا ہوا درویش کے ٹھکانے پر آیا۔ جب اس نے درویش کو ایک نظر دیکھا تو اس کی بصیرت نے سوچ سمجھ کر اقدام کا فیصلہ سنا دیا۔

''مہاراج! آپ نے ہمارا دودھ کیوں بند کر دیا؟'' راجو جوگی نے استفسار کیا۔

''نیک طینت لوگ خلق خدا کو فیض پہنچاتے ہیں ان کے منہ سے نوالے نہیں چھینتے......تم نے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے'' درویش نے سرزنش کی۔

''آپ میں کوئی کمال ہے تو مجھے قائل کریں میں باتوں سے مرعوب ہونے والا نہیں ''راجو نے ترت جواب دیا۔

''میں قائل بھی کر سکتا ہوں اور گھائل بھی' مگر سر عام شعبدے بازی اس ناچیز کو پسند نہیں......اپنی ریاضت کا کمال تم پیش کرو تا کہ میں کوئی اندازہ لگا سکوں ''۔

رائے راجو نائب شہر ہونے کا علاوہ باکمال جوگی بھی تھا۔ خرق عادت کمالات دکھانا اس کا شعار تھا۔ اس نے پر تولنے والے انداز میں اپنے بازو بلند کئے اور پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگا۔

''چرند پرند کی عادات اپنانے کا نام تمہارے ہاں ''کمال'' ہے واہ میاں جوگی مہاراج'' درویش نے انگشت شہادت سے اپنی نعلین کی طرف اشارہ کیا۔ جوتیاں ہوا میں پرواز کرنے لگیں بات یہیں ختم نہیں ہوئی فقیر کی جوتیوں نے جوگی پر حملہ کر دیا اور ہدف محو پرواز جوگی کا

Marfat.com

سر پر غرور تھا۔ جوگی کی جان پر بن آئی چیختا چلاتا واپس درویش کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سر ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ ''مہاراج! شما کیجئے اور اس پاپ کی گٹھڑی کو سیدھا راستہ دکھایئے۔''

لاہور میں سید علی ہجویریؒ کی یہ پہلی کامیابی تھی۔ رائے راجو کوئی معمولی شخصیت نہ تھا۔ بڑی کرنی والا جوگی مہاراج تھا وہ حلقہ بگوش اسلام ہوا تو اس کے چیلے اپنے گروہ کی اتباع میں دین فطرت پر ایمان لے آئے۔ لاہور میں پہلے مسلمان کو خدا کے درویش نے شیخ ہندی کا لقب عطا فرمایا اور شیخ ہندی کی اولاد مزار داتا کی مجاور بنی۔ اس کے بعد لوگ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔

مسلمانوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ نطق فقیر میں وہ تاثیر تھی کہ لوگوں کے دل گداز ہو جاتے اور گداز دلوں کو گرفتار محبت ہونے میں وقت ہی کتنا درکار ہوتا ہے؟ ایک یا دو پل؟ پتھروں کو اسیر کرنا البتہ بڑا دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ آپ سے پہلے مسلمان حکمران کی وجہ سے لاہور میں چند ایک مساجد کا وجود ضرور تھا مگر ولی وقت کو درس و تدریس کے لئے ایک ایسی مسجد کی ضرورت پیش آئی جس کی بنیاد خالص تقویٰ پر استوار ہو۔ لہٰذا درویش نے اپنے دست مبارک سے جائے قیام کے قریب ایک مسجد کی۔ تعمیر کی تکمیل تعمیر کے بعد ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس مسجد کا رخ قبلے سے ذرا جنوب کی جانب دکھائی دیتا تھا۔ قیل وقال کے ماہرین پنجے جھاڑ کر ولی وقت کے پیچھے پڑ گئے۔

''اس مسجد کا رخ صحیح نہیں ...... یہ دین میں بدعت کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہے'' علماء نے فتویٰ صادر فرما دیا' ولئ وقت کے دست حق پرست پر بیعت کرنے والے پریشان ہوئے تو آپ نے سب کو تسلی دی۔ آخر ایک روز چیدہ چیدہ حضرات کو مسجد میں نماز پڑھنے کی دعوت دی۔ امامت کے فرائض خود سرانجام دیئے اور نماز پڑھنے کے بعد مقتدیوں سے مخاطب ہوئے۔ ''آپ حضرات میں سے بعض کو اعتراض ہے کہ اس مسجد کا قبلہ درست نہیں' آج اس بات کا فیصلہ بھی کیے دیے دیتے ہیں''

یہ کہہ کر آپ نے دست مبارک بلند کیا۔ مقتدی ورطہ حیرت میں ڈوب گئے۔ کعبۃ اللہ اور مسجد کے درمیان حائل سارے پردے اٹھ گئے مسافتیں سمٹ گئیں۔ بیت اللہ ہر چشم تماشا کے عین سامنے تھا۔ دیدار بیت اللہ کے اس انداز کی تشریح' بعد میں سلطان العارفین حضرت باہوؒ نے اپنے انداز میں کی۔

''مرشد دا دیدار باہو مینوں لکھ کروڑاں حجاں ہو''

Marfat.com

اعتراض کرنے والے شرمسار ہوئے تو اہل دل تماشائی مشکور و ممنون۔ گھر بیٹھے بٹھائے بیت اللہ کا دیدار جو ہو گیا تھا اور شرمساری کا سبب یہ تھا کہ محراب مسجد اور بیت اللہ عین ''سیدھ'' میں تھے۔ سرمو فرق نہیں تھا۔

یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی جو زکوٰۃ کو ٹیکس کا نام دیتے ہیں اور اسلامی سزاؤں کو ظالمانہ کہتے ہیں۔ کُل کی سمجھ میں نہ آنی والی بات کا انکار کر کے ''جزو'' کی سمجھ میں آ جانے والی بات کے اسیر رہتے ہیں۔ یہی پرلے درجے کی جہالت ہے۔

خردکا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

لاہور میں یہ مسجد پہلی اسلامی درسگاہ تھی۔ تشنگان علم جوق در جوق آتے اور اپنی پیاس بجھاتے۔ مسجد کے قریب ایک سادہ سا حجرہ تھا۔ اسی حجرے میں ولیٔ وقت کا قیام تھا۔ شروع شروع میں آپ بچوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے پھر اچانک آپ نے یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ ایک عاشق زار نے اس کا سبب پوچھا تو بڑا لاجواب' جواب دیا۔ ''حکومت کی بو دماغ میں پیدا ہونے لگی تھی'' یہ تھ خود احتسابی کا معیار' مقام ''گنج بخش'' پر فائز ہونا کوئی آسان بات تو نہیں۔ آفتاب' مقام سوز پر فائز ہو کر ہی روشنی فراہم کرتا ہے۔

سنت نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آپ رشتہ ازدواج میں بھی منسلک ہوئے۔ پہلی شادی عنفوان شباب میں کی۔ شریک زندگی کا یہ ساتھ مختصر ثابت ہوا۔ شریک حیات چند سال بعد سفر آخرت اختیار کر گئی پہلی بیوی کی وفات کے بعد تجرد کا سلسلہ گیارہ برس تک قائم رہا۔ دوسری شادی کے متعلق حضرت علی ہجویریؒ کے اپنے الفاظ پیش خدمت ہیں فرماتے ہیں۔

''میں کہ علی بن عثمان جلابی ہوں خداوند کریم نے مجھے گیارہ برس تک آفت اہل و عیال سے بچایا ہوا تھا مگر تقدیر نے مجھے ایک بار پھر گرفتار بلا کر دیا اور میں اپنے ارادے اور خواہش سے بغیر زیر دام آ گیا۔ ہوا یوں کہ میں ایک بار بن دیکھے عشق مجازی میں گرفتار ہو گیا۔ یہ دور ابتلا ایک برس پر محیط ہے قریب تھا کہ میرا دین و ایمان تباہ ہو جاتا کہ مجھ پر حق تعالیٰ کی خاص نگاہ کرم ہوئی اور ایک سال بعد میری خلاصی ہو گئی۔''

اس سے ایک بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ دوسری شادی ایک برس تک رہی بہر حال یہ دونوں شادیاں ورود لاہور سے پہلے کے واقعات ہیں۔ ''وجود زن سے ہے تصور کائنات میں

Marfat.com

رنگ'' میں شک وشبے کی گنجائش نہیں مگر کائنات میں صرف یہی ایک رنگ نہیں۔ صوفیاء عشق مجازی کو دور ابتلاء کا نام دیتے ہیں کیونکہ یہ منزل نہیں یہی وجہ ہے کہ رب العزت کے خاص کرم نے ولئ وقت کو مجاز سے نجات دلا کر سپرد حقیقت کر دیا۔

آپ کی کنیت چونکہ ابوالحسن ہے لہٰذا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری بیوی سے ایک لڑکا تولد ہوا ہوگا جس کا نام حسن رکھا گیا۔ وہ ضرور صغیر سنی میں فوت ہو گیا ہوگا۔ یہ معاملہ گردش ایام کی دھند میں لپٹا ہوا ہے اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ابوالحسن علی ہجویریؒ دو مرتبہ لاہور تشریف لائے۔ پہلی بار 431ء میں یہ قیام 21 برس پر محیط ہے۔ اس کے بعد آپ کو خدمت مرشد میں حاضر ہونا پڑا کہ مرشد کا سفر آخرت قریب تھا اور سید کے علاوہ کون اپنے محسن و مربی کو الوداع کہنے کی جسارت کر سکتا تھا۔ مرشد کا قیام دم آخرت بیت الجن میں تھا' لاہور میں قلب درویش سپرد اضطراب ہوا۔ بیتابی دل حد سے بڑھی تو آپ نے شام کا سفر اختیار کیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر دمشق اور بانیار کے درمیان مرشد کی ہستی بیت الجن میں واقع تھی۔ طالب و مطلوب برسوں بعد ملے شیخ ختلیؒ نے جس پودے کی آبیاری کی تھی وہ اب نخل ثمر بار بن چکا تھا۔ لاہوری سرگرمیوں سے شیخ بخوبی واقف تھے آخری عمر میں اپنی محنت اکارت نہ جانے کی خوشی میسر تھی۔ جہاں دلی تعلق ہو دوریاں فاصلے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

''عزیزم! کیسی گزری؟ شیخ ختلیؒ نے دریافت فرمایا۔

''بفضل خدا محنت رنگ لا رہی ہے۔ شب تاریک قریب الاختتام ہے'' علی ہجویریؒ نے بصد احترام جواب دیا۔

''جان جگر! اعتقاد کے متعلق چند باتیں گوش گزار کرنی ہیں'' مرشد کو دم رحلت بھی دین کی فکر تھی۔

''ارشاد فرمائیے بندہ ہمہ تن گوش ہے۔''

ہر نوع کے حالات میں نیکی بدی کا خالق ''قادر مطلق ہے'' مرشد لب کشا ہوئے ''لہٰذا بندے کو لازم ہے کہ ہر حال میں کبیدہ خاطر نہ ہو۔ اگر بندہ رنج و غم کو دل میں بسیرا کرنے کی اجازت دیتا ہے تو یہ قادر مطلق پر نکتہ چینی کے مترادف ہے عزیزم! اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا اور اب میرے قریب بیٹھ جاؤ مجھے دم آخر تم سے دوری پسند نہیں۔''

حضرت علی ہجویریؒ نے مرشد کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ مرشد نے شاگرد رشید کے چہرہ

Marfat.com

انور پر نگاہیں گاڑ دیں اور طائر روح کو قفس عنصری سے پرواز کی اجازت دے دی۔

دم آخر اس اعتقادی مسئلے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ تقاضائے بشر کے پیش نظر مرشد کو دیکھتے ہی حضرت علی ہجویریؒ رنجیدہ خاطر ہو گئے تھے۔ محسن مربی کی جدائی کا دل پر اثر ضرور ہوا تھا مگر مرشد کامل نے جاتے جاتے حق ادا کر دیا۔ یہ واقعہ 453ھ کا ہے۔

مرشد کی تجہیز و تکفین کے بعد ولئ وقت دوبارہ عازم لاہور ہوئے اور اپنے وظیفے کا عین اس جگہ سے آغاز کر دیا جہاں سے چھوڑ کر گئے تھے۔ کلام پر تاثیر وہ خدمت سرانجام دے رہا تھا جو تیر و تفنگ کے بس میں نہ تھی۔ دن کو تشنگان علم کی درس و تدریس' رات کو طالبان حق کی تلقین و راہنمائی ہوتی۔ کاردگر کی جانب توجہ دینے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں منکرین سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے' ہزار ہا دیوانے عقل و ہوش کے دائرے میں آئے' ہزار ہا ناقص مقام اکملیت پر فائز ہوئے اور کاملوں کو رہنمائی نصیب ہوئی۔

درویش کامل ہونے کا ساتھ ساتھ ہجویریؒ عالم باعمل تھے۔ ایسا عالم جو علوم ظاہری و باطنی کا گہرا اور بے کراں سمندر ہے۔ باطنی علوم کے متعلق ساحل پر کھڑا شخص لب کشائی کی جرات کیسے کر سکتا ہے البتہ اس بحر ذخار میں غوطہ زن ہستیوں کے بقول سید موصوف کی گہرائی کی حد تھی نہ انتہا۔ معین الدین چشتیؒ جیسے حضرات جس ہستی سے فیض حاصل کرنے کو باعث صد افتخار گردانیں' نظام الدین اولیاء جس ہستی کی تصنیف کو مقام مرشد عطا فرمائیں اس کے کمالات میں لب کشائی کی جرات کون کرے الغرض ایک چشمہ فیض ابل رہا تھا اور خلق خدا مستفیض ہو رہی تھی ۔ گفتار اور کردار ہجویری ایک ایسا تند سیلاب تھا جس میں سارے مت دین دھرم کے نظریات خشک تنکوں کی طرح بہہ گئے آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ ہند تو ہر نظریہ حیات اور تہذیب کے لئے کان نمک ثابت ہوا تھا۔ اس کا سادہ اور آسان جواب یہ ہے کہ سید موصوف نے جو نظریہ حیات پیش کیا وہ مقامی مخلوق کے دل میں اتر جانے والا تھا۔ تمام لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ چند لوگوں کو ایک حد تک دام تزویر میں لانا ممکن ہے۔ سرزمین ہند تو ویسے بھی تشنہ لب تھی۔ برہمن مت کے گورکھ دھندے سے خلق خدا نے نجات حاصل کرنے کی بارہا کوشش کی مگر الہامی رہنمائی میسر نہ آنے کی بنا پر وہ از سر نو پرانے شکنجے میں جکڑی جاتی۔ حضرت علی ہجویری کی پہلی خوبی یہ تھی کہ جو کچھ وہ کہتے اس پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے گویا وہ محض گفتار کے غازی نہ تھے بلکہ کردار کے غازی بھی تھے۔ اسوہ حسنہ کا انہوں نے عملی نمونہ پیش کیا تو اس روشنی نے خلق خدا کے سینے منور کر دیئے

Marfat.com

خلق خدا تو گویا اجالے کی تلاش میں تھی۔ کامیابی کی دوسری بڑی وجہ اس سچائی کی سادگی تھی جو دلوں میں اتر جانے والی تھی۔ سرفہرست تخلیق کائنات کا تصور تھا۔

ہندوؤں میں تخلیق کائنات کا جو تصور رائج تھا وہ اتنا الجھا ہوا اور ناقابل فہم قسم کا تھا کہ دلوں کی تسکین نہیں ہو پا رہی تھی اول تو خالق کا تصور ہی عجیب و غریب تھا۔ پھر مختلف مکاتب فکر کے گروہ ایک دوسرے کی تردید فرما رہے تھے۔ مثلاً برہما نے کائنات ایک سنہری انڈے سے پیدا کی۔ یہ انڈا کہاں سے آیا؟ ہندو روایت کے مطابق برہما نے پہلے بہت سا پانی پیدا کیا اس میں ایک بیج بویا۔ وہ بیج انڈے کی شکل و صورت اختیار کر گیا تو برہما نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ انڈے کا نصف حصہ سنہرا تھا جس سے آسمان معرض وجود میں آیا اور دوسرا حصہ روپہلا تھا جس سے زمین کی تخلیق ہوئی لیکن اس نظریے کے برعکس ہندوؤں کو جہان پستک لنگ پران میں برہما اور وشنو کو باہم دست و گریباں دکھا کر دونوں کی تخلیقی قوتوں پر خط تنسیخ کھینچا ہوا تھا اور شولنگ کو خلقت کا بانی قرار دیا تھا۔ آریاؤں کے دیوتا جو ویدک کی تعلیم کے مطابق کائنات کے کرتا دھرتا تھے ایک دور میں پس پردہ چلے گئے۔ اندرتک کو بھلا دیا گیا اور شوشکتی کو کائنات کے کاروبار کا مالک و مختار بنا ڈالا گیا۔ ایک گروہ مظاہر قدرت کی پرستش کرتا تھا۔ آفتاب کے عاشق زارالگ تھے۔ سید علی ہجویری نے خدا اور اس کی وحدانیت کو متعارف کرایا اور اپنے پیش رو بزرگان کی تائید کی تو بات خلق خدا کے دل کو لگی۔ ایک سجدہ اگر ہزاروں سجدوں سے نجات دلا دے تو یہ سودا خسارے والا تو نہیں ہوتا۔ انسان جبلی طور پر خسارے والے سودے سے گریز کرتا ہے اور سودمند سودے کی طرف لپکتا ہے۔

خدا کی وحدانیت کے بعد تصور آخرت تھا۔ علی ہجویریؒ کے سامنے ایسا معاشرہ تھا جو تناسخ اور اواگون کے جال در جال میں جکڑا تڑپ رہا تھا۔ مکتی اور نجات کا ایک لامتناہی گورکھ دھندا تھا کہ ہندومت نے بالخصوص لوگوں کی مت ماری ہوئی تھی۔ آتما کبھی کتے کے جسم میں حلول کرتی کبھی گدھے کے۔ ہجویریؒ نے قرآن و سنت کے مطابق خیر و شر کی تشریح کی جزا و سزا کا تصور پیش کیا گناہ ثواب کی وضاحت کی تو یہ سچائی بھی لوگوں کو من موہنی سی لگی ...... اور انہوں نے آواگون کے شکنجے کو ایک ہی جھٹکے سے توڑ ڈالا۔

رہی سہی کسر ہندومت کے نظام ذات پات نے پوری کر دی۔ شودر، ویش اور نچلا وغیرہ برہمنوں کی خاک پا بھی نہ تھے۔ نچلا طبقہ پیدائشی بدبخت اور سوختہ ساماں تھا۔ اس جھوٹ کو خلق خدا کب تک برداشت کرتی۔ اسی محاذ پر تو بدھ اور جین مت کے وارے نیارے ہوئے تھے۔ سید علی

Marfat.com

ہجویری نے اسلامی مساوات کا عملی درس دیا تو لوگ گویا دیوانے ہو گئے۔ساری زنجیریں توڑ کر انہوں نے دامن ہجویریؒ کو مضبوطی سے تھام لیا۔یہ امید کی ایسی کرن تھی جسے وہ کسی طور ہاتھوں سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔

معاشرے میں عدل وانصاف کی داستان سنائی گئی۔اسوہ حسنہ کے روشن پہلو خلق خدا کے سامنے رکھے گئے تو نچلے طبقے کے سارے زخم تازہ ہو گئے۔ان کو وہ ناانصافیاں سپرد اضطراب کرنے لگیں جو برہمن مت نے ان سے روا رکھی تھیں۔یہ عدل وانصاف کو کند چھریوں سے ذبح کرنا مہینوں برسوں کی بات نہ تھی، چند دنوں کا قصہ نہ تھا بلکہ صدیوں پر محیط داستان خونچکاں تھی۔اسلامی مساوات کے تذکرے نے گویا رستے ناسوروں پر مرہم رکھ دیا۔

طہارت اور پاکیزگی کا تصور ہندومت میں مکروہ اور گھناؤنی قسم کا تھا۔گائے کا بول و براز پوتر (پاک) تصور ہوتا تھا۔جوگیوں اور سنیاسیوں کے بعض سمپردائے (فرقے) جسم پر گندگی ملنا جائز قرار دیتے تھے اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کے مطابق طہارت کا جو تصور سید موصوف نے پیش کیا وہ پسندیدہ اور فطرت انسانی کے عین مطابق تھا۔ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا بڑا خوشگوار اثر ہوا۔جوگ سنیاس میں غیر فطری رسوم اس قدر تھیں کہ انسانی ذہن عاجز آ چکا تھا۔مکتی اور نجات کے لئے اتنے تکلیف دہ طریقے رائج تھے کہ خلق خدا ان سے کتراتی تھی۔دنیا کو تیاگ کر پہاڑوں کی گپھاؤں میں راہ فرار اختیار کرنا عام سی بات تھی۔علی ہجویری نے دنیا کے رطب ویابس کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے نجات کے راستوں کی نشان دہی کی۔فصیل جاں کو کانٹوں کی سیج کے سپرد کرنا فضول اور لغو قرار دیا جو معاشرے کے ہر فرد و بشر کو پسند آیا۔

ہر معاشرے میں چند افراد گداز دل کے مالک ہوتے ہیں وہ دنیا کے بکھیڑوں میں الجھنا پسند نہیں کرتے اور خالق سے خوشگوار تعلقات کو ہر شے پر فوقیت دیتے ہیں۔یعنی اپنے ظاہر کو سنوارنے سے زیادہ باطن کو زیادہ قابل توجہ گردانتے ہیں یہ عشاق کا گروہ ہر مذہب وملت میں پایا جاتا ہے۔ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کی صفائی کا تصور اسلام میں بھی موجود ہے۔باطن کا سمندر تو ویسے بھی گہرا اور وسیع وعریض ہوتا ہے اس کی غواصی ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔اہل ہنود میں یہ تصور غیر فطری قوانین کا مجموعہ تھا۔

ویسے تو مکمل ہندومت ہی رسومات کے مجموعے کا نام تھا مگر دھرم کا یہ محاذ ہجویری فکر نے ہدف خاص قرار دیا۔سید نے ایسے دل گداز حضرات کے لئے ایک ایسی کتاب تصنیف کی جو راہ

Marfat.com

سلوک کے مسافروں کیلئے تاقیامت مینار نور کا درجہ رکھتی ہے۔اس کتاب میں انہوں نے اسلامی تصوف کے اسرار ورموز دل کش پیرائے میں کھول کر بیان فرمادیئے اس کے علاوہ غیر اسلامی تصوف ونظریات جوامت مسلمہ کے عقائد میں در آئے تھے ان کی نشاندہی بھی کردی۔تاکہ کوئی راہ سلوک کا مسافر بے خبری مارا نہ جائے۔یہ دینی خدمت عظمیٰ صدقہ جاریہ کا مقام رکھتی ہے اور تا قیامت آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہے۔یہ عوام الناس کے لئے بھی اتنی ہی مفید ہے جتنی خواص کے لئے' کیونکہ یہ اسلام کے پیغام محبت اور سلامتی کے پرچار کا دلنواز مرقع ہے۔اس کا نام انہوں نے کشف المحجوب رکھا یعنی اسرار ورموز کو کھول کر بیان کرنے والی کتاب مگر اس کتاب پر تبصرے سے پیشتر ان کی دیگر تصانیف کا مختصر سا تعارف بے حد ضروری ہے۔

منہاج الدین: اس کتاب میں مناقب اہل صفہ مرقوم ہیں۔وہ حضرات جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں علم کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ان حضرات کی پہلی درسگاہ مسجد نبوی کے اندر موجود تھی اور یہی پہلی اسلامی یونیورسٹی تھی۔

کتاب الفنا والبقا: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں حقیقت فنا اور بقا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔بقا کے لوازمات کی نشاندہی اس کے درجات وغیرہ پر مدلل بحث پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ان دو کتاب کے علاوہ اسرار الخرق الموناتِ پھر تصوف کی ایک حیران کن تصنیف ''کتاب البیان لاہل العیان'' یعنی چشم بینا رکھنے والوں کے لئے مکمل وضاحت۔

بحر القلوب اور الرعایۂ حقوق اللہ یہ دونوں کتب علم کا سمندر ہیں۔

ولی وقت کو شعر وشاعری سے بھی شغف تھا مگر ان کا دیوان زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

کشف المحجوب کی پذیرائی ہر مکتبہ فکر میں ہوئی۔حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے تو اسے مرشد کامل کا درجہ دیا۔شرف الدین یحیٰی' جہانگیر اشرف سمنانیؒ اور دارا شکوہ قادری جیسے اہل قلم و دانش وراس کتاب کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہے۔اس کتاب کی تصنیف کا سبب سید علی ہجویریؒ کے دست راست ابو سعید ہجویری تھے جو تصوف کے اسرار ورموز سے آشنائی کے تمنائی تھے۔برصغیر میں اسلامی تصوف کی پہلی اور مکمل کتاب اسے ہی گردانا جاتا ہے۔''اثبات علم'' سے لے کر ''آداب سماع'' تک اس میں کل 139 ابواب ہیں جن سے مکمل واقفیت آج وقت کی اشد ضرورت ہے۔فارسی زبان میں اس موضوع کو جس انداز میں ولئ وقت نے بیان کیا وہ اپنا جواب

Marfat.com

آپ ہے۔

پہلے باب کا آغاز علم ماہیت سے ہوا ہے۔علم جو حیوان ناطق کو مقام آدمیت پر فائز کرتا ہے۔علم جس کی بنا پر اس مشت غبار کو مسجود ملائکہ کا مقام عطا ہوا۔راہ سلوک میں یہی علم سالک کے مقامات میں بلندی کی ضمانت بنتا ہے۔جس ضابطہ حیات میں علم کا حصول فرض قرار دیا گیا۔اسی پر یقین کے مدعی اس میدان میں پیچھے رہ گئے۔یہی لمحہ فکریہ ہے۔علم کا سرچشمہ خالق کائنات ہے اور علم کی افادیت اس پر عمل کرنے سے مشروط ہے۔خالق اور مخلوق کے علم میں وہی فرق ہے جو بحر ذکار و بیکراں اور قطرہ آب میں ہو سکتا ہے۔علم اگر نافع نہیں تو وہ خام ہے۔کسی نہ کسی مقام پر خرابی ضرور ہے عالم یا علم میں۔اصولی علم ظاہر و باطن کا احاطہ کرتا ہے۔اسی وسیلے سے ہر فرد بشر پر لازم ہے کہ وہ اپنے ظاہر کو سنوارنے اور باطن کی گہرائی میں غوطہ زنی کرے۔ظاہر بغیر باطن کے منافقت اور باطن بغیر ظاہر کے زندقہ ہے۔شرعی قوانین کی اتباع بندے کا ظاہر اور اپنی اندر کی جان کاری علم حقیقت کے زمرے میں آتی ہے۔علم حقیقت اصل میں ذات وصفات باری تعالیٰ سے آشنائی کا نام ہے۔ظاہری اور باطنی علم سید علی ہجویری کے نزدیک لازم و ملزوم ہیں اور حیات کے قلب کے لئے دونوں یکساں اہمیت کے حامل۔علم حقیقت کے فقدان سے انسانی قلب 'جہالت کی بنا پر مردہ ہوتا ہے اور علم شریعت نہ ہو تو بوجہ نادانی' انسان کا دل عارضے میں مبتلا ہو جائے گا۔

دوسرے باب میں غنا و فقر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔فقر سے مراد پیشہ ور گداگری ہرگز نہیں یہ تو ایک لعنت ہے جس میں آج ہماری قوم مبتلا ہے۔فقر 'ہونے' نہ ہونے سے بے نیازی کا نام ہے یعنی سیم و زر کی کثرت وجہ انبساط نہ ہو اور تنگ دستی و تہی دامانی وجہ غم نہ ہو۔فقر میں تنگ دستی کو اس لئے فوقیت حاصل ہے کہ اس کیفیت میں اسرار کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے۔مال و متاع سے بے نیازی الطاف خفی کا سبب بنتی ہے۔ایک فقیر کا کمال یہ ہے کہ اس کے ترازو میں پوری کائنات' مچھر کے پر برابر وقعت اختیار کر جائے۔یعنی اس کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔تصوف میں فقر کا یہی مفہوم ہے۔جہاں تک غنا کا تعلق ہے تو اس صفت کی سزاوار ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔فقر کو ذات باری تعالیٰ سے منسوب کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں بے نیازی کے ساتھ کمی کا وجود ہر حال موجود ہوتا ہے اور صفات خداوندی میں ''کمی'' محال ہے۔بندہ اور صاحب بندہ میں صفات کو برابر ثابت کرنا کج فہمی کی دلیل ہے کیونکہ بندے کی ہر صفت جس کا امکان ذات بندہ میں ہو وہ بہر حال

Marfat.com

مانگنے کی تصور ہوگی۔ صفات خداوندی کریم اور صفات بندہ حادث اور فانی ہونے کی بنا پر دونوں کو ایک نظر سے دیکھنا مسلک ہجویریہ میں جائز نہیں۔ اسی مسلک پر کیا موقوف یہ ایک ازلی وابدی حقیقت ہے جس کا انکار جہالت ہے......اور جہالت علم کی ضد ہے۔ غنائے بندہ کا کوئی سبب ہوتا ہے جبکہ غنائے مطلقہ سبب سے بے نیاز ہے۔ وجود بشر اور حاجت لازم وملزوم ہیں لہٰذا محتاج، غنی نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سید علی ہجویری صفت غنا کو خدا کی ذات سے مختص کرتے ہیں۔ البتہ جسے خدا غنی فرمادے اس کا غنی ہونا محال نہیں رہتا۔ بندہ مقام غنا پر فائز ہوجائے تو غفلت اس کے لیے آفت بن جاتی ہے جیسے فقر میں حرص، بندے کے لئے فقر، غنا سے بہتر ہے کیونکہ اس میں ماسوا کے دھیان کا احتمال نہیں رہتا۔

تیسری فصل باب دوئم میں فقر وفقیر سے متعلق اقوال مشائخ اور ان کی تشریح مرقوم ہے۔ تیسرے باب میں صوفی کی اصلیت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ لفظ صوفی کی تشریح مشائخ نے مختلف انداز میں کی ہے مثلاً ایک گروہ کا خیال ہے کہ صوف یعنی اونی لباس زیب تن کرنے والا صوفی ہے دوسرا کہتا ہے صف اول میں رہنے والا صوفی ہے تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ صوفی کا تعلق اصحاب صفہ سے ہے اور چوتھے مکتبہ فکر کے حضرات لفظ صوفی کو اسم صفا سے مشتق گردانتے ہیں، مگر سید موصوف نے تمام تشریحات پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ ان کے ہاں ماسوا کے خیال اور کدورت سے پاک وصاف دل والا صوفی ہوتا ہے کیونکہ تصوف باب الصل سے ہے جس کا خاصہ تکلیف اٹھانا ہے اور صوفی اپنے نفس پر تکلیف اٹھاتا ہے صوفی اپنی ذات کو فنافی الذات کرکے بقا حاصل کرتا ہے اور اس مقام کو مجاہدے سے تلاش کرنے والا متصوف ہوگا لیکن کمترین مقام کا حامل یعنی مسصوف وہ ہے جو سیم وزر کے لئے ڈھونگ رچاتا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ اپنے خیالات کو مشائخ کے اقوال سے سچ ثابت کرتے ہیں اور جنید بغدادی کے رویے کی تائید فرماتے ہیں۔ اسی میں تصوف کی بنیاد آٹھ خصائل پر استوار ہوتی ہے۔ سیدنا ابراہیمؑ کی سخاوت، اسمٰعیلؑ کی رضا، صبر ایوبیؑ، اشارات حضرت زکریاؑ کے، غربت حضرت یحیٰؑ کی، سیاحت حضرت عیسیٰؑ کی موسوی پیرہن اور فقر محمد مصطفیٰ ﷺ۔ تصوف محض علوم ورسوم کا نام نہیں یہ ایک اخلاقی رویہ ہے۔ اخلاق جو انسان کا خلق خدا سے رویہ ہوتا ہے، اخلاق جو عبارت عبادت کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے......

چوتھے باب میں سید موصوف نے لباس صوفی پر بحث کی ہے۔ تصوف کی جملہ شرائط کو پورا کئے بغیر گدڑی پہننے کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے فرماتے ہیں پہلی شرط تو یہ ہے کہ کوئی

Marfat.com

فرد بشر یہ لباس از خود پہننے کا مجاز نہیں ۔برس ہا برس کی تربیت کے بعد بندے کا راہنما (مرشد، استاد، شیخ) یہ فریضہ سرانجام دیتا ہے اور اس تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ گدڑی پہننے والا خلق خدا کو اپنی ذات سے افضل تسلیم کرے اور اس کا عملی ثبوت پیش کرے ورنہ ''رہا صوفی گئی روشن ضمیری'' والی بات صادق آ ئے گی ۔علی ہجویری کے نزدیک گدڑی زیب تن کرنا کفن پہننے کے برابر ہے۔اس کے بعد زندگی کی لذتوں سے کنارہ کشی لازمی امر بن جاتا ہے۔

امت مسلمہ کو جتنا گزند تصوف کے بہروپ نے پہنچایا اسے احاطہ تحریر میں لانا دشوار ہے ۔عقیدت واحترام کے محاذ پر غیروں نے ہر دور میں کامیاب شب خون مارے حالانکہ مومن وہ ہے جو نہ دھوکا دیتا ہے نہ دام تزویر میں آتا ہے۔(لاتخدع ولاتخدع)

چھٹا باب ملامت کی دلنواز تشریح پر مشتمل ہے۔ایسی وضاحت جو بربط دل کے تار ہلا دیتی ہے اور اسرار ورموز کا انکشاف ہوتا چلا جاتا ہے۔بندے کو خلق خدا کا طوق رسوائی پہنانا اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو تقویت پہنچانے کے مترادف ہے لہٰذا ''ملامت'' قابل نفرت نہیں ۔مجاز تک میں لوگ رسوائی پسند فرماتے ہیں ۔عشق حقیقی میں تو اس کا مقام اوج ثریا پر ہونا چاہیے ۔بندے کے تعلقات صاحب بندہ سے خوشگوار ہوں لیکن اس کے باوجود خلق خدا اسے رسوا کرے تو تصوف کی زبان میں اسے ملامت کہتے ہیں ۔صوفیاء اسے ناپسند نہیں فرماتے جیسے شیخ ابوطاہر حرمیؒ کو کسی نے سربازار کہا ''اے پیر زندیق! کہاں کا ارادہ ہے۔'' ان کا ایک غمگسار لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا۔شیخ نے اسے منع فرمایا اور گھر پہنچ کر اسے خلق خدا کے بے شمار خطوط دکھائے جس میں موصوف کی تعریف وتوصیف کی گئی تھی ۔شیخ السلام، شیخ الحرمین، شیخ زہاد وغیرہ وغیرہ۔

''عزیزم! یہ میرے نام نہیں ہیں'' شیخ نے بڑی رسان سے مرید باوفا کو سمجھایا۔''اپنے ظرف وشرف کے مطابق لوگ مجھے القابات سے نوازتے ہیں ۔اس میں کبیدہ خاطر ہونے والی کون سی بات ہے؟'' ملامت میں صرف ایک بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ خلق خدا غلط فہمی کا شکار ہے ۔اگر ملامت کرنے والے کے الفاظ مبنی برحقیقت ہوں تو جس پر ملامت کی جارہی ہو وہ دگنے عذاب کا مستحق ہوگا...... یہی مسلک ہجویری ہے۔

مخلوق کی ملامت کو روا رکھتے ہوئے خالق کی غلامی میں امکان سے بڑھ کر ڈوب جانا صوفیاء کے ہاں ''جوہر ملامت'' ہے ۔ابو یزید ایک بار سفر حجاز سے لوٹے تو خلق خدا ان کے استقبال کو امڈ پڑی...... پل بھر کے لئے ابو یزید یاد خدا سے غافل ہو گئے ۔رمضان کا مہینہ تھا اور

Marfat.com

آپ روزے سے تھے مگر آپ نے سر عام روزہ توڑ ڈالا۔ استقبال کو آنے والے ملامت کرنے لگے۔ ابو یزید نے بعد میں کفارہ ادا کیا مگر نمود و نمائش پر ضرب کاری لگائی اور نفس کی سرکشی کو نیست و نابود کر ڈالا۔ گویا ملامتی طرز استدلال' ریا کی ضد ہے۔ آج بھی اگر ہم ہجویری طرز فکر کو اپنا لیں تو سب کچھ سنور سکتا ہے موصوف' ملامت کو عشاق کے لئے سرسبز و شاداب نخلستان' احباب کے لئے سامان تفریح' مشتاقان دید کے لئے راحت اور مریدوں کے لئے سرور کا درجہ دیتے ہیں۔

ایک بار سید علی ہجویری نے مسلسل تین ماہ تک مزار ابو یزید پر قیام فرمایا۔ طہارت کا خاص خیال رکھنے کے باوجود سرور کی لذت سے محروم رہے۔ آخر خراسان کا سفر اختیار کیا۔ دوران سفر ایک نام نہاد صوفیاء کی جماعت سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے ولئ وقت کو نگہ حقارت سے نوازا تمسخر اڑانے سے بھی گریز نہ کیا۔ طنز کے تیر برساتے رہے۔ ایک منچلے نے تو پھل نوش جاں کر کے چھلکے آپ کی طرف اچھال دیئے...... یہ آتش زیر پا ہو جانے والی بات تھی مگر سید علی ہجویریؒ اس تحقیر سے لطف واندوز ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مطلوبہ کیفیت کا حصول اسی جگہ اسی پل ہو گیا ......بغور دیکھا جائے تو بزرگان حق پرست جہلا کی ہم جلیسی اسی بنا پر گوارا فرماتے تھے۔ یہ واقعی بڑی گہری بات ہے۔ مسلک ہجویری میں ذرا سی بات پر بھڑک اٹھنا ناپسندیدہ فعل ہے۔

کشف المحجوب میں مسلسل سات ابواب صوفیاء کے فرقوں اور ان کے عقائد پر مشتمل ہیں۔ ہر فرقے پر ناقدانہ اور محققانہ بحث دل نشین انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ولئ وقت کے پیش نظر آج کا دور خرابی تھا۔ رضا اور مقامات کی تشریح میں فرماتے ہیں ۔ بندے کی رضا اور رضائے ربی میں امتیاز سالک کیلئے ضروری ہے ۔ رضائے ربی مجسم عطا ہے اور رضائے بشر' سر تسلیم خم کرنا اور اس انداز سے خم کرنا کہ جلال و جمال میں تمیز نہ رہے یعنی جلال سے اسی طرح لطف واندوز ہوا جائے جیسے جمال سے کیف وانبساط کا حصول ہوتا ہے۔ سجدے کا کمال یہ ہے کہ پیکر خاک کے ساتھ دل بھی سجدہ کرے اور اس میں روح کا میلان بھی شامل رہے ۔ عطائے ربی پر راضی ہونا (خیر و شر کی صورت میں) مقام معرفت ہے۔ صرف خیر پر خوش ہونا اہل دنیا کا شیوہ ہے۔ مقامات کے لالچ سے بے نیاز ہو کر اس کی محبت کا دم بھرنا حقیقت عشق ہے۔

سکر اور صحو تصوف کی دو معروف اصطلاحیں ہیں گروہ طیفوریہ جس کے بانی بایزید بسطامی تھے سکر کے پرجوش مبلغ تھے جبکہ علی ہجویریؒ صحو کو سکر پر فوقیت دیتے تھے۔ ایک سالک جب جمال یار کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے ہوش و خرد مغلوب ہو جاتے ہیں اس بے خودی میں عقل سے

Marfat.com

بیگانگی بھی متوقع ہوتی ہے جسے دیوانگی کہتے ہیں اور راہ سلوک کا مسافر پکار اٹھتا ہے۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش وخرد شکار کہ قلب و نظر شکار کر

محبت کے اس غلبے کا نام سکر ہے اور یہ محویت' کیفیت فنا تک لے جاتی ہے۔ صحو اس سے بلند تر مقام کا نام ہے یعنی جمال محبوب کے مشاہدہ کے بعد حیرت و وحشت کا باقی نہ رہنا۔ کوہ طور پر سیدنا موسیٰ کلیم اللہ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اور جس انداز میں ہوش وخرد شکار ہوئے وہ سکر کی بہترین مثال ہے اس کے برعکس حضور اکرم ﷺ قربت کی انتہا تک پہنچنے کے باوجود' قابہ قوسین او ادنے (دو قوسوں کا فاصلہ یا اس سے بھی کم) ہوش و حواس میں رہے تو یہ صحو کی مثال ہے۔ صحو میں غفلت سے اجتناب شرط اولین ہے یہی وجہ ہے کہ علی ہجویری نے اسے میدان مرداں کہا' بہر حال اصل دونوں کی ایک ہے۔۔۔۔۔ لیکن اگر ان دونوں کیفیات میں تصنع کی رمق شامل ہو جائے تو نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ دور حاضر کے نام نہاد صوفیاء کے لئے لمحہ فکر یہ ہے۔

حضرت سہل بن سہری کے پیرو وسہیلہ کہلاتے ہیں۔ موصوف کی تعلیم کے مطابق حصول مراد مجاہدہ نفس اور ریاضت کا مرہون منت ہے جسے یہ حضرات اجتہاد' مجاہدہ' اور ریاضت کا نام دیتے ہیں۔ اس سارے عمل کی غرض وغایت نفس کی مخالفت کرنا ہے۔ ہجویر یہ وضاحت کے مطابق نفس کی مخالفت محبت کا سرچشمہ ہے اور محبت کی انتہا عبادت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ گویا اصل عبادت ہی نفس کی مخالفت ہے۔۔ نفس کی پہچان سالک کیلئے بے حد ضروری ہے وہ اس لئے کہ پائے ظرف وشرف کا اندازہ ہو سکے۔ کیونکہ جس محبت کا دعویٰ کیا جا رہا ہے وہ جبار و قہار ہونے کے ساتھ ساتھ بے نیاز بھی ہے گویا مختلف صفات کا دلنواز مرقع۔ اپنے آپ کی پہچان نہ ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہدف تک

رسائی دشوار ہو جائے گی اسے کہتے ہیں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ ظاہری بات ہے۔ سالک کو جب اپنی ذات کا عرفان ہو جائے گا تو وہ اپنی خامیوں کا تدارک ضرور کرے۔ یہ اہتمام اس کی کامیابی کا ضامن ہوگا اسے کہتے ہیں من عرف نفسہ' فقد عرف ربہ' اور یہی مطلوب ومقصود ہے۔ بقول علی ہجویریؒ عبداللہ سریؒ نے اس میں غلو فرمایا کیونکہ سریؒ مجاہدے کو مشاہدے کی علت قرار دیتے ہیں گویا یہ بھی ایک اکتسابی فعل ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ تو عشق مجاز میں بھی سو فیصد درست نہیں۔ مجاہدے کے ساتھ رضائے محبوب کا ہونا شرط ہے یعنی ''عنایت ایزدی'' بقول علی

Marfat.com

ہجویریؒ مجاہدہ وصال حق کی علت نہیں ہو سکتا اسے وصل حق کا ذریعہ سمجھنا چاہیے۔ نفس خواہشات کا سرچشمہ ہے اور خواہشات کی پیروی کفر و گمراہی تک لے جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جنید بغدادیؒ ترک خواہشات کو وصال یار کا درجہ دیتے ہیں اور ہجویریؒ کے نزدیک یہ عبادت عظمیٰ ہے۔

ہوائے انسانی کی ازل سے دو ہی اقسام رہی ہیں۔ پہلی لذت اور شہوت دوسری جاہ طلبی ۔یہی معاشرے میں فساد کی جڑ اور گمراہی کا سبب تھا' ہے اور رہے گا۔

لذت اور شہوت کی پیروی سے خلق خدا بحیثیت مجموعی محفوظ رہتی ہے مگر جاہ طلبی بین الاقوامی فتنے کا سبب بھی بن سکتی ہے بصیرت ہجویریہ کا یہ انداز ہر زمانے پر صادق آتا ہے۔ فرقہ حکمیہ کے بانی عبداللہ بن علی الحکیم ترمذی تھے۔ ان کے ہاں ولی اللہ ہر دور میں معاشرے کا معتبر ترین بندہ ہوتا رہا ہے۔ اس لئے کہ اس پر نگہ کرم ہوتی ہے۔ ولایت کا خلاصہ فکر ہجویریہ میں یہ ہے کہ اولیاء میں خالق کی دوستی کے سبب ماسوا سے بے نیازی ہو جاتی ہے وہ غم و اندوہ سے دور ہوتے ہیں اور خوف ان کے قریب نہیں آ سکتا۔ قرب قیامت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ کرہ ارض ایسے بندوں سے خالی ہو جائے گا۔ بے خوف لوگوں کے عدم وجود سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جانا سمجھ میں آنیوالی بات ہے۔ فرقہ معتزلہ کا مشہور نظریہ تھا کہ خالق اپنے بندوں سے بلا امتیاز یکساں محبت کرتا ہے لہٰذا ولی برگزیدہ نہیں ہوتا...... اس کا مدلل جواب علی ہجویریؒ نے دیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی تخلیق سے مساوی محبت اگر تسلیم کر لی جائے تو جنت دوزخ کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ چناؤ' انعام و اکرام ہر نظام کو بروئے کار لانے کیلئے بے حد ضروری ہے۔ رسالت اس کی بہترین مثال ہے۔ فرقہ حشویہ کے مطابق برگزیدگی کا دور ختم ہو چکا ہے مگر علی ہجویری نے دوٹوک الفاظ میں اس کی تردید کی اور خواص کی درجہ بندی بھی کر دی یعنی اخیار' ابدال' اوتاد' نقباء' اور قطب یا غوث......

امت مسلمہ میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ولی کو عاقبت کے خوف سے بھی مستغنی قرار دیتا ہے اور اولیاء کیلئے غرور کو جائز مانتا اور گردانتا ہے۔ سید علی ہجویری نے دلائل سے اسکی تردید کی مگر اولیاء سے کرامت کے ظہور پر مفصل روشنی ڈالی جس میں ثابت کیا کہ افضل ترین ذات انبیاء کی ہوتی ہے دوسرے درجے پر اولیاء فائز ہوتے ہیں اور اولیاء کا مقام فرشتوں سے بلند تر ہوتا ہے۔

کشف المحجوب فنا اور بقا پر بھی مدلل بحث کرتی ہے۔ امت مسلمہ میں یہ نظریہ بھی موجود ہے کہ فنا سے مراد اپنی ذات کو مٹا دینا اور بقا کا خلاصہ یہ کہ ذات باری تعالیٰ سے متحد ہو کر بندہ اس

Marfat.com

میں حلول کر جائے۔ تصوف ہو یا حقیقت یہ بات قرین قیاس نہیں اور سید موصوف نے تو ان دنوں کی تردید کی ۔ ذات باری تعالیٰ میں حلول محال ہے اس لئے کہ حادث اور قدیم' خالق اور مخلوق' صانع اور مصنوع باہم متحد ہو ہی نہیں سکتے ۔ جہاں تک فنا کا تعلق ہے تو اس سے مراد شہوات و لذات کو نیست و نابود کر کے بشری تقاضوں سے الگ ہو جانا ہے ۔ سادہ الفاظ میں دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی فنا ہے اور راضی بہ رضا ہو کر سر تسلیم خم کرنا بقا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بندے کے افعال کو صاحب بندہ اپنی جانب منسوب کرتا ہے۔ چونکہ ذات باری تعالیٰ کو فنا نہیں لہٰذا اس نسبت کی بنا پر مشت غبار دبھی بقا کا حصول ہو جاتا ہے۔ فرقہ حلولیہ کو حضرت علی ہجویری نے نہ صرف رد کیا بلکہ اسے زندیق اور کافر قرار دیا۔ فانی پیکر کو ازلی ابدی ذات کے مساوی قرار دینا نہ صرف کفر ہے بلکہ ذہنی دیوالیہ پن سے بھی نچلا درجہ ہے ۔ گدڑی پہن کر حلول حلول الاپنے سے حقیقت نہ بدل سکتی ہے نہ چھپ سکتی ہے ۔ راہ سلوک میں بقول علی ہجویریؒ 12 حجاب (پردے) ہوتے ہیں۔ معرفت یا عرفان پہلا حجاب ہے۔ یہی وہ موضوع ہے جس میں فرقہ معتزلہ نے امت مسلمہ میں انتشار کی بنیاد ڈالی۔ یہ مشیت ایزدی کا صریحاً انکار کوئی آج کی پیداوار نہیں ذہنی کج روی کا بڑا پرانا مسئلہ ہے۔ معتزلہ کے بقول عرفان ایک اکتسابی مسئلہ تھا یعنی علم اور عقل کے وسیلے سے ذات باری تعالیٰ کو پہچان ہو سکتی تھی۔ علی ہجویری نے دلیل پیش کی کہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہر عالم اور عاقل نور معرفت کا حامل ہوتا جب کہ ایسی کوئی بات نہیں انکے دروازے خالق کی نگہ کرم ہی سے کھلتے ہیں فہم و فراست قوت مدرکہ معرفت کے اسباب ہیں علت تامہ نہیں ۔ علت تامہ صرف اور صرف اس کی عنایت ہے۔ باب علم حیدر کرار کا قول ہے کہ "میں نے خدا کو خدا ہی کے وسیلے سے پہچانا اور اس کی روشنی میں ماسوا کو دیکھا" حضرت عبداللہ بن مبارک کے بقول معرفت کسی شے پر تعجب نہ کرنا ہے کیونکہ تعجب مقدور سے وراشے پر ہوتا ہے لیکن خالق کائنات ہر کمال پر قادر ہے پھر تعجب کس بات کا۔ ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ معرفت' خالق کے مسلسل لطف و کرم کی وجہ سے سربستہ رازوں کے انکشاف کا نام ہے ۔ اس سے دل روشن اور بصیرت کمال عروج پر جا پہنچتی ہے اور بندہ آفات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

مشیت ایزدی پر ایمان ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ امت مسلمہ میں جب بھی انتشار و فساد کا آغاز ہوا اسی ایمان کی کمزوری کی بنا پر ہوا۔ تعلیمات ہجویری چونکہ ایک سچے مسلک کی تشریح پر مبنی ہیں لہٰذا اس سے واقفیت آج کی اشد ضرورت ہے۔

Marfat.com

دوسرا حجاب جس کی ولیٔ وقت نے دل نشین وضاحت کی وہ توحید ہے اس میں تین باتیں قابل غور ہیں۔ خالق کو اپنی وحدانیت کا خود بھی احساس ہے۔ دوسرے وہ اپنی وحدانیت کو تسلیم کرنے کا حکم دیتا ہے اور تیسرے بندہ کے گوشہ دل میں اس کی وحدانیت کا عرفان موجود ہوتا ہے۔ راہِ سلوک کا مسافر منزل پر پہنچ کر محسوس کرتا ہے کہ خالق لامحدود ہے اطراف کی قیود سے مبرا' وہ قید مکاں سے آزاد اس کی ذات وصفات تغیر پذیر نہیں۔

تیسرا حجاب ایمان کا ہے۔ ایمان کی علت معرفت ہے یا بندگی؟ ہجویریؒ کے نزدیک وہ معرفت فضول ہے جس میں بندگی نہ ہو۔ معرفت تو شوق اور محبت کا نام ہے اور وہ محبت کا اعلان جھوٹا ہے جس میں اطاعت نہ ہو۔ یہ کہنا غلط ہے کہ بندگی کی ضرورت حصول عرفان تک ہے۔ چوتھا حجاب طہارت ہے۔ ایمان کے بعد اس کا درجہ آتا ہے مگر طہارت ظاہر اور باطن دونوں کی ضروری ہے۔ باطنی طہارت سے مراد دل کا شکوک وشبہات سے پاک ہونا ہے جس کے بغیر معرفت کا حصول ممکن نہیں۔ اس کا آغاز توبہ سے ہوتا ہے۔ توبہ احکام الٰہی کو نظرانداز کرنے پر تاسف کا نام ہے۔ توبہ کی شان یہ ہونی چاہیے کہ احکام الٰہی کی مخالفت ترک کی جائے اور مخالفت کے طرف لوٹنے کا قطعاً خیال نہ ہو۔ یہ رویہ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب ندامت کا احساس اجاگر ہو جائے۔ یہی ندامت خدا کو مرغوب ہے۔

موتی سمجھ کر شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

پانچواں حجاب نماز کا ہے جو راہ راست پر قائم رہنے کا وسیلہ ہے۔ اس میں وضو طہارت ظاہری ہے۔ توبہ طہارت باطنی' قبلہ رو ہونا مرشد سے رابطہ' قیام مجاہدہ نفس' قرات ذکر' رکوع تواضع' سجدہ معرفت نفس' تشہد مقام محبت اور سلام ان مقامات سے باہر آنے کا نام ہے۔ اصل نماز تو یہ ہے کہ جسم عالم ناسوت میں ہو تو روح ملکوت تک رسائی حاصل کر لے۔ مردان حق ایسی نمازیں ادا کر چکے ہیں۔

چھٹا حجاب زکوٰۃ ہے جو جزوِ ایمان ہے۔ سالک کو زکوٰۃ میں سخی نہیں بلکہ جواد ہونا چاہیے۔ سخی دوران سخاوت کمی میں امتیاز کا قائل ہوتا ہے جبکہ جواد اس امتیاز سے کوسوں دور۔ یہاں ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ تہی دستی' فقر کا طرہ امتیاز ہے تو پھر زکوٰۃ کا سوال کہاں سے پیدا ہوا۔ علی ہجویری اس کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔ زکوٰۃ مال ومتاع ہی کی نہیں تندرستی کی بھی ہوتی

Marfat.com

ہے۔صحت کی زکوٰۃ یہ ہے کہ دکھ تکلیف میں مبتلا سالک شکر بجالائے اور اسے منجانب اللہ تصور کرتے ہوئے اظہار مسرت کرے۔علاوہ ازیں صحت کی زکوٰۃ تندرست اعضاء کو مصروف پرستش رکھنا ہے۔باطن کی زکوٰۃ پاکیزگی اور عرفان کا حصول ہے۔

ساتواں حجاب روزہ ہے۔اس سے مراد حواس خمسہ کو اس طرح پابند سلاسل کرنا کہ ہوا و ہوس کا گزر تک نہ ہو۔بھوک سے عاجزی پیدا ہوتی ہے جسم کی ابتلا دل کو روشن کرتی ہے۔

آٹھواں حجاب حج کا ہے۔صوفی کا ہر گناہ سے تائب ہونا سفر حج پر نکلنا ہوتا ہے۔احرام زیب تن کرنا انسانی عادات سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہے۔وقوف عرفات سے مراد مشاہدے کا کشف حاصل کرنا' مزدلفہ نفس کی تمناؤں کی ترک کرنا انسانی عادات سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہے۔وقوف عرفات سے مراد مشاہدے کا کشف حاصل کرنا' مزدلفہ نفس کی تمناؤں کو ترک کرنا اور خانہ خدا کا طواف جمال یار کا مشاہدہ ہے۔صفا و مروا میں دوڑنا دل کی صفائی میں جدو جہد کرنا' قربانی سے مراد ماسوا کی خواہشات کا ذبح کرنا اور کنکریاں پھینکنا یعنی رمی جمرات دنیاوی رشتوں ناطوں سے فرار حاصل کرنے کے مترادف ہے۔صوفی کو اگر یہ کیفیات حاصل نہیں ہوئیں تو اس کا حج نہیں ہوا۔

کشف المحجوب کا آخری باب آداب سماع پر مشتمل ہے۔اس کا متن پیش خدمت ہے۔مسلک ہجویریہ میں محفل سماع مباح یعنی جائز اور روا ہے مگر اس کی شرائط اتنی کڑی اور آداب اتنے پاکیزہ ہیں کہ ان کی بجا آوری تقریباً ناممکن ہے۔ بلا ضرورت محفل سماع کا انعقاد ممنوع ہے۔اس ضرورت کا فیصلہ ظاہر ہے عدالت دل میں ہوگا۔دو محافل کے درمیان طویل وقفہ لازم ہے تاکہ سماع کا وقار قائم رہ سکے۔محفل میں سالک کا مرشد موجود ہونا چاہیے عوام الناس کی شرکت ممنوع ہے۔قوال فاسق و فاجر نہ ہوں۔(شراب کے جام نوش فرما کر قوالی کا انعقاد جائز ہے یا ناجائز اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے)بوقت سماع' دنیاوی علائق سے سینہ پاک ہو۔کھیل تماشہ مقصود نہ ہو دل کے گداز میں ارتقاء مطلوب ہو۔کیفیت وجد میں کسی سے معاونت کی امید نہ ہو اور نہ اس میں تکلف برتا جائے۔محفل سماع میں نوعمر لڑکے نہ ہوں رقص ہر حالت میں ناجائز اور ناپسندیدہ ہے۔

سید علی ہجویریؒ نے احیائے دین کا اگر کوئی کام نہ کیا ہوتا تو صرف اس کتاب کی وجہ سے ان کا نام اہل دل حضرات کے سینوں میں تا قیامت زندہ رہتا۔یہ کتاب واقعی اسرار و رموز کو کھول

Marfat.com

کر بیان کرنے والی ہے جو سینوں کو روشن اور دماغوں کو معطر کرتی ہے۔اس کا مختصر تعارف اس لئے پیش کیا گیا کہ ایک تو یہ وقت کی ضرورت ہے دوسرے ذکر علی ہجویری اس کتاب کے تعارف کے بغیر ناممکن رہ جاتا۔

صفر کا مہینہ تھا اور 465 ولی وقت کی طبیعت ناساز ہوئی۔ شیخ ہندی نے اظہار تفکیر کیا تو آپ نے مسکرا کر فرمایا۔"میں نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ میں غیر فانی ہوں اور پھر اس تجربے سے تو ہر فرد بشر کو گزرنا ہے۔ شیخ کبیدہ خاطر ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔"

آفتاب عالم غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا اور لاہور میں اپنے دست حق پرست پر دین فطرت قبول کرنے والے پہلے ہوش مند انسان کو تسلی وتشفی سے نواز رہا تھا۔شاید اسے علم تھا کہ سرزمین لاہور سے دور قصبہ گیلان یا جیلان میں صرف پانچ برس بعد ایک سورج طلوع ہونے والا ہے جو کرہ ارض کے گوشے گوشے کو منور کر دے گا۔خلق خدا نے اس غروب ہونے والے آفتاب کو دا تا گنج بخش کہا تو جیلان میں طلوع ہونے والے مہر منور کو پیران پیر۔ظاہر اور باطنی علم سے بڑھ کر اور کون سا خزانہ ہو سکتا ہے کہ خلق خدا علی ہجویریؒ کو گنج بخش کا خطاب نہ دیتی۔

20 صفر والے دن سرزمین لاہور کو چونتیس برس تک منور کرنے کے بعد مقام سوز پر فائز یہ سورج غروب ہو گیا مگر کیا واقعی اس کی کرنیں بھی دم توڑ گئیں؟ اپنے گردو پیش نگاہ دوڑائیے کتنے لوگ ہر روز اپنے اپنے ظرف وشرف کے مطابق ان روشن کرنوں سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔کیا اس میں شک وشبے کی گنجائش ہے آج ہی کیا موقوف ماضی قریب وبعید میں جھانکیے۔سینہ روشن ہو جائے گا۔شیخ الاسلام خواجہ معین الدین چشتیؒ جیسی شخصیت شاہان وقت کو خاطر میں نہ لانے والی ہستی' وصال ہجویریؒ کے سو برس بعد کشاں کشاں مزار اقدس پر حاضر ہوتی ہے خزانے حاصل کرنے کی غرض سے نہیں چلہ کشی کے لئے روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے۔شیخ الاسلام نے روحانی ملاقات میں کن موضوعات پر لب کشائی کی ہوگی۔کیا کچھ طلب کیا ہوگا اس طلب وعطا کے متعلق لب کشائی کی جسارت کوئی نہیں کر سکتا جو بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔وہ ہر چشم تماشا کے عین سامنے ہے۔وہ مقام بھی محفوظ ہے جہاں شیخ الاسلام نے چلہ کشی فرمائی اور جس انداز میں خراج تحسین پیش کیا وہ تو دنیا دیکھ رہی ہے۔چلہ کشی کا دورانیہ اختتام پذیر ہوا تو قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرشد وراہنما بے ساختہ پکار اٹھا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا

Marfat.com

ناقصاں راپیر کامل کاملاں را راہنما

جانے اس کامل کو کون سا خزانہ ہاتھ لگا تھا۔ وہ رہنمائی تھی' روشنی تھی یا مدارج میں ترقی و بلندی' یہ تو خیر چھٹی صدی ہجری کی بات تھی حسین ڈاہڈا شاہ حسین یا مادھولال حسین نے کمال کہاں سے حاصل کیا۔ ابوبکر بگھوی یا بہلول دریائی تو نشان دہی فرما کر سرخرو ہو گئے شاہ حسین اسی آستانے پر دھرنا مار کر بیٹھ گئے اور خزانہ حاصل کر کے رہے...... یہ سلسلہ تو صدیوں سے جاری ہے۔ موجودہ صدی میں بھی ایک مرد قلندر پیدا ہوا تھا لوگوں نے اسے حکیم الامت کا خطاب دیا تھا وہ گداز دل انسان اس خطاب کا مستحق تھا

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

یہی پکارتا ہوا آستانہ عالیہ پر حاضر ہوا۔ مشرق و مغرب کا علم ایک جرعے میں پی چکا تھا پھر بھی سپرد اضطراب تھا۔ شاہان وقت کو رموز کشور کشائی اور آداب جہانداری سکھانے والا محمد اقبال علامہ' رات رات بھر ہجویری دربار میں حاضری دیتا رہا۔ جب سکون قلب نصیب ہوا' بے قراریوں کو قرار آیا تو بے ساختہ پکار اٹھا۔

سید ہجویر مخدوم امم
مرقد او پیر سنجر را حرم
خاک پنجاب ازدم او زندہ گشت
صبح ما از مہر او تابندہ گشت

حکیم الامت کی صحبتیں روشن کرنے والی ہستی کو گنج بخش نہیں تو اور کس نام سے یاد کیا جا سکتا ہے ۔جس آستانے پر ایسی بلند مرتبت ہستیاں زنوائے ادب تہ کرتی ہوں وہاں ہم آپ جیسے کس شمار و قطار میں ہیں ۔ برصغیر پاک و ہند میں آستانہ ہجویریہ ہی وہ سرچشمہ فیض ہے جہاں سے عوام اور خواص یکساں مستفیض ہوتے ہیں۔ یہ آستانہ لاہور بھاٹی دروازے کے مغرب میں داتا دربار کے نام سے مشہور ہے۔

سلطان محمود غزنوی کے خاندان میں سے سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود غزنوی نے اس دربار کی بنیاد رکھی ۔ مغل شہنشاہوں نے اپنے اپنے ادوار میں حسب توفیق اس کی توسیع میں

Marfat.com

حصہ لیا۔ آج بھی اس کی آرائش وزیبائش زور شور سے جاری ہے مگر کاش اس درویش بے ریا کی تعلیمات پر بھی کوئی توجہ دیتا ورنہ تو یہ چند کلمات پر قناعت کرنے والی بات ہے۔ شاید نادانی اسے ہی کہتے ہیں۔

Marfat.com

اللہ لوگ

حضرت سید عبدالقادر جیلانی المعروف غوث الاعظم پیران پیرؒ

Marfat.com

علم شریعت' طریقت و حقیقت' علم حال اور فصل الرجال کے مظھر 'نجیب الطرفین' سید حضرت" عبدالقادر جیلانی" کا ظھور ۴۷۰ ھجری میں ھوا. روحانی وعلمی اوج کمال اور دائمی روحانی تصرفات کے باعث دنیا میں انھیں غوث الثقلین 'پیران پیراورغوث الاعظم کے نام سے جانتی 'پھچانتی اور مانتی ھے .پانچویں صدی ھجری کے دور انحطاط میں دین محمد ی کے تن ناتواں میں وہ روح پھونکی کہ آپ"محی الدین "کے لقب بابرکت سے سرفراز ھوئے .مجتھد العصر کے علمی و روحانی فراست سے دور سیاہ کے مسائل نظری و علمی خرافات نہ صرف دم توڑ گئیں بلکہ تعلیمات غوثیہ سے دین محمدی ﷺ کی ازسر نو شیرازہ بندی ھوئی .مقام محبوبیت پر فائز اس بطلِ جلیل کے فیوض کا یہ عالم رھا کہ آپ نے منجانب اللہ نعرہ افتخار لگایا"میر ا یہ قدم اولیاء اللہ کی گردن پر ھے "جس کی تصدیق معتقدین اور متاخرین نے کی .آ پ کی تصنیف"غنیتہ الطالبین "آج بھی تشنگانِ علم کی پیا س بجھاتی ھے .

Marfat.com

غوث الثقلین

ایک تو دریا کنارے پانی کی لہروں پر ہلکورے لیتا ہوا سیب بڑا خوش رنگ تھا دوسرے نوجوان مسافر کا بھوک سے بُرا حال تھا۔ کئی روز سے کھیل تک اڑ کر منہ میں نہ آئی تھی۔ لذت کام ودہن سے ناآشنا مسافر کے لئے یہ گویا غیبی رزق والا ماجرا تھا۔ اشتہا سے مجبور انسان نے ہاتھ بڑھا کر سیب پکڑ لیا اور بسم اللہ پڑھنے کے بعد اسے کھانے لگا۔ وسائل سے یکسر محروم اور وسائلِ دنیا سے مالا مال انسان میں بنیادی فرق صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو وقت کی روٹی کا ہوتا ہے اس کے بعد شکم پروری کا جذبہ دونوں کو ایک سطح پر لے آتا ہے مگر حُب اللہ میں سرشار لوگ، اس کلیے قاعدے سے مستثنےٰ ہوتے ہیں اور کئی روز کا بھوکا مسافر ''حب اللہ والرسول'' کے بحرِ بے کنار میں غوطہ زن ہو چکا تھا۔ سیب حلق سے نیچے اترا تو آتش شکم کو قدرے قرار آ گیا مگر ''حب اختیاری'' نے اسے سپردِ اضطراب کر دیا''۔ یا ویلتی یا حسرتی'' یہ میں کیا کر بیٹھا؟ مسافر سوچنے لگا۔ یہ سیب آخر کسی شاخ ثمر بار سے ٹوٹ کر گرا ہوگا اور وہ شاخ کسی شجر کا حصہ ہوگی۔ پھر سیب کا وہ درخت خودرو نہیں، کسی کی ملکیت ہوگا اور میں مالک کی اجازت کے بغیر ہی اسے نگل گیا، یہ تو لقمہءِ حرام والی بات ہوگئی، اب کیا ہوگا؟ مسافر کی ''بنتر'' نیک تھی لہٰذا وہ اس حقیقت سے آشنا تھا کہ

Marfat.com

ایک لقمۂ حرام چالیس دن کی عبادت پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے اور ہر حرف دعا شرفِ قبولیت سے پیشتر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اسی سوچ سے بے چین ہو کر بھوکا مسافر، دریا کنارے، بہاؤ کی مخالف سمت چلنے لگا۔ بھوک بے شک طاقتور جذبۂ بقا ہے مگر خوفِ احتساب کے حاملِ، نیک طینت حضرات، اسے طاقت ورترین نہیں گردانتے۔ ان کے نزدیک خوفِ خدا سرِ فہرست اور جذبۂ بقا کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ مسافر کا سفر رائیگاں نہیں گیا۔ لب دریا اسے ایک وسیع و عریض باغ دکھائی دیا جس میں سیبوں کے بے شمار درخت تھے "یقیناً یہی میری منزل ہے اور انہی درختوں میں، کسی ایک کی شاخ سے وہ سیب گرا ہوگا" مسافر یہ سوچ کر باغ کے مالک کو تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ملاقات ایک نورانی چہرے والے بزرگ سے ہوئی۔

"آپ کون ہیں اور کس کو تلاش کر رہے ہیں؟" بزرگ نے مسافر سے پوچھا۔ محترم بزرگ اگر آپ ہی اس باغ کے مالک و مختار ہیں تو مجھے آپ ہی کی تلاش تھی"۔ مسافر نے جھکی نگاہوں سے کہا۔

"ہر شے کا مالکِ حقیقی تو رب العزت ہے البتہ اس باغ کی چند روزہ ملکیت اس نے مجھے عطا کر رکھی ہے" بزرگ نے مسافر کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جناب، مجھ سے ایک گناہ سرزد ہو چکا ہے، میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کا ایک سیب کھا بیٹھا ہوں۔ اگر آپ میری یہ تقصیر معاف فرما دیں تو بڑی کرم نوازی ہوگی" مسافر حرف مدعا زبان پر لے آیا۔ اب بزرگ نے از سرِ نو مسافر کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور چشمِ تماشا نے جو کچھ دیکھا دِل سے اسے بے حد پسند کیا۔

"آپ کی یہ تقصیر کیوں معاف کر دی جائے؟" بزرگ نے عجیب و غریب سوال کیا۔

"تا کہ میں سجدوں کی لذت سے محروم نہ ہو جاؤں" مسافر نے مختصر مگر جامع جواب دیا۔

"برخوردار، معافی طشت میں سجا کر مفت پیش نہیں کی جا سکتی" بزرگ نے برجستہ کہا" ہر گناہ کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے"

"میں ہر قسم کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں مگر مجھے معافی سے محروم نہ فرمائیں۔"

"چند روز اس باغ کی رکھوالی کرو پھر معافی کے متعلق غور کیا جا سکتا ہے؟" بزرگ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ یہ بزرگ اپنے زمانے کی مستجاب الدعوات ہستی شیخ عبداللہ صومعیؒ تھے جن کا شمار جیلان کے مشائخ اور زہادِ شب زندہ داروں میں ہوتا تھا۔ اور معافی کے خواستگار مسافر، ولیٔ وقت

Marfat.com

سیّد ابو صالحؒ تھے۔ سیّد موصوف اپنے شوق جہاد کی بنا پر جنگ دوست یا ''جنگی'' کے نام سے مشہور تھے۔ بعض کتب میں سیّد ابو صالح ''جنگی'' آیا ہے جو اصل میں ''جنگی'' ہے (جس کی وجہ تسمیہ بیان کی جا چکی ہے) جیل یا جیلان، طبرستان سے پرے مدائن کے قریب دریائے دجلہ کے کنارے ایک قصبہ ہے جسے عجمی زبان میں گیلان یا گیل کہا جاتا ہے (اردو زبان کا انتیسواں فارسی کا چھبیسواں حرف ''گاف'' عربی زبان میں چونکہ موجود ہی نہیں لہٰذا اس گیلان ہی کا عربی تلفظ ''جیلان'' ہے) حضرت شیخ عبداللہ اور ابو صالح کے درمیان معاملہ طے ہوا تو موخر الذکر نے پوری تن دہی سے باغ کی نگہداشت کے فرائض سرانجام دینا شروع کیے۔ پتے پتے اور بوٹے بوٹے کا احوال جس انداز میں دریافت فرمایا اس سے شیخ عبداللہ اور بھی گرویدہ ہو گئے۔ اس گہری وابستگی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ حضرت شیخ نے باغ کے رکھوالے میں ایک ایسے نقطۂ نور کا جلوہ دیکھا تھا جس سے ان کی روحانی چشم تماشا بھی چندھیا گئی۔ جسے وہ پہلی نظر میں ایک معصوم کبوتر سمجھ بیٹھے تھے وہ تو ابر پاروں سے بلند پرواز کرنے والا شاہین نکلا جو محض اتفاق سے ان کے ہاتھ آ گیا۔ اس کی نشست و برخاست، ہر معاملے میں رضائے رب کو فوقیت اور خشیت الٰہی دیکھ حضرت شیخ عبداللہ صوفیؒ بڑے متاثر ہوئے۔ وہ خود صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے اور چشم بینا سے بہت دور تک دیکھ سکتے تھے لہٰذا انہوں نے کافی غور و خوض کے بعد ایک بڑا فیصلہ صادر فرمایا۔ وقت معین کے اختتام پذیر ہونے پر جب ابو صالح ان کی خدمت میں اپنا مقدمہ لے کر دوبارہ حاضر ہوئے اور معافی کی درخواست پیش کی تو شیخ موصوف نے ایک عجیب و غریب شرط پیش فرما دی۔

''عزیزم معافی کی صرف ایک ہی صورت ہے'' انہوں نے سنجیدگی سے وضاحت فرمائی ''میری ایک صاحب زادی ہے جو آنکھوں سے اندھی، قوتِ سماعت سے محروم اور ہاتھ پاؤں سے مفلوج ہے اس سے رشتۂ ازدواج قبول کر لو تو ہمارا حساب بے باق ہو جائے گا۔''

''محترم بزرگ، مجھے اپنے سجدوں کی لذت، فصیل جان سے بھی عزیز ہے لہٰذا آپ کی شرط قابل قبول ہے۔ میں آپ کے حسب ارشاد اس رشتے کو قبول کرتا ہوں'' سیّد موصوف نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح دونوں کے مابین نئے رشتے کا آغاز ہوا۔ مگر شب زفاف کے موقع پر ایک حیران کن بات ہوئی۔ جونہی دُلہا نے شریک حیات کو دیکھا تو گھبرا کر گھر سے باہر بھاگے۔ دُلہن نہ صرف ظاہری عیوب سے پاک تھی بلکہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ سیّد موصوف کسی غلطی کے احتمال کی بنا پر بھاگے بھاگے اپنے سُسر کی خدمت میں پہنچے، حضرت عبداللہ نے

Marfat.com

فراست باطنی سے اپنے داماد کی پریشانی کا سبب معلوم کرلیا اور فرمایا ''

بیٹے ،کوئی غلطی وغیرہ نہیں ہوئی یہی میری صاحب زادی اور تمہاری شریک حیات ہے۔میں نے اپنی صاحب زادی میں جو عیوب گنوائے تھے ۔وہ اصل میں اس کی صفات ہیں ،بصارت سے محرومی کی وضاحت یہ ہے کہ اس نے آج تک کسی نامحرم کو دیکھا تک نہیں ۔یہ اس کے حیا کی انتہا ہے چوں کہ اس نے زندگی میں کبھی خلاف حق بات نہیں سنی لہٰذا وہ کذب فریب کے لیئے ،سماعت سے محروم ہے۔گھر کی چار دیواری سے چونکہ اس نے کبھی بلاضرورت شرعی باہر قدم نہیں رکھا لہٰذا وہ غیر شرعی اقدام کے لیئے پاؤں سے مفلوج ہے۔کارخیر کے سوا اس کے ہاتھ ہر کام سے نا آشنا ہیں لہٰذا وہ کار شر کے لئے ہاتھوں سے بھی مفلوج ہے''

حضرت عبداللہ صوفیؒ نے یہ وضاحت پیش کی تو نوجوان کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا شرم وحیا کی پتلی حُسن سیرت وصورت سے مالا مال شریک حیات سے بڑھ کر دنیاوی نعمت اور کیا ہوسکتی تھی۔عبداللہ صوفیؒ کی اس صاحب زادی کا اسم گرامی ام الخیر سیدہ فاطمہؓ ہے جو سیّدنا غوث پاک کی والدہ ماجدہ ہیں۔

شیخ عبداللہ صوفیؒ سیّدنا غوث پاک کے نانا ،علم وفضل میں لاثانی ہونے کے علاوہ صاحب حال ولیءِ وقت تھے ان کے حسب مزاج واقعات کا ظہور پذیر ہونا تاریخ تصوف کی کتب میں محفوظ ہے۔کسی بدنصیب سے غیر شرعی فصل سرزد ہونے کی بناپر اگر شیخ موصوف کو غصہ آجاتا تو اس شخص کا مبتلائے عذاب ہوجانا یقینی امر ہوا کرتا تھا اس کے برعکس اگر وہ کسی کو نظرِ التفات سے نوازتے تو وہ شخص رب العزت کی جانب سے انعام واکرام کا مستحق قرار پاتا اور یہی صاحب تصرف ولی اللہ کی پہچان ہے۔کبیر سنی کے باوجود نوافل بکثرت ادا فرماتے اور خشوع وخضوع کو انتہا تک پہنچا دیتے ،''بندہ نوافل سے میرے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ اس کے افعال مجھ سے منسوب ہونے لگتے ہیں'' شیخ موصوف اس حدیث کی منہ بولتی تصویر تھے۔یہ بات تو مستند ہے کہ ان کے لیئے زمینی مسافت کو مختصر کردیا گیا تھا اس کی صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ان کے عقیدت مند چند تاجر سامانِ تجارت لے کر نکلے تو سمرقند کے گھنے جنگل میں ان کو خطرناک ڈاکوؤں کے گروہ نے اپنے نرغے میں لے لیا۔تاجر حضرات تو ویسے بھی جدال وقتال سے نا آشنا قسم کے لوگ تھے۔اچانک تاجروں نے شیخ صوفیؒ کو چیخ چیخ کر پکارنا شروع کیا ''یا شیخ المدد۔اس آفت ناگہانی سے ہمیں بچایئے'' اس فریاد کا ارتعاش ابھی فضا میں موجود تھا کہ ان کو شیخ صوفیؒ کی موجودگی

Marfat.com

کا احساس ہوا۔ پھر ظاہری چشم تماشا نے عجیب وغریب منظر دیکھا۔ شیخ موصوف ان کے قریب کھڑے قہر آلود نگاہوں سے ڈاکوؤں کو گھور رہے تھے پھر انہوں نے گرج کر کہا "سبوح قدوس ربنا اللہ تفرقی یا خیل عنا" (ہمارے رب پاک اور بے عیب ہے اے سوارو ہم سے دور ہو جاؤ) زبان شیخ سے ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ سارے ڈاکو حواس باختہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے پھر وہ سر پر پاؤں رکھ کر یوں بھاگے جیسے آہوئے مرگ دیدہ بھاگتا ہے' کچھ تو قریبی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کچھ جنگل میں روپوش ہو گئے۔ تاجروں کے ہوش وحواس درست ہوئے تو انہوں نے شیخ صوفیؒ کو غائب پایا جیسے ہوا کا حبس مٹانے والا جھونکا تھا یا کوندا کہ لپکنے کے بعد صرف اپنا احساس چھوڑ گیا۔ اپنی بصارتوں اور سماعتوں کو جھٹلانے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ بہر حال فیصلہ ہوا کہ دن اور وقت کو ذہنوں میں محفوظ کر لیا جائے اور جیلان واپس پہنچ کہ شیخ موصوف سے اس کی تصدیق کرا لی جائے۔ جب وہ لوگ بخیر وعافیت وطن لوٹے تو انہوں نے مجلس شیخ میں سارا واقعہ مِن وعَن بیان کیا۔ حاضرین مجلس نے خدا کو حاضر وناظر گواہ بنا کر کہا "اس روز تو شیخ یہاں موجود تھے"۔

اس خاندان کی ایک خاتون شیخہ عائشہ کا (شیخ صوفیؒ کی سگی ہمشیرہ یعنی غوث پاک کی پھوپھی) بھی زہد تقویٰ میں بلند مرتبہ تھا۔ ایک بار جیلان میں ایسی خشک سالی ہوئی کہ زمین قطرہ آب کو ترسنے لگی۔ جس کے نتیجے میں قحط کا دور دورہ ہوا۔ سب دعائیں بے اثر ہوئیں اور نمازِ استسقاء بھی شرف قبولیت حاصل نہ کر سکی۔ شاید قدرت کو بندوں کا امتحان مقصود تھا۔ تھک ہار کر خلق خدا شیخہ عائشہ (ام محمد) کے آستانے پر حاضر ہوئی اور دعائے استسقاء کی درخواست کی۔ موصوفہ نے صحن میں کھڑے ہو کر سوئے آسمان دیکھا پھر جاڑ پکڑ کر صحن کے ایک گوشے میں جاروب کشی کرنے کے بعد خالق کائنات سے فریاد کی "رب کائنات' جھاڑو میں نے دے دی رحمت کا چھڑکا ؤ تو کر دے"، خلق خدا نے عجیب نظارہ دیکھا۔ نیلے صاف شفاف آسمان پر گھن گھور گھٹائیں چھا گئیں اور چھاجھوں پانی برسنے لگا۔ لوگ اپنے گھروں تک پہنچتے پہنچتے ابر رحمت میں شرابور ہو گئے اور جیلان آباد ہو گیا۔ شیخہ ام محمد کا وصال جیلان ہی میں ہوا اور مزار مقدس بھی اسی جگہ ہے۔ غوث الثقلین کے ننھیال کا سلسلہ امام حسین ابن علی سے جا ملتا ہے جبکہ والد بزرگوار کا دس واسطوں سے امام حسن ابن علی المرتضیٰ سے رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ گویا غوث الاعظم حسنی حسینی یعنی نجیب الطرفین سید ہیں۔ ان واسطوں کی تفصیل یہ ہے۔ غوث اعظم شیخ محی الدین عبدالقادر بن ابی صالح موسیٰ بن ابی عبداللہ بن یحییٰ زاہد بن داؤد بن موسیٰ بن عبداللہ بن موسیٰ الجون بن عبداللہ المحض بن

Marfat.com

حسن المثنیٰ بن حسن بن علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

ام الخیر ساٹھ برس کی عمر میں حاملہ ہوئیں۔عرب خواتین بالعموم پچاس برس تک عمل تولید کے قابل ہوتی ہیں مگر کہتے ہیں کہ قریشی خواتین ساٹھ برس تک ''کارِ تخلیق'' سرانجام دے سکتی ہیں۔غوث پاکؒ پیدائشی ولی تھے عہدِ رضاعت میں ایک بار رمضان المبارک کا چاند مشتبہ ہوگیا۔اور رویت ہلال کا فیصلہ ام الخیر نے کیا۔''میرا بچہ رمضان المبارک میں سحری کے بعد دودھ پینے سے پرہیز کرتا ہے،اگر کل صبح اس نے دودھ سے گریز کیا تو ماہ رمضان کا آغاز سمجھو ہوگیا'' دوسرے روز واقعی شیر خوار نے دودھ پینے سے انکار کردیا حالانکہ شیر مادر سے صحت مند بچے کا انکار ،خلاف عقل بات تھی۔تصدیق کرنے پر خلقِ خدا دنگ رہ گئی کہ اس روز واقعی یکم رمضان المبارک تھی۔اس طرح سارے جیلان میں یہ خبر پھیل گئی کہ ابو صالح کا فرزند پیدائشی ولی ہے۔سماعتوں کو یقین کرنے میں تامل تھا مگر اس کا کیا علاج کہ شیر خوار بچہ سب کے سامنے تھا اور بندوں کے پاس ایمان لانے کے لیے، آنکھ ہی معتبر وسیلہ ہے۔یہ الگ بات کہ عنداللہ آنکھ کی گواہی کوئی اتنی معتبر نہیں ہوتی۔اگر آنکھ کی گواہی واقعی قابل اعتبار ہوتی ہے تو کائنات کی سب سے بڑی کتاب قرآن میں ایمان بالغیب کی شرط عائد نہ کی جاتی۔آنکھ چونکہ فریب نظر کا شکار ہوکر اکثر اوقات قوت مدرکہ دھندلا دیتی ہے لہٰذا اس کی گواہی خواص کے ہاں قابل قبول نہیں۔بہر حال یہاں ذکر ایک عام چشم تماشا کا ہو رہا ہے جو قدم قدم پر ورطہ حیرت میں ڈوبتی ہے ورنہ خواص نے تو غوث پاک کی پیدائش کے سلسلے میں،اپنے اپنے ظرف و شرف کے مطابق پیشین گوئیاں کر ہی دی تھیں۔

ام الخیر سیّد فاطمہؒ بنت عبداللہ صومعیؒ جیسی زاہدہ عابدہ خاتون کے بطن سے سیّد ابو صالح موسیٰ کے ہاں رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں سنہ ۴۷۰ھ کی ایک دل کش چاندرات، وہ بچہ تولّد ہوا جو دین محمدی کے افق پر آفتاب عالمتاب بن کر چمکا۔اس مہر پر تنویر کی واقعی اشد ضرورت تھی اس مادر زاد ولی بچے کا نام نامی اسم گرامی ''عبدالقادر'' تجویز کیا گیا۔کیا اسے صرف تاریخی اتفاق سمجھا جائے کہ اس پیدائشی ولی بچے کے جدِ اعلیٰ،کائنات کے سب سے بڑے انسان حضرت محمد ﷺ ختمی مرتبت کی شان کا خلاصہ ''عبدہٗ'' ہے اور صدیوں بعد اسی مبارک سلسلے کی درخشاں کڑی ،غوث پاک کا اسم گرامی بھی ''عبد'' القادر ہے۔راقم کی چشم بصیرت کو اس تاریخی ''اتفاق'' پر ہمیشہ چندھیا جاتی ہے۔شان غوث الثقلین کے ادراک کے لیئے چشم بصیرت درکار ہے ایسی آنکھ جو ماضی و مستقبل میں بہ آسانی جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔کورنظر چشم جہالت تو فہم و فراست کو صرف

Marfat.com

گمراہ ہی کر سکتی ہے۔ ولادت غوث پاک کی اہمیت کے علاوہ ''شدید ضرورت'' سے آشنائی کے لیے اس دورِ تاریک پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا بھی بے حد ضروری ہے۔ یہ ایک سیدھا سادہ شدت طلب اور ''عطا'' والا معاملہ ہے۔ دین محمدی کے تنِ ناتواں کی رگوں میں صحت مند خُون دوڑانے کے لیے ایک ''محی الدین'' شخصیت کی ضرورت تھی ایسی شخصیت جو جلال و جمال کا دلنواز مرقع ہو۔ قدوسی و جباری وقہاری و جبروت کا خلاصہ ہو، اور یہ شخصیت، غوث پاکؒ ہی کی ہو سکتی تھی جس نے دینِ فطرت کے جسدِ جاں بہ لب میں ایسی توانا روح پھونک دی کہ وہ بپھرے ہوئے ''تاریخی طوفان'' کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گیا۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جو ساری دنیا پر روزِ روشن کر طرح عیاں ہے۔

غوث پاک کی ولادت با سعادت پانچویں صدی ہجری بمطابق گیارھویں صدی عیسوی ہے۔ یہی وہ صدی ہے جسے مسٹر گبن اور دیگر مستشرقین نے اسلام کا عہدِ تاریک قرار دیا ہے لیکن ہمارے لیے یورپین مورخوں کی آراء سے بڑھ کر رسالت مآب ﷺ کے فرمان کی اہمیت ہے کیوں کہ آپ ہی ''محرم رازِ درون خانہ'' ہیں۔ البتہ اگر دنیا کے کسی گوشے سے کوئی آواز، حضور ختمی المرتبت کی تائید میں بلند ہو تو وہ بھی ہمارے لیے معتبر بن جاتی ہے۔ اس دور کے روحانی انحطاط کے متعلق علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے بھی فیض الباری ''تعلیقاتِ بخاری'' میں ایک روایت نقل کی ہے آنحضرتؐ نے فرمایا ''پانچویں صدی کے قریب میری امت پر آفت کی ایک چکی چلے گی اگر اس سے بچ نکلی تو پھر کچھ مدت کے لیے اسے استقامت نصیب ہو جائے گی'' حضورؐ کے فرمان کی روشنی میں، ادبار کی ان گھٹاؤں میں ایک ایسے آفتاب عالمتاب کی ضرورت تھی جس کی ضیا پاشیوں کا فیض دائمی ہو اور سنہ ۴۷۰ھ میں یہ آفتاب طلوع ہوا، جسے دنیا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام سے جانتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دورِ انحطاط کی تفصیل بیان کردی جائے تاکہ غوث پاک کی ولادت، باسعادت کے سیاق وسباق اور ضرورت کی وضاحت ہو سکے۔

ولادت غوث پاک سے پہلے امتِ مسلمہ کو فسق وفجور، بدکاری، سیاسی ابتری اور اخلاقی انحطاط یعنی چار بلاؤں نے مکمل طور پر اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ عددی اعتبار سے مسلمان کم نہ تھے۔ اسلامی سلطنتوں کا سلسلہ اُندلس سے برصغیر تک پھیلا ہوا تھا مگر سارا جاہ جلال محض دکھاوے کا تھا۔ سیاسی مرکز بغداد کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ خلافتِ بنوامیہ کا سنہری دور جو عبدالملک بن مروان سے شروع ہو کر حضرت عمر بن عبدالعزیز تک رہا' قصہء پارینہ ہو چکا تھا۔ بنوعباس کا عروج

Marfat.com

ہارون الرشید کے عہد خلافت سے گرتے گرتے عباسی خلیفہ مستظہر باللہ تک آ پہنچا تھا۔ (بنوعباس کے کل خلفاء کی تعداد ۳۷ ہے۔ سنہ ۱۳۲ھ السفاح سے لے کر سنہ ۶۵۶ھ یا سنہ ۱۲۵۸ء تک۔ آخری خلیفہ مستعصم باللہ تھا جسے ہلاکو خاں نے ہلاک کیا) ولادت غوث پاک کے وقت خلافت بغداد کی گرفت اتنی کمزور تھی کہ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ امیر عبدالرحمٰن اموی کی قائم کردہ حکومت، اندلس میں دم توڑ چکی تھی۔ یورپ کی عیسائی طاقتیں گھات لگائے بیٹھی تھیں کہ موقع ملتے ہی گرتی ہوئی دیوار کو آخری دھکا دے کر زمیں بوس کر دیں۔ مصر کی سلطنت باطنیہ عبیدیہ الحاد و بے دینی کے پرچار میں سرفہرست تھی۔ علامہ سیوطیؒ نے تاریخ خلفاء میں اسے سلطنت ''خبیثہ'' کا مناسب ترین نام دیا۔ بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں جا چکا تھا اور یورپی متحدہ طاقتیں سرزمین حجاز وعراق پر حملے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ (اسی سلسلے کی ابلیسی کڑی ریجنالڈ کو بعد میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے دست مبارک سے واصل جہنم کیا)۔ جہاں تک مشرق وسطیٰ کا تعلق ہے تو خلافتِ بغداد کا اثر و رسوخ برائے نام سارہ گیا تھا۔ سلجوق اور دیگر سلاطین آپس میں دست وگریباں رہتے، جو برسرِ اقتدار آتا، اہل بغداد اسی کا کلمہ پڑھنے لگتے برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں ہند کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والے سلطان محمود غزنوی کے جانشینوں کی حالت بھی قابل رحم وافسوس حد تک خراب ہو چکی تھی اور ہندو راجگان اپنی ذلت آمیز شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے پر تول رہے تھے۔

مسلمان امراعیش وعشرت میں ڈوب چکے تھے۔ حرم سراؤں کی زیبائش اور لونڈیوں سے کیف وسرور حاصل کرنے کے علاوہ ان کو کوئی اور کام ہی نہ تھا۔ چشم تصور سے اندازہ لگائیں کہ مشرق وسطیٰ کا ایک متوسط رئیس ابن مروان کی حرم سرائے میں رقص وسرور میں ماہر لونڈیوں کی تعداد پانچ سو تھی۔ اسی طرح ایک اور معتمد نامی، قرطبہ کے رئیس نے، ایسی لونڈیوں کی فوج ظفر موج پال رکھی تھی جس کی تعداد آٹھ سو سے ایک ہزار بیان کی جاتی ہے۔ ہسپانیہ کے نقاب پوش سلاطین فنون لطیفہ وثقافت کی ترویج وترقی کے نام پر، اسلامی پردے پر خط تنسیخ کھینچ چکے تھے۔ عوام الناس نے بھی حکمرانوں کی تقلید میں نقاب پہننے شروع کر دیئے تھے اور خواتین کھلے منہ اپنے سرمائے کی نمائش کرتی پھرتی تھیں۔ امرا سے عوام تک اغراض کے بستر سجائے، بدکاری و مے نوشی میں ڈوب چکے تھے۔ مذہبی اور روحانی کیفیت نا قابل بیان حد تک خراب ہو چکی تھی۔ قرامطہ اور باطنیہ کے افکار کی روشنی میں علماء سو کا طاقت ور طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ملتِ اسلامیہ کا درد اور

Marfat.com

سود و زیاں کا احساس رکھنے والے وفا کے پتلے، باطنیہ کے خنجروں کا ہدف بن رہے تھے۔ سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی اور اس کے بعد سنہ ۴۸۵ھ (ولادت غوث پاک کے پندرہ برس بعد) میں سلجوق شہنشاہ ملک شاہ انہی قاتلوں کے شکار ہوئے۔ رہی سہی کسر یونانی فلسفے کی یلغار نے پوری کر دی۔ (اس کے جواب میں غوث پاک کے ہمعصر امام غزالیؒ نے تہافتہ الفلاسفہ تصنیف فرمائی)

ابو حامد محمد بن محمد الطوسی المعروف امام غزالی (سنہ ۱۰۵۸ء تا سنہ ۱۱۱۱ء) کا غوث اعظم کے آگے باقاعدہ زانوئے تلمذ کرنا تو ثابت نہیں مگر جب آفتاب طلوع ہو جائے تو اس کی کرنوں سے شجر و حجر تک بلا امتیاز فیض یاب ہوتے ہیں۔ وہ زمانہ چوں کہ غوث الثقلین کا تھا لہٰذا اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ہر ذہن کی جلا، فیض غوث پاک ہی کی مرہون منت تھی۔ امام غزالی نے اپنی تصنیف ''احیاءُ العلوم'' میں اس زمانے کے علماءِ سو کی تفصیل بیان کی ہے۔ امام موصوف رقم طراز ہیں۔

''وہ ہر وقت شیعہ، سُنّی، حنبلی اور اشعری مناظرات میں مصروف رہتے تھے۔ گالی گلوچ اور کشت و خون تک نوبت پہنچنا ایک معمولی بات تھی۔ اور کچھ نہیں تو صدر نشینی ہی پر جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا۔ معاشرے کا یہی وہ سیاسی و روحانی ادبار تھا جسے آں حضرت ﷺ نے سب سے زیادہ خطرناک قرار دیا تھا۔ صحاح ستہ میں ایک حدیث شریف ذرا مختلف الفاظ میں موجود ہے۔ ''خدا کی قسم غربت و افلاس کا مجھے تمہارے متعلق کوئی خوف نہیں بلکہ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ تم پر دنیا کے دروازے کھل جائیں گے (یا کھول دیئے جائیں گے) اور پھر جیسے تم سے پہلی امتوں میں مقابلے کا بازار گرم ہوا، اسی حالت میں تم بھی مبتلا ہو جاؤ گے یعنی اس حالت میں اغیار نہیں بلکہ خود مسلمان ہی مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے ہو جائیں گے''

آں حضرتؐ کے الفاظ چونکہ تقدیر انسانی کا درجہ رکھتے ہیں لہٰذا بغداد کے گلی کوچوں میں ارزانی سے بہنے والے خون نے اس حدیث شریف کی تصدیق کر دی۔ اس اندھیرے میں ایک ایسی روحانی قوت کی اشد ضرورت تھی جو دین محمدی کی ازسر نو شیرازہ بندی کر سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے آنے والے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی بنا سکے۔ صورت حال اس بات کی بھی متقاضی تھی کہ اس بطل جلیل کا روحانی تصرف وقتی یا عارضی نہ ہو بلکہ دائمی ہو۔ معروضی حالات کے تقاضوں کے عین مطابق ایک ایسے مردِ مومن کو پیدا فرمایا گیا جسے دنیا قیامت تک پیران پیر، غوث الاعظم اور محی الدین جیسے مبارک اسمائے گرامی سے پکارتی رہے گی۔

Marfat.com

اس میں شک وشبے کی رتی برابر گنجائش نہیں کہ تعلیماتِ غوثیہ اور ان کی مساعیءِ جمیلہ ہی کے نتیجے میں امتِ مسلمہ نہ صرف سنبھل گئی بلکہ اس قابل بھی ہوگئی کہ ان کی وفات کے بعد اٹھنے والے فتنہءِ تاتار کی غارت گری سے سلامتیءِ ایمان کے ساتھ نبرد آزما ہوئی۔ اس فتنہءِ عظیم کی تباہ کاریاں اگرچہ بے حد وحساب تھیں۔ آگ اور لہو کا ایک بپھرا ہوا سمندر تھا جس میں امتِ مسلمہ کو ڈوب کر ابھرنا پڑا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی اور قوم کو اس بدبختی کا سامنا کرنا پڑتا تو اس کا نام ونشان، صفحہءِ ہستی سے مٹ چکا ہوتا۔ یہ اعجاز کیا کم ہے کہ سلسلہءِ قادریہ ہی کے ایک بزرگ نے فتنہءِ تاتار کے گھپ اندھیروں میں اسلام کی نورانی شمع روشن کی اور

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کے مصداق خود تاتاری قوم ہی قبول اسلام کے بعد ملتِ اسلامیہ کی محافظ بنی۔ برصغیر میں سلطنت مغلیہ اس کی درخشاں مثال ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے شہرہ آفاق تصنیف ''ہمعات'' میں اس نکتے کی وضاحت بڑے دل کش انداز میں کی ہے۔ ''حضرت غوث الاعظم کی اصل نسبت، نسبت اویسہ ہے جس میں نسبت سکینہ کی برکات ان معانی میں شاملِ ہوتی ہیں کہ شخص مذکورہ، ذات الٰہی کے ''ذال'' کے نقطے کی طرح شخص اکبر میں، ارواحِ کاملہ اور ملاءِ اعلیٰ کی محبت میں، خود محبوب بن جاتا ہے۔ اس مقام محبوبیت کی وجہ سے اس کے ارادہ وتوجہ کے بغیر، تجلیات الٰہی میں سے وہ تجلیءِ اس پر ظاہر ہوجاتی ہے جو ابداع، خلق، تدبیر اور تدلّی کا خلاصہ ہوتی ہے۔ اس تجلی کی وجہ سے ایسی انسیت اور برکات کا ظہور ہونے لگتا ہے جن کی کوئی انتہا نہیں۔ اس انسیت کے نتیجے میں امور کائنات خود بخود ظہور پذیر ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے غوث الاعظم نے کلمات فخریہ فرمائے اور ان سے تسخیر عالم کا ظہور ہوا''

درجہ بالا تحریر کی تائید میں ایک حدیث شریف کا اجمالاً ذکر کیا جاچکا ہے جس کا متن ہے کہ کثرت نوافل سے بندہ میرے قرب سے فیض یاب ہوجاتا ہے ایسا قرب کہ وہ اپنی ذات کو میری ذات میں فنا کردیتا ہے ''فنافی الذات'' پھر میں اس کی بصارت وبصیرت، سماعت، زبان اور ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں۔ گویا انسان، خدائی طاقت وتوانائی کا مظہر بن جاتا ہے اور حیات فانی کے بعد یعنی جسدِ خاکی کے زیرزمیں سوجانے کے بعد اس کے روحانی تصرفات کا آغاز ہوجاتا ہے موجودہ دور کی زبان میں اسے میٹافزکس (Meta Physics) مابعدالطبیعات کا نام دیا گیا ہے اور انشااللہ 21 ویں صدی میں اس کے حقیقی معانی عوام الناس پر آشکار ہوں گے۔ ابھی تک

Marfat.com

ایک عام انسان کی ذہنی سطح بلوغت کے اس مقام تک نہیں پہنچ پائی کہ روحانی تصرفات کا کما حقہ ادراک حاصل کر سکے۔بغیر ادراک کے ایمان لانے کے لیے ہمت و حوصلے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

یہ تھی امتِ مسلمہ کی حالتِ زار جب سنہ ۴۷۰ھ میں غوث پاک تولد ہوئے۔کم سنی میں پیدائشی ولی کو علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے مکتب کا راستہ دکھا دیا گیا۔مگر حالت یہ تھی کہ جو آپ سوئے مکتب تشریف لے جا رہے ہوتے تو فرشتوں کا ایک گروہ ساتھ ہوتا جو لوگوں کو احترام غوث کی تلقین کر رہا ہوتا ''راستے سے ہٹ جاؤ، سرِ تسلیم خم کرتے جاؤ اللہ کا ولی آ رہا ہے'' اکثر یوں بھی ہوتا کہ غوث پاک کے ہم مکتبوں کو سرزنش کی جاتی ''مقام احترام، حدِ ادب، اللہ کے ولی کے لیے جگہ دو اور حیران کن بات یہ ہے کہ کم سنی ہی میں غوث پاک کو اپنے مقام و مرتبے کا احساس ہو چکا تھا آپ خود فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی ولایت کا احساس دس برس کی عمر میں ہو گیا تھا۔

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

کے مصداق کم سنی میں احساس ولایت صرف اس صورت میں حیران کن بات نہیں کہ ظرف انسانی کی وسعت بھی اس کے عین مطابق ہو ورنہ منصور حلاج والا قصہ بن جاتا ہے اور انسان چھلک کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔غوث پاک اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر منصور میرے زمانے میں ہوتا تو میں ضرور اسے سنبھال لیتا۔

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

چھوٹی عمر میں ولایت کے بارِگراں کا احساس، بذات خود ایک ایسا کارنامہ ہے جو کبھی کسی نے دیکھا نہ سنا۔کم سنی ہی میں غوث پاک کو دوہرے صدمے کا سامنا ہوا۔والدِ بزرگوار اور شفیق نانا سفرِ آخرت اختیار کر گئے گویا شجر سایہ دار سے محروم ہونا پڑا۔اس طرح تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ام الخیر سیدہ فاطمہ کے کندھوں پر آن پڑی۔والدہ ماجدہ بھی بچے کے مقام و مرتبے سے آشنا تھیں لہٰذا اسی کے مطابق انہوں نے ہر کام سرانجام دیا۔غوث پاک کا اصل مقام تو تلامیذ الرحمٰن کی سرداری تھا مگر دستورِ دنیا کے عین مطابق آپ کو اکتساب علم کرنا پڑا۔اس طریقہ کار سے صرف انبیا کی ذات ہی مستثنیٰ ہوتی ہے ورنہ غوث، قطب، ابدال ہر شخص کو کسی نہ کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنا ہی پڑتا ہے۔پھر ان واقعات کے ظہور کا آغاز ہوا کہ غوث پاک عارضی طور پر سہم سے جاتے۔گھر سے

Marfat.com

قریب ایک وسیع وعریض میدان میں چند بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔غوث پاک بھی ان میں شامل ہونے کے لیے میدان کی جانب لپکے پھر فضا میں ایک عجیب وغریب قسم کی گونج سنائی دی۔''الی یا مبارک''(اے برکت والے میری طرف آ)اس گونج کے ارتعاش میں موسیقیت بھی تھی الوہی سرور بھی،اور یہ پُر ہیبت بھی تھی۔غوث پاک سہم کر گھر کی طرف بھاگے اور آغوش مادر میں آ بیٹھے۔اس طرح کھیل کود کا خیال دل سے نکل گیا۔والدہ نے مسکرا کر نورانی چہرے کی طرف دیکھا تو آپ بھی مسکرانے لگے۔یہ سہم،یہ خوف ندائے غیبی کی بنا پر تھا۔وہ ندا جسے سن کر کوہِ طور پر حشر بپا ہوا۔موسےٰ علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر ہی اس صدا کو برداشت کر سکتا تھا اور وہ بھی ہوش وحواس سے بیگانہ ہوکر۔اسے تو ویسے بھی لوگ ''وقفہ تسلیم ورضا'' کہتے ہیں۔کھیل تماشے سے گریز کی تلقین کرنے والی ندائے غیبی کا بار بار اعادہ ہوا تو قلب معصوم نے اس کا بھی حل ڈھونڈ نکالا۔ایسا کھیل پیش کیا کہ خلقِ خدا انگشت بدنداں رہ گئی۔وہ کون استاد تھا جو معصوم بچے کی راہنمائی فرما رہا تھا اور ایسے مشکل مضامین ذہن نشین کرا رہا تھا؟

''آؤ ساتھیو ایک بڑا دلچسپ کھیل کھیلیں''ایک بار خود عبدالقادرؒ نے ہمجولیوں کو ترغیب دی۔''میں کہوں گا''لا الہ ''اور تم سب اس کے جواب میں بہ آوازِ بلند کہنا۔اِلا اللہ''بس بڑا مزا آئے گا''
چنانچہ اس روز جیلانی کے گلی کوچے معصوم صداؤں سے گونجنے لگے ایسی صدائیں

جو سپرِ اضطراب اب دلوں کو سامانِ تسکین فراہم کرتی ہیں۔خلقِ خدا ورطہ حیرت میں ڈوبی مگر ام الخیر کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔خیر کا سرچشمہ آخر اسی کے وجود سے پھوٹ رہا تھا بات فخر کرنے کے لائق تھی۔

عنفوانِ شباب نے ابھی در پر دستک نہ دی تھی کہ قلب معصوم،گہری سوچوں کے حوالے ہوگیا۔بندہ اور صاحب بندہ کے تعلقات،تخلیق کائنات،انسانی اعمال وافعال اور امتِ مسلمہ کا زوال یہی سوالات تھے جو ذہن میں گردش کرتے رہتے۔دل معصوم ضرور تھا مگر دریاؤں سمندروں سے گہرا تھا۔لہٰذا موضوعات کی وسعت اس میں سما سکتی تھی جیسے آنکھ کی پتلی میں بیکراں نیلا آسمان سما جاتا ہے۔ان موضوعات پر غور وفکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ غوث پاک اکثر وبیشتر مہر بہ لب رہتے۔

''جانِ عزیز:بعض سوچیں اندر کی لو مدہم کر دیتی ہیں اور بعض سینے کو جلا بخشتی ہیں''ام الخیر نے ایک روز لختِ جگر سے فرمایا''لہٰذا سوچ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے''
''جس چراغ کی لو اتنی ناتواں ہو اس کا بجھ جانا ہی بہتر ہے،امی جان''

Marfat.com

''مناسب ترین بات ہے'' ام الخیر نے مسکرا کر تائید کی''۔میری خواہش ہے کہ آج تم زمین کے ٹکڑے پر ہل چلا دو، موسم اس توجہ کا تقاضا کر رہا ہے'' ام الخیر نے لختِ جگر کی خاموشی کا حل تجویز کیا۔غوث الثقلین، والدہ کی خواہش کے احترام میں فوراً تیار ہو گئے۔آگے آگے بیل تھا پیچھے پیچھے آپ۔کھیت کے قریب پہنچے تو اچانک بیل ٹھٹک کر رک گیا۔بیل تو جانور تھا اس کی کیا مجال تھی کہ معاملاتِ غوث میں مداخلت کرتا۔روکنے والی تو کوئی اور ذات تھی۔وہی ذات جو ارادوں کی محتاج ہے نہ اسباب کی۔جو کُن کی ادائیگی سے کائنات تخلیق فرما سکتی ہے۔''یہ کُن'' بھی ہمیں سمجھانے کے لیے ہے ورنہ وہ ذات تو ''کن'' کی بھی محتاج نہیں۔کتنا دشوار ہے اس ذات کا ادراک؟ کیوں کہ لامحدود شے کا محدود شے میں سمانا محال ہے۔مگر ذہن انسانی، لامحدود کو محدود میں سمونے کی مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ہی رہتا ہے۔اس بے زبان بیل کا غوث پاک سے محوِ کلام ہونا، امرِ ربی تھا اس سارے واقعہ کی عقلی توجیہہ تلاش کرنا بھی حماقت کے زمرے میں آتا ہے اور حماقتوں سے گریز ہی کا نام دانش مندی ہے۔

''شرح عقائد نسفی'' میں ایک عام انسانی ذہن کو مدنظر رکھتے ہوئے ذات باری تعالےٰ کے مفہوم و معانی کا تعین کیا گیا ہے۔مرقوم ہے ''لیس له مکان و لایجری علیه الزمان ،تعالےٰ عن الجهات '' یعنی'' وہ قید مکان سے آزاد ہے (لامکانی) اس پر زمانہ بھی جاری نہیں ہوتا (زمانہ آفات کے تسلسل کا نام ہے) وہ سمتوں سے بھی بلند و بالا ہے۔''

اب انسانی ذہن جو حواس کا قیدی ہے، اس کی تہہ تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔اس لامحدود کے احاطہ کے لیے عقل بھی تو لامحدود ہونی چاہیے۔یہ وضاحت ان حضرات کے لیے ہے جو مناقب غوث پاک کے منکر ہیں۔وہ صرف آنکھوں کے سامنے، سمجھ میں آ جانے والے ''جزو'' کا اقرار تو کر لیتے ہیں مگر سمجھ میں نہ آنے والے، آنکھوں سے اوجھل ''کل'' کو ہضم نہیں کر سکتے۔بہر حال جیلان کے کھیتوں میں سنہ ۴۸۸ھ میں وہ بیل رک گیا اور اس نے غوث پاک کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا ''مالهذا خلقت ولا بهذا اُمرت '' آپ کی تخلیق اس کام کے لیے نہیں کی گئی اور نہ آپ کو اس کا حکم دیا گیا ہے۔غوث پاک تو پہلے ہی آفاقی سوچ کے حاملِ تھے۔ان کو یہ اشارہ ہی کافی تھا لہٰذا اس کارِ جہاں کو چھوڑ چھاڑ کر گھر تشریف لے آئے اُور گوشۂ تنہائی کی تلاش میں مکان کی چھت پر جا چڑھے۔اچانک ایک قافلے پر نگاہ پڑی جس کی منزل حرمین شریفین تھی۔سوچ کے سوتے سرسبز و شاداب ہو گئے۔خاموشی سے نیچے آئے اور والدہ ماجدہ کی خدمت

Marfat.com

میں درخواست پیش کی''اگر حکم ہو تو زیارت بزرگان اور تحصیل علم کے لیے بغداد چلا جاؤں''ام الخیر کی عمر اس وقت ۷۸ برس کی تھی اور ان کے سامنے اٹھارہ برس کا نورِ نظر بصد احترام کھڑا تھا۔ ضعیفی سود و زیاں کے پلڑے میں ہر چیز تول رہی تھی اور شاہین آسمان کی بے کراں وسعتوں کو عبور کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ سیّدہ فاطمہ کوئی معمولی ماں نہیں تھیں ام الخیر تھیں اور اپنے لختِ جگر کے مقام و مرتبے کا تھوڑا بہت ادراک بھی ان کو تھا۔ چند لمحوں میں فیصلہ ہو گیا۔ وہ چپکے سے اپنی خواب گاہ میں گئیں اپنے سرتاج ابوصالح موسیٰ کا چھوڑا ہوا کل اثاثہ اسّی دینار نکال لائیں پھر اس عمر بھر کی کمائی کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کیا، چالیس دینار غوث پاک کے چھوٹے بھائی کے لیے رکھ لیے اور چالیس دینار پیرہن غوث میں سی کر چھپا دیئے۔

''میرے لختِ جگر، میں جانتی ہوں اس جدائی کے بعد میری آنکھیں تمہارے نورانی چہرے کو ترسیں گی''ام الخیر نے پرنم آنکھوں سے کہا۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ خشک پتے شاخوں سے جھڑ کر نئی کونپلوں کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں کیوں کہ یہی قانون قدرت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب ہماری ملاقات صرف میدانِ حشر ہی میں ہو گی مگر میں کسی صورت بھی تمہاری راہ کی رکاوٹ بننا پسند نہیں کروں گی۔ لیکن ایک وعدہ مجھ سے کرو'' دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔ دو آنکھوں میں ممتا کا سمندر موجزن تھا تو دو میں احترام و سعادت مندی کا بحرِ بے کراں۔

''امی حضور: حکم کیجئے''غوث پاک بصد احترام کہا''آپ کے ہر حکم پر دل و جان سے عمل کروں گا''۔

''بیٹا قرآن میں جھوٹوں پر لعنت کی گئی ہے لہٰذا کچھ بھی ہو جائے جھوٹ سے اجتناب کرنا''

چوں کہ ارشادِ خداوندی اور آپ کا حکم، دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے لہٰذا اس پر عمل کرنے میں میری دلی رغبت اور روح کا میلان بھی شاملِ ہوگا''۔ نوجوان نے اپنی والدہ سے ہمیشہ سچ بولنے کا وعدہ کر لیا اور ام الخیر نے نورِ نظر کو سپردِ خدا کیا۔ اس طرح غوث پاک عازم بغداد ہوئے۔ اس وقت عمر عزیز اٹھارہ برس تھی۔ اکہرے بدن کی وجہ سے نوعمر لڑکا دکھائی دیتے تھے چہرے پر معصومیت جو اندر کی روشنی سے اور بھی بھلی لگ رہی تھی۔ جیلان سے بغداد کا سفر شروع ہوا دستورِ زمانہ کے مطابق یہ سفر ایک قافلے کی ہمراہی میں طے ہو رہا تھا۔ دریائے دجلہ کے کنارے آباد اس مردم خیز علاقے جیلان اور بغداد کے درمیان براستہ واسط، چار سو میل کا فاصلہ اور ایک ماہ کی مسافت تھی (یعنی مروجہ ذرائع آمدورفت کے وسیلے سے)۔ قافلہ ہمدان سے گذر کر جب وادی ربیک میں

Marfat.com

داخل ہوا تو ساٹھ ڈاکوؤں پر مشتمل گروہ غارت گراں کے نرغے میں آ گیا۔غوث پاک فقیرانہ لباس میں تھے لباس مفلسی اور نوعمری کے باوجود ان کی روشن جبین کا سارے قافلے میں چرچا تھا مگر گروہِ ستم گراں کے مسلک میں روسیاہی اور روشن جبینی میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ان کا مسلک صرف ہوس مال وزر تھا۔پل بھر میں ڈاکوؤں نے افرادِ قافلہ کو قلاش کر دیا۔ایک قوی ہیکل ڈاکو،روشن جبیں فقیر سے بھی مخاطب ہوا''اے لڑکے تمہارے پاس بھی کچھ ہے یا ایسے ہی گدڑی پہنے سیر وسیاحت میں وقت گذار رہے ہو''

''ہے کیوں نہیں میرے پاس چالیس دینار ہیں'' روشن جبیں لڑکے نے بلاخوف وخطر اعتراف کرلیا۔

''چالیس دینار؟'' ڈاکو کے لبوں پر حیرت میں ڈوبی مسکراہٹ آ گئی'' کبھی چالیس دینار دیکھے بھی ہیں؟ وہ زیرلب بڑبڑاتا ہوا گدڑی پوش فقیر دکھائی دینے والے لڑکے کو چھوڑ کر کسی دوسرے صاحب مال کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تمہارے پاس کیا ہے لڑکے؟'' ایک دوسرے ڈاکو نے بھی وہی سوال دہرایا۔اس کو بھی وہی جواب ملا مگر یقین اسے نہ آیا تیسرا ڈاکو جہاندیدہ قسم کا تھا۔چالیس دینار کا سن کر وہ اس عجیب وغریب روشن جبیں لڑکے کو پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گیا۔قافلے والے بے سروسامان ہو کر حسرت ویاس سے اس گروہِ ستم گراں کو دیکھ رہے تھے،جنگل کے قانون کا دور دورہ تھا جہاں طاقت ہی قانون ہوتا ہے اور دھونس دھاندلی انصاف۔

''سردار یہ لڑکا کہتا ہے اس کے پاس چالیس دینار ہیں'' ڈاکو نے یہ عجیب وغریب مقدمہ عدالت عالیہ میں پیش کر دیا۔

''جناب کہاں چھپا رکھا ہے آپ نے یہ خزانہ؟'' احمد بدوی ڈاکوؤں کے سردار نے بطرز تفنن پوچھا۔

''میری گدڑی میں بغل کے نیچے'' روشن جبین لڑکے نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔جھوٹ سے ناآشنا زبان کا کوئی یقین نہیں کر رہا تھا۔دغا فریب جن کا اوڑھنا بچھونا ہو،کذب وریا وطیرہ،وہ بدبخت،سچائی کی لذت سے واقعی ناآشنا ہوتے ہیں۔سردار نے خنجر سے گدڑی پھاڑ ڈالی تو چالیس دینار اپنی پوری آب وتاب سے،اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔نہ کم نہ زیادہ سردار ورطۂ حیرت میں ڈوبا کبھی دیناروں کو دیکھتا کبھی روشن چہرے والے لڑکے کو۔پھر جانے کیا ہوا کہ لڑکے نے بھی

Marfat.com

اپنی نگاہیں ڈاکو کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ڈاکو معصوم نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور سر جھٹک کر اس طلسم سے باہر آ گیا۔ ''آپ کو سچ بولنے اور زر کثیر کی نشان دہی پر کس نے مجبور کیا تھا؟'' اب ڈاکو کے لہجے احترام تھا۔

''جناب، میں نے اپنی والدہ ماجدہ سے ہمیشہ سچ بولنے کا وعدہ کر رکھا ہے اور ہر حال میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا' یہی شیوۂ مردانگی ہے۔ روشن جبین لڑکے نے سیدھے سادے الفاظ میں کہا۔ ادھر ڈاکو کی سماعت سے یہ الفاظ ٹکرائے تو اسکی دنیا ہی زیر و زبر ہو گئی۔ جھوٹ کے گھپ اندھیرے میں نورِ صداقت کی قندیل روشن ہو گئی۔ خوش بختی نے اس کے درِ دل پر پہلی دستک دی تو اس کی آنکھیں چھلک گئیں جیسے اتھلی ندی میں سیلاب آ جائے تو وہ فوراً کناروں سے باہر چھلک جاتی ہے۔ گذرگاہ گرد و غبار وغیرہ سے بھری ہوئی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

''آپ اپنی والدہ سے کیئے ہوئے وعدے پر قائم ہیں اور میں بدبخت اپنے خالق کائنات سے کئے ہوئے وعدوں کو یکسر بھلا بیٹھا، عمر عزیز کا سارا سفر رائیگاں گیا یا حسرتی، یہ میں نے کیا کر دیا'' سردار کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے اور وہ عرق انفعال میں ڈوبا، سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

چشم تماشا حیران تھی ہر سمت سناٹا طاری تھا۔ لٹ جانے والے حیران و ششدر کسی انہونی کے منتظر تھے تو لوٹنے والے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ روشن جبین لڑکے نے پروقار انداز میں ایک قدم آگے بڑھ کر اپنا دست مبارک گناہ گار سردار کے کاندھے پر رکھ دیا۔ ''درِ توبہ وقت نزع سے ایک پل پہلے تک کھلا رہتا ہے اپنی جان کو ہلاکت میں مت ڈالو۔'' یہ اس ہاتھ کی کرامت تھی کہ عمل غوث کا کرشمہ، جہاندیدہ سردار نے اس ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا جیسے بھنور میں ڈوبتا ہوا شخص، کشتی کے کنارے کو تھام لیتا ہے۔ شاید اسے ہی ''دست گیری'' کہتے ہیں۔ بہر حال ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ تبلیغ کا یہ منفرد اور انوکھا انداز، چشم فلک نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وادی ربیک کی ان وسعتوں میں، لاؤڈ سپیکر نصب تھے نہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کوئی ڈرا دھمکا رہا تھا مگر سردار کے علاوہ ستم گروں کے پتھر دل موم ہو چکے تھے۔ سردار، کبھی نہ چھوڑنے کے لیے جو ہاتھ تھام چکا تھا اسی کے سہارے اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھیوں نے اس کے اشارہ ابرو پر لوٹا ہوا مال اصل مالکوں کو

Marfat.com

لوٹا دیا، معافی کے خواست گار بھی ہوئے۔ لوٹنے والے خود لٹ گئے اور ایسے لٹے کہ دین و دنیا کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ ساٹھ ڈاکوؤں نے غوث پاک کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ یہ عبدالقادر جیلانیؒ کا پہلا کارنامہ تھا۔ تاریخ تبلیغ دین میں ہے کوئی ایسی مثال؟ ھا تو برھانکم ان کنتم صادقین (سچ کے دعویدار ہو تو دلیل پیش کرو) شیخ محمد بن قائد الا یوانی فرماتے ہیں، میں نے حضرتِ غوث الثقلین سے ایک بار پوچھا ''آپ نے اپنے مسائل کی بنیاد کس چیز پر قائم کی؟'' ''راست گوئی اور سچائی پر'' غوث پاک نے جواب دیا ''میں نے مکتب میں حصول تعلیم کے دوران بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا'' واقعی قندیل صدق روشن ہو تو جھوٹ کا اندھیرا بکھر ہی جاتا ہے

ہے افق سے ایک سنگ آفتاب آنے کی دیر
ٹوٹ کر مانندِ آئینہ بکھر جائے گی رات

تائب ہونے والے ڈاکوؤں کے اس گروہ میں سے اکثر حضرات ''واصلین باللہ'' ہوئے ان کا فرداً فرداً ذکر موضوع سے ناانصافی والی بات ہوگی۔ مناقب غوث پاک کی کتب میں یہ داستان محفوظ ہے۔

ہارون الرشید کے عہدِ خلافت میں جس کا آغاز ولادتِ غوث پاک سے تین صدی پیشتر ہوا، بغداد کرۂ ارض کا علمی ادبی مرکز تھا۔ علم کلام، منطق کے علاوہ یونانی فلسفے کی یلغار بھی ہوئی۔ جس کے نتیجے میں قرآنی مسائل کی من پسند تاویلیں ہوئیں۔ غوث پاک اٹھارہ برس کی عمر میں جب بغداد میں وارد ہوئے تو مباحثوں اور مناظروں کا بازار گرم تھا۔ ایسے ایسے مسائل زیر بحث تھے کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے اور یہ سب کچھ علمی موشگافیوں کی آڑ میں ہو رہا تھا۔ پہلوانانِ سخن، مسلکوں کے خنجر تانے ایک دوسرے پر پل پڑنے کو ہر پل تیار رہتے تھے۔ مقتدی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کی تلاوت کرے یا نہ کرے، یہی بات طے نہیں ہو پا رہی تھی، اس پر شوافع اور احناف کے درمیان کشت خون ہوئے۔ بغداد کے گلی کوچے آئے دن ایسے تماشوں کا مشاہدہ کرتے۔ ''مسائل نظری'' جن کا رونا حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنے دور میں رویا، اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ علامہ موصوف نے تو ان مسائل کو ''شرارت ابلیس'' قرار دیا۔ مسائل میں سرفہرست یہ مسئلہ ہے۔ ''صفات خداوندی عین ذات ہیں یا غیر ذات۔ اب اس کی الجھن ملاحظہ فرمائیں۔ اگر صفات کو عین ذات یعنی ذات کا حصہ قرار دیا جائے تو ذات اور صفات، دو اشیا قدیم ہوئیں اس طرح ''وحدانیت'' مجروح ہوئی۔ اگر صفات کو ذات سے الگ قرار دیا جائے تو ذات

Marfat.com

خداوندی، صفات اور ذات کا مجموعہ ہوا۔ یہ بھی ''واحدنیت'' کی ضد ہے۔ایسے مسائل چوں کہ فلسفیوں اور منطقیوں کی ذہنی ورزشیں ہوا کرتی ہیں۔لہٰذا ہر سیدھی مت والے دانش ور نے ان سے اجتناب کا درس دیا۔علامہ اقبال تو مایوسی کی حد تک ان مسائل سے متاثر ہوئے۔

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب

غوث پاک کی ذاتِ بابرکات کا اعجاز تھا کہ جب انہوں نے بغداد میں قدم رنجہ فرمایا تو ابلیس صفت علماء سو کے چراغ گل ہوگئے (ان کے طریقہء کار کی وضاحت بعد میں اپنے مقام پر آئے گی، یہی مسائل وفاتِ غوث پاک کے ایک ڈیڑھ صدی بعد پھر بغداد میں پیدا ہوئے جب ہلاکو خاں نے ساری بساط ہی الٹ دی) امام تقی الدین اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''روضتہ الابرار'' میں رقم طراز ہیں کہ جب آپ نے بغداد میں داخل ہونے کا ارادہ فرمایا تو خضر علیہ اسلام نے حکم خداوندی، غوث پاک کے گوش گذار کیا۔ جس کی رو سے، سات برس تک، فصیل شہر کے باہر لب دریا آپ نے قیام فرمایا۔ یہی سات برس کا دورانیہ مجاہدات، ریاضاتِ شاقہ، فقر وفاقہ اور تحصیل علم لدنی کے اعتبار سے، سات زمانوں پر بھاری ہے۔ دریا کنارے اگنے والی سبزیوں سے غذا حاصل کرتے رہے جس سے جسم وجاں والا رشتہ تو برقرار رہا مگر گردن سے سبز رنگ جھلکنے لگا۔ اسکے علاوہ جن آزمائشوں سے ان کو گذرنا پڑا تصور واحساس سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک شب غوث پاک درود وظائف میں مشغول تھے کہ ایک سراپا حسن جہاں سوز دوشیزہ اپنے نسوانی ہتھیاروں سے مسلح ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ یہ ایسا ابلیسی وار تھا جس سے بچنا پیغمبری شان کے مترادف تھا۔ یوسف علیہ السلام بھی اس آزمائش سے گذرے تھے لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن میں ان کی سلامتی کو ''برہان ربی'' سے مشروط کیا گیا ہے۔ اگر وہ خدا کی برہان نہ دیکھتے تو ظلم کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑتا جس کے تصور ہی سے ہر مومن کا دل کانپ جاتا ہے۔

''خاتون بے حیا تو کون ہے اور یہاں تیرا کیا کام؟'' غوث پاک نے قہر آلود نگاہوں سے حسنِ جہاں سوز سے پوچھا ''یہ بھول جائیں کہ میں کون ہوں میں تو آپ کی تشنگی مٹانے آئی ہوں'' اس دوشیزہ نے تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا۔ ساری بات پل بھر میں صاف ہوگئی دوشیزہ کا مخاطب بھی کوئی معمولی انسان نہ تھا مادرزاد ولی اللہ تھا اور ولی بھی ایسا جو اپنی مثال آپ تھا ''اچھا تو تم دنیا ہو جو ابلیس لعین سے مسکوت کرنے کے بعد مجھے یادِ الٰہی سے غافل کرنے آئی

Marfat.com

ہو" غوث پاک نے صورت حال کی وضاحت کر دی "مگر محترمہ، میرا جواب بھی وہی ہے جو میرے جدِ اعلیٰ علی المرتضیٰ کا تھا، میں تمہیں تین طلاق دے چکا ہوں اب میری نظروں سے دفع دور ہو جاورنہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ذبح کردوں گا" یہ سننا تھا کہ وہ بجی سنوری دوشیزہ، روتی پیٹتی غائب ہوگئی واپس جاتے وقت اس کی صورت اتنی مکروہ تھی کہ اگر ایک عام آدمی بھی اسے دیکھ پاتا تو سامان دنیا کو واقعی طلاق بائن (غیر رجعی) دے دیتا۔ آخر کار ایک شب ندائے غیبی نے مژدہ سنایا "عبدالقادر، اب تم بغداد میں داخل ہو سکتے ہو" فصیل شہر سے باہر، لب دریا، سات برس تک قیام کی وضاحت کوئی دشوار مرحلہ نہیں۔ شہر کے اندر جو طوفان بدتمیزی بپا تھا اس کا قلع قمع کرنے کے لیے "سالار جیش" کی تربیت بے حد ضروری تھی تاکہ کہیں پائے استقامت میں لغزش نہ آجائے۔ غوث پاک نے آں حضرت کے نقش پا پر چل کر جو فریضہ ادا کرنا تھا وہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

فصیل شہر سے باہر سات برس قیام والی روایت کی سچائی زیر بحث نہیں۔ مناقب غوث کی مستند کتب میں یہ موجود ہے۔ بہر حال ارشادِ رسالت مآبؐ کے عین مطابق جیلان کا غریب الدیار مفلس طالب علم بغداد میں داخل ہوا اور مدرسہ نظامیہ میں اکتساب علم میں مصروف ہو گیا۔ اسے بغداد کی بلند مرتبہ یونیورسٹی کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ کیسے کیسے یگانہ روزگار اساتذہ بیک وقت علم و آگہی کی قندیلیں روشن کیے بیٹھے تھے درس گاہ کا گوشہ گوشہ بقعہ نور ہو رہا تھا ادب و تفسیر کی بات چلتی تو پھر چلتی ہی رہتی ابوزکریا تبریزی دنیائے ادب کا مہر پُر تنویر تھا کہ۔

جب بھی اس کی بات چلی ہے
ساری ساری رات چلی ہے

کی منہ بولتی تصویر فقہ و اصول کے آفتاب عالمتاب علی ابن عقیل حنبلی اور ابوالحسن محمد بن قاضی ابوالعلیٰ حنبلی پھر شیخ ابوالخطاب محفوظ الکلوذانی، مشائخ حدیث میں ابوالبرکات طلحہ العاقولی، ابوالغنائم محمد بن علی میمون الفرسی، ابوعثمان اسمٰعیل بن محمد الاصبہانی، ابوطاہر عبدالرحمن، ابوغالب الباقلانی، ابوالغز بن محمد بن المختار الہاشمی اور ابومنصور عبدالرحمن القزاز۔ گویا سارے عراق کی علمی شخصیات کا جھرمٹ تھا کہ بغداد کی اس درس گاہ کو فیض یاب فرمارہا تھا۔ بے شک مدرسہ نظامیہ مینار نور کا درجہ رکھتا تھا مگر جیلان کے سے دور افتادہ مقام سے روشن جبیں طالب علم نے جب اس چار دیواری میں

Marfat.com

قدم رکھا در و دیوار۔ نے اھلاً و سہلاً و مرحبا کہا مگر افسوس کوئی ایک حیوان ناطق آنے والے کے مقام و مرتبے کو پہچان نہ پایا۔ جس طرح دوسرے تہی داماں طالب علم چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے اس دنیاوی بے سروسامان کو بھی تہِ سنگِ آسیا ہونا پڑا۔

فصلوں کی کٹائی کا موسم آیا تو حسب دستور طلباء دیہاتوں کی جانب نکل پڑے تا کہ اپنے اپنے مقدر کی مہر لگے، اناج کے دانے اکھٹے کرلائیں اور دوران تعلیم آتش شکم ٹھنڈی کرتے رہے۔ کیسی ستم ظریفی تھی۔ وہ جو غوث الثقلین کے مقام و مرتبے پر فائز ہونے والا تھا۔ اسے بھی ان کاسہ گدائی والوں کا ساتھ دینا پڑا۔ بغداد کے نواحی گاؤں یعقوبا پہنچے تو ایک زمیندار شریف یعقوبی کی چشم حیراں نے قوس قزح کے رنگوں کو پہچان لیا۔ کرگسوں میں شاہین کو پہچاننا اگر چہ کوئی حیرت انگیز کارنامہ نہیں پھر بھی شریف یعقوبی کو داد نہ دینا بخل سے کام لینے والی بات ہے۔

''فرزند: تمہارا نام کیا ہے اور کس خاندان کے روشن چراغ ہو؟'' زمیدار نے اپنے تجس کی پیاس بجھائی۔

''بندے کو عبدالقادر کہتے ہیں اور خاندان کی عظمت کا اعتراف روزانہ پانچ مرتبہ کرۂ ارض کے گوشے گوشے سے ہوتا ہے'' طالب علم نے چونکا دینے والا جواب دیا۔

''بیٹا: نجیب الطرفین مردانِ خدا، دست سوال دراز نہیں کیا کرتے، زمانے کو دستِ نگر بناتے ہیں'' زمیدار نے بڑی رسان سے کہا ''اس گھرانے کے لوگ تو منگتوں کو سلطنتیں عطا کرتے ہیں، مگر شاید لوح محفوظ پر اسی طرح مرقوم ہے۔''

اس پل اس گھڑی کے بعد آپ نے درس گاہ کے اس دستور پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا اور اناج حاصل کرنے والے طلباء کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ طالب علم کو دوسرے طلباء کی طرح بھوک ستاتی تھی اور وسائل سے دامن یکسر خالی تھا۔ یہ بھی تو جدِ اعلیٰ کے نقش قدم پر چلنا تھا کہ کائنات کا سب سے بڑا انسان، رحمت مجسم، گداؤں کو ہفت اقلیم کی دولتیں لٹانے والے کے اپنے گھر میں چولھا اکثر و بیشتر ٹھنڈا ہوا کرتا تھا۔ جن کے مراتب بلند ہوں ان کی آزمائش بھی پہاڑوں ایسی ہوتی ہیں۔

''بھائی: ڈیڑھ روٹی بطور قرض دے دیا کرو قدرت ہوتے ہی قرض چکا دوں گا'' ایک قریبی نان فروش سے آپ نے تنگ آ کر کہا۔ بات اس لب و لہجے میں کی گئی کہ ان پڑھ نانبائی کا کلیجہ کٹ کے رہ گیا۔

Marfat.com

''جانِ عزیز: جب چاہیں اور جو چاہیں لے جایا کریں'' نانبائی آبدیدہ ہو گیا۔ آنسوؤں کی دھند کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ صاف رکھنے والی ہستی کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح لرزاں لہجے میں مدعا گم ہو جاتا ہے اور الفاظ کا پیراہن نامناسب رہ جاتا ہے۔ کچھ عرصہ اس کشمکش میں گذرا نانبائی کا قرض بڑھتا چلا گیا اور غوث پاک کی تفکیر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ قرض ''صراف قدر'' کی مہربانی سے ادا ہوا۔ (وہ ہستی جو بطور خاص اولیاؤں کا قرض چکانے کے لیے منجانب اللہ مقرر ہوتی ہے) آپ کو ایک سونے کا ٹکڑا مہیا کیا گیا اور نانبائی کے قرض سے سبکدوشی ہوئی۔ جبین نیاز سجدے میں جھک گئی۔ اسی تنگی ترشی میں دو برس بیت گئے۔ بغداد میں خشک سالی کا دور دورہ ہوا۔ زمین بوند بوند کو ترسی، سبز پتے زرد ہو گئے۔ اشجار بے برگ و بار ہوئے فصلیں جھلس گئیں اور قحط پھوٹ پڑا۔ اس زمانے میں آپؒ کا قیام محلہ قطبیہ شرقیہ میں تھا (ایک روایت کے مطابق یہ واقعہ اس محلے میں پیش آیا اور آپ نے عبداللہ سلمی سے بیان فرمایا) تفصیل ملاحظہ ہو۔ تنگ دستی کے وہ ایام ایسے تھے کہ اشیائے خوردنی خواب و خیال ہو کر رہ گئیں جسم و جاں کا سلسلہ برقرار رکھنے کے لیے ان اشیا کی بہرحال ہر ذی روح کو ضرورت ہے۔ ایک شخص اچانک کاغذ کا ایک پرزہ آپ کو تھما کر چلا گیا۔ کاغذ میں کچھ رقم موجود تھی۔ یہ گویا امدادِ غیبی والا ماجرا تھا آپ نے اس رقم کا کھانا وغیرہ خریدا اور محلے کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ دل میں طرح طرح کے خیال اٹھ رہے تھے۔ جن سے فصیل جاں سپرِ اضطراب ہو گئی اور آپ نے قبلہ رو بیٹھ کہ کھانے یا نہ کھانے کے متعلق غور و خوض فرمانا شروع کیا۔ سمت قبلہ سے رشتہ استوار ہوا تو یقین کامل تھا کہ غیب سے راہنمائی کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔

دیوار مسجد کے قریب ایک کاغذ دکھائی دیا جس کا وجود یقیناً چند لمحے پہلے وہاں نہیں تھا۔ آپ نے لپک کر اسے اٹھایا کاغذ پر واضح حروف میں تحریر تھا۔ ''ہم نے کمزور مومنین کے لیے خواہش رزق پیدا کی تا کہ وہ بندگی کے لیے اس سے قوت حاصل کریں'' آپ نے اپنا رومال اٹھایا کھانا اسی جگہ رہنے دیا۔ دو رکعت نماز ادا کی اور مسجد سے باہر آ گئے۔ آپ کی نگاہ میں صرف لفظ ''کمزور مومنین'' اہمیت کا حامل تھا۔ وسائل کی کمی مسائل کو جنم تو ضرور دیتی ہے مگر نگہہ غوث میں ایمان کی کمزوری کا وسائل سے اگر کوئی تعلق تھا تو وہ ''تعلق معکوس'' ہونا چاہیے تھا یعنی وسائل کی کمی ایمان کی مضبوطی کا سبب ہونا چاہیے تھی نہ کہ اس سے برعکس۔ بغداد میں تحصیل علم کا یہ دورانیہ بڑا ہی صبر آزما تھا۔ مفلسی الگ سدِ راہ ہوتی۔ اپنے صبر و استقلال اور مجاہدے کے متعلق خود غوث پاک

Marfat.com

فرماتے ہیں ''اس دوران جتنی مشقتیں میں نے برداشت کیں اگر پہاڑوں پر ڈال دی جاتیں تو وہ پارہ پارہ ہو جاتے، جب تکالیف میری برداشت سے باہر ہو جاتیں تو میں سر بسجود ہو کر صدق دل سے تلاوت کرتا'' فَاِنَّ مع العسر یُسراً اِنَّ مع العسر یُسراہ ً (بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے) پھر جب سجدے سے سر اٹھاتا تو سکون کی دولت سے مالا مال ہو چکا ہوتا۔ علم فقہ حاصل کرنے کے دوران میں اکثر ویرانوں میں راتیں بسر کرتا۔ اونی لباس اور پا پیادہ کانٹوں پر چلنا پڑتا۔ درختوں کے پتے اور خودرو گھاس پھوس سے پیٹ بھر لیتا لوگوں نے مجھے دیوانہ بھی قرار دیا' کئی بار مجھے مردہ سمجھ لیا گیا۔

ایک بار غوث پاک کو مسلسل بیس روز تک کوئی مباح شے میسر نہ آ سکی جس سے آتش شکم کو ٹھنڈا کیا جا سکتا۔ مجبوراً آپ ایوان کسریٰ کے کھنڈرات کی طرف چل پڑے۔ وہاں ایک اور ہی طرفہ تماشا آپ کا منتظر تھا۔ وہاں پہلے ہی چالیس اولیا (بعض روایات کی مطابق ستر) اسی جستجو میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے انہیں دیکھ کر غوث پاک اپنی تکلیف بھول گئے اور واپس شہر کی جانب چل پڑے۔ فصیل شہر کے قریب ہی آپ کی ملاقات ایک آشنا سے ہوگئی جو آپ ہی کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ جیلان کا یہ باشندہ آپ کے گھر سے کچھ رقم لایا تھا جو ام الخیر نے ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھیجی تھی۔ غوث پاک نے سجدہ شکر ادا کیا اور اس رقم سے کھانے پینے کی اشیا خرید کر کھنڈرات میں مارے مارے پھرنے والے اولیاؤں کی دعوت کر ڈالی یہ بات مستند ہے کہ غوث پاک، کھانا کھلانے کے عمل کو بہترین قرار دیا کرتے تھے۔

شہر سے باہر ویرانے میں ایک برج تھا جہاں آپ نے مسلسل گیارہ برس، شب و روز عبادت و ریاضت میں گذار دیئے۔ اس بنا پر اس برج کا نام ہی ''برج عجمی'' پڑ گیا۔ بھوک سے متعلق ایک اور واقعہ جو خود غوث پاک نے ابو بکر تمیمی سے بیان فرمایا وہ کچھ اس طرح ہے ''قیام بغداد کے دوران ایک روز میں بھوک سے جاں بہ لب ہو گیا۔ چند روز تک جب بھوک مٹانے کی کوئی سبیل نہ ہو سکی تو میں مجبوراً دریا کنارے جا پہنچا تاکہ گری پڑی گھاس وغیرہ سے اس کا تدارک کر سکوں۔ وہاں مجھے چند لوگ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے نظر آئے۔ میں یہی سمجھا کہ وہ سب مجھ جیسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ مزاحمت کو نامناسب تصور کرتے ہوئے میں واپس آ گیا اور ریحانین کے بازار میں موجود مسجد میں جا پہنچا اس وقت میں بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا مگر دست سوال دراز کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بھوک سے میری موت واقع ہو جائے گی۔

Marfat.com

اچانک مجھے روٹی اور بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز مہک نے بے تاب کر دیا۔ ایک عجمی نوجوان یہ نعمت لے کر مسجد میں داخل ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ کر گوشت روٹی کھانے لگا۔ ایک بار تو بھوک کی شدت سے میرا منہ کھل گیا۔ پھر میں نے نفس کو ملامت کی زد پر رکھ لیا۔ اچانک وہ نوجوان میری طرف متوجہ ہوا "آیئے جناب بسم اللہ کیجئے" اس نے مجھے دعوت دی مگر میں نے انکار کر کے اپنے نفس کو ایک اور کوڑا رسید کیا۔ اس نوجوان کا اصرار بڑھتا چلا گیا تو میں اس کی دل شکنی کو ناپسند کرتے ہوئے اس کی دعوت قبول کر لی۔

"آپ کا شغل کیا ہے؟" اس شخص نے برسبیل تذکرہ مجھ سے پوچھا۔

"میں درس گاہِ نظامیہ میں علم فقہ کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"آپ کس غرض سے بغداد تشریف لائے ہیں" میں نے بھی اس کا احوال دریافت کیا۔

"غرض تو جو تھی سو تھی آج کل مجھے عبدالقادر جیلانی کی تلاش ہے، مگر اس شہر ناسپاس میں، میں خود گم ہو کے رہ گیا ہوں" اس نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کا مطلوبہ شخص میں ہی ہوں، میرا ہی نام عبدالقادر ہے" میں اس حسن اتفاق پر حیران رہ گیا۔ میرا جواب سن کر اس شخص کا رنگ پھیکا پڑ گیا پھر اس نے اپنی روداد رنج و غم بیان کی۔

"خدا کی قسم جب میں آپ کی تلاش میں بغداد پہنچا تو میرے پاس تین روز کا زادِ راہ موجود تھا مگر میں آپ کی تلاش میں ناکام رہا تو مزید تین روز آپ کو بھوکا پیاسا تلاش کرتا رہا۔ میرے پاس آپ کی کچھ رقم بطور امانت موجود تھی مگر اس سے خرچ کرنے کا تصور بھی میرے لیے سوہان روح تھا۔ آخر میرے کیفیت اس حد تک دگرگوں ہوئی۔ جہاں شریعت لقمہءِ حرام کو بھی جائز قرار دے دیتی ہے۔ تب میں نے آپ کی رقم سے یہ روٹی سالن خریدا، لہٰذا یہ آپ ہی کا مال ہے، اطمینان سے شکم سیر ہو کر کھایئے اور مجھے اپنا مہمان تصور کیجئے" پھر وہ شخص امانت میں خیانت کے ارتکاب پر مجھ سے معذرت طلب کرنے لگا۔

غوث پاک کی حیاتِ طیبہ کے یہ واقعات بالتفصیل دو وجوہات کی بنا پر بیان کیے گئے ہیں۔ پہلی یہ کہ آج کے طلباء اشیا کی فراوانی سے نگاہیں ہٹا کر، صرف ایک پل کے لیے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھ سکیں اور اندازہ لگائیں کہ تحصیل علم کے لیے کن مصائب کا سامنا کر کے مقام و مرتبے پر فائز ہوا جاتا ہے۔ علم دین حاصل کرنے والے طلباء بھی اس سے مستثنےٰ قرار نہیں دیئے جا سکتے، سنتِ رسول کی اتباع میں سُرمہ لگانا تو وہ ہرگز نہیں بھولتے مگر جہاں ذرا سی تنگی

Marfat.com

ترشی کا سامنا ہوا جھٹ قرض حسنہ کا کشکول لیے ادھر اُدھر بھاگنے لگتے ہیں اور دعویٰ اتباع رسول گایا ان کے غلاموں کی پیروی کا کیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ وسائل کی فراوانی کسی زمانے میں بھی، کسی جگہ مقام پر، تقرب الٰہی کی دلیل نہیں رہی، بلکہ وجہ آزمائش و ابتلا ضرور رہی ہے۔ اس دورِ ابتلا کا زمانہ برسوں پر محیط ہے۔ فاقہ مستیاں رنگ لاتی رہیں مگر علم و آگہی پر، عمر عزیز چوبیس برس کی ہوئی تو سنہ ۴۹۶ھ میں درس گاہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ دستارِ فضیلت باندھی گئی تو پورے بغداد میں مروجہ علوم کے لحاظ سے کوئی ہم پلّہ نہ تھا۔ فخر و انبساط کا حق تھا تمکنت روا تھی مگر کھنکتی ہوئی نیک مٹی سے خمیر اٹھایا گیا تو فخر و تمکنت کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ ادھر میدان عمل میں قدم رکھا تو ایک طوفان بدتمیزی اپنی لپیٹ میں لینے کو بے قرار نظر آیا۔ بغداد کے کوچہ و بازار میں فروعی مسائل پر مناظرے، کشتی گاہوں میں دنگلوں ہی کے انداز میں انعقاد پذیر ہوتے۔ دلائل کے خنجروں سے ایک دوسرے کو قائل و گھائل کیا جاتا۔ کہیں معتزلہ، عقل کی اپسراؤں کے ناز اٹھا رہے ہیں۔ کہیں رافضیت و شیعیت دست و گریباں، خلق قرآن کا مسئلہ الگ تھا۔ محدثین اپنے نکات ہائے فکر کی ترویج و ترقی میں کوشاں، غوث پاک کو محسوس ہوا جیسے اس طوفان میں گھر گئے تو سلامتی ایمان کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ان کے سامنے دو راستے تھے۔ یا تو پوری تن دہی سے طوفان کا مقابلہ کرتے یا کترا کر نکل جاتے، حیران کن بات یہ ہوئی کہ آپؒ نے موخر الذکر پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کیا مگر اس کی وضاحت سے پیشتر اس وقت زیر بحث موضوعات کا مختصر تعارف بے حد ضروری ہے تاکہ سیاق و سباق کے تناظر میں صورتِ حال کی وضاحت ہو سکے۔

اسلام میں فرقہ بندی کا آغاز شیعہ خوارج سے کیا جاتا ہے جن کی بحث و تکرار کا تعلق عقائد کی بجائے آئین و سیاست سے تھا۔ دوسرے صدی ہجری میں ان جماعتوں نے اپنے اپنے عقائد مرتب کیے۔ خالص عقائد کی بنا پر پہلی گروہ بندی واصل بن عطا کی ذہنی کاوش کا ساختسانہ تھا۔ یہ زمانے بھر کا چرب زبان شخص خواجہ حسن بصری کا شاگردِ خاص تھا۔ مسئلہ جبر و قدر پہلا نزاعی مسئلہ تھا جس کی آڑ میں بنو امیہ خاندان نے اپنے مظالم کے جواز میں دلائل مہیا کیے۔ "ہر چیز جب منجانب اللہ ہے تو انسان مجبورِ محض ہوا لہٰذا ہماری طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں کی جا سکتی اگر ایسا کر بھی دیا جائے تو ہم گنہگار نہیں ہو سکتے"

خواجہ حسن بصری کا حلقہ درس مذہبی اور فلسفیانہ بحث و تمحیص کا مرکز تھا مگر آپ اہل سنت

Marfat.com

والجماعت کا مسلک معتدل یعنی بین الجبر والاختیار کی تشہیر فرماتے جو حکام وقت کے سراسر خلاف تھی حکام وقت انسان کو مجبورِ محض خیال کرتے لیکن اس کے برعکس واصل بن عطا انسان کو مختارِ مطلق تصور کرتا تھا۔ استاد و شاگرد کے درمیان اختلاف کی یہ خلیج اتنی وسیع ہوئی کہ واصل نے اپنا حلقہءِ درس الگ کرلیا اور عربی لفظ اعتزلن "(ہم الگ ہوتے ہیں) سے فرقہ "معتزلہ" معرض وجود میں آیا۔

معتزلہ خالص عقل پرست تھے حتیٰ کہ روایت کو بھی عقل کی کسوٹی پر تولتے پرکھتے لہٰذا محدثین سے ان کا ٹکراؤ ناگریز تھا جن کے نزدیک دین کی اساس ہی نقل و روایت پر تھی۔ پھر یوں ہوا کہ یونانی فلسفہ جب عربی لباس پہن کر تشریف لایا تو معتزلہ نے اسے سینے سے لگالیا اور اس طرح تین گروہ واضح طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ یعنی

خواجہ حسن بصری کی اتباع کرنے والے یا ہم خیال۔ روایت عقل اور وجدان میں توازن کے حامل معتزلہ عقل پرست اور محدثین روایت پرست۔ محدثین نے جب گنہگار پر انعام اور بے گناہ کو سزا دینے کو ممکن قرار دیا تو معتزلہ نے اسے خلاف عدل ثابت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اہل عدل بھی کہنا شروع کیا۔

محدثین نے کہا کہ اشیا میں کوئی شے فی نفسہ اچھی بری نہیں ہوتی نہ شریعت میں وہ اچھی بری ہوتی ہیں معتزلہ نے اسکی سخت مخالفت کی۔ یعنی چیزیں اپنی اصل میں اچھی بری ہوتی ہیں اور شریعت سودمند اشیا کا حکم دیتی اور نقصان دہ سے گریز کی تلقین کرتی ہے اور بھی اختلافات تھے مگر سب سے بڑا اختلاف "خلق قرآن" کا تھا۔ معتزلہ کے ہاں قرآنی الفاظ حادث اور نو پیدا ہیں اور قران مخلوق لہٰذا کل نفس ذالقة الموت کے تحت قرآن بھی تلخی۔ موت چکھے گا یعنی مٹ جائے گا۔ محدثین نے اسے پرلے درجے کی جہالت قرار دیا، انہوں نے کہا قران کلام خداوندی ہے اور کلام صفت الٰہی ہے۔ صفات الٰہی قدیم اور غیر مخلوق ہیں لہٰذا قران غیر مخلوق ہوا۔

اس فتنے کو اصل عروج مامون الرشید کے عہد خلافت میں ہوا وہ خود عقیدۃً معتزلی تھا۔ یونانی فلسفہ اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس نے حکم جاری کردیا کہ قران کو مخلوق تسلیم کیا جائے اور یہ کہ قران کو غیر مخلوق کہنا شرک ہے۔ مامون کے بعد اس کا بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلا مگر امام احمد بن حنبلؒ ان ملحدانہ عقائد کے سامنے دیوارِ چین بن کر کھڑے ہو گئے۔ مستعصم اس زمانے میں طرطوس میں مقیم تھا۔ امام احمد بن حنبل کو پابہ زنجیر طلب کیا گیا۔ عذاب زنداں میں کوئی نسبیت علمی

Marfat.com

کام آئی نہ رشتہ آ گہی۔ سب حوالے دھواں ہوئے۔ امام کی پشت پر کوڑے لگانے کا انداز یہ تھا کہ ہر دو کوڑوں کے بعد دست ستم تبدیل کر دیا جاتا اور تازہ دم جلاد، میدان میں مشق ستم فرمانے اترتا۔ اقلیم فراست میں سزا کوئی دلیل نہیں ہوا کرتی لہٰذا امام موصوف کے پائے استقامت میں لغزش نہ آ سکی۔

امام احمد بن حنبل، امام شافعی کے مایہ ناز شاگرد تھے۔ ان کے نزدیک احکام شرعیہ کا مبنی بر مصلحت ہونا یعنی عقلی مصلحت کے عین مطابق ہونا ضروری نہیں تھا۔ انہوں نے تو اپنے استاد کے ''قیاس در فقہ'' کو بھی کم سے کم کر کے فقہ کو روایت پر منحصر کر دیا اور قیاس کو کتاب و سنت کی تفہیم و تعبیر کے لیے ناقص قرار دیا۔ ابتدا میں امام موصوف تصوف اور ارباب تصوف کے مخالف تھے۔ بعد میں حارث محاسبی کی صحبت میسّر آئی تو تصوف کے قائل وگھائل ہو گئے۔ اس حنبلیت کی تعلیم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے اساتذہ سے حاصل کی اور اسی کے مطابق غنیۃ الطالبین، زمانہ طالب علمی کے فوراً بعد تصنیف فرمائی جو ایک عام حنبلی عقائد کے حامل انسان کا دستور زندگی ہے۔ معرفت خداوندی کو بھی حنبلی عقائد کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا دلچسپ ترین حصہ مسلمانوں میں تہتر فرقوں کے عقائد پر تبصرہ وغیرہ ہے۔

اسلام میں شریعت یعنی زندگی بسر کرنے کے ظاہری قوانین اور طریقت میں پہلا اختلاف سیّدنا عثمانؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوا۔ امیر معاویہؓ اور ان کے رفقاء پر کثرت دولت کی فراوانی سے چند ناپسندیدہ اشیا حاوی ہونا شروع ہوئیں مثلاً نام و نمود کی نمائش، مفاد پرستی، سطحیت جناب ابوذر غفاریؓ نے ان پر اعتراض کیا۔ امیر معاویہؓ نے از روئے شریعت اپنا دفاع کیا، معاملہ سیدنا عثمان غنیؓ کی خدمت میں پیش ہوا تو امیر معاویہؓ اپنا موقف واضح کرنے میں زیادہ کامیاب و کامران ہوئے اور اس طرح ابوذرؓ گوشہ نشین ہو گئے مگر ان کی جگائی ہوئی جوت دلوں کو روشن کرتی رہی۔

شریعت اور طریقت میں دوسری بار واضح ٹکراؤ جنابہ رابعہ بصریہ کے عہد میں ہوا۔ انہوں نے جزا و سزا کے تصور کو جو، خوف اور لالچ کے محدود حصار میں مقید ہو چکا تھا۔ محبت کی وسیع و عریض اور مضبوط بنیاد فراہم کی۔ محبت کے بحر بے کراں میں تمام تلخ تجربے خود بخود ڈوب گئے۔ طریقت کا یہ پہلو بڑا روشن دل کش اور من موہنا تھا۔ تیسری بار یہ اختلاف کھل کر اس وقت سامنے آیا جب حضرت جنید بغدادی نے درس گاہ کے عین سامنے در خانقاہ کھولا اور اسرار و رموز کے

Marfat.com

چہرے سے نقاب الٹ دیا۔ طریقت کے حسن جہاں سوز کا مقابلہ اس کے سوز و گداز کا سامنا شریعت کی ''درشتی'' کے بس کی بات نہ تھی لہٰذا اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

رہی سہی کسر امام غزالیؒ نے اس وقت پوری کر دی جب درس گاہِ نظامیہ کی صدر مدرسی کو لات مار کر وہ حلقہ درویشاں میں جا بیٹھے۔ پھر جب لوٹے تو تصوف کو دینی اور فقہ کو دنیاوی علم قرار دے کر وسعت اختلاف کو ناقابل عبور بنا دیا۔

ایک اور گروہ بھی بغداد میں بڑا طاقت ور تھا۔ ان کے خیال میں سیاسی اور روحانی پیشوائی پر صرف اور صرف ایک خاندان کا حق ہے اور رہے گا۔ یعنی شیعیت اس عقیدے کی ابتداء بنوامیہ کی سیاسی بالادستی کے خلاف جدوجہد کے دوران ہوئی۔ بنو ہاشم کے افراد نے جب اس کا آغاز کیا تو اپنے فضائل کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس پر استحقاق کا رنگ غالب آتا گیا اور پھر افکار و عقائد کا پورا نظام وجود میں آ گیا۔ یہ سنجیدہ کوشش میمون القداح نے فرمائی جو محمد بن اسمٰعیل بن جعفر صادق کا اتالیق تھا۔ میمون القداح سے پیشتر شیعیت کے مخصوص عقائد کا وجود کہیں نہیں ملتا۔ حد یہ کہ بنوامیہ کے خلاف بنو فاطمہ اور بنو عباس کی مشترکہ جدوجہد میں بھی بنو امیہ کے خلاف شدید نفرت کے سوا کسی نظام عقائد کا پتہ نہیں چلتا اور بنو عباس نے بھی برسر اقتدار آ کر سنی عقاید ہی کا اظہار کیا۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے جب عملی دنیا میں قدم رکھا تو مصر میں باقاعدہ شیعیت کی شاخ اسمٰعیلیوں کی حکمرانی تھی اور ان کی نزاری شاخ جو خوف و دہشت کا نشان تھی اکابرین اہل سنت کے سر قلم کرنے میں مصروف تھی۔ اس طاقت کی موجودگی سے بغداد میں رافضیت و شیعیت کو تقویت مل رہی تھی۔ ان مصروضی حالات کی بنا پر غوث پاک کو سلامتی ایمان کی فکر دامن گیر ہوئی اور انہوں نے بغداد کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ پنچھی اور درویش دونوں سفر کی تیاری وغیرہ میں وقت برباد نہیں کرتے بس ارادہ کیا پر سمیٹے اور چل دیئے۔ حضرت شیخ نے بھی قرآن بغل میں دبایا اور چل دیئے فصیل شہر کا دروازہ عبور کرنے لگے تو ندائے غیبی پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

''عبدالقادر! خلق خدا سے منہ موڑ کر خالق کو کن ویرانوں میں پاؤ گے''؟ عجیب قسم کی گونج سماعت سے ٹکرائی

''مجھے خلق خدا سے کیا لینا دینا مجھے بس سلامتیءِ ایمان درکار ہے'' شیخ نے زیر لب دہرایا۔

''ایمان لٹنے کے مواقع ویرانوں میں بھی کم نہیں ہوتے، خلق خدا کو محروم فیض نہ کر، بغداد میں تیرا

Marfat.com

ایمان سلامت رہے گا"

غوث پاک کی ہمت جواب دے گئی اور ترک بغداد کا خیال دل سے نکل گیا مگر افسردگی تھی کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اتنا کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی اندر کی آنکھ بصیرت کو ترس رہی تھی۔ ظاہری علوم سے فصیل جاں کا گوشہ گوشہ منور تھا مگر پھر بھی تاریکی کا احساس پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ بازار سے گذر رہے تھے تو کسی نے دریچہ کھول کر صرف ایک جھلک دکھلائی۔

"عبدالقادر کل کیا معاملہ درپیش تھا" نورانی بزرگ نے یہ کہہ کر دریچہ بند کر لیا اور جلوگی سے بھی محروم کر دیا۔ حضرت شیخ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے اور کوشش بسیار کے باوجود دریچے کو تلاش نہ کر سکے۔ بند دریچہ بیشک نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر چہرہ، گداز دل پر نقش ہو چکا تھا۔ آخر زمینی چہرہ تھا کوئی آسمانی مخلوق نہ تھی۔ غوث پاک نے سراغ پا ہی لیا۔ یہ تھے شیخ حماد الاباس بن مسلم۔ پیر طریقت اور حضرت شیخ کے استادِ اوّل جنہوں نے آپ کو رہ عشق کا راستہ دکھایا۔ وہی راستہ جس کا آغاز اضطراب اور انجام سوختہ سامانی ہے۔ بحرِ عشق واحد سمندر ہے جو ساحل پر بھی اتنا گہرا ہوتا ہے جتنا ساحل سے دور بیچ بھنور میں۔

شیخ حماد دمشق کی نواحی بستی اصبہ کے باشندے تھے۔ عرصہ دراز سے بغداد نقل مکانی کر آئے تھے۔ محلہ مظفر یہ میں خرمے کا شیرہ فروخت کرتے کرتے شیرینیءِ قلب تک رسائی حاصل کر لی۔ اہل دل میں ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ باطنی لذت سے آشنا ہونا ہوتا تو لوگ درِ حماد پر آ دستک دیتے اور لذتِ قلب ونظر سے سرور حاصل کرتے۔ سرد اور تاریک رات میں زمستانی ہوا دو دھاری تلوار کی طرح کاٹ رہی تھی جب آپ شیخ حماد کے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔

تمام مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ شیخ حماد باس بن مسلم میں زہد وطریقت اور مکاشفے کا کوئی ایک بھی وصف نہ ہوتا جب بھی ان کے مقام ومرتبے کے لیے، غوث الاعظم کا استاد ہونا ہی کافی ہے۔ یہ تو رب کائنات کا کرم ہے جو مرتبہ جس کو عطا کر دے "ایں سعادت بزور بازو نیست" بہر حال کوئی بد بخت ہی اس سے انکار کی جرات کر سکتا ہے ورنہ عبدالقادر جیلانی کا استاد ہونا عظمت کی ایسی دلیل ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ حماد کا شمار اس دور میں بھی علماء راسخین میں ہوتا تھا۔ شاگردان رشید کو علوم ظاہری وباطنی سے آراستہ کرنے میں ان کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ شیخ ابوالوفا تک آپ کے اقوال زریں بصد احترام سنا کرتے تھے۔ کشف وکرامت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ ایک بار امیر شہر گھوڑے پر سوار نشے کی حالت میں سرِ پُر غرور بلند کیے چلا آ رہا تھا

Marfat.com

سامنے درویش بے ریا آ گیا۔گویہ تکبر اور خاکساری میں ٹکراؤ ہو گیا۔امیرِ شہر کو لازم تھا کہ کترا کر نکل جاتا مے نوشی اور رندی کا بھرم رہ جاتا مگر وہ اقتدار کے گھوڑے پر سوار تھا۔پاپیادہ درویش کو کیسے خاطر میں لاسکتا تھا ادھر اس کی مسکراہٹ نے جلتی پہ تیل کا کام کیا، یہ گویا گناہ پر اترانے والی بات تھی۔شیخ حماد نے قہر آلود نگاہ ڈالی تو انسان کی بجائے حیوان متاثر ہوا لہٰذا آپ نے گھوڑے ہی سے خطاب فرمایا ''اے اللہ کی مخلوق اس متکبر امیر کو بہت دور لے جا'' ادھر یہ الفاظ ادا ہوئے ادھر گھوڑا برق رفتاری سے بھاگا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔کسی کو خبر نہ تھی کہ اسپ تازی اور سوار کو زمیں کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔چند روز بعد خود شیخ حماد نے یہ عقدہ حل کیا ''وہ دونوں اس سرزمیں سے بہت دور جا چکے ہیں گھوڑا اسے جبلِ قاف کی دوسری جانب لے گیا ہے اور خدا کی قسم اب وہ امیر، یوم حشر کو اسی جگہ سے اٹھایا جائے گا''

ان کے زہد وتقویٰ کا یہ واقعہ تو بڑا مشہور ہے ایک روز شیخ حماد، معروف کرخیؒ کی زیارت کو جا رہے تھے ان کے کانوں میں کسی مغنیہ کی سُریلی آواز آئی۔آلاتِ موسیقی کی سنگت بھی ساتھ ہی تھی۔شیخ وہیں سے واپس ہو لئے گھر آ کر اہل خانہ کو جمع کیا اور سنجیدگی سے دریافت فرمایا۔''آج مجھے کس گناہ کی سزا دی گئی ہے؟'' پتہ چلا کہ اہل خانہ نے ایک برتن خریدا تھا جس پر تصورِ کندہ کی ہوئی تھی۔تقوے کی انتہا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی کوتاہی کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔مناسب اسباب کی فراہمی خود صاحب بندہ فرما دیتا ہے۔دوسری ذہن میں رکھنے والی بات یہ ہے کہ جن کے مراتب بلند ہوں ان کی آزمائشیں بھی کڑی ہوتی ہیں۔ہوا کہ دوش پر اڑ کر آنے والی موسیقی کی ایک لہر بھی لٹیا ڈبو سکتی ہے۔وہ پکڑنے پہ آئے تو رائی برابر کوتاہی کی پاداش میں پکڑ لے لہٰذا بندے کو ہر وقت یہ احساس ہونا چاہیے کہ بخشش، اعمال کی بنا پر نہیں صرف اور صرف اس کی کرم نوازی کے نتیجے میں ہو گی۔

جے میں ویکھا عملاں ولے ککھ نہیں میرے پلّے
جے ویکھاں میں رحمت تیری بلّے بلّے بلّے

بقول شیخ حماد، تقرب الٰہی کا مختصر ترین راستہ ''حب اللہ'' ہے اور یہ محبت اپنی ذات کی مکمل نفی سے حاصل ہوتی ہے یعنی فنافی الذات ہونے سے۔ایک بار خلیفہ مسترشد باللہ کا ایک غلام شیخ موصوف کی زیارت کو حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا

''میں تمہیں قرب الٰہی سے مالا مال دیکھ رہا ہوں خلیفہ کی بندگی چھوڑ کر اللہ کی بندگی میں آ جا'' اس بد

Marfat.com

بخت نے نہ صرف یہ کہ قول شیخ پر عمل نہ کیا بلکہ خلیفہ سے شکایتاً سارا ماجرا کہہ سنایا۔ شاید وہ دربارشاہ میں سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ خلیفہ بھی عقل سے شاید پیدل ہی تھا اس نے بھی درویش کا مذاق اڑایا۔ وہی غلام ایک بار پھر آستانۂ درویش پر حاضر ہوا تو شیخ حماد نے زیر لب مسکرا کر کہا

''برخوردار، حکم خداوندی کے مطابق تیرا احوال سلب کیا جاتا ہے اور تمہیں مرض برص میں مبتلا ہو جانے کا حکم دیتا ہوں'' ابھی آپ کا فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ وہ غلام برص میں مبتلا ہو گیا۔ حاضرین حیران و ششدر تو تھے مگر کسی میں لب کشائی کی جرات نہ تھی۔ ادھر جب غلام دربار خلافت میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے اطباء کو اس مرض کے علاج کا حکم دیا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہوا تو اطباء نے اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیا اور یہ مشورہ بھی دیا کہ غلام کو فوراً محل سے نکال دیا جائے۔ غلام، چار و ناچار شیخ حماد کے قدموں میں آ گرا اور تقرب الٰہی کے حصول کی باتیں کرنے لگا۔ آپ نے اُسے کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اپنی قمیص پہنائی۔ مرض پل بھر میں جاتا رہا مگر غلام کے دل میں خیال آیا۔ ''مرض تو ٹھیک ہو گیا، حاکم وقت کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے شاید پھر دربار شاہی میں جگہ مل جائے'' شیخ حماد نے اسکی دلی کیفیت سے آگاہ ہو کر انگشت شہادت سے اس کی پیشانی پر لکیر کھینچ دی۔ وہ حصہ از سر نو برص میں مبتلا ہو گیا۔ ''یہ حصہ تجھے وعدہ خلافی سے باز رکھے گا'' شیخ حماد نے مسکرا کر کہا۔

شیخ حماد نے بلادِ شام سے نقل مکانی کے بعد، بغداد محلہ ''مظفریہ'' میں سکونت اختیار کی پھر تا حیات وہیں کے ہو رہے۔ سنہ ۵۲۵ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ مزار مقدس قبرستان ''شونیزیہ'' میں ہے۔

سرد اور تاریک رات جب غوث پاک شیخ حماد کے در دولت پر حاضر ہوئے تو وہ عجیب سرد مہری سے پیش آئے خادم کو حکم دیا ''دروازہ بند کر کے چراغ گل کر دو'' غوث پاک نے چراغ گل ہوتے دیکھا تو قدم روک لیے اور خانقاہ کے بند دروازے پر بیٹھ گئے۔ قلائد الجواہر از محمد یحییٰ تادفی میں مرقوم ہے کہ تاریک سرد رات میں بند دروازے کے سامنے بیٹھے بیٹھے آپ کو بار بار اونگھ سی آجاتی اور سترہ بار غسل کی حاجت ہوئی۔ آپ فوراً اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے اور بند دروازے کے سامنے آ کر بیٹھ جاتے۔ صبح حسب معمول درِ درگاہ کھلا تو آپ اندر داخل ہوئے شیخ حماد نے فوراً اٹھ کر استقبال کیا اور معانقے کے بعد عجیب و غریب لہجے میں کہا۔ ''نورِ نظر عبدالقادر: جو مقام و مرتبہ آج میرا ہے وہ کل تمہارے سپرد ہونے والا ہے۔ جب ساری نعمتیں تمہیں حاصل

Marfat.com

ہو جائیں تو تو اس بوڑھی دنیا کی پرانی ہڈیوں کا خیال بھی رکھنا اور انصاف سے بھی کام لینا'' اور اس کے ساتھ ہی شیخ حماد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اب خدا جانے ان اشکوں کی نوعیت کیا تھی۔ خوشی کے آنسو تھے کہ مقام و مرتبے میں پیچھے رہ جانے کا خیال بہرحال شاگرد کا یہ استقبال منفرد نوعیت کا ضرور تھا۔

شیخ حماد کی زیرِ تربیت سلوک کی منازل طے کرنا شروع کیں تو ان کی لذت ہی کچھ اور تھی۔ ہر طلوع ہونے والا سورج آپ کو نئے مقام پر فائز دیکھتا اور جب شام ڈھلے صف لپیٹ کر غروب ہوتا تو آپ نئے مقام پر ہوتے پرانی منزل قصہءِ پارینہ بن چکی ہوتی۔

شیخ حماد کا رویہ بعض اوقات بڑا ہی تلخ' بڑا دُکھ دینے والا ہو جاتا مگر آپ کی جبین نیاز پر ناگواری کی شکن تک نمودار نہ ہوتی۔ دیکھا دیکھی راہِ سلوک کے دوسرے مسافر بھی آپ کا مذاق اڑانے لگے۔ قرآن و حدیث، فقہ اصول و فروع کے بحرِ بے کنار میں آپ پہلے ہی غوطہ زنی فرما چکے تھے۔ یہ صفات دوسروں کی نگاہوں میں عیوب کا روپ دھار گئیں۔

''تم فقیہہ ہو بزمِ درویشاں میں تمہارا کیا کام؟'' طنز و تضحیک کے تیروں سے سینہ چھلنی کیا جاتا۔ آپ صرف استادِ مکرم کی نظرِ التفات کے تمنائی رہتے اور طنز و تضحیک کو خندہ پیشانی سے برداشت کر جاتے۔ آخر ایک روز شیخ حماد جھک پڑے اور تیر برسانے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''تم لوگ بصارت و بصیرت دونوں سے محروم ہو، اس ہما کی بلند پروازی کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے، میں اسے آزمائش کی چکی میں پیس رہا ہوں تم لوگ اپنی زبانوں کو لگام دو ورنہ زبانیں ہوں گی نہ لگامیں''

شاگردانِ حماد اپنے رویے پہ شرمسار ہوئے۔ فصیلِ شہر سے باہر ایک ویرانے میں ''برجِ عجمی'' کی شہرت ہوئی۔ اس برج میں آپ نے برس ہا برس مجاہدے و ریاضت کی انتہا کر دی آپ چوں کہ عجمی تھے لہٰذا زہاد نے اس برج کو آپ کے نام سے موسوم کر دیا۔ عراق کے ویرانے غوث پاک کے پائے استقامت پر ورطہء حیرت میں ڈوب ڈوب جاتے۔ عرفانِ ذات کی منزل میں آپ نے بھوک کو بھوکا مار دیا اور پیاس کو تشنہ لب تڑپایا۔ نیند کو گہری نیند سلا دیا اور بیداری کی ہر حس کو بےدار کر دیا۔ یہ محنت ریاضت اور پُرخلوص طلب کی انتہا تھی۔

چشمِ فلک نے ایسی شدتِ طلب نہ دیکھی نہ سنی۔ پھر حب اللہ کا وہ مقام بھی آیا جہاں صاحب بندہ خود بندے کے ناز اٹھاتا ہے۔ ایسا تو ایک روز ہونا تھا۔ انسانی قوت ارادی کی انتہا

Marfat.com

ہے؟ جہاں تک تصور کی پرواز ممکن ہے اور پھر معراج مصطفےٰ نے تو شہنازِ تخیل کی انتہا کو بھی غلط ثابت کر دکھایا اور یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی رسائی وہاں تک ممکن ہے جہاں تصور کے بھی بال پر جل جائیں۔ غوث پاک جب نقشِ پائے رسالت مآبؐ کی اتباع فرمانے لگے تو سینے میں قلب سلیم دھڑکنے لگا (وہ دل جس میں تقویٰ ایمان اور عرفان تینوں بیک وقت سما جائیں) اس مقام پر ''الست'' کی نازش اور ''بلا'' کا نیاز دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ناز برداریاں اسی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں ''ایک بار میں نے پروردگار سے عہد کیا اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں گا جب تک کوئی مردِ صالح خود میرے منہ میں لقمے نہیں ڈالے گا۔ (یہ اس بے نیاز سے ناز برداری نہیں تو اور کیا ہے) مسلسل چالیس روز گذر گئے میں اپنے موقف پر قائم رہا۔ چالیس روز بعد ایک شخص آیا اور میرے سامنے انواع واقسام کے کھانے رکھ کر چلا گیا۔ میرا نفس الجوع، الجوع (ہائے بھوک ہائے بھوک) پکارنے لگا مگر میں نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ اسی اثنا میں ابو سعید مخزومیؒ ادھر آنکلے اور اپنی فراست باطنی سے یہ ''شور'' سن کر میرے قریب آ گئے اور مجھ سے پوچھا ''اے عبدالقادر یہ شور کیا ہے؟ میں نے جواب دیا ''یہ اضطراب نفس کا شور ہے مگر میری روح یادِ الٰہی میں مطمئن ہے لہٰذا شورِ نفس کی مجھے چنداں پروا نہیں۔''

''میرے غریب خانے پر چلو'' انہوں نے یہ فرمایا اور چلے گئے۔ میں نے دل میں ایک اور شرط عائد کر دی کہ جب تک کوئی خود لے کر نہ جائے میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں اسی خیال میں تھا کہ خضر علیہ السلام تشریف لائے اور مجھے حضرت ابو سعید کے گھر لے گئے۔ شیخ موصوف دروازے میں کھڑے ہمارے منتظر تھے مجھے دیکھ کر فرمانے لگے ''عبدالقادر کیا میرا کہنا کافی نہ تھا کہ خضر علیہ السلام کی ضرورت پیش آ گئی'' پھر وہ مجھے اپنے گھر میں لے گئے اور میری شرط کے عین مطابق اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں لقمے ڈال ڈال کر مجھے کھلانے لگے'' یہ واقعہ ناز و نیاز پر دلالت کرتا ہے اس میں عقلی دلائل یا وجوہات وغیرہ بیان کرنا پرلے درجے کی جہالت ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے\
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

بعد ازاں تو غوث الاعظم اس مقام و مرتبے پر بھی فائز ہوئے جہاں وہ سارے جہان کو کھلانے کے قابل ہو گئے۔ یہ بھی صاحب بندہ کی کرم نوازی تھی۔ سیّدنا غوث الاعظم خلیفہ مستظہر با

Marfat.com

اللہ کے عہد خلافت میں بغداد تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے تیئس برس میں تکمیل ظاہری و باطنی کے بعد انہیں ''محی الدین'' کے مقام پر فائز کر دیا۔ اس کے متعلق بھی انہوں نے جو ارشاد فرمایا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ ''سنہ ۵۱۱ھ میں ایک جمعہ کے روز میں سفر سے پابرہنہ سوئے بغداد آ رہا تھا کہ مجھے ایک ناتواں بیمار شخص دکھائی دیا۔ نقاہت سے وہ جاں بہ لب دکھائی دے رہا تھا ''اسلام علیک یا عبدالقادر'' اس نے مجھ سے کہا، میں نے سلام کا جواب دیا تو وہ کہنے لگا'' مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ'' میں نے اس کی خواہش پوری کی تو پل بھر میں اس کے چہرے پر رونق آ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا لاغر جسم بھی خوب موٹا تازہ ہو گیا۔ میں حیرت زدہ ہوا تو وہ شخص مسکرا کر کہنے لگا۔ ''میں آپ کے جد پاک کا دین ہوں جو قریب المرگ ہو چکا تھا اب اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے مجھے از سرِ نو زندہ کر دیا ہے لہٰذا آپ ''محی الدین'' ہیں اس کے بعد جب میں جامع مسجد کی حدود میں داخل ہوا تو ایک شخص نے مجھے جوتا پہنایا اور پہلی بار یا سیدی محی الدین کے نام سے پکارا۔ نماز جمعہ کے اختتام پر لوگ اٹھ کر میری طرف آنے لگے اور یا محی الدین یا محی الدین پکار پکار کر میرے ہاتھوں کو بوسے دینے لگے حالانکہ اس سے پیشتر مجھے کبھی کسی نے اس نام سے نہیں پکارا تھا۔''

مناقب غوث پاک کے سلسلے میں شیخ عبدالحق دہلوی ''شرح مشکوٰۃ شریف'' میں یوں رقمطراز ہیں ''اسلام، ظاہری اعمال کا نام ہے اور ''ایمان'' باطنی اعتقاد کا اور ''دین'' ان دونوں کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ گویا دین وہ جامع نظام ہے جو بنی نوع انسان کے عقائد و اعمال، ظاہر و باطن، صورت و معانی، روحانیت اور جسمانیت پر مشتمل ہے ایسے نظام کا احیاء، نبی مرسلؐ یا اس کے کامل ترین نائب کے بغیر ممکن نہیں اگرچہ آں حضرتؐ نے ہر صدی کے سرے پر ایسی ہستیوں کی نشان دہی فرمائی ہے جن سے تجدید دین کا فریضہ انجام پذیر ہوتا ہے مگر تجدید اور احیاء، میں ایک نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مجددین کی فہرست میں ابتدا سے لے کر اس وقت تک بہت سے حضرات کے اسمائے گرامی پائے جاتے ہیں مگر ''محی الدین'' کا لقب کسی اور کو عطا نہیں ہوا۔ تاریخ اسلام کے مطالعے سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ احیائے دین کا اہم ترین فریضہ حقیقتاً جناب غوث الاعظم کی ذاتِ گرامی قدر ہی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا اور یہ عظیم الشان لقب صرف آپ ہی کے وجود مسعود پر صادق آتا ہے۔

پچیس برس تک مسلسل غوث پاک نے عراق کے بیابانوں میں صحرا نوردی کی۔ مخلوق

Marfat.com

سے رابطہ منقطع رہا۔ یہ مجاہدے کا دشوار ترین دور تھا۔ رجال غیب اور جنات کو سلوک کی تعلیم عطا فرماتے رہے ان کے علاوہ جناب خضر علیہ السلام ہمدم دیرینہ و محرم راز تھے۔ اِن سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ غوث پاک ان کے کسی حکم کی مخالفت نہیں کریں گے۔ ایک مرتبہ خضر علیہ السلام نے کسی مقام پر بیٹھنے کا حکم دیا تو غوث پاک تین برس تک صبر و استقلال سے اسی جگہ مصروف عبادت رہے۔ سال میں صرف ایک بار خضر علیہ تشریف لاتے اور مسرور مطمئن غائب ہو جاتے ''دنیا'' بارہا مختلف روپ میں آ کر بہکانے کی کوشش کرتی رہی اور منہ کی کھاتی رہی۔ شیاطین بھی مہیب شکلیں اختیار کر کے آ دھمکتے مگر غوث پاک کے پائے استقلال میں سر مو فرق نہ آیا۔ اور راہِ سلوک میں خوف وخطر سے مکمل نجات مل گئی۔ نفس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب غوث پاک پر زمینی مسافت مختصر کی گئی۔ بلادِ ششتر جو بغداد سے بارہ یوم کی مسافت پر تھا۔ چند لمحوں میں زیرِ قدم ہوتا صورت حال یہ ہوگئی کہ ''دنیا'' بذات خود ایک پارسا عورت کے روپ میں اکثر و بیشتر ظاہر ہوتی اور حوصلہ دیتی ''تجھے اپنے احوال پر تعجب کیوں ہے جبکہ تو عبدالقادر ہے؟'' اسی زمانے میں شیاطین سے جنگیں ہوئیں جو آتشیں شعلوں سے لیس ہو کر حملہ آور ہوتے مگر ان کے شعلے انہی پر لوٹا دیئے جاتے۔ ورطہ حیرت میں ڈبو دینے والے واقعات رونما ہوتے رہے مگر غوث پاک ان مقامات سے بہت آگے نکل گئے اور مقاماتِ حیرت و استعجاب بہت پیچھے رہ گئے۔

ایک دفعہ ابلیس نے پینترا بدل کر وار کرنے کی سعی لاحاصل کی۔ وہ غوث پاک کی خدمت میں اشک ندامت بہاتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ ''آپ نے میری اور میری اتباع کرنے والوں کی جان عذاب میں کیوں ڈال رکھی ہے لہٰذا میں اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے آپ کا طوق غلامی زیبِ گلو کرنے آیا ہوں'' غوث پاک نے قہر آلود نگاہوں سے ''حریف آدم'' کو دیکھا اور پوری قوت سے طمانچہ مارنے کا ارادہ کیا مگر اس سے بیشتر ہی شیطان کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ لگا اور وہ غائب ہو گیا۔ یہ گویا خدائی حصار میں آنے کے مترادف بات تھی پل بھر میں وہ پھر آ دھمکا۔ اس بار وہ آتشیں نیزے سے مسلح تھا۔ غوث الاعظم کی حسب منشا ان کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ آ گئی جسے دیکھتے ہی حملہ آور کی ترکی تمام ہوئی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اس کے بعد ابلیس نے ایسا حملہ کیا جس سے وہ اکثر اولیاؤں کو بے سروسامان کر چکا تھا۔ اس کا یہ وار بڑا ہی مہلک تھا۔ ایک اندھیری رات میں آپ بے آب و گیاہ صحرا میں مصروف عبادت تھے کہ اچانک آپ کو روشنی کی ایک لکیر دکھائی دی جس سے رفتہ رفتہ سارا آسمان منور ہو گیا۔ پھر ایک گونج سنائی دی۔ ''اے

Marfat.com

عبدالقادر: میں تیرا پروردگار ہوں اور تیری عبادت سے راضی ہو کر تجھے ہر قسم کی عبادت کی مشقت سے آزاد کرتا ہوں' یہ ندائے غیبی سنتے ہی آپ نے اپنے ظاہری و باطنی علم کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا تو اس ''کرم نوازی'' کا جواز نظر نہ آیا۔ آپ کو فوراً خیال آیا ''آں حضرت ختمی مرتبت عمر بھر عبادت کے مکلف و پابند رہے، کیا یہ ممکن ہے کہ ان کے بعد کوئی شخص، عبادت سے آزاد کر دیا جائے'' یہ خیال آتے ہی آپ نے لاحول پڑھا تو روشنی کا وجود مٹ گیا۔ اب ابلیس اپنی اصل شکل صورت میں غوث پاک کے سامنے آ کھڑا ہوا ''میں نے اس وار سے جانے کتنے عبادت گذاروں کو چت کر دیا مگر عبدالقادر آپ اپنے علم کے زور سے صاف بچ نکلے'' یہ داؤ پہلے سے بھی خطرناک تھا مگر ''محی الدین'' نے اس کی توڑ بھی پیش کر دی۔ آپ نے فرمایا۔ ''مردود، دفع ہو جا میں اپنے علم کے زور سے نہیں' تائید الٰہی اور اس کی کرم نوازی پر بھاری ہے۔

۴ شوال سنہ ۵۲۱ھ نمازِ ظہر سے پہلے اس اضطراب کا مداوا بھی ہو گیا جس نے غوث الاعظم کو پابہ زنجیر کر رکھا تھا۔ یعنی فصحائے عرب کے مقابلے میں اپنی کمتر حیثیت کا احساس۔ افصحا الفصحا کی نظر کرم نے یہ عقدہ بھی حل کر دیا۔ حضرت شیخ کو حضور اقدسؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔

فرزند: تم کلام کیوں نہیں کرتے؟'' آں حضورؐ نے دریافت فرمایا۔

''میں ایک عجمی، فصحائے بغداد کے سامنے لب کشائی کی جرات کیسے کر سکتا ہوں' غوث پاک نے اپنا مسئلہ دربارِ رسالت میں پیش کیا۔

''فرزند اپنا منہ کھول'' کائنات کی ساری رحمت مائل بہ کرم ہوئی غوث پاک نے منہ کھولا تو کائنات کی فصاحت و بلاغت کا رس ٹپکایا گیا۔ حضور اکرمؐ نے سات بار لعاب دہن سے سرفراز فرمایا۔ اور ساتھ ہی تلقین فرمائی۔ ''حکمت اور عظمت کے ذریعے لوگوں کو صراط مستقیم کی دعوت دیتے رہو' جلوگی اختتام پذیر ہوئی تو غوث پاک پر وجدانی کیفیت طاری تھی جس کا آغاز قوت مدرکہ کی انتہا کے بعد ہوتا ہے پل بھر میں کیا سے کیا ہو گیا۔ فصاحت و بلاغت نے خود کلام غوث پر ناز کیا۔ یہ وجدانی کیفیت کوئی پل دو پل نہ تھی۔ نماز ظہر کی ادائیگی تک جاری رہی مدینۃ العلم کی نظارگی سے طاری ہونے والی وجدانی کیفیت اختتام پذیر ہوئی تو نئی لذت کا آغاز ہوا۔ یہ کیفیت پہلی سے ذرا مختلف تھی فصیل جاں کا رواں رواں کیف و سرور کے نئے انداز میں جھوم رہا تھا۔ باب العلم، جلوہ افروز ہوئے۔ علی المرتضےؓ نے فرمایا ''منہ کھولو' غوث پاک نے تعمیل ارشاد کی تو باب العلم نے چھ بار لعاب دہن سے سرفراز فرمایا۔ غوث پاک کی کیفیت ''ھل من مزید'' ہو رہی

Marfat.com

تھی۔عطا کی انتہا تھی تو شدت طلب بھی شمار و قطار سے باہر تھی۔

''حضور: سات بار سرفراز نہیں فرمائیں گے؟'' عبدالقادر جیلانیؒ نے سوال کیا۔

''نہیں فرزند، ادب رسالت ملحوظ خاطر ہے'' علی المرتضیٰؓ نے فرمایا اور نظروں سے اوجھل ہو گئے اس روز غوث پاک نے منبر پر کھڑے ہو کر کلام کیا تو فصحائے بغداد دنگ رہ گئے۔آشنا حیران ہوئے تو نا آشنا پریشان۔فصاحت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو انسانی عقلوں کو خشک پتوں کی طرح بہا لے گیا۔کلام اوّل ملاحظہ فرمائیں:۔

فکر غوطہ خور، دل کے بحرِ زخار میں موتیوں کی تلاش میں ہے اور ان موتیوں کو سینے کی گہرائی سے نکال کر قصہ گو زباں کے سپرد کر دیتا ہے وہ موتی جو دلوں کی پہنائی میں سجائے اور حسنِ اطاعت کے سرمائے سے خریدے جاتے ہیں''

اس بات پر کم وبیش تمام مشائخ کا اتفاق ہے کہ یہی کلام اول ہے جو آپ نے لوگوں کو تعلیم کیا۔چند روز بعد خضر علیہ السلام تشریف لائے یہ گویا غوث پاک کا امتحان تھا اور کوئی انوکھی یا نئی بات نہ تھی بلکہ اولیاؤں کا امتحان ایک دستوری بات تھی مگر یہاں تو کایا ہی پلٹ چکی تھی غوث الاعظم نے فرمایا ''آج میں آپ کے الفاظ آپ ہی پر لوٹا رہا ہوں وہ الفاظ جو آپ نے موسیٰ علیہ سے کہے تھے یعنی میرے جیسے صبر وتحمل کی آپ میں تاب ہے نہ مجال'' اس لیے کہ آپ اسرائیلی ہیں اور میں ''محمدی'' ہوشیار ہو جائیں، ہم دونوں شہسوار ہیں اور میدان سامنے ہے۔مگر میرے زین کسے ہوئے گھوڑے کو ملاحظہ فرمائیں اور کڑی کمان کے چلّے پہ چڑھے ہوئے تیر کو نگاہ میں رکھیں ،میری کاٹ دار شمشیر برّاں کا بھی اندازہ لگالیں'' مناقب غوث پاک کی مستند کتب میں یہ مکالمت من وعن موجود ہے جو چاہے ملاحظہ فرما سکتا ہے۔اس روز آپ نے ولائت کی خصوصیات بیان فرمائیں۔مسند ولائت کے سجادہ نشیں میں بارہ فضائل کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) دو خصلتیں خالق کائنات کی۔

(۲) دو صفات رسالت مآب کی۔

(۳) دو سیدنا صدیق اکبرؓ کی۔

(۴) دو عمر فاروقؓ کی۔

(۵) دو عثمان غنیؓ کی۔

(۶) دو علی المرتضےٰؓ کی۔

Marfat.com

سامعین حیران وششدر یہ اندازِ تکلم سن رہے تھے اور تشریح طلب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے آپ نے حاضرین کی تشنگی ان الفاظ سے دور کی۔

ستار وغفار ہونا رب العزت کی خصلتیں ہیں، شفیق ورفیق، شیوہ رسالت مآبؐ ہے صادق ومتصدق (تصدیق کرنے والا) صدیق اکبرؓ کی خصوصیات ہیں، عمر فاروقؓ کی خصوصیات میں اوامر ونواہی کی پابندی کرنا اور کرانا سرفہرست ہیں، حضرت عثمان غنی کا طرۂ امتیاز، بھوکوں کو کھانا کھلانا اور شب بیداری (عبادت کی غرض سے) ہے اور سیدنا علیؓ کی خصوصیات عالم اور شجاع ہونا ہیں یہ بارہ صفات اگر کسی شخص میں بیک وقت موجود نہیں تو وہ مقام ولایت سے بہت دور ہے اس کا دعویٰ جھوٹا اور بھرم بھاؤ کھوکھلا ہے۔ پھر منظوم کلام میں ''شیخ'' کے پانچ خصائل بیان فرمائے۔

(۱) احکام شریعت سے مکمل واقفیت اور علم حقیقت کی اصل سے آشنائی۔

(۲) حسن خلق کا بہترین نمونہ ہونا (اخلاق ساری عبادت کا نچوڑ ہے۔ اور یہ خلق خدا سے، بندے کے تعلقات کا نام ہے)

(۳) وہ قول وفعل سے مساکین کی تواضع کرنے والا ہو۔

(۴) حرام وحلال میں امتیاز کرنے والی قوت مدرکہ کا مالک ہونا۔

(۵) اپنے نفس اور طالبین کی طریقت کو کما حقہ، مہذب کرنے کی صلاحیت کا مالک ہو۔

رشد وہدایت کا سلسلہ جاری ہوا تو کلام میں الوہی رنگ کی دھوم مچ گئی۔ سامعین ایک عرصے کے بعد وجدانی لذتوں سے آشنا ہوئے۔ ان کے کان تو فلسفے کی موشگافیاں سن سن کر عاجز آچکے تھے۔ سماعتیں مسلکی دلائل سے مجروح ہو چکی تھیں۔ اسی زمانے میں کرامات کے ظہور کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر وعظ بذات خود ایک کرامت ہوا کرتا تھا لوگ تڑپ تڑپ جاتے الفاظ بے شک وہی تھے جو دوسرے علماء استعمال کیا کرتے تھے۔ بلحاظ تاثیر زمین وآسمان کا فرق تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ مدرسے کی قریبی سرائے (رباط) میں بیٹھنے لگے انداز بیاں ایسا تھا جو ہر طالب کے تاروں کو جا چھیڑتا اس صورت حال کے پیش نظر مدرسہ ابوسعید مخزومی کی توسیع ضروری قرار دی گئی۔ ارد گرد کے مکانات دوکانیں سرائے وغیرہا مسمار کرکے درس گاہ کو وسیع وعریض کر دیا گیا چند روز بعد درس گاہ نے پھر تنگی داماں کی شکایت کی لوگ اپنی اپنی سواریوں پر آتے درس گاہ کے ارد گرد کھڑے ہو جاتے یہ نطق غوث کا اعجاز تھا کہ جہاں کوئی کھڑا ہوتا مفہوم ومعانی لب ولہجہ ہر سامع

Marfat.com

کے دل پر نقش ہو جاتا۔ اس زمانے میں برقی رو کا رواج تھا نہ لاؤڈ سپیکر ایجاد ہوا تھا پھر بھی صدائے غوث کی لہریں ایک جیسی گونج ایک جیسی شدت کے ساتھ ہر سماعت کو فیض یاب فرماتیں۔
یہ بیان خلاف عقل تو ہے مگر کرامت کہتے کسے ہیں؟

آج علوم سائنس کی ترویج و ترقی کے وسیلے سے ہم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ آواز کی لہریں مخرج سے خارج ہونے کے بعد جب ہوا کے دوش پر رقص کرتی ہوئی ساعتوں سے ٹکراتی ہیں تو مسافت کے مطابق کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں اسے تکنیکی زبان میں "ATTENUATION" (عمل تخفیف) کہتے ہیں اور ان لہروں کی شدت کی پیمائش کے لیے جو اکائی مستعمل ہے اس کا نام ڈی بی "Deci bel" ہے۔ اس کے برعکس صوتی لہروں کو طاقتور بنانے والے عمل کا نام "Amplification" "عمل توسیع ہے جو لاؤڈ سپیکر میں کارفرما ہوتا ہے لیکن کلام غوث پاک کو کون یکساں شدت کے ساتھ دور و نزدیک پہنچاتا تھا، کون ان کے ذکر کو بلند فرماتا تھا یہی نکتہ قابل غور ہے۔ یہ عوام الناس کی جہالت کے خلاف جنگ تھی دلوں پہ لگے ہوئے قفل کھل رہے تھے شیطنت کا قلع قمع ہو رہا تھا مگر اندازِ غوث سے ہر چشم تماشا ورطہ حیرت میں ڈوب کر ابھر رہی تھی۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

پھر یوں ہوا کہ کلام غوث پاک کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہوا کہ خطاب بغداد کی درس گاہ میں ہو رہا ہوتا مگر سامعین کالے کوسوں دور بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہوتے۔ خلق خدا کے ہجوم کے پیش نظر ایک عجیب و غریب اعلان ہوا۔ "جو لوگ الوہی رنگ پسند کرتے ہیں اور میرا خطبہ صدق دل سے سننا چاہتے ہیں ان کے لیے مجلس میں حاضری کی قید ختم کی جاتی ہے" یہ تمکنت، یہ ناز، یہ انداز بیاں، جہلاء کی سمجھ سے بالاتر تھا تار برقی و لاسلکی کا زمانہ تو تھا نہیں اور نہ ہی ٹیلی وژن ایجاد ہوا تھا۔ بات سمجھ میں آتی تو کیسے آتی لیکن ایک بات پر سب کا اتفاق ہے کہ علمائے سو تک مذاق اڑانے یا تردید کی جرات نہ کر سکے۔ غوث الاعظم کی جمالی شان دل کش تھی تو جلالی شان راکھ بھی کر سکتی تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ چشم بینا کے حامل حضرات اس اعلان کی عملی وضاحت فرمانے لگے۔

غوث پاک کا معمول تھا کہ ہفتے میں تین بار عوام الناس سے خطاب فرماتے۔ جمعتہ المبارک کی صبح منگل کی رات اور اتوار کی صبح محافل کا انعقاد ہوتا۔ ہر مجلس میں عوام کے علاوہ عراق

Marfat.com

کے مشائخ، مفتی اور علماء شرکت فرماتے۔ ان میں شیخ بقاء بن بطو، شیخ ابوسعید قیلوی، شیخ علی بن ہیتی، شیخ ابونجیب عبدالقادر سہروردی، شیخ ماجد کردی۔ شیخ مطر با درانی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جیسے آفتاب ومہتاب شریعت بھی موجود ہوتے۔ رجال الغیب اور فرشتے بھی گروہ در گروہ تشریف لاتے اور کلام غوث پاک سے مستفید ہوتے۔ دوران خطاب سامعین کی آہیں اور سسکیاں تو سنائی دیتیں مگر سوختہ ساماں عشاق دکھائی نہ دیتے۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ کوئی شخص فرش زمیں پر ہاتھ رکھتا تو اسے غیر مرئی وجود کا احساس ہوتا جیسے اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ پر آ گیا ہو۔ حاضرین وسامعین کو رجال غیب کی موجودگی کا احساس تو ہر محفل میں ہوتا۔ خطاب اختتام پذیر ہوتا تو اس کا طلسم تادیر قائم رہتا لوگ وجدانی کیفیات میں سرشار ہو چکے ہوتے پھر غوث پاک فرماتے ''قال تو ہو چکا اب حال کی طرف آیئے اس اعلان کے ساتھ ہی محفل کا رنگ بدل جاتا اور لوگ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے۔ وفور شوق کا یہ عالم کہ ہر دل کی یہی تمنا ہوتی ''یا الٰہی: یہ رنگ محفل ابد تک قائم رہے اور عمر عزیز اسی کیف میں تمام ہو جائے۔''

غوث پاک کے اس اعلان کی عملی وضاحت کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں شیخ عبدالرحمٰن طفسونجیؒ کبھی بغداد میں نہیں آئے مگر اپنے شہر میں سرراہ بصد احترام کھڑے رہتے اور لوگوں سے ارشاد فرماتے۔ ''لوگو: سیدنا عبدالقادر کا خطاب شروع ہونے والا ہے شائقین میرے غریب خانے پر حاضر ہو کر ارشادات عالیہ ساعت فرما سکتے ہیں'' لوگ گروہ در گروہ ان کے گھر جمع ہو جاتے۔ ادھر بغداد میں محفل کا آغاز ہوتا ادھر کالے کوسوں دور طفسونجیؒ کے گھر تشنگان اپنی پیاس بجھانے اپنے کانوں سے ایک ایک لفظ سنتے اور غوث پاک کی موجودگی کو محسوس کرتے۔ اکثر لوگ وقت اور تاریخ کو ضبط تحریر میں لے آتے اور موضوع سخن کی چیدہ چیدہ باتیں بھی لکھ لیتے۔ بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوتا کہ واقعی اس روز، اس وقت، غوث الاعظم نے فلاں موضوع پر گفتگو فرمائی تھی۔ پہلے تو خلق خدا حیرت زدہ رہ جایا کرتی تھی رفتہ رفتہ لوگ اس کے عادی ہو گئے اور مختلف شہروں میں ایسی محافل بڑے اہتمام واحترام سے انعقاد پذیر ہوئیں۔

ایسی ہی ایک محفل ''کوہ لالش'' پر منعقد ہوا کرتی جس کا اہتمام سیدنا عدی بن مسافرؒ فرمایا کرتے۔ ان کی رہائش اس پہاڑ پر تھی وہ بھی ہفتے میں تین خطاب غوث سے پیشتر اعلان فرما دیتے اور خلق خدا پہاڑ کا رخ کرتی۔ یہ بات مستند ہے کہ ہر محفل میں چند افراد مفہوم کی شدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے، جان بحق ہو جاتے۔ جیسے پتنگے شمع کی لو پر قربان ہو جاتے ہیں دم آخر

Marfat.com

ان کی کیفیت سے صاف عیاں ہوتا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک بار دورانِ وعظ آپ نے سلسلہ کلام منقطع کر کے اچانک کہا ''اے اسرائیلی ٹھہر جا اور ''محمدی'' کا کلام بھی سنتا جا'' جب آپ سے (بعد میں) لوگوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا ''جناب خضر علیہ السلام محفل کے قریب سے گذر رہے تھے یہ خطاب ان کے لیے تھا''۔

قزاق، ڈاکو لٹیرے معاشرے کے رستے ہوئے ناسور جو غوث پاک کے دست حق شناس پر تائب ہوئے ان کی تعداد ایک لاکھ بیان کی جاتی ہے لیکن آپ کی محافل میں سینکڑوں یہود ونصاریٰ کا حلقہ بگوش اسلام ہونا، اس سے بھی بڑا کارنامہ ہے کیوں کہ یہودی بڑے پتھر دل واقع ہوتے ہیں۔ ایک بار بڑی عجیب وغریب صورت حال کا سامنا ہوا۔ گفتگو کا موضوع ''ایثار'' تھا۔ الفاظ ومعانی کا سیلاب تھا جو خس وخاشاک کی طرح سامعین کو بہائے لے جا رہا تھا کہ اچانک آپ خاموش ہو گئے اور بڑے غور سے ایک سمت دیکھنے لگے۔ تشنگان حیران وپریشان تو ہوئے مگر دم مارنے کی کس میں مجال نہ تھی (آپ کی محافل میں کوئی کھانستا تک نہیں تھا) پھر آپ نے خلاف توقع کہا ''ایک سو دینار معاوضہ طلب کیے بغیر میں خطاب نہیں کروں گا'' پہلے تو یہ بات لوگوں کی سمجھ ہی میں نہ آئی مفہوم آشکار ہوا تو چالیس افراد نے سو سو دینار پیش کیے، ہر شخص بخوبی آگاہ تھا کہ اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔ آپ نے ایک شخص کے دینار قبول کیئے اور خادم خاص ابو رضا سے فرمایا۔ ''شونیز کے مقبرے میں جاؤ وہاں ایک بربط نواز آلۂ موسیقی سے کھیلتا ہوا ملے گا۔ یہ رقم اسے پیش کر کے، موسیقار کو میرے پاس لے آؤ''

ابو رضا تعمیل ارشاد میں شونیز کے مقبرے کی طرف چل دیا۔ وہاں اسے وہ بربط نواز ملا جو واقعی قبرستان میں بربط بجا رہا تھا۔ ابو رضا نے سو دینار پیش کیئے اور کہا 'تمہیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے یاد فرمایا ہے' بربط نواز چند لمحے ہکا بکا ہو کر خادم غوث کو دیکھنے لگا پھر چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو تاسف بھرے لہجے میں کہنے لگا ''ہائے' قصۂ رسوائی کس محفل تک جا پہنچا کاش میری ماں نے مجھے جنم ہی نہ دیا ہوتا'' خادم نے تسلی آمیز الفاظ میں اس کی دلجوئی کی اور دونوں محفل غوث پاک میں حاضر ہوئے۔ چشم فلک نے عجیب نظارہ دیکھا' غوث الاعظم نے گناہگار کو منبر کے قدمچے پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ لوگوں کی حیرت دیدنی اس وقت ہوئی جب وہ

Marfat.com

شخص واقعی، کاندھے پر بربط سجائے منبر پر بیٹھ گیا۔

''اب بتا یہ قبرستان میں بربط بجانے کا کیا سبب ہے؟'' غوث پاک نے تشریح طلب کی تو وہ سر جھکا کر خجل خجل سا فرش زمین کو دیکھنے لگا۔

''مہر سکوت توڑ اور داستان غم بیان کر'' غوث پاک کے لبوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جس نے اس گہنہ گار کو حوصلہ عطا کیا۔

''حضور! میں بچپن ہی سے فن موسیقی میں ماہر تھا'' بربط نواز نے دلی کرب کا اظہار کیا۔ ''میرے فن کی ہر طرف دھوم تھی، عہد شباب آیا تو میرا فن اور بھی نکھرا' شہرت و دولت میرے گھر کی کنیز ہوئی مگر افسوس کے جب ضعیفی نے در پر دستک دی، قویٰ مضمحل ہوئے تو دنیا مجھ سے روٹھ گئی۔ قدردانوں نے دھتکار دیا۔ ہاتھوں میں ارتعاش کی بنا پر فن بھی رخصت ہو گیا۔ تب میں نے عہد کیا کہ اپنا شہر ناسپاس چھوڑ کر بغداد جا بسوں گا اور اپنا فن صرف مردوں کے سامنے پیش کروں گا اس لیئے کہ زندوں سے تو میں مایوس ہو چکا تھا' بغداد پہنچا تو ''حسب عہد'' میں نے قبرستان کا رخ کیا اور زیر زمیں سونے والوں کو بربط سنانے لگا۔ جناب عالی! پھر ایک عجیب ماجرا ہوا ابھی میں نے مضراب سے تاروں کو چھیڑا ہی تھا کہ ایک پرانی قبر شق ہوئی' ایک شخص نے گردن باہر نکالی اور کہا ''اے بدبخت انسان' زندوں مردوں کے چکر میں مت آ' نغمہ سرائی کا شوق ہے تو اس ذات کی مدحت و ثنا بیان کر جو حیی و قیوم ہے۔ پھر من کی مراد پالے گا''

میں نے اسی وقت رب العزت کی حمد کا آغاز کیا اور پہلا نغمہ ابھی اختتام پذیر بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ کا فرستادہ مجھ تک پہنچ گیا اور سو دینار کی خطیر رقم پیش کرنے کے بعد مجھے یہاں لے آیا۔ میں نے اس کی طرف پہلا قدم اٹھایا تو اس نے مجھے آغوش کریمی میں پناہ دی لہذا آج کے بعد میں اپنے بربط کو توڑتا ہوں اور اس ذات سے رشتہ جوڑتا ہوں'' یہ کہہ کر بربط نواز نے اپنے عمر بھر کے ساتھی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ محفل پر سناٹا چھا گیا۔

''اے حق کے طلبگارو! غور کرو اس شخص کی داستان پر'' غوث اعظم نے سامعین سے فرمایا۔ ''اس شخص نے لہو و لعب میں صداقت اختیار کی تو اپنی منزل کو پا لیا یہ الگ بات کہ وہ منزل کوئی اتنی پسندیدہ نہیں لیکن اگر راہ حق کا کوئی مسافر صداقت اختیار کرتا ہے تو اندازہ لگاؤ وہ تقرب الٰہی کے کس مقام پر ہو گا۔ تم پر لازم ہے کہ اپنے افعال کو صداقت اور خلوص سے نکھارو۔ اپنی کھیتیوں کو فریبی پانیوں سے مت سینچو' فصل حماقت لہلہائے گی جو تم کو سپرد ہلاکت کر دے

Marfat.com

گی' غوث پاک نے صرف ایک شخص سے سو دینار قبول کیئے باقی انتالیس افراد نے بھی بربط نواز کو سو سو دینار پیش کیئے جو اس نے یہ کہہ کر در کر دیئے "اب مجھے ایسا خزانہ مل گیا ہے جس کے سامنے درہم و دینار کی کوئی حقیقت نہیں اس محفل میں پانچ افراد نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

ایک زمانے میں امام غزالیؒ نظامت بغداد کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے' زرق برق لباس زیب تن فرماتے علوم ظاہری میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ یونانی فلسفے کے ماہر' ایسی ایسی موشگافیاں بیان کرتے کہ لوگ جھوم جھوم جاتے۔ ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جب امام موصوف تشکیک کی دلدل میں پھنس چکے تھے پھر جب غوث الاعظم نے بغداد میں قدم رنجا فرمایا' رشد و ہدایت کا چراغ روشن ہوا' امام غزالی بھی اس سے فیض یاب ہوئے۔ لباس فاخرہ کو خیر آباد کہا سادگی کا وطیرہ اپنایا۔ ایسے تائب ہوئے کہ فلسفی امت کے مقام و مرتبہ پر فائز ہوئے تہافتہ الفلاسفہ اور احیاء العلوم جیسی معرکتہ الآرا کتب تصنیف کیں۔ یہ فیض غوث پاک کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔

سرزمین عراق طریقت و حقیقت کے شہسوار پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی مگر چار مشائخ زیر زمیں روپوش ہونے کے باوجود زندوں کی طرح تصرف کے حامل ہیں اور نہجۃ الاسرار کے مطابق ان میں سرِ فہرست شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہیں پھر شیخ معروف کرخیؒ' شیخ عقیل نجی اور شیخ حیاۃ بن قیس حسرانیؒ کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ اسی طرح وہ بزرگ جو مادر زاد اندھوں کو نورِ بصارت عطا کرنے پر قدرت رکھتے تھے ان میں بھی سرفہرست شیخ عبدالقادر جیلانی ہیں پھر شیخ بقا بن بطو' شیخ ابوسعید قیلوی اور شیخ علی بن ہیتیؒ ہیں۔

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے عنفوان شباب میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے شیخ موصوف کی کایا ہی پلٹ دی اس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی آغاز جوانی میں تیز طبع' جوشیلے نوجوان تھے۔ علم کلام' یونانی فلسفہ اور دیگر علوم مناظرہ و مجادلہ پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کے چچا ابوالنجیب سہروردیؒ ان علوم سے گریز کی تلقین فرماتے مگر شہاب الدین اپنے مسلک سے باز نہیں آتے تھے۔ ایک روز چچا اپنے قابل صد افتخار بھیتجے کو لے کر دربارِ غوث میں حاضر ہوئے۔ راستے میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرا دی کہ دربار غوث کی اہمیت و فضیلت کرہ ءِ ارض پر لاثانی ہے "دیکھ بیٹا" آج ہم اس کی کی زیارت کرنے والے ہیں جو رموز ربانی کی خبریں دینے پر قادر ہے" چچا نے کہا "یہ ایسی بابرکت شخصیت ہے جو دلوں پر لگی مہریں مٹا دیتی ہے لہٰذا اگر کچھ حاصل کر سکو تو کر لو۔ یہ سنہری موقع

Marfat.com

خوش نصیبوں کے ہاتھ آتا ہے' بس ادب واحتیاط کا دامن تھامے رکھنا' اللہ خیر کرے گا'' دونوں حضرات دربارِ غوث میں حاضر ہوئے تو ابو لنجیب سہروردی نے بصد احترام درخواست پیش کی حضور! یہ میرا فرزند' فلسفے اور علم کلام کے خارزاروں میں بھٹک رہا ہے میں نے بارہا ان علوم سے گریز کی تلقین کی مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں''

''اے عمر! عزیزم کون کون سی کتب کا مطالعہ کر چکے ہو' غوث پاک' نوجوان فلسفی منطقی کی طرف متوجہ ہوئے۔ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرفران کتب کے نام گنوانے شروع کئے لہجے میں غرورِ علم بھی تھا' اور ملکنتِ قیل وقال بھی۔

''ذرا میرے قریب تو آؤ'' غوث پاک نے زیرلب مسکرا کر فرمایا۔ فلسفی قریب ہوا تو آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سینے پر اس طرح پھیرا جیسے پتھر سے دھول صاف کی جاتی ہے ہاتھ ابھی سینے سے جدا نہیں ہوا تھا کہ فلسفی کے ذہن سے کتب فلسفہ کے سارے دلائل' سارے الفاظ حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ بقول شہاب الدین سہروردیؒ ''میرا ذہن کورے کاغذ کی طرح صاف ہوگیا۔ سارے مطالب ذہن سے محو ہو گئے تو میں حیران وششدر ادھر اُدھر دیکھنے لگا' غوث پاک نے زیرلب مسکرا کر میرے سینے پر انگشت شہادت رکھ دی۔ خدا کی قسم علم لدنی کا سمندر میرے اندر موجزن ہوگیا اور میں عارفانہ گفتگو کرنے لگا''

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ عراق کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن پر باطنی علوم کو بھی ناز تھا ہے اور رہے گا۔ خود غوث پاک نے ایک بار فرمایا تھا'' شہاب الدین' تم مشاہیر کے آخری فرد ہو' الختصر آپ اسرار ورموز کا خزینہ تھے ایسا خزینہ جسے تا ابد زوال نہ ہوگا۔ آپ کے مصاحب خاص شیخ نجم الدین رقم طراز ہیں ''ایک بار میں نے اپنے شیخ کو پہاڑ کی بلند چوٹی پر موجود پایا۔ آپ کے سامنے جواہرات کا انبار لگا تھا جسے مٹھیاں بھر بھر کر آپ ہجوم پر نچھاور فرمارہے تھے لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ گراں مایہ انبار میں کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔ بعد میں میں نے اپنے شیخ سے التماس کی کہ وہ مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کریں تو آپ نے فرمایا۔ ''تیری چشمِ تماشہ نے جو کچھ دیکھا وہ سچ تھا مگر یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا کہ یہ سارا فیض شیخ عبدالقادر جیلانی کا ہے۔ میں جو کچھ بھی ہوں ان ہی کی نظرِ کرم سے ہوں''

آپ کا وصال محرم سنہ ۶۳۲ھ میں ہوا رباط بطامی' رباط ناصری اور رباط مالونیہ تین خانقاہیں آپ کے دم قدم سے معرضِ وجود میں آئیں۔ شافعی مسلک کے متبع تھے۔ سلسلہ نسب

Marfat.com

سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ پیدائش سہرورد میں ہوئی بغداد میں مدفون ہیں۔

غوث الاعظم کے صبر واستقامت پر دلالت کرنے والا ایک واقعہ اہل علم حضرات میں بڑا مشہور ہے۔ اس زمانے میں آپ کی عمر مبارک ترپن برس کی تھی گویا یہ ۵۲۳ھ میں پیش آیا۔ شیخ کیمیائی، شیخ بزاز اور شیخ ابوالحسن یہ تینوں حضرات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہمراہ مقبرہ شونیز میں مزارات کی زیارت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ فقہاء اور قرأ حضرات کی کثیر تعداد بھی ساتھ تھی۔ شیخ حماد بن مسلم کا وصال ہو چکا تھا۔ غوث پاک اپنے استاد مکرم کے مزار پر بے حس وحرکت کھڑے ہوئے۔ سورج رفتہ رفتہ بلند ہونے لگا اور گرمی کی شدت نا قابل برداشت ہونے لگی۔ مگر چوں کہ غوث پاک خاموش کھڑے تھے لہذا دیگر حضرات بھی آپ کے پیچھے دست بستہ کھڑے رہے۔ کافی عرصہ بعد آپ نے مڑ کر ساتھیوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ رخ روشن پر بشاشت تھی۔ لوگوں نے طویل قیام کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا" آج میں دلی مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ آج میں اپنے شیخ کے کام آیا۔ یہ میرے عنفوان شباب کا ذکر ہے۔ ایک روز میں شیخ حماد کی ہمراہی میں نماز جمعہ کی ادائیگی کیلئے جامع الرصافہ کی طرف جارہا تھا۔ کثیر تعداد میں دیگر طلباء بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جب ہم قنطورہ یہود (قنطورہ بمعنی پُل) کے قریب پہنچے تو جانے میرے شیخ کے دل میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے شدید سردی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے برفیلے پانی میں دھکا دے دیا میں نے اونی جبہ پہنا ہوا تھا۔ پانی میں گرنے سے ایک پل پیشتر میں نے فوراً بسم اللہ پڑھ کر غسل جمعہ کی نیت کر لی۔ شیخ حماد تو مجھے دھکا دے کر آگے بڑھ گئے میں پانی میں شرابور ٹھٹھرتا ہوا باہر آیا اور خاموشی سے اپنے شیخ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دیگر طلباء نے جب میری کیفیت دیکھی تو میرا مذاق اڑانے کی کوشش کی مگر شیخ حماد نے ان کو ڈانٹ دیا اور کہا" میں نے تو عبدالقادر کو آزمائش میں مبتلا کرنا چاہا تھا مگر یہ کوہ گراں اپنی جگہ سے متحرک ہی نہیں ہوتا۔ آزمائش کی گھڑی سے بھی اس نے استفادہ کر لیا" یہ اشارہ میری نیتِ غسل کی طرف تھا۔

اس واقعہ کو ایک عرصہ بیت گیا شیخ حماد رحلت فرما گئے آج میں نے شیخ موصوف کو پوری سج دھج میں دیکھا۔ ان کے جسم پر جواہرات سے مرصع لباس فاخرہ تھا سر پر تاج یاقوت ہاتھوں میں طلائی کنگن اور پاؤں میں طلائی جوتے عجیب بات میں نے یہ دیکھی کہ آپ کا دایاں ہاتھ مفلوج تھا۔"

"آپ کے اس ہاتھ کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا تو آپ

Marfat.com

نے فرمایا
فرزند! اس ہاتھ سے میں نے تجھے قنطورہ یہود پر سے پانی میں دھکا دیا تھا' کیا تو مجھے معاف نہیں
کر سکتا؟''

''استاد مکرم' میں صدق دل سے آپ کو معاف کرتا ہوں' میں نے فوراً کہا'' اور رب
عزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کے دست مبارک کو صحت کاملہ عطا فرمائے'' چنانچہ میں ابھی
تھوڑی دیر پہلے جب بارگاہ ایزدی میں دعا کر رہا تھا تو پانچ ہزار اولیاء اپنے اپنے مزارات میں
میری دعا پر امین کہہ رہے تھے۔ میری دعا کو شرف قبولیت نصیب ہوا۔ شیخ حماد کی تکلیف دور ہوئی
اور انہوں نے ابھی ابھی مجھ سے مصافحہ کیا ہے۔''

اس واقعہ کی تشہیر بغداد کے گلی کوچوں میں ہوئی تو اکثر مشائخ میں چہ میگوئیاں ہونے
لگیں۔ علماء وصوفیا کی جماعت' حقیقت حال سے آگاہی حاصل کرنے درس گاہ غوث الاعظم میں
حاضر ہوئی مگر کوئی ایک فرد بھی رعب وجلال کے سبب حرف مدعا زبان پر نہ لا سکا۔ آپ نے خود ہی
فراستِ غوثیہ سے کام لیتے ہوئے ان کا عندیہ پالیا اور مسکرا کر کہا۔ ''آپ لوگ شیخ حماد والے
واقعے کی تصدیق کرنے آئے ہیں بہتر ہے اپنے میں سے دو بزرگوں کا انتخاب کر لیں' حقیقت
حال خود بخود ان کی زبان پر آ جائے گی''۔

چنانچہ شیخ ہمدانی جو بغداد میں بطور مہمان مقیم تھے اور ایک مقامی بزرگ عبدالرحمن کو منتخب
کیا گیا۔ آئندہ جمعہ تک ہماری زبانوں پر حقیقت حال آ جانی چاہیئے۔'' دونوں بزرگوں نے بیک
زبان کہا۔ مگر غوث پاک مراقبے میں جا چکے تھے حاضرین بھی خاموش ہو گئے۔ محفل پر سکوت بے
کراں جاری تھا جب اچانک درس گاہ کے باہر شور بلند ہوا اور شیخ یوسف نامی بزرگ برہنہ پا
بھاگتے ہوئے محفل میں حاضر ہوئے'' خدا کی قسم مجھے ابھی ابھی شیخ حماد نے حکم دیا ہے کہ میں
سارے واقعے کی تصدیق کروں۔ ساری بات مبنی بر حقیقت ہے'' حیران کن بات یہ ہوئی کہ وہ
''منتخب شدہ حضرات'' بھی سر محفل تصدیق فرمانے لگے۔ اور علماء کی جماعت شدت خجالت سے
معافی کی خواستگار ہوئی۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا رنگ گندمی' آواز کڑک دار جس کی گونج میں کھنک واضح تھی
۔ جسم اکہرا مگر سینہ مبارک کشادہ تھا۔ ریش مبارک گھنی اور لمبی تھی۔ اکثر خاموش رہتے مگر جب لب
کشا ہوتے تو حاضرین وسامعین خود بخود مہر بہ لب ہو جاتے۔ ہر طرف سناٹا چھا جاتا ارشادات

Marfat.com

عالیہ کا ایک ایک لفظ سماعتوں سے ٹکراتا ہوا دلوں تک اتر جاتا اور ان کی آلائش و کدورتیں دور کر کے ان کو آئینہ تمثال بنا دیتا۔ لوگ مفاہیم کے موتیوں سے بصیرتوں کو سجاتے اور غوث پاک کی موجودگی پر سجدۂ شکر بجا لاتے۔

آپ مجتہد العصر بھی تھے آپ کا ہر اجتہاد امت مسلمہ کے لیے باعث خیر و برکت ہے۔ فتویٰ صادر فرماتے وقت آپ اپنے جد اعلیٰ حیدر کرارؓ ہی کی طرح پل بھر میں بات کی تہ تک رسائی حاصل کر لیتے اور ایسا لاجواب فتویٰ دیتے کہ ہر شخص کی تسلی و تشفی ہو جاتی۔ واضح رہے کہ اس دور میں مفتیوں کی کمی نہ تھی نہ علماء کی۔ بغداد تو ویسے بھی علم و آگہی کا گہوارہ رہا ہے۔ ایک بار ایک شخص نے بڑا انوکھا مسئلہ چھیڑ دیا فتوے کی نوعیت عقدہ کشائی کے بعد مناسب راہنمائی کا تقاضا کرتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی عجیب و غریب شرط رکھ دی جو پوری نہ ہوئی تو طلاق بائن ہو جاتی۔ شرط یہ تھی ''میں ایسی عبادت کروں گا جو اس وقت کرۂ ارض پر کوئی نہ کر رہا ہو اور اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو میری بیوی کو طلاق ہو'' بغداد کیا امت مسلمہ کے سارے مفتی اور علماء عاجز آ گئے۔ انداز عبادت کوئی سا بھی ہو یہ بات کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ کرۂ ارض پر اسی قسم کی عبادت کوئی اور نہیں کر رہا...... رات بھر میں قران ختم کرنا' جنگلوں پہاڑوں میں یاد الٰہی کی جانب راغب ہونا' سطح آب پر نوافل ادا کرنا ہر نوع کی عبادت میں شک و شبہے کی بہر حال گنجائش ضرور ہوتی ہے کہ کرۂ ارض کے کسی گوشے میں کوئی اور اللہ کا بندہ بھی اس قسم کی عبادت میں مصروف ہو۔ بہر حال یہ ایسا عقیدہ تھا جسے حل کیا جانا ضروری تھا۔ مفروضہ تھا یا حقیقت' اس سے بحث نہیں۔ انسانی فہم و فراست کا امتحان ضرور تھا اور اس کے لیے فراست ''باب علم'' درکار تھی۔ غوث پاک کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپ نے پل بھر میں اسے حل کر دیا ''یہ شخص فوراً بیت اللہ شریف میں حاضر ہو۔ مطاف کو خالی کرایا جائے اور یہ شخص تنہا طواف کرے طلاق نہیں ہوگی''

فتوے اور فیصلے کی خوبی یہی ہے کہ وہ مبنی بر انصاف' محسوس ہو اور دل مطمئن ہو جائے۔ متن کو حاشیہ آرائی سے سہارا دینا فیصلہ ہوتا ہے نہ فتویٰ اور یہی علوم ظاہری و باطنی میں فرق ہے۔

مشہور کتب روایات کے مطابق سیدنا غوث الاعظم حنبلی مسلک رکھتے تھے دنیائے اسلام کے مختلف ممالک سے استفتاء (فتویٰ حاصل کرنے والے) آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ کی رائے حرف آخر سمجھی جاتی اور آپ فقہی مسائل میں امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل

Marfat.com

(۷۸۰ء تا ۸۵۵ء) کے مسلک پر فتویٰ دیا کرتے تھے ویسے بھی بغداد میں علماء حنابلہ کی اکثریت تھی امام موصوف چونکہ کافی عرصہ بغداد میں مقیم رہے لہٰذا ان کی تعلیمات کا اثر زیادہ تھا۔ یہ بات بھی مناقب غوث کی مستند کتب میں مرقوم ہے کہ غوث الاعظم' حضرت امام ابوحنیفہ سے بعض فقہی مسائل میں اختلاف رکھتے تھے اور امام احمد بن حنبل سے آپکو دلی لگاؤ تھا چنانچہ اکثر مقامات پر آپ ''امامنا احمد بن حنبل'' تحریر فرمایا ہے۔

ایک روز علی بن الہیتی رحمتہ اور شیخ بقابن بطور رحمتہ دونوں حضرات' غوث الاعظم کے ہمراہ امام احمد کے روضے پر زیارت کے لیے گئے تو امام موصوف بہ نفس نفیس قبر مبارک سے باہر تشریف لائے غوث الاعظم کو سینے سے لگایا' خلعت پہنائی اور کہا ''عزیزم عبدالقادر! علم شریعت' طریقت وحقیت' علم حال اور فصل الرجال' اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد کیے'' اس میں شک وشبے کی بہرحال کوئی گنجائش نہیں کہ غوث الاعظم احمد بن حنبل سے غایت درجے کا دلی لگاؤ تھا اور وہ فتویٰ بھی ان ہی کے مسلک پر صادر فرمایا کرتے تھے لیکن راقم اپنی تحقیق بھی پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے (فیصلہ قارئین کی صوابدید پر چھوڑا جاتا ہے)

شیخ ابوتقی محمد بن ازہر صیرفینی رحمتہ ایک برس تک کسی رجال الغیب سے ملاقات کی حسرت لیے پھرا کرتے تھے ایک بار انہوں نے عالم رویا میں مزار احمد بن حنبل پر گوہر مقصود حاصل کرلیا۔ بیدار ہوئے تو فوراً مزار مبارک کی طرف چل دیئے۔ وہاں عالم خواب کا ملاقاتی موجود تھا۔ آپ اس کی طرف لپکے تو وہ دریائے دجلہ کی طرف برق رفتاری سے چلنے لگے۔ دریائے دجلہ پر پہنچے تو اس شخص کے سامنے دریا کے دونوں کنارے سمٹ کر ایک قدم کے فاصلے پر آگئے۔ چنانچہ وہ شخص دریا کے اس پار جا پہنچا۔ صیرفینی رحمتہ نے بہ آواز بلند اسے رب العزت کا واسطہ دے کر رک جانے کو کہا۔ خیر دونوں کی ملاقات ہوئی تو بزرگ موصوف نے رجال غیب سے دریافت کیا ''آپ کا مسلک کیا ہے؟''

''الحمدللہ میں ملت حنفیہ کا پیرو ہوں''

ملاقات سے واپسی پر صیرفینی رحمتہ اس ملاقات کی روداد' غوث الاعظم کے گوش گزار کرنے آستانہ غوثیہ پر حاضر ہوئے مدرسے کے دروازے پر پہنچے تو دروازے کھولے بغیر ہی غوث الاعظم نے فرمایا ''اے محمد صیرفینی! روئے زمین پر مشرق ومغرب میں اس وقت کوئی ولی اللہ سوائے عبدالقادر کے' حنفی مسلک کا موجود نہیں'' یہ واقعہ بہجت الاسرار کے علاوہ قلائد الجواہر

Marfat.com

ہیں بھی مرقوم ہے۔

غوث پاک کے عہد شباب میں جس شخصیت نے سب سے پہلے ان کے مقام و مرتبے کو کما حقہ پہچانا وہ کرد قبیلے کے مایہ ناز اور قابل صد افتخار بزرگ تاج العارفین شیخ ابوالوفا بن محمد صلوانی المعروف کاکیس رحمتہ اللہ ہیں خود غوث پاک فرمایا کرتے تھے کہ ''کرد قبیلے میں تقرب الٰہی کے اعتبار سے کاکیس رحمتہ لاثانی ہیں۔ خدا سے ان کی وابستگی، ہر ولی کیلئے باعث رشک ہونی چاہیئے ''۔

جس بزرگ کے بلند مقام و مرتبے کی شہادت خود غوث پاک دے رہے ہیں اہل قلم اس کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں۔ پہلی بار غوث پاک جب عنفوان شباب میں ابوالوفاؒ کی خدمت میں خانقاہ قلمیبیا حاضر ہوئے تو بڑی عجیب صورت حال کا سامنا ہوا۔ واضح ہو کہ شیخ ابوالوفاؒ عمر میں غوث پاک سے ترپن برس بڑے تھے اور مقام ولایت پر کافی عرصہ پہلے فائز ہو چکے تھے۔ اس لحاظ سے نوعمر طالب علم پر ایک بزرگ ولی اللہ کا ادب واحترام واجب تھا۔ ابھی آپ درِ خانقاہ سے کافی دور تھے کہ ابوالوفاؒ نے مرید خاص مطر رحمتہ اللہ کو حکم دیا اے مطر! دروازہ بند کر دو اگر کوئی اندر آنے کی اجازت طلب کرے تو صاف انکار کر دینا۔ مطر رحمتہ اللہ علیہ اپنے شیخ کے اس عجیب وغریب حکم پر حیران تو ہوئے کہ یہ دربار شاہی نہیں، آشیانہ فقیر تھا۔ جہاں ہر شخص بلا روک ٹوک حاضر ہو سکتا تھا۔ مگر لیت ولعل وغیرہ سے کام لینا بھی دستور خانقاہی کے منافی تھا لہذا انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ''عبدالقادر جیلانی کو اندر آنے کی اجازت درکار ہے۔ دروازہ کھولئے'' نوجوان طالبعلم نے اجازت طلب کی تو مطرؒ نے اپنے شیخ کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا اور شیخ اشارے سے انکار کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ ادھر شیخ عبدالقادرؒ مضطرب انداز میں خانقاہ کے سامنے ادھر ادھر ٹہلنے لگے، غیر متوقع صورت حال کا سامنا ہو تو طبیعت پر اضطراب ہو ہی جاتی ہے۔ کافی دیر کے بعد شیخ ابوالوفاؒ مراقبے سے باہر آئے گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے، مطرؒ کو فوراً دروازہ کھولنے کا حکم دیا اور خود نوجوان طالب علم کے استقبال کو آگے بڑھے، تین بار غوث پاک سے معانقہ کیا، مطرؒ ان کے مرید خاص بھی حیران و ششدر اپنے شیخ کو تک رہے تھے کہ شیخ موصوف کی طبیعت میں جلالی شان کچھ زیادہ ہی تھی۔ کاکیس رحمتہ نے معانقے کے بعد فرمایا ''اے عبدالقادر! دروازہ بند کرنے کا سبب بداخلاقی یا غرور تکبر نہیں، میری ناآشنائی تھی۔ تمہارے مستقبل کے مقام و مرتبے سے آگاہ ہو کر سچ بات تو یہ ہے کہ میں خوف زدہ سا ہو گیا ہوں

Marfat.com

خیر‘عزت وذلت تو خدا کے ہاتھ ہے۔اب جب کہ تمہاری آمد کے مقصد سے میں بخوبی واقف ہو چکا ہوں تو میرا خوف بھی زائل ہو گیا ہے خوش آمدید‘فرزند صد افتخار‘خوش آمدید‘‘

اس کے بعد بھی غوث الاعظم زمانہ طالبعلمی میں شیخ ابوالوفا کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ فوراً اٹھ کر استقبال کرتے بلکہ حاضرین مجلس کو حکم دیتے ’’لاثانی ولی اللہ کی تعظیم بجالاؤ‘ کھڑے ہونے میں تاخیر مت کرو‘ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران شیخ مطر رحمتہ نے اپنے شیخ سے غوث پاک کے مقام ومرتبے سے واقفیت حاصل کرنا چاہی تو شیخ موصوف نے فرمایا۔’’میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ لڑکا بغداد میں نعرہ زن ہوگا۔قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ‘‘ میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے)اور پھر تمام اولیاء کرام اپنی گردنیں خم کر دیں گے‘‘ پھر ابوالوفا نے حاضرین مجلس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور مزید فرمایا تم میں جو شخص اس وقت موجود ہو‘عبدالقادر کے سامنے سر تسلیم خم کردے‘ کہ یہی لوح محفوظ پر مرقوم ہے‘‘۔محفل پر سناٹا طاری تھا کہ یہ کلمات د افتخار تو بظاہر تکبر کی حدود چھو رہے تھے۔خانقاہ میں استقبال کے علاوہ بھی کاکیں رحمتہ نے شیخ عبدالقادر رحمتہ کا عالم شباب میں انوکھا تعارف پیش کیا جو بظاہر توہین آمیز دکھائی دیتا تھا مگر وضاحت کے بعد ہر شخص کی تسلی وتشفی ہوگئی۔

ایک روز شیخ ابوالوفا رحمتہ خانقاہ قلمنبیا بغداد میں واعظ فرما رہے تھے کہ غوث پاک بھی محفل میں شرکت کی غرض سے ادھر آنکلے۔شیخ موصوف نے سلسلہ وعظ منقطع کر کے آپ کو محفل وعظ سے چلے جانے کا حکم دیا اور انکے چلے جانے کے بعد وعظ کا ازسرنو آغاز کیا۔تھوڑی دیر بعد غوث الاعظم پھر محفل میں آگئے اور شیخ ابوالوفا نے حسب سابق ان کو بزم وعظ سے نکال دیا ۔تیسری بار جب غوث پاک تشریف لائے تو کاکیں رحمتہ نے وعظ روک کر ان کا استقبال کیا منبر سے اتر کر ان سے معانقہ فرمایا اور روشن جبین پر بوسہ ثبت فرمانے کے بعد حاضرین مجلس سے کہا ’’سب لوگ ولی اللہ کی تعظیم میں کھڑے ہو جائیں‘‘ پھر انہوں نے اہل بغداد کو تنبیہ فرمائی۔’’اے اہل بغداد‘ میری بات ہمہ تن گوش ہو کر سنو‘ عبدالقادر کو محفل میں شرکت سے باز رکھنے سے مراد ان کی توہین نہیں کی بلکہ میرا مدعا ان کا تعارف کرانا تھا‘ غور سے دیکھ لو اور پہچان لو‘ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہء قدرت میں ساری کائنات ہے‘ عبدالقادر کے سر پر بے مثال تاج ہے جس کا دائرہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے‘‘ پھر وہ غوث پاک سے مخاطب ہوئے’’اے عبدالقادر! بے شک یہ ہمارا دور ہے مگر عنقریب عراق میں تمہارے مرغ کے سوا سب کے مرغان خوش گلو خاموش

Marfat.com

کر دیئے جائیں گے اور پھر تمہارا مرغ خوش الحان تا قیامت بانگ دیتا رہے گا''

محفل وعظ اختتام پذیر ہوئی تو شیخ ابوالوفا نے غوث پاک کو پانچ اشیاء عنایت فرمائیں اپنا مصلیٰ، قمیص، تسبیح، پیالہ اور عصا۔ لوگوں نے یہ دلی لگاؤ دیکھا تو اصرار کیا ''اپنے دست حق شناس پر عبدالقادر سے بیعت لے لیں''

''کاش ایسا ممکن ہوتا'' کا ئیں رحمۃ اللہ نے فرمایا ''اس روشن جبیں پر میرا نہیں کسی اور کا نام لکھا ہوا ہے'

''جب تمہارا دور آئے تو ان بوڑھی ہڈیوں کو نظر انداز نہ کر دینا'' ایک بار پھر شیخ ابوالوفا نے غوث پاک کے مقام و مرتبے کو اجاگر کیا۔ یہ تبرکات جو مستقبل کے ولی الزماں کے سپرد کیے تھے معمولی اشیاء نہ تھے بلکہ غیر معمولی خصوصیات کے حامل تھے۔ مثلاً اس تسبیح کا ہر دانہ خود بخود گردش کرتا رہتا تھا (وصال شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بعد یہ تسبیح شیخ علی بن الہیتی کے ہاتھ جا پہنچی) اس پیالے کی خصوصیت یہ تھی کہ جب کوئی غیر شخص اسے چھوتا تو اس کا سارا بازو لرزنے لگتا۔

تاج العارفین شیخ ابوالوفا رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مقام کا وقت سے پہلے اعلان کر دیا تھا چونکہ متقدمین کے زمرے میں شمار ہوتے تھے نیز غوث پاک سے گہرے لگاؤ کا تقاضا ہے کہ ان کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔ آپ اپنے دور کے سردارِ مشائخ مشہور تھے۔ لاتعداد کرامتیں آپ سے ظہور پذیر ہوئیں۔ فیض یافتگان میں شیخ الہیتی اور بقا بن بطوؒ جیسی شخصیات کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ مشائخ عراق کے بقول آپ کے جھنڈے تلے سترہ اولیاء تھے۔ جب شیخ ابومحمد شنکیؒ نے آپ کو بیعت کیا تو تاریخی الفاظ کہے تھے ''آج میرے جال میں ایسا شاہین آ گیا ہے جس کی مثال کسی شیخ کے پاس نہیں''۔

ایک زمانے میں شیخ ابوالوفا نامی گرامی ڈاکو تھے ستم گری پیشہ تھا۔ ایک بار شیخ شنکیؒ کی عملداری میں واردات کا ارتکاب کیا لوگ آستانہ فقیر پر روتے پیٹتے حاضر ہوئے اور عرض کی ''ڈاکوؤں نے ہمیں بے سروسامان کر دیا'' ہم نہ یہ نقصان برداشت کر سکتے ہیں نہ ان کا مقابلہ 'ہماری دادرسی کی جائے'' شیخ شنکی خلق خدا کی آہ و فغاں سے بڑے متاثر ہوئے اور تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچتے رہے پھر انہوں نے اپنے خادم کو حکم دیا ''ڈاکوؤں کے سردار کے پاس جاؤ اور اس سے کہنا زیادہ بلندی پر پرواز کرنے والا پرندہ جب گرتا ہے تو کبھی نہ اٹھنے کے لیے گرتا ہے۔ ہم صرف پر نوچ رہے ہیں ضرورت پڑنے پر بازو بھی توڑ سکتے ہیں کافی اودھم مچا لیا اب گھر لوٹ آؤ'' خادم

Marfat.com

جب ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچے تو سردار کی ہیبت سے لرزنے لگا۔ ادھر سردار نے شعلے برساتی آنکھوں سے فرستادہ فقیر کو دیکھا تو اس خادم کے حواس کوچ کر گئے پھر جانے کیا ہوا کہ خود ڈاکوؤں کے سردار نے زمیں بوس خادم فقیر کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا' تھوڑی دیر بعد جب خادم کو ہوش آ گیا تو وہ ڈاکو کے طرزِ عمل سے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا

"تمہارے شیخ نے کیا پیغام بھیجا ہے' جلد بتاؤ مجھے بڑی وحشت ہو رہی ہے" ڈاکوؤں کے سردار نے کہا

"شیخ نے کہا ہے' گھر لوٹ آؤ" خادم نے سارا پیغام من وعن ڈاکو کے گوش گذار کیا۔ الفاظ تو عام تھے مگر ان کی تاثیر غیر معمولی ثابت ہوئی۔ سردار نے سوئے آسمان دیکھا اور کہا "اچھا چلو گھر چلیں" اور اسی وقت شیخ ابوالوفا خادم کے ہمراہ آستانہ شیخ شنکی رحمتہ کی طرف روانہ ہو گئے اور ایک توبہ کی کہ توبہ بھی نازاں ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق خادم اکیلا واپس چلا گیا تھا اور شیخ ابوالوفا بعد میں چوکڑیاں' شیخ شنکی رحمتہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ بہر حال دونوں کی ملاقات ہوئی تو درویش نے اپنا دستِ حق پرست آگے بڑھایا جسے ڈاکو سردار نے کبھی نہ چھوڑنے کے لیے تھام لیا۔ شیخ شنکی نے بیعت لینے کے لیے فوراً اپنا خرقہ "تائب نو" کو پہنا دیا اور اپنے پہلو میں بیٹھا کر دعائے خاص سے نوازا۔ اتنے میں موذن نے ظہر کی اذان دی۔ شیخ شنکی نماز کے لیے اٹھنے لگے تو انوکھے مرید نے بصد احترام عرض کی۔ "حضور مرغِ عرش کی اذان کا تو انتظار فرمائیں"۔

شیخ شنکی نے چونک کر اپنے شاگرد رشید کو دیکھا اور فرمایا "فرزند! یہ اذان تم کب سے سن رہے ہو؟"

حضور! کوئی عرصہ تیئس برس سے یہ اذان میری سماعت سے ٹکرا رہی ہے' ابوالوفا نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

"اللہ تمہاری "تاخیر" سے درگذر فرمائے اور بساطِ علم کو وسیع کرے" شیخ شنکی نے صدق دل سے دعا کی۔ مشہور روایت ہے جب شیخ ابوالوفا بغداد میں داخل ہوئے تو گلی کوچوں میں ندائے غیب گونجی "لوگو! مینارِ نور کی تعظیم کے لیے تیار ہو جاؤ"

حنبلی مسلک کی یہ عظیم شخصیت ۵۰۱ھ میں دنیا سے روپوش ہوئی۔ مزار مقدس بقلمنیا (بغداد) میں ہے۔ بعض کتب میں آپ کا مسلک "شافعی" مرقوم ہے۔

Marfat.com

مناقب غوث پاک میں ان کے کشف وکرامات کی تفصیل تو بے حد طولانی ہے ہم ان کے ''نعرہ افتخار'' کی تشریح کرتے ہیں جو منجانب اللہ تھا اور جس کی تصدیق متقدمین اور متاخرین نے فرمائی۔ حلب کی خانقاہ میں مشائخ عراق کی کثیر جماعت تھی۔ حافظ ابوالعزیز عبدالمغیث، شیخ علی بن الہیتی، شیخ ابوالنجیب سہروردی مرشد وعم محترم شیخ شہاب الدین سہروردی اور دیگر بڑی بڑی شخصیات موجود تھیں۔ غوث الاعظم سب کے روبرو وعظ فرما رہے تھے۔ خطاب کے عین درمیان آپ اچانک خاموش ہو گئے اور مکاشفے کے بعد فرمایا۔

''قدمی ھذہٖ علیٰ رقبۃ کلِّ ولی اللہ'' (میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے)

محفل پر چھایا ہوا سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا۔ سب سے پہلے شیخ علی بن ہیتی کو ہوش آیا آپ نے عملاً آگے بڑھ کر آپ کا قدم اپنی گردن پر رکھ لیا۔ پھر شیخ ابوالنجیب سہروردی نے اپنی گردن اتنی جھکا دی کہ پیشانی زمین کو چھونے لگی ہونٹوں سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے ''علی راسی علیٰ عینی دراسی'' (میرے سر آنکھوں پر)

غوث پاک نے جب قدمی ...... الخ والے الفاظ ادا کیے تو اطراف عالم میں دور ونزدیک کوئی ایسا ولی نہیں تھا جس نے قطبیت کے اس پرچم کا مشاہدہ نہ کیا ہو جو آپ کے دست مبارک میں تھا۔ اور تاج غوثیت جو سر مبارک کو زینت بخش رہا تھا سب کے زیر مشاہدہ تھا اور خلعت فاخرہ چشم تماشا کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ اس وقت روئے زمین پر 313 اولیاء موجود تھے جن میں سترہ حرمین شریفین میں، ساٹھ عراق میں چالیس عجم میں، تیں شام میں، بیس بلاد مصر میں، ستائیس مغرب میں، گیارہ حبشہ میں گیارہ وادی یاجوج ماجوج میں، سات سراندیپ میں، سینتالیس کوہ قاف میں اور چوبیس بحر محیط میں (یہ کل تعداد 294 بنتی ہے بقیہ 19 کے متعلق اللہ بہتر جانتا ہے) ان اولیاء میں دس حضرات ابدال وقت تھے باقی سلاطین طریقت۔ ابدال کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ بقا بن بطو ۲۔ شیخ ابوسعید قیلوی ۳۔ شیخ علی بن الہیتی ۴۔ شیخ عدنان بن مسافر ۵۔ شیخ موسیٰ زولی ۶۔ شیخ عبدالرحمٰن طفسونجی ۷۔ شیخ ابومحمد بصری ۸۔ شیخ حیات بن قیس اور شیخ ابومدین مغربی ۱۰۔ شیخ احمد رفاعی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) شیخ احمد رفاعی اس وقت مجلس میں خطاب فرما رہے تھے۔ اچانک انہوں نے خاموشی اختیار کی اور بے ربطہ سا جملہ ادا کیا 'میری گردن پر'' ابھی ابھی شیخ عبدالقادر نے کہا ہے ''میرا قدم تمام اولیاء کی گردن پر''

Marfat.com

شیخ ابو مدین بلاد مغرب میں تھے انہوں نے بھی اس پر لبیک کہا اور فرمایا ''اے اللہ تیرے فرشتوں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے سنا اور سر تسلیم خم کر دیا'' بعد میں مشائخ نے اس کی تشریح فرمائی کہ یہ الفاظ شیخ عبدالقادر جیلانی نے رب العزت کے حسب حکم ادا کیے تھے اور یہ اختیار بھی ان کو عطا فرمایا تھا اگر کوئی سر تسلیم خم نہ کرے تو اس کا مقام سلب کر لیا جائے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ ان دنوں خراسان کے پہاڑوں میں مجاہدات و ریاضت میں مصروف تھے ہواؤں کے دوش پر اڑتا ہوا یہ حکم ان تک پہنچا تو انہوں نے بھی اپنی گردن اس قدر خم کی کہ پیشانی زمین کو چھونے لگی اور بے اختیار ان کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے ''قد ماک علی راسی وعینی'' خود غوث الاعظم اس اظہار نیاز سے اتنے متاثر ہوئے کہ بھری بزم میں اعلان فرمایا۔ ''غیاث الدین کا صاحب زادہ اطاعت میں بازی لے گیا عنقریب اس کے عوض ولایت ہند پر متمکن ہوگا۔''

اصفہان کے ایک ولی اللہ شیخ صنعان رحمۃ، غوث پاک کے ہم عصر تھے مگر مقام غوث پاک کے ادراک میں ٹھوکر کھا گئے اور گردن جھکانے میں قائل نہ ہوئے حالانکہ روحانی وسیلے سے پیغام ان تک پہنچ گیا تھا۔ ان کی ولایت و بصیرت سلب ہو گئی حتیٰ کہ ایمان تک کو خطرہ لاحق ہو۔ آخر کار ان ہی کے ایک ارادت مند کی عاجزی و خدمت گزاری کام آئی اور غوث الاعظم نے متوجہ ہو کر ان کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ اس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ غوث پاک کے یہ الفاظ حکم الٰہی کے مطابق ادا ہوئے تھے مگر وسعت فرمان کے متعلق موجودہ دور کے بعض اکابرین نے اختلاف کیا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ یہ فرمان اولیائے وقت یعنی اس زمانے کے اولیا تک محدود تھا۔ کیونکہ اولیائے متقدمین میں صحابہ کرام، تابعین اور اولیائے متاخرین میں حضرت امام مہدی بھی شامل ہیں۔ لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ اس قول کے تحت تمام اولیائے متقدمین و متاخرین بھی آتے ہیں مگر اصحاب رسولؐ اور اہل بیت کے اولیاء اس زمرے میں نہیں آتے کہ ان کا مقام بہر حال بلند و بالا ہے۔

شیخ ابوسعید قیلوی نے اس فرمان کی تشریح یوں فرمائی کہ یہ حکم خداوندی کے عین مطابق تھا اور چوں کہ شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ قطبیت کے اکمل ترین مقام پر فائز تھے لہذا اس کا اعلان ضروری تھا۔ کیوں؟ مقام قطبیت، شفاعت کی علامت بن جاتا ہے۔ لیکن بعض حضرات نے قدم سے مجازی معنی بھی مراد لیئے ہیں۔ یعنی قدم مراد طریقہء بیان، راستہ وغیرہ جیسے عربی میں کہا جاتا

Marfat.com

ہے ''فلان علٰی قدمِ حمید'' یعنی فلاں عمدہ راستے پر ہے۔ استدلال وہی ہے کہ اگر ''قدمی'' سے مراد ماضی و مستقبل کے اولیاء کرام مراد لی جائے تو بزرگان اسلاف کا احترام بے معنی ہو کررہ جاتا ہے۔ بقول حضرت جنید بغدادی ''طریقت کی اساس احترام پر ہے۔''

علامہ عسقلانی نے اس جملے کی تشریح میں فرمایا کہ اس سے مراد ''کثرت کرامت'' ہے جس سے بہر حال انکار کی گنجائش نہیں۔ ہم نے غوث پاک کے نعرہ ''قدم رقبہ'' کے متعلق تمام نکات ہائے نظر پیش کر دیئے (باقی واللہ اعلم بالصواب)

ہر مقام وجگہ پر ہر طرح کے لوگ آباد رہے ہیں اور رہیں گے۔ فرح بن حمامی درس گاہ غوثیہ کے قریب ہی رہتا تھا۔ مبالغہ آمیز خرق عادت وکرامات کا سن سن کر ہمیشہ ان کو بعید از قیاس تصور کرنے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ صفات کا تو منکر تھا مگر ''ذات'' کے نیاز حاصل کرنے کا دل سے مشتاق بھی تھا۔ ایک روز وہ اتفاقاً درس گاہ میں پہنچ گیا اس وقت موذن اقامت کہنے میں مشغول تھا چنانچہ ابوفرح نے سوچا کہ نماز ادا کرنے کے بعد نیاز بھی حاصل کرلوں گا لہذا وہ بھاگ کر کھڑی ہونے والی نماز میں شامل ہو گیا۔ لیکن اس افراتفری میں وضو کرنا اسے یاد ہی نہ رہا۔ نماز اور دعا کے بعد غوث پاک نے بڑی میٹھی سی مسکراہٹ سے اسے نوازا اور کہا'' صاحب زادے کسی خدمت کا موقع مجھے دیتے تو میں ضرور تمہارے کام آتا' مگر تمہاری غفلت کا تو یہ حال ہے نماز بھی بے وضو ہی ادا کر لی۔ یعنی زندگی میں نہ نظم وضبط ہے نہ ترجیحات کا خیال'' ابوفرح تو گویا بھرے بازار میں ننگا ہو گیا مارے وحشت سے ہوش اڑ گئے۔ شدت خجالت سے زمین میں گڑے کا گڑا رہ گیا۔ مشہور ہے کہ ابوفرح نے اپنی سوچ کا انداز بدلا تو غوث پاک کی نظر کرم سے بلند مرتبے پر فائز ہوا۔

یہ بات بھی مستند ہے کہ غوث پاک کے جسم پر مکھی نہیں بیٹھا کرتی تھی۔ یہ بڑا لطیف مسئلہ ہے۔ از روئے شریعت سوئی کے ناکے برابر نجاست' لباس کو پلید نہیں کر سکتی مگر اتقی کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔ پیکر اندر باہر سے پاک ہو تو نجاست میں لتھڑے ہوئے مکھی کے پاؤں بھی ناپسندیدہ گردانے جاتے ہیں۔ یہی پیکر غوث پاک پر مکھی نہ بیٹھنے کی وضاحت ہے۔

غوث پاک کی پیدائش سے بہت پہلے شیخ ابوبکر ہواز نے ایک مرتبہ دوران وعظ فرمایا کہ عراق میں پیدا ہونے والے اولیاء کی تعداد آٹھ ہے۔ (اولیائے کرام کے مدارج میں ولی' غوث' قطب' ابدال اور اوتاد شامل ہیں) حضرت معروف کرخیؒ' امام احمد بن حنبلؒ' بشیر الحافیؒ

Marfat.com

، منصور بن عمار، جنید بغدادی، سری سقطی، سہیل بن عبداللہ تستری اور شیخ عبدالقادر جیلانی
۔حاضرین مجلس نے پوچھا ”شیخ عبدالقادر جیلانی کون بزرگ ہیں؟“

”یہ شخص پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوگا آپ نے تعارف پیش کیا ایک عجمی شریف النسب، صدیقین وقطاب دوراں میں منفرد ہستی کا حامل ہوگا“

جیسا عرض کیا جا چکا ہے غوث پاک جلالی و جمالی صفات کا دلنواز مرقع تھے ایک نظر میں خلق خدا کے دلوں کو دھندلا دینے والی اشیاء کو پہچان لینے کے بعد اس کا تدارک بھی فرما دیتے۔ شیخ مظفر بن مبارک واسطی المعروف، شیخ حداد عنفوان شباب میں خدمت غوث پاک میں حاضر ہوئے ان کے پاس فلسفے کی ایک مشہور کتاب تھی جو شیخ حداد کو دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ غوث پاک نے نو وارد کی بغل میں کتاب پر نگاہ ڈالی اور بند کتاب کا مفہوم فراست قطبیت سے سمجھ لیا اور کہا ”صاحب زادے! یہ کتاب مار آستین سے کم نہیں اس کے حروف کو دھو ڈال“ پہلے تو شیخ حداد کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ بات جب پلے پڑی تو وہ بے حد پریشان ہوئے۔ کتاب سے جدائی بھی ناقابل برداشت تھی اور حکم غوث بھی ٹالا نہیں جا سکتا تھا اسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ ان کو ایک ترکیب سوجھی۔ ”کتاب کو ایک جگہ چھپا دیتا ہوں جو ہر نظر سے اوجھل ہو بعد میں چپکے سے اٹھا لوں گا“ یہ سوچ کر شیخ حداد اٹھنے لگے تو محسوس ہوا کہ ہاتھ پاؤں نے علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ وہ تو گویا مفلوج ہو کر رہ گئے۔ ادھر غوث پاک نے زیر لب مسکرا کر دیکھا۔ ان نظروں کا مفہوم شیخ حداد نے کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیا۔

”عزیزم! ادھر یہ کتاب لاؤ“ غوث پاک نے بڑی رسان سے کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ شیخ حداد نے کتاب پیش کرنے سے پہلے ایک حسرت بھری نگاہ سے اس کی ورق گردانی کرنا چاہی مگر وہ حسرت بھری نگاہیں ورطہ حیرت میں ڈوب گئیں۔ کتاب کے حروف غائب ہو چکے تھے۔ بہر حال وہ ”سادہ کاپی“ شیخ حداد نے غوث پاک کے حوالے کر دی۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے ورق گردانی کرتے ہوئے فرمایا ”کتنی مبارک ہے یہ کتاب ابن ضریس محمد کی فضائل قران ہے نا“ کتاب شیخ حداد کے پاس پہنچی تو وہ واقعی ”فضائل قران“ از ابن ضریس بن چکی تھی“ خط بھی بڑا دلکش تھا۔

”اپنی زبان اور دل کا رشتہ مضبوط بناؤ، زبان اور دل میں تضاد بندے کو لے ڈوبتا ہے“ غوث پاک نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا۔ ”اب رخصت ہو جاؤ“

Marfat.com

شیخ حداد محفل سے نکلے تو فلسفے کے سارے اسباق ذہن سے مٹ چکے تھے بالکل کتاب کے اوراق کی طرح۔ دوسرے روز شیخ حداد دلی رغبت اور روح کا میلان لے کر خدمت غوث پاک میں حاضر ہوئے۔ خوش آمدید بھی اسی انداز میں کیا گیا۔ اسی محفل میں کسی شخص نے ایک بزرگ کا قصہ چھیڑ دیا جو صاحب کشف و کرامات تھا۔ اس کے زہد و تقوے کی بڑی دھوم تھی قصہ گو نے بڑے دکھ سے کہا "وہ بزرگ کہتا ہے کہ وہ یونس بن متّٰی علیہ اسلام سے بلند مقام پر فائز ہو چکا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ غوث پاک کی آنکھوں سے گویا شعلے برسنے لگے۔ "کوئی ولی شان نبوت کی ہمسری نہیں کر سکتا" آپ نے فیصلہ صادر فرما دیا۔ پھر اپنے قریب پڑے تکیے کو پکڑ کر مسلنا شروع کر دیا۔ "یہ وہ ناپاک دل ہے جس میں ابلیس گھر کر چکا تھا لو ہم نے اسے مسل ڈالا"

یہ سنتے ہی محفل سے کچھ لوگ فوراً اس بزرگ کے گھر کی طرف دوڑے۔ وہاں تو کہرام مچا تھا۔ مریدان باوفا آہ و فغاں میں مشغول تھے "ہمارے شیخ اچھے خاصے بیٹھے ہم سے محو کلام تھے کہ اچانک گر کر تڑپنے لگے" سب نے بیک زبان صورت حال کی وضاحت کی۔ بعد میں یہی بزرگ اپنے ایک مرید کو خواب میں بڑے خوش و خرم دکھائی دیئے اور اپنی شادمانی کا سبب یوں بیان کیا "اگر چہ میری لغزش ناقابل معافی و تلافی تھی مگر شیخ عبدالقادرؒ کی دعاؤں کے طفیل میرا ناپسندیدہ قول حضرت یونسؑ نے معاف فرما دیا اور اس طرح خالق کائنات نے بھی مجھے بخشش سے نوازا۔"

"جو شخص اللہ کی محبت کا دم بھرتا ہے وہ اس کے بندوں سے نفرت کر ہی نہیں سکتا" غوث پاک مجلس خاص میں ارشادات عالیہ سے نواز رہے تھے۔ "گناہ بندے کی ذات نہیں اس کی صفت ہے گناہ قابل نفرت سہی مگر بندہ قابل نفرت نہیں ہونا چاہیے۔ قلب انسانی کی مثال آئینے کی سی ہوتی ہے جو گناہوں سے دھندلا جائے تو دستِ ہنرمند اسے صیقل کر سکتا ہے دھندلائے ہوئے آئینے کو توڑ دینا دانشمندی نہیں" یہ کہہ کر اچانک آپ خاموش ہو گئے اور سلسلہ کلام موقوف کر کے معذرت کرتے ہوئے مجلس سے باہر نکل گئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ جاتی دفعہ اپنا مصلیٰ بھی اٹھا کر لے گئے۔ اکثر حضرات مزاج آشنا تھے لہٰذا وہ مہر بہ لب رہے وہ جانتے تھے کہ غوث پاک کا کوئی عمل مقصد سے خالی نہیں ہوتا یہ الگ بات کہ ظاہر کی آنکھ اس مقصد سے آشنا نہ ہو سکے۔ گھر سے نکل کر آپ اپنے پڑوسی عبداللہ بن نقطہ کے ہاں پہنچے۔ وہاں عجیب دھما کہ چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ قمار بازوں کا گروہ، اپنے کام میں مشغول تھا۔ شطرنج کی بساط بچھی ہوئی تھی اور عبداللہ شرط

Marfat.com

لگا کر کھیل رہا تھا۔صورت حال یہ تھی کہ غوث پاک کا پڑوسی اس روز مسلسل ہارتا چلا گیا۔نقدی زیورات حتیٰ کہ اپنا مکان اس نے داؤ پر لگا دیا اور وہ بھی اجڑ گیا۔''جو اکسی کا نہ ہوا'' کے مصداق وہ مفلس وقلاش ہو گیا تو ہارے ہوئے جواری کی طرح دل شکستہ ہو کر بیٹھ گیا۔جیتنے والوں نے آخری بازی لگانے پر اکسایا''اب میرے پاس ہارنے کے لیے کچھ بھی نہیں''عبداللہ نے رحم طلب نگاہوں سے دشمن دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تمہارے پاس بہت کچھ ہے''جیتنے والے شخص نے کہا''اپنا دایاں ہاتھ داؤ پر لگا دو۔ شرط یہ ہوئی کہ جیتنے والا شکست خوردہ کا ہاتھ قلم کر دے۔''

''مجھے منظور ہے اگر میں جیت گیا تو ہاتھ قلم کرنے کی بجائے اپنا ہارا ہوا مکان واپس لے لوں گا''عبداللہ نے شرط میں ترمیم پیش کی جو حریف نے قبول کر لی۔بازی کا آغاز ہوا تو قسمت پھر اسے دغا دے گئی۔جب غوث پاک پڑوسی کے دولت خانے میں داخل ہوئے تو وہاں عبداللہ کا ہاتھ قلم کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اور خنجر آب دار کو دیکھ کر عبداللہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔غوث پاک تو کشف سے سب کچھ سمجھ چکے تھے' قمار باز البتہ ان کی آمد پر حیران وششدر رہ گئے۔آئینہ دل جب تک بالکل سیاہ نہ ہو جائے گنہگار حضرات'اللہ والوں کا احترام'عام انسانوں سے زیادہ کرتے ہیں کہ ان کو اپنی بے سروسامانی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔احساس زیاں کا مٹ جانا تو خیر پستی کا آخری درجہ ہوتا ہے جو بہت دیر میں آتا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ واپسی کے کئی راستے ہوتے ہیں مختصر سے لے کر مختصر ترین بھی۔بعض اوقات تو منزل ایک پل کی مسافت پر موجود ہوتی ہے بشرطیکہ قدم صدق دل سے اٹھایا جائے۔

''جناب آپ؟''قمار بازوں نے بیک زبان پوچھا

''محترم حضرات!میں اپنے پڑوسی نیک دل عبداللہ کی مدد کو آیا ہوں''غوث پاک نے سرسری لہجے میں فرمایا۔''معلوم ہوتا ہے آج ہمارا دوست بدنصیب ثابت ہو رہا ہے''۔پھر آپ نے اپنا مصلیٰ عبداللہ کی طرف بڑھایا۔''لو عزیزم ہمارا مصلیٰ داؤ پر لگا دو'مگر احتیاط سے کھیلنا شکست کا الزام ہمیں نہ دینا۔''

پہلے تو جواری لوگ ذرا حیران ہوئے پھر انہوں نے غوث پاک کے مصلے کو داؤ پر لگانا قبول کر لیا۔غوث پاک واپس ہوئے تو شدت کرب سے آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے۔وہ دل جو صبر واستقلال کا پہاڑ تھا جسے جنگلوں ویرانوں میں شیاطین عاجز نہ کر سکے وہ رو رہا تھا بھوک پیاس

Marfat.com

کی یلغار جاں لیوا تکالیف جن مبارک آنکھوں میں نمی پیدا نہ کرسکیں اور جو پلکیں آنسوں سے نا آشنا تھیں وہ ایک گناہوں کی دلدل میں ڈوبے انسان کی رائیگانی پر اشکوں سے تر تھیں۔ جب آپ محفل میں واپس آئے تو مزاج آشنا بھی پلکوں پر لرزتے آنسو دیکھ کر بیتاب ہو گئے۔

''حضور! کیا کسی سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی' ان آنکھوں میں اشکوں کا سبب؟'' تمام دلوں کا مدعا زبانوں پر آ گیا۔

''کوئی خاص بات نہیں عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا'' غوث پاک نے سب کو تسلی وتشفی سے نوازا اور سلسلہ کلام کا از سر نو آغاز کیا۔ یہ محفل کافی طویل ثابت ہوئی۔ ادھر غوث پاک کے پڑوسی نے وہ مصلیٰ داؤ پر لگا کر کھیل کا آغاز کیا جو غوث الثقلین' محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی کی روشن جبیں کا محرم راز تھا۔ کھیل کا پانسہ پلٹ گیا۔ جیتنے والے شکست پر شکست کھاتے چلے گئے عبداللہ بن نقطہ نے اپنا سب کچھ واپس جیت لیا اور مصلیٰ لے کر خدمت غوث میں حاضر ہوا جہاں افق طریقت کے درخشندہ ستارے' اور وہ بھی ایک سے ایک بڑھ کر تشریف فرما تھے۔ غوث الاعظم ان درخشاں ستاروں میں ماہ کامل کی صورت نورِ رشد و ہدایت بکھیر رہے تھے۔

''آؤ عبداللہ اس محفل میں خوش آمدید' کہو کیسی رہی؟'' غوث پاک نے گنہ گار کا بھرم رکھتے ہوئے اشارے کنائے میں بات کی۔

''جناب اللہ تعالیٰ کا اتنا کرم ہوا کہ بس تنگی داماں کا احساس ہونے لگا'' عبداللہ اس پردہ پوشی پر دل ہی دل میں قربان ہو رہا تھا۔

''پیاسے ہو' اسی لیے سادہ پانی بھی لذیذ لگتا ہے'' غوث الاعظم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عبداللہ ایسا بیٹھا کہ بس اسی آستانے کا غلام ہو گیا۔ دوسرے دن وہ اپنے گھر گیا اور سارا مال و متاع راہ خدا میں خیرات کر کے پھر اسی محفل میں آ بیٹھا۔ آستانے کے خادم نے دبے الفاظ میں پوچھا ''بھائی اپنے لیے بھی کچھ بچایا ہے یا سب کچھ خیرات کر دیا؟''

''جو کچھ میرے پاس بچ رہا ہے وہ ہفت اقلیم کے خزانوں سے بھی زیادہ ہے'' عبداللہ نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

کہتے ہیں غوث الاعظم کی نظر کرم سے عبداللہ بغداد کا دیانت دار و امین تاجر مشہور ہو گیا دو سو دینار تک یومیہ آمدن ہو گئی مگر راہِ خدا میں خرچ کرنے کا ایسا چسکا پڑا کہ ساری آمدنی غربا و مساکین کو کھانا کھلانے میں خرچ کر دیتا اور نماز عشاء سے پہلے دستر خوان جھاڑ کر کہتا۔

Marfat.com

''لو جناب آج کا حساب بے باق، کل سے نیا حساب شروع'' غوث پاک اپنے ''نو گرفتار'' سے مہر و محبت کا سلوک فرماتے اور عبداللہ تو خیر کشتگان غوث میں داخل ہو ہی چکا تھا۔

ایک بار آپ نے عجیب و غریب خطاب فرمایا ''مردِ کامل وہ ہے جو تقدیر سے جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ کیسا مرد ہے جو تقدیر کے سامنے سرنگوں ہو جائے؟''

گویا صدیوں بعد جو نعرۂ مستانہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے بلند کیا تھا ۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تو وہ کوئی غلط نہیں تھا شرط صرف یہ ہے کہ وہ نگاہ، ایک مرد مومن کی ہونی چاہیے۔ آیئے دیکھتے ہیں علامہ موصوف کیسی نگاہ کی طرف ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔ ابوالمظفر حسن بن نعیم ایک تاجر شیخ حماد بن مسلم کا عقیدت مند تھا۔ سفر سے پہلے وہ دعائے خیر و برکت کی غرض سے شیخ حماد کے آستانہ عالیہ پر حاضری دیا کرتا تھا۔ حسب دستور وہ شیخ حماد کی خدمت میں حاضر ہوا اور دعائے خیر کی درخواست پیش کی۔ حضور اس بار ملک شام جا رہا ہوں۔ سات سو دینار کی سرمایہ کاری کی ہے، دعاؤں سے فیض یاب ہونے حاضر ہوا ہوں۔

شیخ حماد مراقبہ میں گئے اور پھر گھبرا کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ''بہتر ہے یہ سفر ملتوی کر دو'' انہوں نے وضاحت فرمائی ''اس سال اگر تم سفر کرو گے تو وہ سفر آخرت ہوگا کیونکہ تم قتل کر دیے جاؤ گے۔ یہی لوح محفوظ پر مرقوم ہے۔''

حسن بن نعیم مغموم صورت بنائے درگاہ حماد سے نکلا۔ راستے میں غوث اعظم سے ملاقات ہوگئی۔ (یہ واقعہ ان کے عہد شباب کا ہے) غرض مند تو ویسے بھی دیوانہ ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی ایک سے مصیبت کا احوال کہنا بذات خود ایک مصیبت سے کم نہیں لیکن مصیبت اگر موت کی صورت، دندانِ ہلاکت کے ساتھ منتظر ہو تو حال دل سنانا دشوار نہیں ہوتا، تاجر نے من و عن شیخ حماد سے ملاقات کا حال بیان کیا اور اس سب دکھڑے میں گویا دست دعا پھیلا کر پیش کر دیا۔ غوث پاک نے داستان غم سماعت فرمائی اور مراقبے میں تشریف لے گئے۔ تاجر بیم و رجا کی حالت میں رخ انور کا نظارہ کرنے لگا۔ ہر پل اس پر قیامت گزر رہی تھی۔ قربت غوث پاک کا فیض تھا کہ خود تاجر کا احساس بیدار ہو چکا تھا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ گلاب کے پودے تلے کی مٹی بھی مہکنے لگتی ہے۔ لہذا چشم تصور سے تاجر حسن کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آخر جب وہ

Marfat.com

اپنے اضطراب پر قابو نہ رکھ سکا تو لپک کر غوث پاک کے قدموں سے لپٹ گیا اور کیفیت مراقبہ مجروح ہو گئی۔ یہ اگر چہ غایت درجے کی بے ادبی تھی مگر الاعمال بالنیات کے مصداق اس کی نیت خراب نہ تھی۔ حالت عشق و مستی میں سرزد ہونے والی کوئی حرکت بے ادبی کے زمرے میں نہیں آتی۔ غوث پاک نے اس دیوانے کو باغور دیکھا اور زیر لب تبسم سے فرمایا ''سودائی میرے پاؤں تو چھوڑ''

''حضور! میں ٹھہرا تاجر اب مفت میں یہ پاؤں چھوڑنے سے تو رہا'' غوث پاک کے تبسم نے تاجر کو تقویت بخشی۔

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم شوق فزا ہوتا ہے

''خدا تیری عمر دراز کرے پاؤں چھوڑ اور آرام سے میری بات سن'' غوث پاک نے دست کرم اس تاجر کے سر پر رکھ کر فرمایا ''تو سفر پر جا انشاءاللہ فائدے میں رہے گا۔''
تاجر اپنی سلامتی کی ضمانت لیکر واپس آیا تو زیر لب مسکرا کر کہہ رہا تھا
''اب دیکھتا ہوں موت میرا کیا بگاڑ لیتی ہے۔'' مناقب غوث پاک کی ساری کتب گواہ ہیں کہ حسن بن نعیم ملک شام میں اپنا تجارتی مال فروخت کر کے واپس آیا۔ اس سفر میں اس کو تین سو دینار کا فائدہ ہوا۔ یعنی سات سو کا مال اس نے ایک ہزار دینار میں فروخت کیا۔ اس کے بعد ظہور پذیر ہونے والے واقعات البتہ صورت حال کی مکمل وضاحت کرتے ہیں کس طرح اور کیسے ہوا۔ اس سے بحث نہیں اہم بات صرف یہ ہے کہ کیا ہوا؟ بغداد میں یہ ہوا کہ حسن بن نعیم جب صحیح سلامت سفر سے واپس آ رہا تھا تو حلب کے ایک حمام میں گیا۔ ہزار دینار والی تھیلی حمام کے طاق میں بھول کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس رات اس نے بڑا بھیانک خواب دیکھا' اس نے دیکھا کہ شام سے واپس آنے والے اس کے قافلے پر راہزنوں نے حملہ کر دیا ہے اور سارا مال و متاع لوٹ کر اہل قافلہ کے ہر فرد کو قتل کر دیا ہے۔ ایک راہزن نے حسن بن نعیم کی گردن پر بھی مہلک وار کیا ضرب اتنی شدید تھی کہ حسن بن نعیم ہڑ بڑا کر خواب سے بیدار ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو وہ خواب کی دہشت سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا گویا سینے کے حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے گا اور سب سے حیران کن بات یہ کہ گردن پر نہ صرف ضرب کی شدت کا احساس تھا بلکہ خون کا نشان بھی موجود تھا۔ اور آخری بات یہ کہ اسے اپنے ہزار دنیار والی تھیلی بھی یاد

Marfat.com

آ گئی۔ وہ بھاگم بھاگ حمام میں پہنچا تو اس کا سارا سرمایہ محفوظ تھا۔ اُس نے تھیلی قبضے میں کی اور سوئے بغداد چل پڑا۔ بخیر و عافیت شہر میں داخل ہوا تو معمر بزرگ ہونے کے ناطے اس نے سب سے پہلے شیخ حماد سے ملاقات کی ۔ ولی اللہ کی توہین وتضحیک مطلوب تھی نہ ان کو غلط ثابت کرنا۔ ان کی عمر کا تقاضہ تھا کہ پہلی ملاقات ان ہی سے کی جائے ۔ شیخ حماد تاجر کو دیکھتے ہی کھل اٹھے۔ ''آؤ برخوردار' تمہیں زندہ سلامت دیکھ کر عبدالقادر کے مقام ومرتبے کا صحیح ادراک ہوا۔'' شیخ حماد نے واقعات کی وضاحت کر دی ''لوحِ محفوظ پر تمہارا قتل مرقوم تھا' ایک دو بار نہیں ستر بار شیخ عبدالقادرؒ نے تمہارے حق میں دعائے خیر کی اس طرح عالم بے داری والا قتل' عالمِ خواب میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور تمہاری تقدیر میں' لٹ جانے والے مال کو نسیان میں بدل ڈالا گیا اس بنا پر تم اپنی تھیلی حمام کے طاق میں بھول گئے تھے ۔ بہر حال ماں سے محروم تو ہوئے اور تلخیِ قتل کا احساس بھی تمہیں دلا دیا گیا۔''

تاجر نے شیخ حماد کے ہاتھوں کو عقیدت بھرا بوسہ دیا اور غوث الاعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو آپ نے فرمایا۔ ''میرے محترم استاد شیخ حماد نے درست فرمایا ہے' تیری تقدیر بدلنے کے لیے مجھے واقعی ستر بار رب العزت کے حضور دست بہ دعا ہونا پڑا''۔

واقعی نگاہ مردمومن سے تقدیر بدل جاتی ہے مگر اس شہادت گہہ الفت میں قدم کون رکھے گا' کون راحت وآرام سے کنارہ کشی اختیار کرے ۔ پہلے ان اولیاء اکرام کی سنت پر کوئی عمل تو کر کے دکھائے آج بھی دہکتے شعلے اندازِ گلستاں پیدا کر سکتے ہیں۔ شرط فنا فی الذات ہونا ہے لقمہ حرام سے شکم سیری کے بعد دست دعا بلند کرنا ہی حماقت ہے اور حماقت کی بلند پروازی کیا اور پائے عرش کو ہلانا کیسا۔

غوث پاک کے عقیدت مندوں میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ ہوا کرتے تھے ۔ رنگین مزاج بھی یقیناً تھے مگر جب وہ ''سایہ عافیت'' میں آجاتے تو ان کے مزاج بھی بدل جاتے ۔ انداز فکر میں تبدیلی پیدا کرنا معمولی کارنامہ نہیں ہوا کرتا۔ آپ کا ایک خادم خاص ایک رات' بار بار محتلم ہوا ۔ ہر مرتبہ خواب میں ایک نئی ''صورت'' نظر آتی ۔ بعض خواتین سے تو وہ آشنا تھا مگر بعض صورتیں اس کے لیے اجنبی تھیں۔ صبح وہ عالم پریشانی میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے لب کشائی کا موقع دیئے بغیر ہی خجالت سے بچالیا۔ رات والے سارے واقعات کو بھول جاؤ لوح محفوظ پر مرقوم تھا کہ تم فلاں فلاں عورت سے زنا کا ارتکاب کرو گے ۔'' پھر آپ نے ان خواتین کے نام اور حلیے بیان

Marfat.com

فرمائے۔ ''مجھے تمہاری تباہی پسند نہ تھی لہذا میں نے رب العزت کے حضور دعا کی اور عالم بیداری میں وقوع پذیر ہونے والا بہ اختلاط حالت خواب میں تبدیل کر دیا گیا۔'' غوث پاک نے صورت حال کی وضاحت فرمائی تو خادم سجدہ شکر بجا لایا۔

بغداد کا ایک صاحب ثروت تاجر عبدالصمد بن ہمام علم کلام اور فلسفے کا ماہر تھا۔ کرامات غوثیہ کو خلاف عقل قرار دینے میں مشہور تھا۔ اچانک ہی اس کی کایا پلٹ گئی۔ ہر روز کاروبار زندگی کا آغاز زیارت غوث پاک کے بعد کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی دیوانگی کے قصے بغداد کی گلیوں میں عام ہونے لگے۔ پڑھا لکھا صاحب حیثیت انسان تھا لوگ اس کی مالی حالت اور اثر و رسوخ کے پیش نظر ہر زیادتی نظر انداز کر جاتے لیکن نوبت بہ ایں جا رسید کہ وہ غوث پاک کے متعلق معمولی مخالفانہ گفتگو سن کر ہی آتش زیر پا ہو جاتا اور مرنے مارنے پر تل جاتا۔ ''میں شیخ کائنات کی شان میں گستاخی کرنے والی زبان کو گدی سے نکال پھینکنے کی طاقت رکھتا ہوں جو چاہے اور جب چاہے آزما دیکھے'' مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ اپنی کایا پلٹ کیفیت کے راز میں کسی کو شریک نہیں کرتا تھا۔ غوث پاک کے عالم فانی سے روپوش ہو جانے کے بعد اس نے اس راز سے پردہ ہٹایا جس کا متن پیش خدمت ہے۔ ''یہ میری بدنصیبی کی انتہا تھی کہ میں آب حیات کے چشمے کو دیکھ کر بھی تشنہ لب رہا'' عبدالصمد بن ہمام نے کہا ''سارا بغداد گواہ ہے کہ میں غوث پاک کی ہر کرامت کا نہ صرف منکر تھا بلکہ خلاف عقل ثابت کرنے میں بھی مشہور تھا۔ ایک روز میں آپ کے مدرسے کے سامنے سے گذر رہا تھا کہ اذان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے بیت الخلا جانے کی ہلکی سی حاجت محسوس ہوئی جو کوئی پریشانی والی بات نہ تھی کہ مجھے اپنے ''نظام'' پر بھروسہ تھا۔ بہر حال میں نے یہی سوچا کہ نماز کے بعد حاجت سے فراغت حاصل کر لوں گا لہذا میں مسجد میں داخل ہوا اور وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر منبر کے قریب اگلی صف میں جا بیٹھا۔ اس وقت قضاء حاجت کا احساس بھی مٹ چکا تھا اصل بدقسمتی یہ ہوئی کہ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ اس روز جمعہ کا دن تھا۔ مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تو مجھے احساس ہوا کہ آج تو جمعتہ المبارک ہے۔ غوث پاک منبر پر تشریف فرما ہوئے تقریر کا آغاز ہوا تو میری آزمائش کی گھڑی آ پہنچی۔ خلق خدا کا ہجوم تھا اور مسجد سے باہر نکلنے کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ میں منبر کے بالکل قریب بیٹھا تھا مگر میری حالت متغیر ہونے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے مزید ''ضبط'' کیا تو میری جان ہی نکل جائے گی۔ بصورت دیگر میں خلق خدا کے سامنے ایسا تماشا بن جاتا جس کے بعد میں شاید خودکشی پر مجبور ہو جاتا۔ میں پورے وثوق سے کہہ

Marfat.com

سکتا ہوں کہ اس کرب سے گزرے بغیر کوئی میری ابتلاء کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ میرے منطقی دماغ نے اس ساری مصیبت کا ذمہ دار منبر پر تقریر کرنے والی ہستی کو ٹھہرایا اور میرے بغض و عناد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس خیال سے میرا دم گھٹنے لگا کہ چند لمحوں بعد بھری دنیا میں میرا کیا حشر ہو گا

'پھر ایک عجیب بات ہوئی'

'' میری گناہگار آنکھوں نے دیکھا کہ غوث الاعظم منبر سے نیچے اترے اور انہوں نے اپنی عبا میرے اوپر ڈال دی اس کے ساتھ ایک محیر العقول بات بھی ہو چکی تھی اگر آپ لوگ یقین کریں تو اس کا اظہار بھی کیے دیتا ہوں'' عبدالصمد بن ہمام نے جواب طلب نظروں سے سامعین کی طرف دیکھا۔

'' اور وہ محیر العقول واقعہ کیا تھا'' ایک از سامعین نے پوچھا۔

'' جس سمے غوث الاعظم کا نورانی پیکر مجھے اپنی عبا اوڑھا رہا تھا' اس وقت انکا ایک پیکر سر منبر تقریر کر رہا تھا گویا مسجد میں کسی شخص کو احساس تک نہ ہونے پایا کہ مجھے عبا سے ڈھانپ دیا گیا ہے کیونکہ خطاب کا سلسلہ منقطع ہی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو ایک سرسبز وشاداب جنگل میں پایا قریب ہی ایک چشمہ بھی جاری تھا۔ میری مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ میں نے بول بزار سے فارغ ہو کر اس چشمے کے شفاف پانی سے وضو کیا پھر دو رکعت '' تحیۃ الوضو'' ادا کیں تب مجھ گنہگار کے سر سے عبا ہٹا دی گئی۔ وہی جگہ تھی وہی مسجد میرا محبوب شیخ سر منبر خطاب فرما رہا تھا۔ میری حالت درست ہو چکی تھی اور وضو کے اثر سے میرے اعضا ابھی بھیگے ہوئے تھے ۔اسوقت میری عقل زائل ہوگئی یہ سب کچھ مجھ پر بیتی تھی کوئی سنی سنائی بات نہ تھی میرا منطقی دماغ ساری صورت حال کی توجیہہ تلاش کرتے کرتے عاجز آ گیا۔''

'' نماز اختتام پذیر ہوئی مسجد خالی ہوگئی۔ شیخ مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز میں ڈالتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ میں اسی جگہ بیٹھا رہا۔ میرے رومال کے ساتھ ایک چابی بندھی تھی جو مجھے نہیں مل رہا تھا میں نے اپنی نشست کے قریب ادھر ادھر دیکھا مگر اپنی تلاش میں ناکام رہا۔ پھر مجھے یاد آگیا کہ اس چشمے کے کنارے جہاں میں وضو کیا تھا' ایک درخت کی شاخ پر میں نے اپنا رومال رکھا تھا' مگر وہ جگہ وہ مقام جانے روئے زمین کے کس گوشے پر تھا۔ وہ چابی میرے لیے بڑی اہم تھی مگر اس جگہ کے متعلق میں کس سے دریافت کرتا اور کن الفاظ میں اپنے منطقی احباب کو یقین دلاتا۔ لہذا میں نے چپ سادھ لی۔ میری راتوں کی نیند اڑ چکی تھی اور دن کا چین حرام ہو چکا

Marfat.com

تھا۔" اس سارے واقعہ کی کوئی نہ کوئی عقلی دلیل ضرور ہوگی۔" سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے بس یہ خیال مجھے ستاتا رہتا۔"

"چند روز بعد مجھے ایک طویل سفر درپیش ہوا۔ میں نے لوہار سے اپنے صندوق کی دوسری چابی بنوا کر ضروری سامان نکالا اور سفر پر روانہ ہوگیا۔ بغداد سے تین یوم کی مسافت طے کرنے کے بعد میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جو مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ شفاف پانی بہتا ہوا چشمہ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بالکل وہی مقام تھا جو میں عالم بے داری یا خواب یا مدہوشی میں دیکھ چکا تھا۔ اپنی اس کیفیت کو کن الفاظ کا لبادہ اوڑھاتا اور اسے کس نام سے یاد کرتا۔ میں مسجد میں بھی تھا' اس چشمے کے کنارے بھی' خدا جانے میں کہاں تھا' اور یہ سب کیا تھا؟ میرے ساتھیوں نے خیال ظاہر کیا قیام وطعام وغیرہ اور نماز کے لئے وہ جگہ مناسب ترین تھی' لہذا وہ سب عارضی پڑاؤ کیلئے تیار ہوگئے میں متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دراصل مجھے اس درخت کی تلاش تھی جس کی شاخ کے ساتھ میں نے اپنا رومال ٹانگا تھا۔ آخر وہ درخت مجھے نظر آ ہی گیا۔ میں لپک کر آگے بڑھا تو میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے میرا گمشدہ رومال لٹک رہا تھا اور وہ چابی جس کی نقل میں نے لوہار سے بنوائی تھی' اس رومال کے ساتھ منسلک تھی۔ تو گویا میں اپنے وجود' اپنی پوری شخصیت کے ساتھ' بغداد سے تین یوم کی مسافت پر اس جگہ آیا تھا اور اس جگہ میں نے دو رکعت نماز بھی ادا کی تھی اور پھر میں پل بھر میں بغداد کی مسجد میں بھی موجود تھا۔ کیسا سفر اور کیسا کاروبار حیات' میں سارے مکروہات زمانہ پر لات مار کر واپس بغداد آیا اور سیدھا اپنے محبوب شیخ پردہ پوش کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد والے واقعات سے آپ سب لوگ بخوبی واقف ہیں اور میری عقیدت کے گواہ' بغداد کے گلی کوچے ہیں۔ چوں کہ میں اپنے محبوب کو اچھی طرح آزمانے کے بعد حلقہء بگوش عقیدت ہوا لہذا میرا مقام کوئی اتنا بلند نہیں اس لیے میں ہمیشہ مہر بہ لب رہا۔ عشق میں آزمانا گناہ کبیرہ شمار ہوتا ہے۔ میں اب بھی خاموش رہتا مگر میرے عزیز دوست ہم پیالہ وہم نوالہ ابوالیسر نے مجبور کیا کہ اس کی تفصیل سے ساری دنیا کو آگاہ کر کے گواہ بنالوں اور اپنے تعلق کو دوام بخش دوں۔ کیوں کہ اپنے محبوب شیخ سے میرا یہی تعلق توشہء آخرت ہے" یہ روداد بیان کرنے کے بعد بغداد کا عبدالصمد' سامعین کے چہروں کو پڑھنے لگا۔ پھر مطمئن ہو کر خاموش ہوگیا۔ کیوں کہ سامعین کو اس پر اعتبار آ گیا تھا' ورنہ وہ دیوانہ مرنے مارنے پر تل جاتا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ عشق میں "تو کلام الفقہ اسکوت

Marfat.com

الذہب'' اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا''۔

اس عاشقِ غوث پاک کی ایک عادت بڑی عجیب تھی زکواۃ بڑی باقاعدگی سے ادا کرتا مگر مستحق وغیر مستحق لوگوں میں امتیاز کیے بغیر بس جو سامنے آیا اسے سب کچھ تھما دیا۔ کسی بے تکلف دوست نے ایک بار اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے بڑا لاجواب' جواب دیا'۔ '' کیا میں اس نظر کرم کا مستحق تھا۔ جس سے شیخ نے مجھے نوازا' جب اللہ تعالیٰ کرم نوازی کرتے وقت مستحق اور غیر مستحق میں تمیز نہیں فرماتا تو بندے کو بھی راہ خدا میں خرچ کرتے وقت اس امتیاز سے گریز کرنا چاہئے ویسے یہ نکتہ مجھے میرے شیخ نے تعلیم کیا تھا۔'' آخری فقرہ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا کیوں کہ اس کا دوست اسے ہضم نہیں کرسکتا تھا۔

غوث پاک نے جب ''قدم ورقبۃ'' والا نعرۂ مستانہ بلند کیا تھا تو اس سے کچھ عرصہ بیشتر سرورِ کائنات آں حضرت صلعم نے آپ کو وہ خلعت عطا فرمائی تھی جو آپ ﷺ کے جسدِ اقدس پر تھی اور ساتھ یہ بھی فرمایا تھا۔ '' یہ خلعتِ قطبیت ہے جو ابدال کو عطا کی جاتی ہے۔'' اس خلعت فاخرہ کا اثر تھا کہ غوث الثقلین دنیاوی شہنشاہوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ سلاطین و امرء جب آستانہءِ غوثیہ پر حاضری دیتے تو آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دے کر بڑے ادب سے بیٹھ جاتے۔ خلیفہءِ وقت کو خط لکھنا ہوتا تو اس کا انداز فدویانہ نہیں بلکہ شاہانہ ہوتا مثلاً '' یہ مکتوب عبدالقادر کی جانب سے تم کو لکھا جا رہا ہے اور تم کو فلاں فلاں باتوں کا حکم دیا جاتا ہے'' اور جب یہ مکتوب دربارِ خلافت میں پہنچتا تو خلیفہ اسے چوم کر آنکھوں سے لگاتا اور اعلان کرتا '' آپ نے درست فرمایا آپ کا حکم سر آنکھوں پر'' اور خط میں مرقوم ایک ایک لفظ پر عمل کرتا۔

خلیفہ مقتصی بامر اللہ سے ایک بار غوث پاک ناراض ہوگئے۔ درس گاہ کے صحن میں ایک شجر سایہ دار کھڑا تھا آپ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا۔'' باز آ جاورنہ میں تیرا سر قلم کر دوں گا'' خلیفہءِ وقت کو خبر ہوئی تو وہ بڑا گھبرایا۔ ایک طرف مطلق انسان خلافت جو شہنشاہیت سے کسی طور کم نہ تھی اس کا نشہ' دوسری طرف غوث الاعظم کا رعب و دبدبہ عجیب مخمصے کا شکار ہوگیا۔ آخر اس نے اپنے چرب زبان وزیر باتدبیر ابن ہبیرہ سے مشورہ طلب کیا اور اسے دربارِ درویش میں بھیجا اور درخواست پیش کی کہ غوث الاعظم' حاکم وقت کی اتنی توہین نہ کریں' ابن ہبیرہ جب غوث پاک کی خدمت میں حاضر ہوا تو اپنی ساری چرب زبانی بھول گیا۔ درویش نے ایک نظر دیکھا تو وزیر بہ تدبیر تھر تھر کانپنے لگا۔'' ہاں میں اسے قتل کر دوں گا اگر اس نے اپنا طرزِ عمل نہ بدلا تو'' غوث پاک

Marfat.com

نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ شیخ ابوالحسن فقیہہ فرماتے ہیں کہ ابن ہبیرہ زار وقطار رونے لگا۔ غوث پاک کو اس پر رحم آ گیا تو اسے تسلی و تشفی فرمانے لگے۔ حاکمِ وقت سے رعب و دبدبے والے رویے کی ایک مثال شیخ ابوالعباس خضر موصلی نے بیان کی ہے کہ ایک بار خلیفہ مستنجد باللہ سلام کی غرض سے حاضر ہوا "حضور! مجھے کوئی نصیحت فرما دیجئے" یہ کہہ کر زر و جواہرات سے بھری دس تھیلیاں پیش کیں۔

"یہ کیا ہے؟" غوث پاک نے بے نیازی سے فرمایا۔

"یہ حقیر نذرانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے" خلیفۂ وقت نے بصد احترام کہا۔

"حالاں کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں اور تم ان کے محتاج ہو" آپؒ نے بے نیازانہ لہجے میں سمجھایا۔ مگر حاکمِ وقت کا اصرار بڑھتا ہی گیا تو آپ نے دس تھیلیوں میں سے دو عمدہ ترین اٹھا لیں خلیفۂ وقت کا چہرہ کھل اٹھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کتب تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہو گیا اور تا قیامت حکامِ وقت کے لیے درسِ عبرت کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ نے ایک تھیلی دائیں ہاتھ میں پکڑی اور دوسری بائیں میں، پھر ان کو زور سے نچوڑا، چشمِ فلک نے نظارہ کیا اور شرکاءِ مجلس حیران و ششدر رہ گئے۔ زر و جواہرات سے بھری ہوئی تھیلیوں سے سرخ لہو کے قطرے ٹپکنے لگے۔

"اے ابوالمظفر! (خلیفۂ وقت کی کنیت تھی) خلقِ خدا کا خون نچوڑتے وقت خدا سے شرم نہیں آئی اور اب وہی خون مجھے پیش کرنا چاہتا ہے؟" یہ الفاظ آپ کی زبان سے ادا ہوئے تو خلیفہ کا رنگ فق ہو گیا تھیلیوں سے خون ٹپکتا دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ "خدا کی قسم اگر مجھے اس نسبت کا پاس نہ ہوتا جو تجھے رسول اللہ ﷺ سے ہے تو اس خون کو تیرے محل تک بہا دیتا اور اس خون میں تیرا سامانِ حیات، تنکوں کی طرح بہہ جاتا"

ان واقعات کے برعکس، ایک کند ذہن طالب علم پر آپ بڑی محنت فرماتے مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ غوث پاک بڑے صبر و تحمل سے پورے سبق کا ایک ایک لفظ بار بار دہراتے مگر پتھر میں لگنے والی بات تھی۔ لوگ اس بات پر بھی حیران تھے کہ غوث پاک جو ایک نظر سے ولایت عطا کر دینے کی قدرت رکھتے ہیں ایک ابتدائی کتاب، طالب علم کے ذہن نشین نہیں کرا سکتے۔ ابن الہیتیؒ نے دبی زبان میں اس طرف اشارہ کیا تو آپ نے زیرِ لب مسکرا کر جواب دیا "صرف پانچ دن کی بات ہے" اس وقت اس جملے کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا مگر پانچ دن بعد اچانک وہ

Marfat.com

طالب علم مرگ ناگہانی کا شکار ہوگیا تب جاکر آپ کا طرزِ عمل لوگوں کی سمجھ میں آیا۔ طالب علم کی تدفین کے بعد آپ نے فرمایا۔ ''آ گہی کا ایک اپنا کرب ہوتا ہے جسے عام ظرف والا انسان برداشت نہیں کرسکتا''۔

اسی زمانے میں آپ نے ایک ایسا فتویٰ صادر فرمایا جس کی سارے بغداد میں دھوم مچ گئی اور بغداد میں دھوم مچنے کا مطلب تھا کہ تمام بلادِ اسلامیہ میں آپکی شہرت ہوئی۔ احکام شریعت کی باریکیوں پر گہری نگاہ کی دلیل کے طور پر دیکھا جائے' تو بھی اس فتوے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آپؒ کے ایک معتقد نے بھری محفل میں اپنی بیوی کو طلاق مغلظ کی قسم کے ساتھ کہا ''میں بایزید بسطامی سے افضل ہوں'' (یعنی اگر وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ثابت ہوجائے تو اسکی بیوی کو طلاق غیر رجعی ہوجائے گی) بایزید بسطامیؒ کے مقام و مرتبے کے پیش نظر اکثر علماء نے متفقہ فیصلہ دے دیا کہ میاں بیوی میں مراجعت نہیں ہوسکتی۔ بعض علماء عراق تو بالکل خاموش ہوگئے۔ وہ شخص حد سے زیادہ پریشان ہوا تو دوست احباب نے اسے غوث الثقلین کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ وہ شدتِ خجالت سے منہ چھپاتا پھر رہا تھا کہ یہ ساری صورت حال ہی بڑی لغو قسم کی تھی۔ ایک تو جائز احکام میں بدترین فعل ''طلاق'' گردانا جاتا ہے دوسری وجہ طلاق بڑی نامعقول قسم کی تھی۔ بہر حال وہ معتقد' غوث پاک کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا سنانے کے بعد اس نے عرض کی۔ ''حضور! میں نے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرلوں یا اسے اپنے ساتھ رکھوں؟''

''ساتھ رکھو' سارا ماجرا سن کر آپ بڑے کبیدہ خاطر ہوئے مگر احکام شریعت کی روح اجاگر کردی ''تو' ابویزید بسطامیؒ سے چند معاملات میں آگے ہو لہٰذا تمہارا دعویٰ مبنی پر حقیقت ہے تم نے علم فتویٰ حاصل کیا اور وہ مفتی نہیں ہے' تم نے نکاح کیا وہ اس سنت کی ادائیگی سے محروم رہے لہٰذا اپنے مقام و مرتبے کے باوجود وہ اس معاملے میں تم سے پیچھے رہ گئے۔ تم اپنی اولاد کے رزق حلال کا خیال رکھتے ہو وہ اس معاملے ہی سے یکسر محروم تھے''

امتِ مسلمہ کے علماء (متقدمین و متاخرین) تمام اس بات پر متفق ہیں کہ جس تواتر اور کثرت سے کشف و کرامات کا ظہور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ہوا اور کسی ولی' غوث' قطب اور ابدال سے نہیں ہوا۔ یہ بات بھی مستند ہے کہ انسانوں کی طرح جنات بھی آپ سے بکثرت فیض یاب ہوئے۔ عمر بغدادی (معروف عالم عراق ابونظر کے والد) کے بقول ''میں نے ایک مرتبہ

Marfat.com

ایک جن کو طلب کیا تو وہ بڑی تاخیر سے حاضر ہوا۔قریب تھا کہ میں اسے گزند پہنچا دیتا اس نے بڑے دُکھ بھرے لہجے میں کہا" بہتر ہے جب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ خطاب فرما رہے ہوں تو آپ مجھے طلب نہ فرمایا کریں" میں اس جن کے لہجے پر حیران رہ گیا' میں نے اسکی وجہ پوچھی تو اس نے کہا" حضرت شیخ کی مجلس میں انسانوں سے زیادہ ہمارا ہجوم ہوتا ہے اور ہم میں سے اکثر جنات ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کر چکے ہیں۔میں خود تائب ہو کر مشرف بہ اسلام ہو چکا ہوں" ابو نظر بن عمر بغدادی نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی۔

یہ واقعہ سنہ ۵۳۷ھ کا ہے جب غوث الثقلین عمرِ عزیز کے ۶۷ ویں برس میں قدم رکھ چکے تھے۔ابو سعید عبداللہ بغدادی کی حسین وجمیل صاحب زادی فاطمہ چھت پر گئی اور وہیں سے غائب ہو گئی۔جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تو ابو سعید خدمتِ غوث پاک میں حاضر ہوا اور اس حادثے کا ذکر کیا آپ نے تھوڑی دیر مراقبہ فرمایا اور کہا" تم آج رات کرخ کے ویرانے میں چلے جاؤ۔وہاں پانچویں ٹیلے کے قریب ایک خط کھینچ کر دائرہ بنا لو اور بسم اللہ پڑھ کر نیت کرنا کہ وہ حصار تم میری طرف سے کھینچ رہے ہو۔غروب آفتاب کے بعد' جنات کی مختلف جماعتیں تمہارے پاس آئیں گی' تم مطلق خوف زدہ نہ ہونا۔صبح کے قریب ایک لشکر کے ساتھ ان کا شہنشاہ گذرے گا اور تم سے چند سوال کرے گا تم ان کے جوابات دیتے جانا' پھر وہ تمہاری موجودگی کا سبب دریافت کرے گا۔تم سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد کہنا" میں شیخ عبدالقادر کا فرستادہ ہوں" بس اب تم رخصت ہو جاؤ۔"

ابو سعید نے ارشاد غوث پاک کی تعمیل کی۔تمام واقعات اسی طرح پیش آئے جس طرح آپ نے بیان فرمائے تھے۔جب شہنشاہ جنات آیا تو اُس نے ابو سعید سے پوری داستان سنی پھر جب اس نے یہ بتایا کہ وہ غوث الثقلین کا فرستادہ ہے تو شہنشاہ جنات فوراً گھوڑے سے اتر کر زمین کو بوسہ دیتے ہوئے' حصار کے کنارے بصد احترام بیٹھ گیا پھر اس نے اپنے لشکر سے دریافت کیا۔" یہ حرکت نازیبا کس نے کی ہے؟" مگر حاضر جنات مہر لب رہے۔پھر اس کا پیغام مختلف ممالک میں بھیجا گیا۔آخر چین کا ایک باشندہ لڑکی سمیت حاضر ہوا اور دست بستہ اپنے بادشاہ کے حضور کھڑا ہو گیا۔" یہ لڑکی جو قطبِ دوراں کی نگرانی میں تھی تو اسے کیوں اٹھا لے گیا" شاہ نے گرج کر پوچھا" میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا اب معافی کا خواست گار ہوں" اس نے جواب دیا۔" تم دل کے ہاتھوں مجبور ہوئے ہم احترام غوث سے مجبور ہیں" یہ کہہ کر شاہِ جنات نے اپنے

Marfat.com

بے ادب ساتھی کا سر قلم کروا دیا اور فاطمہ کو ابو سعید کے حوالے کر دیا۔ ابو سعید یہ دیکھ کر اپنے تجسس پہ قابو نہ رکھ سکا اور اس نے دریافت کیا ''آپ حضرتِ شیخ کے اس قدر تابع فرمان ہیں؟''

''ہم ان کی تابعداری کیوں نہ کریں''۔ شاہِ جنات نے جواب دیا ''خدا کی قسم جب وہ ایک نظر مشرق کی طرف ڈالتے ہیں تو اس سمت کے سارے سرکش لرزہ براندام ہو جاتے ہیں اور مغرب کی جانب ان کی نگاہ جاتی ہے تو اس سمت تہلکہ مچ جاتا ہے اور سارے سرکش منہ چھپائے پھرتے ہیں وعلیٰ **ھذا لقیاس** ۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو مقامِ قطبیت عطا کرتا ہے تو جن وانس پر اس کو دسترس دے دیتا ہے۔ ہم جنات کو تو بطورِ خاص اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے''

یہ واقعہ مشتے از خروارے کے طور پر بیان کیا گیا ہے ورنہ ایسے واقعات شمار وقطار سے باہر ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ سو فیصد درست ہے کہ کشف وکراماتِ غوث پاک کا ذکر فردِ واحد کے بس کی بات نہیں اور نہ ان تمام روشن پہلوؤں کو ضبطِ تحریر میں لانا کسی ایک شخص سے ممکن ہے ۔مناقب غوث الثقلین کی بے شمار کتب ہمارے لکھے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔

شیخ شہاب الدین سہروردی ''عوارف المعارف'' میں رقمطراز ہیں کہ غوث الثقلین نے حضور پاک ﷺ کی اجازت کے بعد نکاح کیا۔ چار بیویوں کے بطن سے انچاس اولادیں ہوئیں جن میں ستائیس صاحب زادے اور بائیس صاحب زادیاں تھیں۔ بقول شیخ جبائیؒ غوث پاک نے ایک بار فرمایا میرے گھر لڑکا تولد ہوا تو میں نے اسے دیکھتے ہی معلوم کر لیا کہ اس کی سانسوں کا سلسلہ جلد منقطع ہونے والا ہے لہٰذا جب وہ فوت ہوا تو رب العزت نے میرے قلب کو پہلے ہی پرسکون بنا دیا تھا۔ اس طرح مجھے نومولود کی موت کا قلق نہیں ہوا۔''

فرزندانِ غوث الثقلین جو مہ وانجم کی طرح افقِ دین پر درخشاں ہوئے ان کی تعداد دس عدد ہے (یا شاید اولادِ دگر' قلمکاروں کی تسہل پسندی کا شکار ہوگئی بہر حال ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیل دستیاب نہیں) سب سے بڑے صاحب زادے حضرت شیخ عبدالوہابؒ ہیں جنہوں نے فقہ کی تعلیم اپنے والد بزرگوار اور غالب بن بنا سے حاصل کی۔ بلادِ عجم سے بھی اکتساب علم کیا اور سنہ ۵۴۳ھ یعنی حیاتِ غوث پاک ہی میں ان کی درس گاہ میں درس وتدریس سے منسلک ہو گئے۔ وعظ اور افتاء کا سلسلہ البتہ رحلتِ غوثؒ کے بعد شروع کیا۔ ذہانت ومتانت کے اعتبار سے اولادِ غوث پاک میں آپ سب سے ممتاز مقام ومرتبے کے مالک ہیں۔ سنہ ۵۸۳ھ میں خلیفہ ناصر الدین نے محکمہ دادرسی مظلوماں قائم کیا جس کی سربراہی کے لیے آپ ہی کا انتخاب ہوا۔ محکمہ چوں

Marfat.com

کہ مزاج مطابق تھا لہٰذا آپ نے قبول کرلیا۔ آپ کے شاگردانِ رشید میں شریف الحسینی بغدادی اور احمد بن عبدالواسع جیسی شخصیات ہیں۔ ماہ شعبان سنہ ۵۲۲ھ میں بغداد میں تولد ہوئے سنہ ۵۹۳ھ اکہتر برس کی عمر میں سفرِ آخرت اختیار فرمایا مزارِ مقدس قبرستان حلبہ بغداد میں ہے۔ شرفاءِ گیلان جو ملتان' لاہور' اور اوچ میں مقیم ہیں شیخ عبدالوہابؒ ہی کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں گویا نسبتِ غوث پاک کے طفیل صاحب عزو وقار سیّد ہیں۔ گیلان اور جیلان کے تلفظ کی تشریح اجمالاً پیش کی جا چکی ہے مزید عرض ہے کہ بلادِ عرب یعنی جہاں عربی بولی جاتی ہے ان میں افریقی ملک مصر واحد مثال ہے جہاں جیم کا تلفظ عام بول چال میں گاف کیا جاتا ہے یعنی وہ بھی جیلانی کو گیلانی کہیں گے۔ (مصری حضرات قاف دو نقطیے کا تلفظ الف مروجہ بلادِ عرب کے لب و لہجے کے مطابق ہوتا ہے)

غوث پاک کے دوسرے فرزند شیخ عیسیٰؒ بھی درس و تدریس سے منسلک تھے۔ وعظ و افتاء (فتویٰ صادر کرنا) کے علاوہ تصنیف و تالیف کی طرف بھی آپ کا رجحان تھا۔ علم تصوف پر آپ کی دو کتب جواہرالاسرار اور لطائف الانوار' افقِ سلوک پر ستاروں کی طرح چمک رہی ہے شیخ عیسیٰؒ قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ رحلت غوث پاک کے بعد بغداد سے نقل مکانی کر کے شام چلے گئے پھر تا حیات مصر میں مقیم رہے۔ سنہ ۵۷۳ھ مصر ہی میں وصال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ تیسرے فرزندِ غوث پاک شیخ ابوبکر عبدالعزیزؒ ہیں جنہوں نے علم فقہ و حدیث کی تعلیم اپنے والد ماجد ہی سے حاصل کی۔ بے حد متواضع انسان تھے۔ سنہ ۵۰۸ھ میں واپس جیلان تشریف لے گئے اور سنہ ۶۰۲ھ میں وہیں وفات پائی۔ جیلان میں آپ کی اولاد آج بھی موجود ہے۔ شیخ عبدالجبار (چوتھے فرزند) راہِ سلوک کے مسافر ہوئے۔ صاحب بصیرت و بصارت درویش تھے۔ عالم شباب ہی میں (سنہ ۵۷۵ھ) وفات پائی۔ مزار شریف قبرستان حلبہ بغداد میں موجود ہے۔ پانچویں فرزندِ غوث الثقلین کا نام شیخ عبدالرزاق حلبیؒ ہے۔ جو تدریس کے علاوہ آغاز شباب میں مناظرہ و بحث و تمحیص میں دل چسپی لیا کرتے تھے۔ خوش الحان قاری اور عمدہ حافظ قرآن تھے رفتہ رفتہ علم معرفت کی طرف متوجہ ہوئے تو بحرِ طریقت میں غواصی کا یہ عالم کہ خوف خدا اور حیا کی وجہ سے' تیس برس تک سوئے آسمان نہیں دیکھا' بغداد کے مشرقی محلہ حلبہ میں قیام پذیری کی وجہ سے آپ کو ''حلبی'' کہا جاتا ہے۔ بوقت وفات یہ درویش بے رِعا' بغداد کے گلی کوچوں میں اسقدر مقبول ہو چکا تھا کہ نماز جنازہ مختلف مقامات پر ادا کرنا پڑی۔ فصیل شہر کے باہر آغاز ہوا۔ نماز جنازہ کے

Marfat.com

بعد لوگ جنازے کو کاندھوں پر اٹھا کر جامع مسجد رصافہ لائے یہاں نماز ادا کی گئی پھر ''تربت خلفاء'' کے مقام پر نماز ہوئی۔اس کے بعد لب دجلہ خضریین' پھر علاقہ بابِ حریم' خربیہ سے ہوتے ہوئے لوگ مزار امام احمد بن حنبل پر جنازہ لائے اور آخری نماز جنازہ ادا کر کے امام موصوف کے پڑوس میں اس فقہی' قاری' حافظ درویش اور متواضع فقیر کو دفن کر دیا گیا۔ یہ ۶ شوال سنہ ۶۰۳ھ کا واقعہ ہے۔

شیخ ابراہیم غوث پاک کے چھٹے فرزند فقہ وحدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد واسط کی جانب کوچ کر کے اور تاحیات وہیں مقیم رہے۔

شیخ محمدؒ بن عبدالقادر جیلانیؒ نے علم حدیث کو اوڑھنا بچھونا بنایا اوران کی شہرت بام عروج کو پہنچی۔آپ نے سنہ ۶۰۰ھ میں وفات پائی۔

شیخ عبداللہؒ آٹھویں فرزند غوث الثقلین بغداد کی معروف علمی شخصیت تھے۔اکتساب علم غوث پاک کے علاوہ' مشہور فقیہی سعید بن النباء سے کیا۔شیخ یحییٰؒ' غوث پاک کی حبشی النسل زوجہ کے بطن سے تولد ہوئے جبکہ غوث پاک کی عمر اسی برس تھی یعنی سنہ ۵۵۰ھ (وفات سے گیارہ برس قبل) اور شیخ یحییٰ ہی آپ کی سب سے چھوٹی اولاد ہیں۔مشہور روایت ہے کہ ایک بار غوث پاک سخت علیل ہو گئے حتیٰ کہ ان پر غشی طاری ہو گئی عزیز واقربا آہ وفغاں کرنے لگے تو آپ نے ہوش میں آنے کے بعد فرمایا ''یہ گریہ زاری بند کرو میری موت کا وقت ابھی بہت دور ہے ابھی تو میرے صلب سے ایک لڑکا یحییٰ نامی تولد ہونا ہے'' شیخ عبدالوہاب بیان کرتے ہیں کہ اس وقت ہم سب یہی گمان کیا کہ والدِ محترم پر غلبہءِ موت طاری ہے لیکن رفتہ رفتہ آپ روبصحت ہونے لگے پھر ایک حبشی النسل خاتون سے نکاح کیا اور شیخ یحییٰ تولد ہوئے۔

غوث پاک کے دسویں فرزند شیخ موسےٰؒ بھی سعید بن النباء کے شاگرد تھے۔فارغ التحصیل ہو کر اہل دمشق کو روحانی فیض پہنچایا اور تاحیات دمشق ہی میں مقیم رہے۔جمادی آلاخر سنہ ۶۱۸ھ میں جہانِ فانی سے روپوش ہوئے۔محلہ عقیبہ ''قبرستانِ قاسیاں'' میں مدفون ہیں۔

غوث الثقلین کی ذات سے جلالی وجمالی صفات کا اظہار دمِ آخر تک ہوتا رہا۔چراغ تلے اندھیرا یا مکے کے بدوؤں والی ضرب الامثال میں سچائی ایک حقیقت ہے غوث پاک کا ایک خادم بھی اسی قبیل کا تھا۔درس گاہِ غوثیہ میں مختلف ممالک کے مشائخ جمع تھے۔دسترخوان بچھانے کا حکم ہوا۔مشائخ کھانا تناول فرمانے لگے تو غوث پاک نے اپنے خادم سے کہا ''عزیزم' تم بھی کھانا

Marfat.com

کھالو، مگر خادم نے کہا ''جناب میں روزے سے ہوں''

''کھانا کھالو روزے کا ثواب مل جائے گا'' غوث پاک نے تمام بلند مرتبت مشائخ کی طرف اشارہ فرما کر کہا ''ان کی قربت سے ایک کی بجائے سو روزوں کا ثواب ملے گا'' مگر بات خادم کی سمجھ میں نہ آسکی ''اچھا ایک سال کے روزوں کا ثواب ملے گا'' غوث پاک نے کرم نوازی کی حد کردی مگر وہ بدنصیب اپنے روزے کی رٹ لگاتا جارہا تھا۔ تمام مشائخ بڑی دلچسپی سے یہ طرفہ تماشا دیکھ رہے تھے آخر غوث الاعظم نے فرمایا۔ ''کھاؤ، تمہیں سارے جہان کے روزوں کا ثواب ملے گا''

''میں نے روزہ رکھا ہوا ہے'' خادم نے آخری بار جب کہا تو اکثر مشائخ بے ساختہ اٹھے ''بدنصیب جلد لقمہ اٹھالے'' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اُدھر غوث پاک کو جلال آ گیا نظرِ کرم قہر کی نگاہ میں بدل گئی۔ آپ نے ایک نظر دیکھا تو وہ گر کر تڑپنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کا بدن سوج رہا تھا پھر ہر بن مُو سے خون جاری ہوگیا۔ مشائخ بھی دم بخود یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ لب کشائی کی کسی میں تاب نہ تھی۔ مہمانوں کی یہی خاموشی آڑے آئی۔ آپ کا غصہ کافور ہوا تو خادم کی جاں بخشی ہوئی۔

عمر مبارک نوے برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ احباب شریک بزم تھے۔ شیخ علی بن الہیتی دائیں جانب بیٹھے تھے۔ قریب ہی دوسرے مشائخ بھی تھے۔ ایک پُر وقار روشن جبیں نوجوان محفل میں شامل ہوا ''اسلام وعلیک یا ولی اللہ'' اس نے آتے ہی آپ کو مخاطب کیا غوث پاک نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور بغور نوجوان کو دیکھنے لگے۔

''میں ماہِ رمضان ہوں'' نوجوان نے اپنا تعارف پیش کیا ''آپ کو الوداع کہنے اور آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں'' یہ کہہ کر وہ نوجوان الٹے قدم واپس چلا گیا۔ حاضرین مجلس اس عجیب گفتگو پر حیران ہو رہے تھے مگر شیخ عبدالقادر ''رمضان شریف'' کی آمد کا مطلب سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا وہ شعر پڑھا جو آج بھی عربی ادب کی جان سمجھا جاتا ہے۔

سقانی الحبُ کاساتِ الو صالی
فقلتُ لِخمرتی نحوی تعالی

اسی کا اردو منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جو شمش بریلوی کی قلمی کاوش ہے۔

ساغر پلائے عشق نے مجھ کو وصال کے

Marfat.com

لاجس قدر بھی خم ہیں شراب جمال کے

اسی سال ماہ رمضان سے پہلے آپ کا وصال ہوا۔۱۸ ربیع الاخر کا دن تھا۔ ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات تھی سنہ ۵۶۱ھ سنِ رحلت ہے۔ جس رات آپ کا وصال ہوا خبر سنتے ہی سارا شہر بے دار ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں طلوع آفتاب کے بعد بلکہ سارا دن تدفین ممکن نہ ہو سکی۔ ابن جوزی رات کو تدفین کی وجہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ خلقِ خدا کے اژدہام کی بنا پر بغداد کے کوچہ و بازار اور سڑکیں شاہراہیں تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ جس کی وجہ سے جنازے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ممکن نہ تھا۔ ابن اثیر اور بن کثیر نے بھی اپنی اپنی تاریخ کی کتابوں میں یہی وجہ بیان کی ہے اور دوسرے مورخین نے انہی کتبِ تاریخ سے استفادہ کیا ہے' بہر حال ۔رات کو باب الازج کے مدرسے میں غوث الثقلین کا جسدِ خا کی سپردِ خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ آپ کے بڑے صاحب زادے شیخ عبدالوہاب نے پڑھائی۔ نماز میں مریدین' تلامذہ حضرتِ شیخ کی اپنی اولاد تو شامل تھی ہی مگر رجال الغیب کی موجودگی ہر شخص محسوس کر رہا تھا۔ تدفین کے بعد الصباح جب درس گاہ کا دروازہ کھولا گیا تو خلقِ خدا کا ہجوم مزار پر ٹوٹ پڑا۔ وہ دن اور آج کا دن یہ سلسلہ جاری ہے۔ کرہ ارض کے کونے کونے سے زائرین مزار پر حاضری دینے بغداد آتے ہیں اور زیارتِ مزار کو توشہ آخرت تصور کرتے ہیں۔ یہ مستنجد باللہ کا عہدِ خلافت تھا۔

غوث الثقلین کی ہمہ جہت شخصیت' ان کے فیوض و برکات کو احاطہ تحریر میں لانے کے لیے عمریں درکار ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کے روحانی تصرفات دائمی ہیں یعنی ان کا سلسلہ بعد از وصال بھی جاری رہا اور رہے گا۔ شریعت محمدی کے تنِ ناتواں میں جس انداز میں انہوں نے نئی روح پھونکی وہ بذاتِ خود ایک محیر العقول کارنامہ ہے اس میں شک نہیں کہ ان کی مساعیءِ جمیلہ کو تائیدِ ایزدی حاصل تھی علم لدنی اور مقام قطبیت اور وہ بھی کامل و اکمل' یہ تمام صفات ان کی کامیابی و کامرانی میں کارفرما ضرور ہیں۔ ان تصرفات کی تشریح پیش کرنے سے پیشتر ان کی شخصیت کو جدید علوم کی روشنی میں دیکھیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کائنات کی وسعت کا اندازہ لگانے کی جدید علوم نے سعی لاحاصل کی ہے۔ اور پھر شکست کا اعتراف بھی کیا ہے مثلاً ہمارے نظام شمسی میں سورج کے گرد نو سیارے گردش کر رہے ہیں یعنی عطارد' زہرہ' زمین' مریخ' مشتری' زحل' یورینس' نیپچون اور پلوٹو سب سے آخری معلوم سیارہ جو سورج سے تین ارب ستاسٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ (ہماری زمین کا فاصلہ ۹ کروڑ تیس لاکھ میل بنتا ہے) ایسے دس کروڑ نظام مل

Marfat.com

جائیں تو ایک کہکشاں معرضِ وجود میں آتی ہے اور ایسی دس کروڑ کہکشاؤں کا علم آج ہمارے پاس موجود ہے۔ ان فاصلوں کی پیائش نوری سالوں میں کی جاتی ہے یعنی روشنی کی رفتار سے اگر سفر طے کیا جائے تو وہ جتنا فاصلہ ایک سال میں طے کرے گی ایک نوری سال کہلائے گا۔ (واضح ہو روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے) آخری کہکشاں جس کا علم ہمیں ریڈیائی لہروں سے لیس دوربین سے ہوا۔ وہ ہماری زمین سے دو کروڑ نوری سالوں کے فاصلے پر ہے۔ اب اس کے بعد یہ سلسلہ کہاں تک دراز ہے؟ اس سے کوئی آشنا نہیں گویا چشمِ بصیرت وبصارت چندھیا جاتی ہیں۔ الغرض سیاروں ستاروں کی تعداد اور ان کے مابین فاصلے دونوں شمار نہیں کیئے جا سکتے اور نہ ان کی پیائش ممکن ہے۔ ان سے کماحقہٗ آگاہی تو ایک الگ مسئلہ ہے۔ تادمِ تحریر، بڑے سے بڑا ریاضی دان، سائنس دان، یا ماہر اجرام فلکی، اس وسیع وعریض کائنات کا مرکز معلوم کرے یا حدود تعین کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکا۔ اس کے برعکس چشمِ قطبیت نے آج سے دس صدیاں پیشتر نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

نظرتُ الیٰ بلادِ اللہ جمعاً
کخردلۃ علیٰ حکمِ اتصال

(بلادِ ربّ العزت ''کائنات'' میری نظر میں، ہتھیلی پر رائی کے دانے کی مانند ہے۔ ''خردل'' عربی زبان میں رائی کے دانے کو کہتے ہیں) یہی روحانی آنکھ کا کمال ہے کہ جہاں مادی وسائل سے لیس آنکھ عاجز آجائے، اسکی کارکردگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ تصرف بعد از وصال کے لیے ایسی ہی کسی آنکھ کی اشد ضرورت تھی جو پوری کائنات کا احاطہ کر سکے اور یہ چشمِ بصیرت وبصارت حضور پاک ﷺ کے طفیل غوث الثقلین کو نصیب ہوئی۔ اس تصرف کے وسائل البتہ الگ الگ نوعیت کے رہے ہیں۔ پہلا وسیلہ تو آپ کی تعلیم تھی جس نے امتِ مسلمہ کے افق پر چھائی ہوئی ادبار کی پہلی گھٹا ختم کی یعنی حکومت باطنیہ کا جنازہ نکلا اور نور الدین زنگی افق اسلام پر طلوع ہوا پھر صلاح الدین ایوبی نے یورپ کی متحدہ طاقتوں کو شکست دے کر بیت المقدس آزاد کرالیا۔ عروج ایوبی سے ملتِ اسلامیہ کا مرکز مضبوط ہو گیا۔ ان ہی ایام میں غزنویوں کے انتشار میں سے خاندان غوری نمودار ہوا جس نے برصغیر میں مسلم حکومت کے قیام کی داغ بیل ڈالی اس میں غوث پاک کے قریبی عزیز اور فیض یافتہ خواجہ غریب نواز معین الدین چشتیؒ کا دستِ مبارک بھی کارفرما تھا۔ پھر آپ ہی کے خلفاء، شاگردان رشید مشائخ چشت اور سہروردیہ بزرگان بہاالدین

Marfat.com

زکریا' شاہ صدرالدین عارف' شاہ رکن عالم ملتانی' مخدوم جہانیاں جہاں گشت اوچ' لعل شہباز قلندر سندھی اور غوث الثقلین کے روشن کیئے ہوئے دوسرے چراغوں نے پورے برصغیر کو بقعہ ءِ نور بنادیا۔

کرہ ءِ ارض کا گوشہ گوشہ کیوں منور نہ ہو جاتا' امتِ مسلمہ میں اس منفرد شان وشوکت والا ولی اللہ پہلے پیدا ہی کب ہوا تھا۔آپ کی ولادت باسعادت کے متعلق پیشن گویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرتِ شیخ سے دوسو برس پیشتر جنید بغدادیؒ نے تو اس قدر وضاحت سے بتادیا کہ چشم بصیرت حیران رہ جاتی ہے۔درس گاہِ علوم ظاہری کے عین سامنے جنید بغدادیؒ اپنی خانقاہ میں تشریف فرماتھے۔مراقبے کی غواصی میں سے اچانک ابھرے اور فرمانے لگے۔مجھے عالمِ غیب سے اطلاع ملی ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں جیلان کے اندر سید المرسلین ﷺ کی اولادِ اطہار میں سے غوث الاعظم پیدا ہوں گے'ان کا نام ''عبدالقادر'' ہوگا اور لقب ''محی الدین''۔ رسول اکرم ﷺ کی اولاد میں سے ائمہ کرام اور اصحاب کرام کے علاوہ انہیں اولین وآخرین زمانہ کے ''ہر ولی کی گردن پر میرا قدم ہے'' کہنے کا حق ہوگا۔بحث وتمحیص یا مناظروں کا انعقاد غوث الاعظم کے مقام ومرتبے کے منافی باتیں تھیں مگر جب آپ نے معروضی حالات کو سنوارنے کا بیڑہ اٹھایا تو ہر وعظ فراست کی منہ بولتی تصویر ہوا کرتا تھا جس میں ہر معترض کی تسلی وتشفی ہو جاتی ۔کسی کو سوال کرنے کی جرات ہوتی نہ احتیاج۔

ایک عرصے سے شریعت اور طریقت میں اختلاف چلا آرہا تھا اور مرورِ زمانہ کے ساتھ اختلاف کی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جارہی تھی۔علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ امامِ وقت کا دعویٰ بھی کر سکتے تھے کہ مسائل فقہ پر جتنی گہری نگاہ آپ کی تھی اس دور میں کسی کو نصیب نہ تھی آپ کی رائے حرف آخر سمجھی جانے لگی تھی مگر اس کے باوجود آپ نے حنبلی مسلک کی ترویج وترقی میں کوشاں رہے۔دنیا جانتی ہے کہ یہ مسلک احکام شرعی کی اتباع میں سخت ترین رویوں کا حامل ہے۔اس کی اساس ہی روایت پر استوار ہوتی ہے گویا عقل کے مقید علمائے سو کی یہ ضد تھا ۔اس طرح جب آپ نے حنبلی مسلک کی اتباع کرتے ہوئے طریقت کو اوڑھنا بچھونا بنالیا اور سرعام قال سے ''حال'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامعین وحاضرین کو تڑپا تڑپا دیا تو شریعت وطریقت کے مابین اختلاف خود بخود ختم ہوگیا۔غوث الاعظم نے ثابت کردیا کہ مذہبی شعور نابالغ رہ جائے تو شریعت وطریقت میں اختلاف جنم لیتا ہے۔یہ شعور بلوغت کے بلند مقام پر

Marfat.com

ہوتو دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

شریعت وطریقت کے حسین امتزاج کے علاوہ آپ نے عقل پرست معتزلہ فرقے کا ناطقہ بند کر دیا۔ خلق قران کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہوگیا۔ وعظ شریف کا متن تھا۔ قرآن کلام الٰہی ہے جو صفت خداوندی کے زمرے میں آتا ہے۔ فانی ذات کی ہر صفت فانی ہوسکتی ہے غیر فانی اور قیوم (ذات جو اپنے سہارے پر قائم ہو) کی ہر صفت بھی غیر فانی ہوگی لہذا قرآن کبھی نہیں مٹ سکتا۔

شیعت ورافضیت کے دلائل کو رد کرنے کے لیے آپ کا نجیب الطرفین سید ہونا ہی کافی تھا۔ کیوں کہ ان کے ہاں سیاسی وروحانی پیشوائی کا حق صرف اسی خاندان کو ہے جس کے آپ چشم وچراغ تھے۔ کسی کو جرات نہ تھی کہ آپ کی موجودگی میں امامت کا دعوے کر سکے۔ کوئی مدمقابل تھا ہی نہیں، علم وفضل، زہد وتقویٰ اصل ونسل ہر لحاظ سے آپ بلند وبالا تھے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ سلسلہ قادریہ کا اجرا گردانا جاسکتا ہے جو تصرف بعد از وصال کا ذریعہ بنا۔

فتنۂ تاتار جس نے ۶۱۵ھ سے ۶۵۶ھ تک اسلامی سلطنت، تہذیب وثقافت کی اینٹ سے اینٹ بجادی سلسلہ قادریہ ہی کی مساعی جمیلہ سے نیست ونابود ہوا۔ یہ داستان حیرت انگیز افسانے سے کم دلچسپ نہیں۔ دنیا اس حقیت سے آشنا ہے کہ دست تاتار امت مسلمہ کی شہ رگ تک پہنچ چکا تھا۔ (اس کی تفصیل میں جانا موضوع سے ناانصافی والی بات ہوگی) کہ ایک خراسانی بزرگ صرف فیض غوث الاعظم سے مسلح ہوکر بھیڑیوں کے بھٹ میں جا گھسے۔ سلسلہ قادریہ کے اس بزرگ کو اشارۂ غیبی ہوا تھا یا نہیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ کتنی عجیب اور حیرت انگیز بات ہے کہ تموجن (چنگیز خان) کی اولاد جس نے کرۂ ارض کے مسلم جغرافیے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ ملکوں کی سرحدوں کو روند کر انسانی کھوپڑیوں کے بلند وبالا مینار تعمیر کیے اور تاریخ انسانی کو انوکھی ''تخریب'' سے روشناس کرایا ایسی تخریب جو کبھی چشم فلک نے دیکھی نہ سنی، وہی اولاد ایک نہتے درویش کے سامنے بے بس ہوگئی۔ یہ درویش جب ہلاکو خاں کے بیٹے تگودار خاں سے ''مذاکرات'' کرنے پہنچا تو وہ شکار کھیل کر واپس آرہا تھا۔ خون بہانے کی جانے کیسی ہوس تھی جو اس نسل کی گھٹی میں پڑ چکی تھی اور اب وہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بہر حال تگودار خان اپنے محل کے سامنے ایک مرنجامرنج درویش کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔

''درویش ایک بات تو بتا'' اس نے تمسخرانہ لہجے میں پوچھا ''یہ تمہاری داڑھی کے بال

Marfat.com

بہتر ہیں یا میرے کتے کی دم؟'' بڑا عجیب سوال تھا مگر طاقت کا اوٹ پٹانگ سوال بھی درست اور مناسب ہوا کرتا ہے۔

''میں بھی اپنے مالک کے در کا کتا ہوں'' درویش نے جواب دیا ''اگر میں اپنی جاں نثاری اور وفاداری سے مالک کو خوش کر دوں تو یقیناً میری داڑھی کے بال آپ کے کتے کی دم سے اچھے ہیں' ورنہ ان سے' کتے کی دم بہتر ہے''۔

''وہ کیسے؟'' تگودار خاں اپنے واہیات سوال کا اتنا معقول جواب سن کر قدرے حیران ہوا۔ ''آپ کا کتا آپ کے لیے شکار کی خدمت سرانجام دیتا ہے جو وفاداری و جاں نثاری کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ دو وفاؤں کا مقابلہ ہے اور ظاہر ہے جیت اسی کی ہوگی جو معیار میں اعلیٰ اور مقدار میں زیادہ ہوگی'' درویش کا یہ جواب تگودار خان کی سوچ کے عین مطابق تھا یہ منفرد قسم کی گفتگو اسے بڑی اچھی لگی لہذا درویش اس کا مہمان بن گیا۔ اس کے بعد ہر چیز خود بخود ہوتی چلی گئی۔ اولاد چنگیز کے پاس وحشت و بربریت تو بے شک وافر مقدار میں تھی مگر نہ طریقے سلیقے کی سوچ تھی نہ ڈھنگ کا ضابطۂ حیات۔ کھوکھلی رسمیں اور بے بنیاد توہمات کے سہارے کوئی قوم آخر کتنا عرصہ بام عروج پر رہ سکتی ہے۔

دیوار وحشت و بربریت نے مسمار ہونا تھا اور وہ ہو کر رہی۔ تگودار بزرگ کی باتیں سنتا تو اسے منفرد قسم کا سکون محسوس ہوتا۔ جیسے پاگلوں کے شور میں کوئی سریلا نغمہ سماعت میں رس گھولنے لگے۔ اور آخر کار اس کے دل نے' در پردہ حقیقت کا اعتراف کر لیا اور خراسانی قادریہ سلسلے کے دست حق شناس پر اس نے اسلام قبول کر لیا۔

''میری قوم کے سر سے ابھی وحشت و بربریت کا بھوت نہیں اترا'' تگوداد نے اپنی فراست سے کام لیتے ہوئے کہا ''میں نے اپنی مسلمانی کا اعلان کیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا لہذا بہتر ہے آپ وقتی طور پر منظر سے غائب ہو جائیں اور مجھے ان وحشیوں کو رام کرنے کا موقع دیں۔ میں رفتہ رفتہ اپنی قوم کو نیا مذہب اختیار کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لوں گا'' تگوداد خاں کی یہ بات منی بر حقیقت تھی لہذا درویش واپس خراسان آ گیا اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔ مشیت ایزدی کے تحت وہ خراسانی بزرگ سفر آخرت اختیار کر گئے مگر اپنے بیٹے کو اس ادھورے کام کی ذمہ داری سونپ گئے۔ باپ کی وصیت کے مطابق درویش کا صاحب زادہ تگوداد خان کے دربار میں حاضر ہوا۔

Marfat.com

''قوم کی اکثریت میری ہم خیال ہو چکی ہے مگر ایک طاقتور سردار نہیں ہو رہا'' تگوداد خان نے اپنی تفکیر کا اظہار کیا۔''اس کے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں لہذا زبردستی کی گئی تو خانہ جنگی چھڑ سکتی ہے''۔

''آپ اس سردار سے میری ملاقات کا بندوبست کریں'' درویش نے کہا''اللہ کارساز ہے''

تگوداد نے ضدی سردار کو طلب کیا۔ درویش نے بطریق احسن گفتگو کا آغاز کیا مگر وہ سردار ہتھے سے اکھڑ گیا۔''دیکھیے جناب میں جنگجو قسم کا انسان ہوں اور صرف طاقت پر ایمان رکھتا ہوں کیوں کہ طاقت ہی سب سے بڑی سچائی ہے۔''سردار نے دوٹوک فیصلہ سنادیا۔''آپ میرے ایک سپاہی سے جنگ کریں اگر آپ غالب آگئے تو میں آپ کا دین قبول کرلوں گا''۔

''میں ہرگز اسکی اجازت نہیں دے سکتا'' تگوداد خان نے اسکی سخت مخالفت کی مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ درویش نے ضدی سردار کا چیلنج قبول کرلیا اور ایک طاقتور سپاہی سے مقابلے کا اعلان ہوگیا۔ تگوداد خان کا کہنا تھا کہ ناتجربہ کار درویش کا ایک جنگجو سے مقابلہ قتل عمد کے برابر ہے مگر ضدی سردار کا استدلال بھی کچھ کم نہ تھا۔

''یہ مقابلہ ہو کر رہے گا درویش کی موت دوسرے دخل در معقولات کرنے والوں کے لیے درس عبرت ہوگی اور اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ آئندہ ہمارا''خان'' ایرے غیرے لوگوں کی باتوں میں آنے سے گریز کرے گا''۔

مقابلے والے دن ہزار ہا تماشائی یہ''طرفہ تماشا'' دیکھنے اکٹھے ہوگئے۔ ایک طرف قوی ہیکل جنگ جو انسان تھا تو دوسری طرف میدان میں اترنے والا ایک مرنجا مرنج قسم کا درویش کوئی تمسخر اڑا رہا تھا کوئی قہقہے لگا رہا تھا۔ دونوں حریف آمنے سامنے (اسے سوا یا ڈیڑھ حریف کہنا زیادہ مناسب ہوگا) پھر ایک عجیب بات ہوئی چشم فلک حیران ہوئی تو تماشائی حیران و ششدر رہ گئے۔ درویش نے پوری قوت سے آگے بڑھ کر صرف ایک طمانچہ حریف کے منہ پر مارا۔ حریف کا نہ صرف جبڑا ٹیڑھا ہوگیا بلکہ وہ اپنی تمام تر وحشت و بربریت کے ساتھ زمیں بوس ہوگیا۔ مقابلے کے منصف نے دیکھا تو تاتاری جنگ جو کی کھوپڑی چٹخ چکی تھی۔ جانے اس طمانچے کے پیچھے کون سی قوت کارفرما تھی۔ یہ سزا تھی یا عذاب الٰہی۔ تاتاری بے شک وحشی قوم تھی مگر طاقت کے قانون کا احترام کرنا جانتی تھی۔ درویش کی فتح کا اعلان ہوا تو تاتاری پہلوانوں نے درویش کو

Marfat.com

اپنے کاندھوں پر اٹھا کر جلوس نکالنے کی ضد کی۔ ادھر ضدی سردار نے حسب وعدہ دست فقیر کو بوسہ دے کر اپنی شکست کا اعتراف کیا اور اس کے ساتھ ہی قبول اسلام کا اعلان بھی کر دیا۔

اب تگودار خان کو بھی اخفائے راز کی چنداں ضرورت نہ تھی لہٰذا اس نے بھی سر عام اپنی قلبی کیفیت کا اظہار کیا اور اپنا نام ''احمد خان'' رکھا۔ کتب تاریخ میں ۱۲۸۱ء سے ۱۲۸۴ء تک تگودار خان کی بجائے احمد خان مرقوم ہے۔

سلاطین مصر سے احمد خان کے تعلقات خوش گوار رہوتے ہوتے رہ گئے۔ تاتاری جرنیل اتنی بڑی تبدیلی کو اتنی جلد ہضم نہ کر سکے انہوں نے چنگیزی دستور کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ہی سردار کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ احمد خان نامساعد حالات کے باوجود میدان میں ڈٹ گیا۔ مقصد تھا یا شاید وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔ ہلاکو خان نے جس امت مسلمہ کی شہہ رگ پر وار کیا اس کا اپنا بیٹا اسی امت کے ناموس پر کٹ مرا۔ احمد خان نے جام شہادت نوش فرمایا۔ یہ غوث الثقلین کا روحانی فیض تھا کہ وقت کی تیز ترین تلوار' سچائی کے تحفظ کے لیے بے نیام ہوئی۔ احمد خان کی شہادت سے تاتاریوں میں مبلغ اسلام کی رفتار قدرے سست ضرور ہوئی مگر بنیاد ہل چکی تھی ظلم کی دیوار کو زمیں بوس ہونا تھا اور وہ ہو کر رہی۔

ہلاکو خان کا چچازاد بھائی ''برکہ خان'' ایک اور درویش بے ریا شیخ شمس الدین باخوریؒ کے دست حق پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

❁❁❁ ❁❁❁

Marfat.com

Marfat.com

اللہ لوگ

حضرت شاہ حسین المعروف مادھو لعل حسینؒ

Marfat.com

ذات باری تعالیٰ کی جلالی و جمالی صفات کے مظہر 'مجاز کے پردے میں "حقیقت "کے مینارہ نور 'برصغیر میں ملامتیہ مسلک کے امام 'شاعر بے بدل'مقام فنا و بقاء کی زندہ تشریح 'محرم راز زماں و مکاں' آیات قرآنی کی انوکھی او رعملی تشریح پیش کرنے والی وہ برگزیدہ ہستی جس کے حضور شاہ و گدا سرنگوں ہونا توشہ ء آخرت تصور کرتے تھے .مظاہر قدرت کی تاثیر بدل دینے والی صاحبِ تصرف شخصیت 'درد لا دوا کی اکثیر دوا' سونے کے انبار کو ناپاک مشت خاک ثابت کر دینے والی ذات جس کے سامنے زمین کی طنابیں کھنچ گئیں او رفاصلے مٹ گئے .

Marfat.com

مادھو لال حسینؒ

بچے کی عمر یہی کوئی دس برس تھی مگر جس انہاک سے وہ دریائے راوی کی لہروں کا مشاہدہ کر رہا تھا وہ اس کی عمر سے ''لگا'' نہیں کھا رہا تھا۔ شاید وہ مقام حیرت میں گم تھا۔ راہِ سلوک میں ''مقام حیرت'' وہ مقام ہے جہاں سالک اشیا کی ظاہری شکل وصورت سے تحریک حاصل کر کے 'خالق کائنات کی جلالی و جمالی شان تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اپنی حقیر ذات پر نگاہ ڈالتا ہے تو ذرے اور آفتاب کی اس نسبت کا احساس اسے ہوش وخرد سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ حیرانگی کی یہ انتہا جب الفاظ کا لبادہ اوڑھ لے تو سالک بے اختیار پکار اٹھا ہے۔

کتھے مہر علی کتھے تیری ثناء
گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں

لیکن ایسا مقام حیرت سے ابھرنے کے بعد ہوتا ہے۔ دریائے راوی کے کنارے لڑکے کا انہماک بڑے عجیب انداز میں ٹوٹا۔ ایک نورانی چہرے والی سبز پوش شخصیت نے اچانک ظاہر ہو کر اس کے کاندھے پر بڑے رسان سے ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکے نے چونک کر نورانی صورت پر

Marfat.com

نگاہ ڈالی تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور زبان گنگ ہوگئی۔ حیرت کی شدت ہمیشہ قوتِ گویائی سلب کر لیتی ہے۔ شدت میں کمی واقع ہونے کے بعد گفتگو کا سلیقہ واپس آتا ہے تو لہجے میں لکنت رہ جاتی ہے۔ بزرگ کا چہرہ نورانی ہالے میں یوں جگمگا رہا تھا جیسے قندیل میں شمع روشن ہو جیسے پسِ کہسار سے آفتاب طلوع ہو رہا ہو۔

''بیٹا! کہاں تک اظہار حیرت کرتے رہو گے' تمہاری مسافت بڑی لمبی ہے اور قدم قدم پر حیرت گھات لگائے بیٹھے ہیں'' بزرگ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''مسئلہ کیا ہے؟''

''حضور! مجھے یہاں میرے استاذ میرے پیر و مرشد نے بھیجا ہے'' بزرگ کے تسلی آمیز لہجے سے بچے کے اوسان بجا ہونے لگے تو اس نے اپنی الجھن بیان کی ''میرے شیخ کا حکم تھا کہ اس رمضان المبارک میں نماز تراویح پڑھاؤں' سات سیپارے میں نے حفظ کر رکھے تھے جو گزشتہ رات تراویح میں سنا چکا ہوں' آج آٹھواں پارہ سنانا ہے' سمجھ میں نہیں آ رہا کیا ہوگا؟''

''بیٹا! میں تمہارے شیخ کے مقام سے بھی واقف ہوں اور تمہاری مشکل سے بھی۔ میں تو تمہارے اعتدال پر آنے کا انتظار کر رہا ہوں'' بزرگ نے بڑے نرم لہجے میں کہا ''مقام حیرت' صرف جلوگی کا تماشا ہے۔ جس میں تا دیر محو رہنا شیوہ مردانگی نہیں' یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم زندگی کا بیشتر حصہ اسی کھیل تماشے میں مصروف رہو گے مگر خیر!''

''جناب' آپ کون ہیں؟ اور میری آئندہ زندگی سے کس طرح واقف ہیں؟'' لڑکے نے ہمت کر کے پوچھا۔

''میں خالق کائنات کی برہان ہوں' صراط مستقیم کی نشان دہی کرنے والا ''خضر''۔ ہر نیک روح مجھ سے بخوبی واقف ہے۔''

خضر علیہ السلام نے اپنا تعارف پیش کیا تو لڑکا وفور شوق سے ان کے قدموں میں گر گیا۔ خضرؑ نے ایک ہاتھ سے بچے کا سر اٹھایا اور چلو بھر پانی اس کے حلق میں ڈال دیا۔ منہ میں ٹپکائے ہوئے پانی کے چند قطرے بچے کے حلق سے نیچے اترے تو وہ کسی اور ہی عالم میں جا پہنچا۔ کیف و سرور کی ناقابل بیان کیفیت تھی جس میں وہ ہلکورے لے رہا تھا۔ خاک زمین کی دبیز تہ شیشے کی طرح شفاف ہوگئی۔ مرّوجہ و غیر مرّوجہ علوم کا سمندر اس کے سینے میں موجزن ہوگیا۔

''حضور! یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' لڑکا اپنی کیفیت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہ راز ربانی ہے' اسے علم لدنی کہتے ہیں' یہی وہ عطا ہے جس کے بعد ہر علم کا انکشاف

Marfat.com

اور ہر عالم سے تعارف ہو جاتا ہے۔ تم عنقریب اپنی کیفیت پر قابو پا کر خاموش ہو جاؤ گے' اپنے شیخ سے میرا سلام کہنا۔ مالک کائنات تمہاری مشکلات آسان فرمائے" یہ کہہ کر خضرؑ غائب ہو گئے اور لڑکے نے اپنی حیرت پر قابو پالیا۔

گرنی تھی ہم پر برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

سچ ہے عطا اگر ظرف کے عین مطابق ہو تو بندہ اسے ہضم کر کے خاموش ہو جاتا ہے ورنہ خالی ڈھول کی طرح بجنے لگتا ہے جس کی آواز صرف دور ہی سے سہانی معلوم ہوتی ہے۔ قریب جاؤ تو سمع خراشی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ یہ لڑکا جسے دس برس کی عمر میں خضرؑ کی زیارت نصیب ہوئی لاہور محلہ تلہ بگھہ یا "تل بھاگا" کے رہنے والے عثمان بافندے کا لخت جگر حسین تھا جس نے اپنے آپ کو بصد فخر حسین جولاہا کہا۔ لوگ اسے حسین ڈاھڈا یا شاہ حسین کہتے تھے۔ اپنی شاعری میں اس نے اپنے آپ کو حسین فقیر بھی کہا۔ برصغیر میں وہ مادھولال حسین کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۶ویں صدی کے پہلے نصف میں دریا کی گزرگاہ' موجودہ رواں راستے سے قطعاً مختلف تھی۔ یہ دریا لمبائی کے لحاظ سے مختصر سہی مگر اپنی گزرگاہ تبدیل کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ بھارت صوبہ ہماچل پردیش کے ضلع کانگڑہ میں "کلو" کے مقام سے نکلنے والا دریائے راوی ریاست چمبہ میں سے گزرتا ہوا مقبوضہ کشمیر (علاقہ جموں) میں داخل ہوتا ہے۔ پاک و ہند کی سرحد کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے پنجاب میں داخل ہوتا ہے اور اپنے منبع سے صرف ۴۵۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اپنے آپ کو دریائے عشاق یعنی چناب کے حوالے کر دیتا ہے۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس دور میں دریائے راوی موجودہ شاہی قلعے سے تھوڑی دور بہتا تھا۔ لاہور کا شاہی قلعہ جو جلال الدین اکبر مغل اعظم کے عہد حکومت میں ۱۵۶۶ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا اس زمانے میں کچا قلعہ تھا جو مٹی کے عظیم ٹیلے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ موجودہ بادشاہی مسجد کا تو نام و نشان تک نہ تھا۔ بادشاہی مسجد عہد اورنگ زیب عالمگیر میں تعمیر ہوئی یعنی ۱۰۸۴ھ بمطابق ۱۶۷۳ء (اس مسجد کی تعمیر پر چھ لاکھ روپے لاگت آئی تھی)

محلہ تل بھاگا اسی بادشاہی مسجد سے شروع ہو کر ٹیکسالی دروازہ موتی روڈ اور دربار گنج بخشؒ کے درمیان والی بستی کا نام تھا جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ عثمان بافندے کا مکان بادشاہی مسجد کی مغرب دیوار کے قریب تھا اور اسی مکان میں جس کا اب نا

Marfat.com

م ونشان مٹ چکا ہے' ۹۴۵ھ بمطابق ۱۵۳۸ء بروز جمعۃ المبارک شاہ حسین اس عالم کون وفساد میں تشریف لائے۔ شعور کی آنکھ کھولتے ہی بچے کو محلے کی مسجد کا راستہ دکھا دیا گیا جو گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھے۔ اس مسجد کے امام' عالم وقت' حافظ ابو بکر بکھوی تھے جو محلے کے بچوں کو قرآنی تعلیم سے بھی مستفید فرمایا کرتے تھے۔ یہ مسجد آج بھی لاہور ٹیکسالی دروازے کے آغاز میں موجود ہے ۔یعنی رسوائے زمانہ ہیرامنڈی کے آغاز میں یہ مسجد شاید اتمام حجت کے لیے بدستور قائم اور موجود ہے۔ اسی مسجد کے حجرے میں پنجابی ادب کی مشہور و معروف شخصیت استاد چراغ دین المعروف استاد دامن نے اپنی عمر عزیز کے ۴۵ برس گزار دیئے اور بعد از مرگ' شاہ حسین کے پڑوس میں دفن ہونے کی وصیت کر گیا چنانچہ استاد دامن کو مزار مادھو لال حسین کے قرب دفن کیا گیا۔

یہ بات مستند ہے کہ شاہ حسین کے استاد اوّل امام مسجد' ابو بکر بکھوی تھے جنہوں نے شاہ حسین کو سات سیپارے حفظ کرائے۔ اس وقت شاگرد کی عمر دس برس تھی۔ ۱۶ ویں صدی میں لب دریا واقع اس محلے کو تلہ بگھہ کیوں کہتے تھے اس کا سمجھنا بھی کچھ مشکل مرحلہ نہیں۔ اس زمانے میں علمائے کرام کو واقعی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ حضرات ''خیر'' کی چلتی پھرتی درس گاہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ آج کے اخلاقی انحطاط سے بہت پہلے کی داستان ہے۔ استاد ابو بکر کا تعلق ضلع جہلم تحصیل پنڈ دادخان کے گاؤں ''بکھہ'' سے تھا جہاں کے حفاظ بڑے مشہور تھے ۔(یہ گاؤں آج بھی اسی نام سے موجود ہے) حفاظ کے علاوہ یہ گاؤں ایک زمانے تک عظیم الشان علمی مرکز رہا ہے۔ حافظ ابو بکر جب لاہور تشریف لائے تو اہل محلہ نے اپنی بستی کا نام' امام مسجد کی عزت افزائی کی خاطر تلہ بگھہ رکھ دیا۔ لفظ تلہ' ٹیلے کا بگاڑ ہے۔ اس گاؤں کا ایک خاندان تو اپنی علمی استعداد کی بنا پر بلند مقام و مرتبے پر فائز ہوا۔ نسل در نسل اس میں کلام اللہ کے حافظ اور علم حدیث کے ماہر چلے آتے تھے۔ مولانا غلام محی الدین بکھوی عالم بے بدل کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا پھر ان کے والد حافظ نور حیات' دادا حافظ محمد شفا' پردادا حافظ نور محمد بکھوی گویا پشت ہا پشت سے یہ حضرات اس خدائی اعلان کے امین تھے جس میں خالق کائنات نے اپنے کلام اور کائنات کی سب سے بڑی کتاب قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ مولانا غلام محی الدین کا سن پیدائش ۱۷۸۸ء ہے اور صاحب ''حدائق الحنفیہ'' نے مولانا موصوف کے حفظ قرآن والا عجیب و غریب واقعہ ان الفاظ میں رقم کیا ہے۔ ''آپ نے تھوڑے عرصے میں قرآن ختم کر لیا تھا مگر حفظ نہیں کیا تھا لیکن چونکہ بڑے خوش آواز تھے اس لیے جب رمضان شریف آیا تو لوگوں نے آپ کے والد ماجد

Marfat.com

سے درخواست کی کہ وہ اس رمضان میں غلام محی الدین سے قرآن سننا چاہتے ہیں۔ حافظ نور محمد صاحب نے اپنے لختِ جگر سے پوچھا تو اس نے جواب دیا ''اگر آپ میرے ساتھ ہر روز ایک پارہ ''دورہ'' کرلیا کریں تو میں قرآن سنا دوں گا'' اس طرح آپ نے اسی رمضان شریف میں نہ صرف قرآن حفظ کرلیا بلکہ سنا بھی دیا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ تمام دن پارہ یاد کیا کرتے تھے تو حافظ غلام محی الدین نے فرمایا ''صرف چاشت کے وقت تک ایک پارہ حفظ ہو جایا کرتا تھا۔''

مولانا غلام محی الدین پنجاب سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے برادر خورد احمد دین کے ہمراہ عازم دہلی ہوئے اور بارہ برس تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ علم حدیث کی تعلیم دونوں بھائیوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے مولوی محمد اسحاق سے حاصل کی۔ مولانا موصوف دونوں نابغہ روزگار بھائیوں کی ذہانت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بصد شوق ان کو اپنے نانا حضور کی خدمت لے گئے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے دونوں بھائیوں سے چند سوالات کئے اور دونوں بھائیوں کی علمی فضیلت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سند حدیث عطا فرمانے کے بعد بطور خاص دعائے خیر سے بھی نوازا۔ مولانا غلام محی الدین بگھوی نے تیس برس تک لاہور لال مسجد میں درس دیا۔ شاہی مسجد لاہور کے خطیب مولانہ غلام محمد آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے۔ مولانا غلام محمد خطیب بادشاہی مسجد کے فتویٰ بھی چلتا تھا جو آج ''فتاوی صابریہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۰۰ء میں مولانا غلام محمد کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کے فرزند مولانا محمد شفیق بادشاہی مسجد لاہور کے خطیب مقرر ہوئے۔ شاہ حسین کے والدین نے حافظ ابوبکر بگھوی کا انتخاب ان خاندانوں کے علمی فضیلت کے پیش نظر کیا تھا

بنظر غور دیکھا جائے تو جو کارنامہ شاہ حسین نے ۱۶ وی صدی میں دریائے راوی کے کنارے حضرت خضرؑ کی وساطت سے سرانجام دیا اور مسجد ابوبکر میں قرآن سنایا اسی کی بازگشت بگھہ دیہات کے علمی خاندانوں میں سنائی دی اور اسی روایت پر عمل پیرا ہو کر مولانا غلام محی الدین نے وہی عمل دہرایا اور علمی وراثت کا حق ادا کر دیا۔

شاہ حسین کے آباؤ اجداد ہندو تھے جو فیرز شاہ تغلق کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہ نومسلم خاندان بطور احترام شیخ کہلایا۔ ویسے شاہ حسین کے والد ماجد شیخ عثمان کا تعلق راجپوت گوت ''کلرائے'' سے تھا اور والدہ' راجپوتوں کی شاخ ڈاھڈی یا ڈاہڈا سے تھی۔ خلاف

Marfat.com

دستور شاہ حسین اپنے باپ کی عرفیت کی بجائے والدہ کی نسبت ''حسین ڈاہڈا'' مشہور ہوئے۔ داراشکوہ نے بھی ان کو حسین ڈاہڈا ہی لکھا ہے مگر طرز تحریر سے عیاں ہوتا ہے داراشکوہ نے شاہ حسین کی جلالی کیفیت سے متاثر ہو کر حسین کے ساتھ ''ڈاہڈا'' کا لاحقہ استعمال کیا ہے کیوں کہ پنجابی زبان میں ڈاہڈا بمعنی سخت مزاج اور تند خو مستعمل ہے۔ شیخ عثمان کا پیشہ بافندگی تھا اس طرح شاہ حسین اپنے آپ کو حسین جولاہا کہا کرتے تھے۔

نام حسین تے ذات جولاہا
گالی دیندیاں تانی والیاں

(میرا نام حسین ہے مگر ذات کا جولاہا ہوں جسے تانی والی بطور تحقیر استعمال کرتی ہیں۔)

شاہ حسین لاہور ٹکسالی دروازے والی مسجد ابوبکر میں حصول تعلیم میں مشغول تھے کہ ایک روز ایک قلندر صفت درویش بے ریا قسم کا انسان اس مسجد میں وارد ہوا۔ چہرے سے تھکن کے آثار ہویدا تھے ظاہرہ حالت اس کی لمبی مسافت کا اعلان کر رہی تھی۔ اسی نے متلاشی نگاہوں سے بچوں کو دیکھا اور اس کی نگاہیں شاہ حسین پر آ کر ٹک گئیں۔ بے اختیار اس کے منہ سے ''آہ'' نکل گئی یہ ''آہ'' اندرونی شدت کرب کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس ''آہ'' کے مترادف تھی جس کا اظہار ایک تشنہ لب مسافر وسیع و عریض اور بے آب و گیاہ صحرا عبور کر کے منزل پا لینے کے بعد کرتا ہے۔ یہ درویش بے ریا شیخ بہلول دریائی تھے جن کو شاہ حسین کا استاد ثانی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ رشتہ چھبیس برس پر محیط ہے۔ شیخ بہلول وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے شاہ حسین کی رندوی و قلندری کو بنظر تحسین دیکھا اور جو کچھ دیکھا اسے دل کی آنکھ نے قبول کر لیا۔

شیخ بہلول دریائی اپنے روحانی فرزند شاہ حسین سے ۲۴ برس بیشتر ۹۲۱ھ بمطابق ۱۵۲۴ء ضلع جھنگ قصبہ لالیاں کے قریب دریائے چناب کے کنارے آباد ایک چھوٹے سے گاؤں ''بہلول'' میں پیدا ہوئے۔ والدہ ماجدہ کا نام تینی جات تھا جن کا تعلق جاٹوں کی معروف ذات ''سپرا'' سے تھا۔ اس خاندان کا پیشہ اگرچہ کاشتکاری تھا مگر جوشیلے نوجوان فوجی ملازمت کو دلی رغبت سے اختیار کرتے تھے۔ شیخ بہلول کے والد ماجد کا یہی خیال تھا کہ ان لخت جگر بڑا ہو کر اعلیٰ افسر بنے گا مگر اہل خاندان کو یہ خبر نہ تھی کہ قسمت میں درویشی کی سپہ سالاری لکھ دی گئی ہے۔ پانچ برس کی عمر میں حرف شناسی کے لیے بچے کو حسب دستور قریبی مدرسے میں داخل کر دیا گیا جہاں پہلے روز ہی بچے نے اپنے پہلے سوال سے استاد کو ورطہ حیرت میں ڈبو دیا۔

Marfat.com

''بیٹا! پڑھو بسم اللہ۔'' استاد نے شاگرد کو حکم دیا۔
''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' بچے نے معصوم لہجے میں سوال کیا۔
''خیر و برکت کے لیے ہر کام کا آغاز ''بسم اللہ'' سے ہونا چاہیے'' استاد نے مسکرا کر بچے کو تسلی بخش جواب دیا۔
''آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ بسم اللہ زبان کا وضو ہے؟'' بچے نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو استاد نے چونک کر شاگرد کو دیکھا۔
''بالکل میرا یہی مقصد ہے'' استاد نے بچے کی تشریح سے ششدرہ گیا۔
''استاد مکرم' کیا غسل کے بعد وضو کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟''
''ہرگز نہیں'' استاد کے لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔
''انسان کا دل سمندر نہیں تو دریا ہونا چاہیے'' بچے نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ''دل دریا میں غوطہ لگانے سے جسد خاکی خود بخود پاک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پانی طاہر بھی ہے اور ''مطہر'' بھی۔ (پاک کرنے والا اور پاک) سارے جسم کے غسل کے بعد زبان کا وضو چہ معنی دارد؟'' استاد کے ساتھ سامعین بھی دنگ رہ گئے۔
''بیٹا! پھر بھی بسم اللہ ہر کام کے آغاز کے لیے بے حد ضروری ہے'' استاد نے زچ ہو کر کہا۔
''کمال ہے' اپنا نام ادا کرنے کے لیے اللہ اپنے نام سے زبان کو وضو کراتا ہے کیوں کہ اس کے بعد آپ کہیں گے کہ بیٹا پڑھو' الف اللہ۔''
''بات یہ ہے بیٹا جی کہ آپ نہ صرف بسم اللہ بلکہ ''تعوذ'' (اعوذ باللہ) بھی پڑھیں تا کہ شیطان رجیم کے شر سے اللہ کی پناہ میں آ جائیں'' استاد نے شاگرد کی زبان میں گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا۔
''ابلیس کی کیا جرات کہ وہ میرے اور اللہ کے درمیانی تعلق میں مداخلت کر سکے'' بچے کا لہجہ اس کی عمر کے مطابق ہرگز نہیں تھا ''ابلیس تو بذات خود ہماری قید میں ہے اور ایک قیدی' آزاد ہستی کے معاملات میں کیسے دخل انداز ہو سکتا ہے؟''
استاد سے جواب نہ بن پڑا تو اس نے روایتی گھن گرج سے کام لیا اور شاگرد کو بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا۔ بچے نے بسم اللہ سے آغاز کیا اور سارا سبق فرفر سنا دیا۔ چند روز تک یہی تماشا ہوتا

Marfat.com

رہا۔ استاد سبق پڑھانے کی کوشش کرتا تو شاگرد اگلا سبق سنا دیتا۔ عجیب صورت حال تھی۔ آخر تنگ آ کر استاد مکرم نے شیخ بہلول کے والد کو مشورہ دیا "یہ بچہ کسی اور منزل کا مسافر ہے' بہتر ہے اسے کسی درویش کے سپرد کر دیا جائے۔"

تینی جاٹ کے اتنے وسائل نہ تھے اور جہاں وسائل نہ ہوں' مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مگر اچھی بات یہ تھی کہ بچہ غیر اخلاقی حرکات کا مرتکب نہیں ہو رہا تھا بلکہ بعض اوقات اس سے خرقِ عادات واقعات سرزد ہونے لگے۔ بستی اور اس کے گردونواح میں بچے کی شہرت پھیل گئی۔ ادھر بچہ رفتہ رفتہ' بچہ نہ رہا' عنفوان شباب میں قدم رکھا تو اندر کی بے چینی نے برا حال کر دیا۔ والدین نے اس بے چینی کا روایتی حل ڈھونڈ نکالا یعنی جوان بیٹے کو شادی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ بیوی بچوں کی زنجیریں سارے کس بل نکال دیں گی۔ والدین کی حکم عدولی کی شیخ بہلول میں تاب نہ تھی نہ مجال۔ لہذا قبیلے کی ایک دوشیزہ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ دو بیٹے محمد علی اور ولی محمد تولد ہوئے۔ عمر عزیز کے ۲۸ ویں برس میں اندر کا اضطراب ناقابل برداشت ہو گیا اور شیخ بہلول زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت حاصل کرنے عزیز واقارب سے رخصت ہو کر گھر سے چل نکلے۔ زادِ راہ کی فکر نہ تھی کہ درویشوں اور پنچھیوں کو ذاتِ برحق پر کامل بھروسہ ہوتا ہے لہذا وہ فکرِ رزق سے آزاد ہوتے ہیں۔

"شہر علم" کی زیارت سے پہلے "باب علم" پر حاضری ضروری تھی۔ لہذا شیخ موصوف نجف اشرف' روضہ حیدر کرارؓ پر حاضر ہوئے۔ دو برس تک مزار مقدس پر جاروب کشی کی۔ علی المرتضیٰؓ سے روحانی فیض حاصل ہوا۔ جب "باب علم" مہربان ہو تو علم کی کون سی شاخ ہے جو حجاب میں رہے۔ ادھر شدتِ طلب ادھر وفورِ عطا' نہ کوئی حد نہ حساب۔ پھر دربار حیدری سے ارشاد ہوا کہ کربلا معلیٰ امام حسینؓ کے روضے پر حاضری دی جائے۔ شیخ بہلول حسب ارشاد کربلا پہنچے اور روضہ حسینؓ پر جاروب کشی کا آغاز کیا۔ تین ماہ بعد عازمِ حرمین شریفین ہوئے۔ یہ حج کا موسم تھا لہذا شیخ بہلول مناسک حج ادا کرنے کے بعد روضۂ رسول ﷺ پر حاضر ہوئے۔ کیف و سرور میں فصیل جاں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی' عالم شوق کی یہ کیفیت کہ پر لگا کر گنبد خضرا تک رسائی کو جی چاہ رہا تھا' پیکر خاک پیاسی زمین بن چکی تھا جو ابرِ رحمت کے قطرے قطرے کی منتظر ہوتی ہے۔ خدا خدا کر کے مکہ سے مدینے کا سفر اختتام پذیر ہوا۔ وفور شوق کا تقاضا تھا کہ فوراً مسجد نبویؐ کی زیارت نصیب ہو۔ پھر روضہ رسول ﷺ پر چھ ماہ بارش انوار میں بسر ہوئے۔ وہ منازل جس کو طے کرنے

Marfat.com

میں عمریں درکار ہوتی ہیں قربت حبیب اللہ کی برکت سے پلوں میں طے ہونے لگیں اور یہیں سے شیخ موصوف کو سفر بغداد کا حکم ہوا۔ گھر سے نکلے پانچ برس گزر چکے تھے، مگر بہلول شیخ وقت اور زمانے کے شمار سے آزاد ہو چکے تھے۔ یہی لمحات حاصل زندگی تھے۔ مدینے کی گلیاں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر حکم رسول ﷺ سے سرتابی کی مجال نہ تھی اس لیے بغداد پہنچے اور غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پرنور پر حاضری دی۔ ایک سال بعد مشہد میں امام موسیٰ کاظم کے دربار پر خاکروبی کا اشارہ ہوا چنانچہ کوچہ مشہد کی گدائی میں پہنچے۔ یہاں مختلف مکاتب فکر کے لوگ آیا کرتے تھے۔ بقول شیخ بہلول سرزمین حجاز میں ایسی ایسی شخصیات مدفون ہیں کہ باقی کرہ ارض پر ان کے عشر عشیر کیا خاک پا کے برابر بھی نہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ہر ملک کے ہر شہر میں بزرگان دین کے مزار موجود ہیں۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی شوخ سے شوخ ستارہ حتیٰ کہ چاند تک اپنی روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس عالم کون وفساد میں غوث، قطب، ابدال کس کی مجال ہے کہ گنبد خضرا کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے یا اس کے ہوتے ہوئے اپنے ''وجود'' کے اظہار کی جسارت کر سکے؟ یہی وجہ ہے کہ سرزمین عرب پر ایک ہی دربار سجا ہے باقی تمام بارگاہوں کی اسکے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔

مشہد سے شیخ بہلول کو افغانستان میں کوہ پنج شیر کی چوٹی پر پہنچنے کا حکم ہوا۔ لہذا اگلی منزل افغانستان قرار پائی۔ کوہ پنج شیر کی اس چوٹی پر ایک ایسا غار موجود ہے جو اصحاب کہف کے غار کی ہو بہو تصویر بیان کی جاتی ہے۔ یہی غار شیخ بہلول کی منزل مقصود تھی۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو چند لوگوں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے شیخ کو غار تک جانے سے منع کر دیا۔ شیخ بہلول کے اشتیاق کو مزید ہوا ملی۔ ''غار میں کیا اسرار پوشید ہیں؟ اور یہ لوگ مجھے وہاں جانے سے کیوں روک رہے ہیں؟'' یہی سوچ تھی جو شیخ کو غار کی جانب کھینچ رہی تھی۔ دامن کوہ میں آباد درویشوں نے تفصیل بیان کی کہ غار میں ایک مرد خدا مصروف عبادت ہے جو مہینوں مراقبے میں بسر کر دیتا ہے۔ اس نے خلق خدا کو دور رکھنے کی بہت کوشش کی مگر لوگ اپنی حاجت روائی کی خاطر کشاں کشاں چلے آتے' اس طرح مرد قلندر کی عبادت میں مخل ہوتے' پہلے تو غار نشین درویش ذات باری تعالیٰ کی جمالی شان کا مظہر تھا پھر رفتہ رفتہ شان جلال غالب آتی گئی' اب صورت حال یہ ہے کہ وہ جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہے اس سمت فضا میں آگ لگ جاتی ہے لہذا جو شے درویش کے روبرو ہو' جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

"کیا اس جلالی شان کا اظہار مسلسل ہوتا ہے؟" شیخ بہلول نے حیران ہو کر پوچھا۔
"نہیں، ایسا تو نہیں" پہاڑ کے دامن میں مقیم لوگوں نے جواب دیا "کچھ عرصہ بعد درویش کی نگاہیں مجسم جمال بن جاتی ہیں اور پھر جب وہ راکھ شدہ اشیا پر نگاہ ڈالتا ہے تو ان کی شادابی لوٹ آتی ہے، ہم چوں کہ کچھ عرصے سے یہاں مقیم ہیں لہٰذا بتا سکتے ہیں کہ آج کل درویش پر جلالی کیفیت ہے لہٰذا اگر آپ اس کے سامنے گئے تو جل کر راکھ ہو جائیں گے۔"

شیخ بہلول دریائی سرنگوں، کچھ دیر سوچتے رہے پھر متبسم لہجے کہا "ہم تو خلقِ خدا کو ضرر رسانی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے۔ مالک کائنات نے ہزار ہا عالم تخلیق فرمائے ہیں اور ہر ذی روح کو تحفظ بھی فراہم کیا ہے۔ اسے اپنے مخلوق سے بے حد پیار ہے اور رضائے الٰہی کے حصول کا بہترین ذریعہ اس کی مخلوق سے پیار کرنا ہے۔ وہ درویش جو بندوں کو گزند پہنچاتا ہے مقام رضا بالقضا سے بہت دور ہے۔ وہ کیسا گزند پہنچاتا ہے مقام رضا بالقضا سے بہت دور ہے۔ وہ کیسا عاشق ہے جو محبوب کے اشارہ ابرو سے غافل ہے اور ہمارے مقصود و مطلوب کی رضا یہ ہے کہ اس کی مخلوق سے پیار کیا جائے" یہ کہہ کر شیخ بہلول دریائی، وادی میں مقیم بوریا نشینوں کے پند و نصائح کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی کی جانب چل دیے۔ ان کو مشہد سے یہی اشارہ ملا تھا کہ ان کی منزل یہی کوہ بیخ شیر کے غار میں مقیم بزرگ ہیں۔ یہاں حالات عجیب رخ اختیار کر چکے تھے، فقیروں نے شیخ بہلول کو دانستہ وادی مرگ میں قدم رکھتے دیکھا تو کف افسوس ملنے لگے مگر جسے شہادت کا شوق ہو اس کا کیا علاج۔ ادھر بہلول دریائی زیر لب مسکرا رہے تھے "واہ مولیٰ" گوہر مقصود کے گرد کیسا آتشیں حصار قائم کر رکھا ہے۔ ٹھیک ہے بندہ تو ہر پل، ہر سانس تیری رضا کا خواہش مند ہے اس راہ میں اگر جل جانا مقدر ہے تو بندے کو کیا عذر ہو سکتا ہے" دل میں یہی سوچ تھی جب شیخ بہلول مطلوبہ غار میں پہنچے۔ انہوں نے اسی دشت پیمائی میں عمر گزاری تھی ہر پل رضائے الٰہی کو چاہا تھا۔ حُبِ اختیاری کا تقاضا تھا کہ گل بوسی کے شوق میں کانٹوں پر لب رکھ دیئے جائیں۔ سورج عن نصف النہار پہ تھا جب وہ غار کے دہانے پر پہنچا۔ یہ وقت شانِ جلال کے عروج کا ہوتا ہے مگر شیخ موصوف سود و زیاں اور عروج و زوال کے بکھیڑوں سے آزاد ہو چکے تھے۔ بے دھڑک اندر داخل ہوئے تو سامنے بزرگ کو حالتِ مراقبہ میں پایا۔ ایک کونے میں گم صم کھڑے ہو گئے۔ غار نشین آنکھیں بند کئے عالم بالا کی سیر میں محو تھا۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھ چکے تھے۔ شیخ بہلول ٹکٹکی باندھے مست الست درویش کو دیکھتے رہے۔

Marfat.com

''درویش حالتِ جذب میں ڈوبا ہوا ہے'' شیخ موصوف نے سوچا ''مراقبے میں مداخلت ظلم کے مترادف ہے لہذا انتظار کرنا مناسب ہوگا'' پھر ایک اور خیال ان کے دل میں پیدا ہوا ''درویش کے بال بے حد تحاشا بڑھ چکے ہیں کیوں نہ ان کو مناسب حد تک تراشنے کا بندوبست کیا جائے؟'' یہ سوچ کر وہ اطمینان سے باہر نکلے اور واپس پہاڑ کے دامن میں تشریف لائے۔ وادی میں مقیم لوگوں نے شیخ کو زندہ وسلامت دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور بخیر و عافیت مراجعت پر مبارک باد پیش کی مگر شیخ بہلول قریبی بستی کی طرف چل دیئے اور بالوں کو تراش خراش کا جملہ ساماں لے کر لوٹے۔ لوگوں نے شیخ کو اس جرات رندانہ سے باز رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی مگر شیخ بہلول نے ان کے مناسب الفاظ میں مطمئن کر دیا۔

''شیخ بہلول' آپ خود غرضی سے کام لے رہیں ہیں'' ایک روشن ضمیر وادی نشین نے یاد دلایا۔

''جناب وہ کیسے؟''

''آپ حصول مقصد کے لیے مرد قلندر کے مراقبے میں مخل ہو رہے ہیں۔ اسے مطلب براری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ دنیادار لوگ اسے اپنا الوسیدھا کرنا کہتے ہیں۔ لازم ہے کہ آپ کچھ دیر انتظار فرمائیں اور غار نشین کو مراقبے سے واپس آ لینے دیں' ہونے نہ ہونے کا بھی ایک وقت مقرر ہے'' بات بہلول کی سمجھ میں آ گئی لہذا وہ رات انہوں نے پہاڑ کے دامن میں بسر کی دوسرے روز وہ پھر سوئے غار چل دیئے۔ دہانے کے قریب پہنچے تو مرد قلندر کو اپنا منتظر پایا۔ شیخ بہلول سجدہ شکر بجا لائے۔ غار نشین سے اجازت لے کر اس کے بال تراشنے لگے' داڑھی حدِ شریعت میں لائی گئی پھر تفصیل سے اپنے آنے کی غرض وغایت بیان کی۔ غار نشین نے سفر کا حال خاموشی سے سنا۔

''شیخ بہلول' اس بندہ ناچیز کو آپ ہی کا انتظار تھا'' غار نشین نے پُرسکون لہجے میں کہا ''لاہور میں دنیاوی رنگین ابر پاروں سے بلندی پر پرواز کرنے والا شاہین پیدا ہو چکا ہے' آپ فوراً تشریف لے جائیں اور اس کی تربیت فرمائیں یہی لوح محفوظ پر مرقوم ہے۔ بلند پرواز شاہین کی تربیت آپ کے نام لکھ دی گئی ہے۔'' پھر غار نشین نے شاہ حسین کا مکمل تعارف' شیخ بہلول دریائی کے گوش گزار کیا اور کامل احتیاط کی تلقین کی۔ شیخ موصوف افغانستان کوہ پنج شیر کی چوٹی سے روانہ ہو کر لاہور محلہ تلہ بھاگا' مسجد ابوبکر تشریف لے آئے اور شاہ حسین کو پہچان کر اسی مسجد میں

Marfat.com

فروکش ہوئے۔اس داستان میں مزید پیش رفت سے پیشتر یہ بتا دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ضلع جھنگ کے شیخ بہلول دریائی جنہوں نے شاہ حسین کی چھبیس برس تک تربیت کی برصغیر کی تحریکِ آزادی کے شہید اعظم سلطان فتح علی ٹیپو حاکم میسور کے جد اعلیٰ ہیں۔یہ اعزاز بھی بڑا غیر معمولی ہے۔محمد بہلول کی فرزندِ اکبر محمد علی کی شادی حضرت شیخ محمد حسین گیسودراز کے خلیفہ مجاز حضرت حسن بخت کی صاحب زادی زینت بیگم سے ہوئی جن کے بطن سے چار لڑکے تولد ہوئے۔محمد الیاس' علی محمد' محمد امام' اور فتح محمد۔شادی کے بعد محمد علی گلبرگہ تشریف لے گئے اور دربار حیدر آباد سے منسلک ہوئے۔چنانچہ فتح محمد اور الیاس حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے اور اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ اراکاٹ چلے گئے۔نواب اراکاٹ کی ملازمت کے دوران فتح محمد یعنی بہلول دریائی کے پوتے کے ہاں شہباز خاں اور حیدر علی پیدا ہوئے۔شہباز خاں فرزند اکبر تھے اور حیدر علی ان سے چھوٹے۔حیدر علی نے ریاست میسور کی فوج میں شمولیت اختیار کی اور فاتح میسور ہوئے۔حیدر علی کی دوسری شادی والیء اراکاٹ نواب سعادت علی خان کی صاحب زادی فاطمہ عرف فخر النساء سے ہوئی جن کے بطن سے مجاہد اعظم سلطان فتح علی ٹیپو شہید تولد ہوئے۔گویا ٹیپو شہید کے دادا' بہلول دریائی کے پوتے تھے۔یہ چار پشتوں کا سلسلہ کوئی اتنا دراز نہ تھا کہ سلطان فتح علی ٹیپو کے شوق شہادت کو متاثر کر سکتا۔دریائے چناب کے پانی کا اثر کم از کم سات پشتوں تک جاتا ہے اسی لیئے اسے ''چن آب'' یعنی اسے آب مہتاب کہا جاتا ہے اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ چاند ہی' سمندروں میں طوفانوں کا اصل سبب ہے۔مدو جزر چاند ہی کی بدولت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

شیخ بہلول نے شاہ حسین کو اپنی شاگردی میں لیا تو اس کی عمر دس برس تھی اس لحاظ سے استاد کی عمر پنتیس برس کی ہو چکی تھی۔یہ ۹۵۵ھ بمطابق ۱۵۴۸ء کا ذکر ہے۔شاہ حسین کی پیدائش جس پر تقریباً سب کا اتفاق ہے وہ ۱۵۳۸ء ہی ہے اور متحدہ ہندوستان میں یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے زیروزبر کر دینے والا تھا۔

مغل شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں کا تخت لرز رہا تھا۔بنگال و بہار سے افغانی سردار فرید خاں عرف شیر شاہ ایک تند طوفان بن کر اٹھا چکا تھا۔اسی برس اس نے صوبہ بہار کی سرحد پر قلعہ رہتاس گڑھ ایک انوکھی سیاسی چال سے حاصل کیا۔مغل افواج سے ٹکرانے کے لئے فرید خاں کو ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعے کی ضرورت تھی اور قلعہ رہتاس گڑھ جو دریائے گنگا کے کنارے پہاڑی کی بلند چوٹی پر واقع تھا' فرید خاں (شیر شاہ سوری) کے خوابوں کی تعبیر تھا مگر والی قلعہ ہر

Marfat.com

کشن مہاراج آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی شے نہیں تھا۔فرید خاں بنیا مزاج ہندو راجا کی حسب منشا جال پھیلایا اور وہ اس ہم رنگ زمین جال میں پھنس گیا۔فرید خاں نے پیغام بھیجا۔''مہاراج ہرکشن! مغل شہنشاہ ہمایوں میری سرکوبی کو بنگال آ رہا ہے' میں اپنا خزانہ اور خاندانی مستورات کسی آپ جیسے غیرت مند اور ایماندار شخص کی سپرد کرنا چاہتا ہوں۔زندہ رہا تو اپنا خزانہ واپس لے لوں گا مرگیا تو اس کے مالک ومختار آپ ہوں گے اور میری خاندانی مستورات کی حفاظت کریں گے۔''

خزانے والی ترغیب کام کر گئی اور فرید خاں نے پانچ صد ڈولیوں میں سپاہی بٹھا دیئے۔چند سپاہی مزدوروں کے بھیس میں ساتھ ہو لیے اور دیکھتے ہی دیکھتے افغان سپاہی رہتاس گڑھ کے ناقابل تسخیر قلعے میں داخل ہو گئے۔اس طرح فرید خاں ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری بنا اور ہمایوں ایران ہجرت کرنے پر مجبور ہوا۔لاہور کی سیاسی فضا بھی اس سے متاثر ہوئی۔یہ شہر تو ویسے بھی سو بار اجڑا اور ایک سو ایک بار آباد ہوا۔بقول شاہ حسین''میرے لاہور کے میر ملک شہزادے اور ان کے جلو میں جنگی ساز و سامان' مسرت کے شادیانے پل بھر میں فنا ہو جاتے ہیں۔''

حضرت بلھے شاہ نے لاہور کے دوسرے رنگ کو اجاگر کیا۔

عرش منور بانگاں ملیاں

سنیاں تخت لاہورے

(تخت لاہور اتنا بلند اور صاحب وقار ہے کہ عرش معلی پر دی گئی اذان لاہور تخت پر سنی گئی)

دس برس کی عمر میں شاہ حسین کی تربیت مولانا ابو بکر سے ہوتی ہوئی شیخ بہلول دریائی تک پہنچی۔شیخ موصوف وارد لاہور ہوئے' اپنی منزل تک پہنچے تو ماہ رمضان کی آمد آمد تھی' تربیت کا آغاز ہوا تو شیخ نے مولانا سے دریافت فرمایا''اس مسجد میں نماز تراویح کون پڑھاتا ہے؟''

'یہ فریضہ اس ناچیز کے ہاتھوں سرانجام پاتا ہے''مولانا نے حقیقت حال کا اظہار کیا۔

''اس بار نماز تراویح یہ بچہ پڑھائے گا''شیخ بہلول نے دھماکا کیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ بچہ تو صرف سات سیپارے حفظ کر چکا ہے اور تراویح میں پورا قرآن سنایا جاتا ہے''مولانا نے حیرت سے شیخ بہلول کی طرف دیکھا۔

''اس کا انتظام بھی ہو جائے گا''شیخ کے لہجے میں اتنا اعتماد تھا کہ مولانا ابو بکر تھوڑی خاموش ہو گئے اور یکم رمضان المبارک کی نماز تراویح کیلئے شاہ حسین کو مقام امامت پر فائز کر دیا گیا۔دونوں اساتذہ مقتدی بنے۔مولانا ابو بکر نے بچے کی تلاوت میں الوہی رنگ ملاحظہ فرمایا تو ورطہ

Marfat.com

حیرت میں میں ڈوب گئے ''یہ انداز تلاوت تو میں نے کبھی دیکھا نہ سنا''
مولانا نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ لاہور میں علم و ادب 'تفسیر' ناظرہ' علم حدیث کے بیسیوں مراکز تھے' ایک سے ایک بڑھ کر علم کا سمندر موجزن تھا ۔ بڑے بڑے علماء تلہ بگھہ کی مسجد میں اس طرفہ تماشا کی دید کو حاضر ہوئے۔ بچے نے سات پارے ختم کیے تو ہر عالم کے ذہن میں بڑا سوالیہ نشان معرض وجود میں آیا۔ خود شاہ حسین کی کیفیت بھی دیدنی تھی۔ چنانچہ علی الصباح سحری کے بعد وہ شیخ بہلول کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سوال سے پہلے ہی شیخ بہلول نے انہیں دریائے راوی پر بھیج دیا۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ دریائے راوی کی گزرگاہ ٹکسالی دروازے سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ وہاں جو کچھ پیش آیا اس کی تفصیل بھی بیان ہو چکی ہے۔ شاہ حسین 'خضرؑ کی زیارت کر کے لوٹے تو ان کی شخصیت میں زمین و آسمان کا فرق نمایاں تھا۔ مرشد نے مسکرا کر دریافت فرمایا۔ ''عزیزم! کس حال میں ہو؟''

''حضور! سارے حجاب دور ہو چکے ہیں'' پھر شاہ حسین نے ملاقات کی تفصیل' اپنے پیر و مرشد کے گوش گزار کی۔ شیخ بہلول نے سکون سے ساری روداد سنی اور کہا ''الحمدللہ آغاز خیل خوب است' انجام بھی انشاء اللہ بخیر ہو گا مگر فرزند' ایک بات یاد رکھنا' یہ راز ربی ہے اور جس نے اس راز کی حفاظت کی وہ منزل مراد سے ہم کنار ہوا' دوسری بات ظرف کی وسعت ہے تنگ ظرف والے انسان فوراً چھلک جاتے ہیں اور یہ شیوہ مردانگی نہیں'' شاہ حسین نے مرشد کے ہر لفظ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنا اور دونوں باتوں کو پلے باندھ لیا۔

شہر لاہور زمانہ قدیم ہی سے علوم کا مرکز چلا آیا ہے۔ ۱۸۴۹ء میں فرنگیوں نے گجرات پنجاب کے مقام پر سکھوں کو شکست فاش سے ہم کنار کر کے سکھ قوم کی سیاسی قوت کا شیرازہ بکھیر دیا اور لاہور انگریزوں کے زیر تسلط آ گیا۔ ۱۸۵۰ء میں بحکم سرکار لاہور کے تحصیلدار لالا اجودھیا پرشاد نے مردم شماری کے بعد جو تفصیل پیش کی وہ حیرت انگیز طور دلچسپ ہے۔ یہ ماضی بعید و قریب کے لاہور کی مکمل تصویر ہے۔ انیسویں صدی کے نصف میں لاہور شہر کی آبادی پچاس ہزار تین سو پانچ نفوس پر مشتمل تھی۔ دکانیں اور مکانات اٹھائیس ہزار چھ سو چورانوے ۲۸۶۹۴ باغات تیس عدد' فارسی عربی اور شاستری مدارس کی تعداد دو سو چونتیس ۲۳۴ بیان کی گئی ہے۔ کیا دنیا کے کسی خطے پر کوئی ایسا شہر موجود ہے جس کی آبادی پچاس ہزار ہو اور وہ مدارس دو سو چونتیس۔ اس تفصیلی جائزے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان میں سیاسی انتشار کے

Marfat.com

باوجود ہر زمانے میں جس چیز کی حفاظت کی وہ علم وعرفان کے مراکز ہیں۔ان دوسو چونتیس مدارس میں غیر مسلموں کے شاستری اسکول صرف اڑتیس تھے باقی ۱۹۴ مدارس عربی فارسی کے تھے۔اس شہر پر ماضی قریب کی تباہیوں میں سکھوں کی تباہی سرفہرست ہے۔احمد شاہ ابدالی' نادر شاہ درانی نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ سے بجادی۔اس سے پہلے مغل بادشاہ شاہ عالم کی تخت نشینی کے سلسلے میں چار میں سے تین شہزادوں نے اس شہر کو میدان جنگ قرار دیا اور مقتول ہوئے۔عہد شاہ حسین میں اک طویل بدنظمی کے بعد مغل شہنشاہ اکبر نے شہر لاہور کی رونق کو بحال کیا۔شاہ حسین نے جب تحصیل علم کا آغاز کیا تو لاہوری مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب پر نظر ڈالیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

خلیق احمد نظامی ''حیات عبدالحق محدث دہلوی'' میں رقم طراز ہیں ''سرزمین ہند کی فضا اس قابل ہوگئی کہ فخرالدین رازی اور امام غزالی کے ہم پلہ عالم پیدا کر سکے اور لاہور علمی مراکز کا دل تھا۔''

کتب تفاسیر جو شاہ حسین کے زیر مطالعہ آئیں ان میں مدارک' بیضاوی' کشاف جیسی بلند پایہ کتب تھیں۔تصوف میں عوارف' خصوص الحکم' احادیث میں مشارق الانوار اور مضابیح السنہ' منطق کی شرح شمسیہ' فن کلام میں شرح صحائف' تمہید از ابوشکور سالمی' اس کے علاوہ ادب میں مقالات حریری' علم نحو میں کافیہ' لب الالباب (از قاضی ناصرالدین بیضاوی) فقہ میں ہدایہ' یہ چند ایک کتب ہیں جو شاہ حسین کے زمانہ طالب علمی میں شامل نصاب تھیں۔ان کتب پر حاوی علماء کو اگر شاہ حسین نے بحث وتمحیص میں لاجواب کردیا تو اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ شاہ حسین کے سینے میں علم لدنی موجزن تھا ورنہ اس نے بھی ان کتب کا مطالعہ اسی انداز میں کیا تھا جس انداز میں اس دور کے دوسرے طالب علم کر چکے تھے۔

بچپن میں شاہ حسین کا طرز استدلال کس انداز کا ہوا کرتا تھا مشتے ازخروارے کے طور پر صرف ایک مثال پیش خدمت کی جاتی ہے۔یہ واقعہ خضر کی زیارت سے مستفید ہونے کے بعد کا ہے۔حفظ قرآن کے بعد شیخ بہلول اپنے شاگرد کی تربیت عموماً درگاہ حضرت علی ہجویری المعروف داتا دربار پر کیا کرتے تھے۔مسجد ابوبکر سے بھی تعلق استوار تھا۔ایک روز مولانا ابوبکر تبھوی درس دے رہے تھے کہ مسئلہ ''توفیق'' الجھ کے رہ گیا۔مولانا کا ارشاد تھا کہ توفیق خداوندی سے بندہ نیک اعمال کا ارتکاب کرتا ہے۔بات تو بظاہر کوئی الجھن والی نہ تھی مگر ابلیس ایسے معاملات ہی میں

Marfat.com

وسوسے ڈالتا ہے۔ایک اچھے خاصے بزرگ صورت سامع نے اعتراض جڑ دیا "جب صاحب بندہ ہی بندے کو توفیق عطا نہ فرمائے تو نیک اعمال کی کوتاہی میں بندے کا کیا قصور؟" یہ اعتراض بھی بظاہر سو فیصد درست معلوم ہوتا تھا لیکن اس طرح تو گناہ و ثواب کا امتیاز ہی اٹھ جاتا ہے۔خدا جسے توفیق عطا فرمائے اس سے نیک اعمال سرزد ہو جاتے ہیں اور اس سے برعکس صورت حال میں انسان گناہوں کی دلدل میں دھنس جاتا ہے۔لیکن جس انداز میں شاہ حسین نے سائل کی تسلی کی وہ تا قیامت کج ذہنوں کا ناطقہ بند کر دینے والی بات ہے۔

"استادِ مکرم' میں آپ کی اجازت سے اس شیطانی وسوسے کا جواب دینے کی جسارت کرتا ہوں" شاہ حسین نے مداخلت کی "توفیق کی تعریف یہ ہے کہ بندے کی نیک خواہشات کے عین مطابق صاحب بندہ کی جانب مناسب اسباب کی فراہمی۔اس طرح توفیق میں شدتِ طلب پہلے آتی ہے اور "عطا" قادر مطلق کی جانب سے اس کا جواب ہوتا ہے۔طلب کے فقدان کی صورت میں عطا پہ اصرار جہالت ہے۔ذاتِ خداوندی کی جانب صدق سے اٹھایا ہوا ایک قدم کافی ہوتا ہے کیوں کہ اس کے جواب میں حق تعالیٰ ستر قدم اپنی پیاری مخلوق کی طرف بڑھا دیتا ہے لہٰذا نیک اعمال کی کوتاہی کے سلسلے میں خالق کو موردِ الزام ٹھہرانا کلمہ کفر ہے" اس تعریف سے خود مولانا ابوبکر دنگ رہ گئے۔بات بالکل سامنے کی تھی مگر اکتسابی اور علم لدنی میں یہی فرق ہے کہ علم لدنی والا جب بات کرتا ہے تو مفہوم دل میں اتر جاتا ہے کیوں کہ بات کرنیوالے کی دلی رغبت اور روح کا میلان' اس گفتگو میں شامل ہوتے ہیں۔

دربار حضرت علی ہجویری پر شاہ حسین علمی منازل طے کرنے کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے اس طرح ان کے تیسرے استاد خود علی ہجویریؒ ہیں۔ایک روز شیخ بہلول اپنے روحانی فرزند کو مفصل ہدایات دینے کے بعد دربار سے رخصت ہو گئے۔ان کے آخری الفاظ تھے "فرزند' باقی کام خود علی ہجویریؒ سرانجام دیں گے اسی آستانے پر مجاہدے اور مراقبے میں مصروف رہنا۔"

شیخ بہلول اپنی ذمے داری بطریق احسن سرانجام دینے کے بعد لاہور سے رخصت ہوئے مگر اپنے آبائی قصبے میں جانے کی بجائے حکومت وقت (مغل شہنشاہ اکبر) کے باغی اور پنجاب کے نامور سپوت عبداللہ بھٹی کے علاقے پنڈی بھٹیاں میں قلعہ کنگراں کے قریب جھونپڑی ڈال کر یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔عبداللہ بھٹی جو تاریخ برصغیر میں دلا بھٹی کے نام سے مشہور ہوا

Marfat.com

شاہ حسین کا ہم عصر تھا اور دونوں میں قدر مشترک حکومت وقت سے ٹکراؤ ہے۔ اس کا مفصل ذکر بعد میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ زمین جس پر شیخ بہلول دریائی نے ڈیرا ڈالا ابدال احمد نامی زمیندار کی ملکیت تھی۔ شیخ موصوف اس زمیندار کا بڑا احترام کرتے۔ لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ بہلول دریائی اس بنا پر زمیندار کا احترام کرتے ہیں تا کہ وہ مروت میں درویش کی اقامت پر معترض نہ ہو۔ حالانکہ درویش کا قیام ابدال احمد کے لئے باعث صد فخر تھا۔ آخر ایک روز بہلول دریائی نے اس احترام کی وجہ بیان کر ہی دی ''ابدال احمد کی پشت سے ''برخوردار'' نامی ایک ولی کامل پیدا ہوگا' یہ احترام اس ہونے والے ولی اللہ کی وجہ سے ہے نہ کہ زمیندار کی زمین پر قیام کی وجہ سے۔''

شیخ بہلول کی یہ پیش گوئی حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ ابدال احمد کا پوتا حافظ برخوردار ولیء وقت ہوا جن کا مزار ضلع جھنگ بھوانہ میں آج بھی ''مزار میاں بکھا'' کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ بہلول جب شاہ حسین کو آستانہ علی ہجویری پر چھوڑ کر لاہور سے رخصت ہوئے تو شاگرد رشید کی عمر بیس بائیس کے قریب تھی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ استادی شاگردی کا رشتہ منقطع ہو گیا بلکہ اب شاہ حسین کے بیک وقت دو اساتذہ تھے۔ ایک شیخ بہلول اور دوسرے خود حضرت علی ہجویری' لاہور میں شاگرد کی تربیت کے لیے شیخ موصوف نے ایک عظیم الشان مدرسے کی بنیاد بھی رکھی تھی جہاں دیگر طلباء تحصیل علم میں مصروف تھے۔ مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے زمانے میں اس مدرسے کی شہرت بام عروج پر پہنچی۔

> تحصیل علم کے لیے عموماً طلبا کو دور دراز کی مسافتیں طے کرنا پڑتی تھیں مگر شاہ حسین کی خوش نصیبی ملاحظہ ہو کہ علم کے دریا سمندر خود اس کے قریب آئے۔ نئی درس گاہ بھی رہائش گاہ کے قریب ہی تھی' ٹکسالی دروازے سے پیر مکی ہوتے ہوئے داتا دربار چند فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ شیخ بہلول کالے کوسوں کا سفر طے کر کے خود لاہور تشریف لائے۔ حافظ ابوبکر بکھوی محلے کی مسجد کے خطیب تھے۔ اس کے علاوہ عہد اکبری میں ایسی ایسی ہستیاں لاہور میں جمع ہوئیں جو اپنی مثال آپ تھیں یہ علم الاخلاق' حساب' فلاحت (کاشتکاری) مساحت ہندسہ' نجوم' رمل' تدبیر منزل (پلاننگ)' سیاست' منطق' طبیعات' تاریخ' غرض ہر موضوع کے ماہرین موجود تھے۔ شاہ حسین اور اس کے ہم عصر طلبا کے زیر مطالعہ درج ذیل

Marfat.com

کتابیں بھی تھیں۔ یہ باقاعدہ نصاب میں تو شامل نہ تھیں مگر اس عہد کے دینی وعلمی رجحان کی عکاسی کے لیے ان کا تذکرہ ضروری ہے۔

ا۔احیاء العلوم ۲۔نہج البلاغہ ۳۔مکتوبات مولانا فخر الدین ۴۔تذکرۃ الاولیاء ۵۔خمسہ نظامی ۶۔قوت القلوب ۷۔رسالہ قشیری ۸۔مرصاد العباد ۹۔مکتوبات عین القضاۃ ۱۰۔لوائح از قاضی حمید الدین ناگوری ۱۱۔تفسیر امام ناصری ۱۲۔نوادر الاصول (از مولانا علاؤ الدین ترمذی) ۱۳۔روح الارواح ۱۴۔مقصد الاقصیٰ ۱۵۔کیمیائے سعادت ۱۶۔تحفۃ الشباب ۱۷۔کنز الادب ۱۸۔تفسیر حقائق ۱۹۔سیر الملوک ۲۰۔مکتوبات مولانا فخر الدین ۲۱۔قدوری ۲۲۔مجمع البحرین ۲۳۔اخبار الاثمار اور فقہ معقول

ان کتب پر طائرانہ نگاہ دوڑائیں تو احساس ہوتا ہے کہ شاہ حسین علم لدنی ہونے کے باجود اکتسابی علم کا بھی سمندر تھے۔ عبادت وریاضت کا یہ حال کہ اکثر بعد از نماز عشاء دریائے راوی پر جا کر ختم قرآن کی سعادت بھی حاصل کرتے۔ یہ گویا خضرؑ سے ملاقات کو خراج تحسین پیش کرنے والی بات تھی۔ اس دور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ایران وتوران سے حکمت اور فلسفے کا ایک طوفان امڈ کر داخل ہند ہوا۔ تورانی مشائخ وعلماء نے اپنے اثر ورسوخ اور چرب زبانی سے حکمران کو قائل کر لیا کہ علوم فلاسفہ اور منطق، اسلامی علوم کے لیے نقصان دہ ہیں لہذا ان کا پڑھنا ''حرام'' قرار دیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان علوم کے ماہرین اور چاہنے والوں کو ملک بدر کر دیا جائے۔ جانے کیسی بد نصیبی والی گھڑی تھی کہ حاکم وقت بھی ان کی باتوں میں آ گیا اور قاضی ابوالمعالی، ملا مرزا جان اور ملا عصام الدین جیسے فلسفی ملک بدر کر دیئے گئے۔ جنہوں نے ہندوستان میں پناہ لی۔ یہ بات مستند ہے کہ ان نابغہ روزگار قسم کی ہستیوں میں علمی گہرائی کے لحاظ سے شاہ حسین اس زمانے میں بھی سر فہرست تھے۔ دلائل دینے پر آتے تو مخالف کو لاجواب کر دیتے۔ یہ مشہور تھا کہ شاہ حسین اگر دلائل دینے پر آئیں تو جمادات، نباتات اور حیوانات کی ماہیت بدل دیں۔ یعنی پتھر کو انسان اور ذی روح کو سنگ وخشت ثابت کر دیں۔

لیکن پہلے شاہ حسین کے تیسرے روحانی راہنما سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کا مختصر تعارف اور انداز تعلیم سمجھ لیں۔

ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی المعروف داتا گنج بخشؒ غزنی کے محلے ہجویر کی مناسب سے برصغیر میں علی ہجویری کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ زمانہ سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی کا ہے

Marfat.com

۔آپ سے پہلے لاہور میں آپ کے پیر بھائی شاہ حسین زنجانی رشد و ہدایات کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔(حسین زنجانی کا مزار لاہور''میراں دی کھوہی'' میں موجود ہے) سید علی ہجویری کے پیرومرشد شیخ ابوالفضل بن حسن ختلیؒ تھے۔ایک روز اچانک مرشد نے آپ کو طلب فرمایا اور سفر لاہور کا حکم دیا۔سید علی ہجویری نے دبے الفاظ میں عرض کی''حضور! وہاں تو بھائی حسین زنجانی موجود ہیں۔''

''تمہیں اس سے کیا غرض؟ اور یہ چون و چرا کا کیا مطلب ہے؟ فوراً لاہور روانہ ہو جاؤ۔''مرشد نے سختی سے تنبیہ کی چنانچہ سید علی ہجویری عازم لاہور ہوئے۔غروب آفتاب کے بعد فصیلِ لاہور تک پہنچے۔رات بیرون شہر گزاری۔صبح کیا دیکھتے ہیں کہ خلق خدا کا ہجوم چلا آ رہا ہے۔یہ کس کا جنازہ لا رہے تھے۔ایک مسلمان کا سفر آخرت دیکھ کر موصوف بھی شریک جنازہ ہوئے۔استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ سفر آخرت کا مسافر تو ان کا پیر بھائی حسین زنجانی ہے۔مرشد کی دوررس نگاہوں اور حکمتِ خداوندی کا مظاہرہ بڑا ہی ایمان افروز تھا۔اہل لاہور اس حقیقت سے ناآشنا تھے کہ نووارد رشد و ہدایت کا مینار نور ہے۔یہی وجہ ہے کہ سید موصوف کو لاہوری علما کی کج بحثیوں سے پالا پڑا۔آگہی کے دکھ اگر منفرد ہوتے ہیں تو بے خبری اور جہالت کے نقصان بھی ناقابل تلافی ہو سکتے ہیں۔بعض اوقات تو بے خبری 'عذر گناہ' کے طور پر بھی قابل قبول نہیں ہوا کرتی۔ٹھیک ہے خسارے کی شدت کے احساس میں کمی ضرور واقع ہو جاتی ہے مگر خسارہ تو خسارہ ہے۔سید علی ہجویری سے علمائے لاہور کا پہلا ٹکراؤ اس وقت ہوا جب داتا گنج بخشؒ نے پہلی سجدہ گاہ تعمیر فرمائی۔دنیا کو مسافر خانہ تصور کرانے والے' پہلی فرصت میں سجدہ گاہ کا اہتمام کرتے ہیں اور بے ریا سجدوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔یہ تاریخی مسجد مزار کے قریب آج بھی موجود ہے بلکہ آج کل تو اس کی شان قابل دید ہے اس مسجد کا محراب' عام مساجد کے مقابلے میں قدرے جنوب کی طرف رخ کیے ہوئے تھا۔علمائے قیل و قال نے طوفان بپا کر دیا۔سید علی ہجویری کی شخصیت میں کوئی ایسی انوکھی بات ضرور تھی کہ علما نے کفر کا فتویٰ فرمانے سے گریز کیا ورنہ''آئے نہ جانے غلیل سے رغبت''قسم کے جاہل مطلق ملا بھی کفر کا فتویٰ صادر فرمانے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔مسائل استنجا کے ماہرین سید موصوف کے مقام و مرتبے سے قطعاً ناآشنا تھے لہٰذا پہلے وہی معترض ہوئے۔علی ہجویریؒ''جواب جاہلاں باشد خاموشی'' کے مصداق خاموش رہے۔تعمیر مسجد کی تکمیل ہوئی تو سید موصوف کے حقیقی تعارف کی گھڑی سر پر آئی۔آپ نے اعتراض کرنے والوں کو دعوت

Marfat.com

نماز دی اور امامت خود کروائی۔ مسائل فقہ کی رو سے عالم کی نماز بے علم کی اقتداء میں ناقص ہوتی ہے۔ مقام امامت پر فائض فائز ہونے کے لیے چودہ مشہور شرائط میں سے علم دین سرفہرست ہے۔ بنا بریں اس دور کے نمازیوں میں سید علی ہجویری امامت کے لیے موزوں ترین ہستی تھے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے مقتدیوں سے بڑے سنجیدہ لہجے میں خطاب فرمایا ''آپ حضرات کو اعتراض تھا کہ اس ناچیز کی تعمیر کردہ مسجد کا قبلہ درست نہیں۔''

''یہ اعتراض جوں کا توں موجود ہے'' ایک عالم دین نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کو غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' سید صاحب نے فرمایا۔

''جناب لاہور میں یہ پہلی مسجد نہیں' کیا آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس شہر میں تعمیر شدہ مساجد کا رخ غلط ہے؟'' کسی دوسرے عالم دین نے پہلے کی تائید کی۔

''کیا صحیح کیا غلط آپ سب لوگ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمالیں'' سیّد علی ہجویری نے اپنا دستِ مبارک بلند فرمایا۔ چشم تماشا کے سامنے سارے حجاب اٹھ گئے۔ تمام مقتدی حیران و ششدرہ گئے۔ خانہ کعبہ ان کے سامنے تھا' مسجد کا محراب اور کعبہ ایک ہی سیدھ میں تھے۔ مسجد کا رخ سو فیصد درست تھا۔ اس بات کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تمام مساجد جن کو معیار تصور کر کے علمائے دین نے سید موصوف کی تعمیر کردہ مسجد کا رخ غلط ثابت کیا تھا ان کا کیا بنا۔ ظاہر ہے تمام مساجد کا شہید کیا جانا ناممکن تھا۔ اس ساری تفصیل سے قارئین کرام جو نتیجہ اخذ کر لیں۔ کعبہ کے مشاہدے والی بات مستند ہے۔ اس تعارف نے اہل لاہور کی آنکھیں کھول دیں۔

عام خیال یہی ہے کہ لفظ گنج بخش کی وجہ' خواجہ معین الدین چشتیؒ کی چلہ کشی ہے۔ حضرت خواجہ نے مزار اقدس پر معتکف ہونے کے بعد فیض حاصل کیا تو مشہور زمانہ شعر پڑھا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راھنما

اسی وقت سے سید صاحب کا نام گنج بخش مشہور ہو گیا۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ تصوف کے موضوع پر آپ کی دو کتابیں ''کشف المحجوب اور کشف الاسرار'' نصاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کشف الاسرار میں علی ہجویریؒ رقم طراز ہیں ''اے علی! خلقت تجھے گنج بخش کہتی ہے حالانکہ تیرے پاس ایک جبہ بھی نہیں۔ گنج بخشی تو اسی کو سزاوار ہے جو مالک الملک ہے'' ظاہر ہے کشف الاسرار حضرت خواجہ کی چلہ کشی سے بہت پہلے معرض وجود میں آئی۔ یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے

Marfat.com

کہ زندگی ہی میں آپ کا لقب ''گنج بخش'' زبان زد خاص و عام ہو چکا تھا۔

کشف المحجوب داتا گنج بخش کی وہ کتاب ہے جو تا قیامت علوم باطنی کے لیے مینار نور کا درجہ رکھتی ہے۔ موضوع کی وسعت اور گہرائی کے سبب مصنف کو زندہ جاوید بنا گئی۔ صوفیائے متقدمین و متاخرین اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ صرف ان دو کتب کے مطالعے سے حضرت علی ہجویریؒ کی علمی استعداد روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ ہر دور کے مصنف نے آپ کے متعلق یہ فقرہ ضرور کہا۔ ''سید علی ہجویریؒ علوم ظاہری و باطنی کے بحر بے کنار تھے'۔ ملا جامی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب نفحات میں' داراشکوہ نے سفینۃ اولیاء میں اور مفتی غلام سرور نے خزینۃ الاصفیاء میں کشف المحجوب کو علم کا سمندر قرار دیا ہے مگر خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی نے اس کتاب کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اس کتاب کے مقام و مرتبے کی بہترین دلیل ہے۔ خواجہ موصوف فرماتے ہیں۔ ''کتب تصوف میں کشف المحجوب کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ اگر کسی طالب صادق کو مرشد کامل نہ مل سکے تو اس کتاب کا مطالعہ کرے' اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔ میں نے خود اس کو اول سے آخر تک پڑھا ہے۔''

سید علی ہجویریؒ نے اس کتاب کی غرض و غایت کتاب کے آغاز ہی میں بیان کر دی ۔متن خدمت ہے۔ ''علم ظاہر سے مراد معاملات کا علم اور باطن سے مراد نیت کی درستی ہے۔ دونوں میں سے صرف ایک کا حصول نامرادی کی دلیل ہے۔۔ باطن کے بغیر ظاہر کا علم منافقت ہے اور ظاہر کے بغیر علم باطن' الحاد و زندیقیت۔ باطن کے بغیر شریعت ظاہر ناقص رہ جاتی ہے اور ظاہری شریعت کو سمجھے اور اس پر عمل کئے بغیر صرف باطن پر قناعت ہوا و ہوس ہے۔ انبیاء اور اولیاء کو بھی علم ہی کے ذریعے معرفتِ الٰہی کا حصول ہوا۔ کوئی شخص علم کے بغیر وادیٔ عرفان و سلوک میں قدم نہیں رکھ سکتا۔''

اصل میں علم کی تین اقسام ہیں علم من اللہ' علم مع اللہ اور علم باللہ۔ موخر الذکر علم معرفت ہے جس کے ذریعے عرفان حاصل ہوتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام علوم بشمولیت علوم ظاہری و باطنی کو غرض و غایت سادہ الفاظ میں بیان کر دی جائے۔ حرف اول تو عقیدہ ہے۔ اس کا درست ہونا بے حد ضروری ہے۔ اعمال کا فیصلہ نیتوں سے ہوتا ہے۔ عقیدہ درست نہ ہو تو نیت کی درستی ہو ہی نہیں سکتی۔ عقیدے سے مراد یہ ہے کہ بندہ اس کائنات میں ہر شے کا مقام و مرتبہ متعین کرے۔ خالق اور اس کا اپنا مقام۔ پھر اس کائنات کا مالک و مختار کون ہے اور کاروبار کائنات کس

Marfat.com

انداز میں رواں دواں ہے۔ عقیدے کا منطقی نتیجہ ''عبادت'' ہوتا ہے جب بندہ' صاحب بندہ کے مقام کا تعین کر لیتا ہے تو اپنی حقیر ذات کا ادراک اسے سرنگوں ہو جانے پر مجبور کر دیتا ہے یہی عبادت ہے اور عبادت کا منطقی نتیجہ ہے'' ''اخلاق''۔ اس سے مراد (سادہ الفاظ میں) بندے کا خلق کی مخلوق سے برتاؤ ہے۔ مخلوق سے انسان کے تعلقات کی نوعیت ہی اخلاق ہے۔ دنیا کے تمام الہامی مذاہب کی تعلیم کا یہی نچوڑ ہے کہ یہ تعلق خوش گوار ہو اور اسی کا تبلیغ سید علی ہجویریؒ نے زبانی' تحریری اور عملی انداز میں کی۔

کشف المحجوب اور کشف الاسرار تو وہ کتب ہیں جن سے عوام الناس بخوبی آگاہ ہیں ۔ان کے علاوہ سید علی ہجویریؒ کی بلند پایہ کتب میں درج ذیل تخلیقات بھی لاجواب ہیں۔

۱۔منہاج الدین (اس میں اہل صفہ کی مناقب مرقوم ہیں)

۲۔کتاب الفناوالبقا ۳۔اسرار الخرق والمونات ۴۔کتاب البیان لاہل العیان

۵۔بحر القلوب ۶۔الرعایۃ الحقوق اللہ

یہ کتب تقریباً نایاب ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت داتا گنج بخش شہرت و ناموری سے دور بھاگتے تھے لہذا اکثر کتب جب منصہ شہود پر آئیں تو مصنف کا نام ان پر نہیں ہوتا تھا' اہل ہوس اور مطلب پرست نااہلوں کی بن آئی۔ ان میں ''مناسب ترمیم'' وغیرہ کر کے اپنے نام سے چھپوالیا اس طرح اکثر کتب گوشہ گمنامی کی نذر ہوگئیں۔ آپ کے اساتذہ میں بلند پایہ برگزیدہ ہستیوں کے نام آتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابوالعباس بن محمود اشقانی جن کی متعلق داتا صاحب ''امام یکتا اور طریقت یگانہ'' کے الفاظ رقم فرماتے ہیں۔

دوسرے شیخ ابوالقاسم عبدالکریم ہوازن القشیری جن کا ایک جملہ بقول سید موصوف سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے ''صوفی کی مثال برسام کے مریض کی سی ہوتی ہے ۔ابتدا میں اس کی کیفیت ہذیانی مگر آخر میں مکمل خاموشی۔ جب صوفی کو تمکن و رسوخ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ گونگا ہو جاتا ہے'' شیخ ابوجعفر محمد بن المصباح کو روسائے صوفیہ کا لقب دیتے ہیں۔ شیخ ابو القاسم بن علی بن عبداللہ الگرگانی کے متعلق داتا صاحب رقم طراز ہیں ''شیخ میری باطنی کیفیت کو ایک نظر میں جان جاتے تھے'' لیکن ابوالفضل حسن ختلی سے اپنے تعلق پر سید علی ہجویری نے ہمیشہ ناز کیا۔ حسن ختلیؒ نے طویل عمر پائی۔ آپ صوفیانہ لباس اور رسوم و قیود سے آزاد تھے۔ موصوف اکثر فرمایا کرتے تھے ''الدنیا یوم ولنا فیہ صوم'' یعنی دنیا ایک روز کی ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں

Marfat.com

لہذا اس کے دام تزویر میں ہرگز نہیں آ سکتے اس کی ایک تشریح یہ بھی ہے کہ ہمارا اس دنیا میں قطعاً کوئی حصہ نہیں۔

داتا گنج بخشؒ نے اپنے اساتذہ کے حوالے سے جو فرمایا اس سے ان کی اپنی ذات بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور خواجہ معین الدین چشتی' بابا فرید الدین گنج شکر سے لے کر شاہ حسینؒ کی مزار پُر انوار پر چلہ کشی کا عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ ان صفات کی بنا پر شیخ بہلول دریائی نے شاہ حسین کو سید موصوف کے سپرد کیا۔ اس درس گاہ میں مادھو لال حسین نے ریاضت و عبادت کی انتہا کر دی۔ مزار اقدس پر تلاوت و نوافل سے فارغ ہو کر وہ جنگلوں ویرانوں کی راہ لیتے۔ مجاہدے اور مراقبے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جسے شاہ حسین نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اتنی کڑی مشقت کے علاوہ شاہ حسین کا شہر کے علمی مراکز اور علما سے بھی تعلق قائم رہا جن میں داؤد کرمانی' شیر گڑھی' ابو اسحاق قادری اور شیخ سعد اللہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانے میں شاہ حسین نے اپنا مکتب بھی آراستہ کیا اور گزر اوقات کے لیے اپنا آبائی پیشہ بافندگی بھی اپنایا۔ الغرض دربار علی ہجویری پر علوم ظاہر و باطنی کا عرصہ بارہ برس کے قریب کا ہے وہ اقوال زریں جنہوں نے شاہ حسین کی تربیت میں اساتذہ کا کام سرانجام دیا' اس بارہ برس کی درس و تدریس کا نچوڑ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ قائین ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے باعثِ وبال ہے۔

۲۔ علم کو دنیاوی وجاہت کا وسیلہ اور ذریعہ نہ بناؤ' یہ تو معرفتِ الٰہی کا وسیلہ ہے۔

۳۔ علم کلام اور علم العقائد پر اکتفا کر کے زہد و تقویٰ سے منہ پھیرنے والا زندیق بن جائے گا۔

۴۔ فقیر وہ ہے جو اسباب کے بجائے مسبب الاسباب پر نگاہ رکھے۔

۵۔ بدترین انسان وہ ہے جسے لوگ اللہ والا تصور کریں اور حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ اچھا انسان وہ ہے جسے لوگ اللہ والا خیال کریں اور وہ حقیقت میں بھی ایسا ہی ہو۔ مگر افضل ترین انسان اسے کہتے ہیں جسے لوگ مردِ کامل نہ سمجھے ہوئے طوقِ رسوائی پہنا دیں لیکن وہ ولی کامل ہو۔ یہی اخفا ہے جو عشق حقیقی کا سرمایہ ہے۔ (اسی قول کو شاہ حسین نے عملاً اپنایا)

۶۔ تقاضائے بشریت کی بنا پر انسان تکدر کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ صوفی وہ ہے جو اس دلدل سے بخیر و خوبی گزر کر صفات بشریت پر غالب آ جائے اور ان صفات کی نفی کر دے۔

۷۔ صوفی ہے جو اپنے وجود سے نکل کر بقاء بالحق ہو جائے یعنی مزاج کی قیود سے آزاد ہو کر حقیقت

Marfat.com

الحقاق سے مل جائے۔

۸۔تصوف' مسلسل مجاہدے کا نام ہے اور شان مردانگی یہی ہے کہ صوفی کے پائے استقلال میں لغزش و لرزش نہ آئے۔

۹۔متاع دنیا میں صوفی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔نہ وہ کسی شے کا مالک ہوتا ہے نہ مملوک۔ان صفات کی بنا پر اسے خلق سے کامل انقطاع مل جاتا ہے۔

۱۰۔بارگاہ الٰہی میں مقبولیت کے بعد انسان طریق ملامت اختیار کرتا ہے۔

۱۱۔ترکِ شریعت پر ملامت سے بھڑک اٹھنے والے لوگ جھوٹے ہوتے ہیں اور اگر وہ سچے ہوتے تو اظہارِ مسرت کرتے کہ ان کی دلی مراد پوری ہوئی۔

۱۲۔اللہ تعالیٰ کی عطا پر خوش ہونے والا صوفی درجہ معرفت پر فائز ہے۔دنیادار عطا پر خوشی اور ابتلا پر ناخوش ہوتا ہے۔مصیبت میں خوش ہونے والا مجاہد مگر اصطفا پر راضی ہونے والے کا مقام ''محبت'' ہے۔(اصطفا بمعنی چناو' منتخب کر لینا)

۱۳۔کرامت صداقت ولایت کی دلیل ہے کاذب سے اس کا صدر ہونا محال ہے۔(ناممکن نہیں)

۱۴۔معجزے میں اظہار شرط اول ہے جبکہ کرامت میں کتمان۔(پوشیدہ رکھا' چھپانا' جیسے من کتم سرہ بلغ مرادہ' جس نے اپنا راز چھپایا بامراد ہوا)

۱۵۔کرامت کا اظہار ولی کے اختیار میں نہیں ہوتا اس میں رضائے الٰہی کی شمولیت شرط ہے۔

۱۶۔کافر' فاسق و فاجر سے خرق عادت امور کا اظہار عین ممکن ہے اسے استدراج کہتے ہیں۔

۱۷۔از خود غائب نہ ہو سکنے والا حاضر بحق نہیں ہو سکتا۔

۱۸۔صرف اور صرف اللہ سے حاجت روائی میں فقر کا وقار اور درویشی کی آبرو ہے۔اسی سے ''توکل'' جنم لیتا ہے۔

۱۹۔مجاہدہ فی الحقیقت علت مشاہدہ ہے۔(علت بمعنی سبب جیسے تشنگی میں پانی پینا' بھوک لگے تو کھانا کھانا وغیرہ۔اسی طرح مشاہدے کی حاجت ہو تو مجاہدہ کرو یہی علت ہے)

۲۰۔افعال میں اسباب دیکھنا عین توحید ہے (جیسے عمر فاروقؓ نے چوری کا ارتکاب کرنیوالے بھوکے غلام کو معاف کر دیا کہ سبب معقول تھا)

ان اقوال کی روشنی میں شاہ حسین بارہ برس تک دربار علی ہجویری پر مصروف آہ و فغاں رہے۔کیسے کیسے مقام آئے اور گزر گئے۔نالہ نیم شبی' آہ سحر گاہی بظاہر بے اثر ثابت ہو رہے تھے۔مگر امر واقعہ

Marfat.com

یہ کہ شاہ حسین کندن بن رہے تھے۔

سرخ رو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

اس دور میں شاہ حسین نے کہا

عاشق ہوویں تے عشق کماویں
راہ عشق دا ئی دا نکا 'دھاگا ہوویں تاں ای جاویں
باہر پاک اندر آلودہ 'کانہوں ایویں شیخ کہاویں
کہے حسین جے فارغ تھیوں تاں تد خاص مراتبہ پاویں

(عشق حقیقی کا تقاضا ہے کہ اسے خون جگر سے کمایا جائے۔ عشق تو سوئی کا ناکہ ہے جس میں سے دھاگہ بن کر گزرنا پڑتا ہے تم باہر سے پاک ہو مگر اندر سے ناپاک ہو اس پر شیخ کہلانا' مناسب نہیں۔ اندر کی کدورتوں سے فراغت حاصل کرلو تو مقام مل سکتا ہے)

سچے عاشق تو دل آوارہ تک کو سینے سے منفی کر دیتے ہیں اگر اس میں کدورتیں جنم لینے لگیں۔

بقول اقبال ساجد مرحوم

کل شب دل آوارہ کو سینے سے نکالا
یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا

شاہ حسین کی آہ زاریاں رنگ لائیں ایک عمر کی محنت کا ثمر ملنے کی گھڑی نے در پر آ دستک دی۔ رمضان المبارک کا مہینہ اور جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ شاہ حسین کے اضطراب نے زیر زمین سونے والے کو بھی بے چین کر دیا۔ جذبہ صادق نے الفاظ کا پیرہن زیب تن کیا تو پائے عرش ہل گیا۔ ''حقیقت الفقرا'' میں مرقوم ہے کہ علی ہجویری کی آخری آرام گاہ سے ایک پیکر نور ہویدا ہوا جیسے چاند چہرہ ابر پاروں کی نقاب سے جھانکنے لگے' جیسے قندیل میں شمع جھلملانے لگے۔ شاہ حسین نے عالم مدہوشی میں سر نیاز خم کر دیا اور اتنا خم کہ پیکر نور کے قدموں پر لب رکھ دیئے۔ یہ بوسہ وارفتگی تھا۔ حواس اعتدال پر آئے تو لرزتے لبوں نے حرف مدعا بیان کرنے کی جسارت کی

''حضور! آپ؟''

''ہاں فرزند' میں فنا و بقا کی مجسم تفسیر ہوں' مجھے ہی علی ہجویری کہتے ہیں''۔ پیکر نور لب کشا ہوا۔ ''تیرہ

Marfat.com

برس کی ریاضت رنگ لائی' آج تو مقام ولایت پر فائز ہوا' سارے خوف سارے حزن دور ہوئے''۔ یہ کہہ کر پیکرِ نور نے شاہ حسین کی پیٹھ پر تھپکی دی اور فضا میں تحلیل ہو گیا۔ جس چراغ کا اہتمام ابو بکر بکھوی نے کیا اس میں تیل اور باتی شیخ بہلول دریائی کی جانب سے مہیا کیے گئے اور روشن کرنے والی ہستی علی ہجویریؒ کی تھی۔ یہ سعادت بزور بازو نہیں جذبہ صادق کی فراوانی سے حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ مشیت ایزدی کھل کر ساتھ دے۔

شاہ حسین نے گوہر مقصود کے حصول کے بعد بھی اپنے معمولات ترک نہیں کیے اور نہ اپنی ولایت کا ڈھنڈورا پیٹا بلکہ وسعت ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے چپ سادھ لی۔

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

وہی تلاوت کا شوق تھا وہی نوافل کی فراوانی' درود و وظائف کے مراحل سے بھی شاہ حسین حسب سابق گزرتے رہے۔ حد یہ ہے کہ اس عہد کے علما سے بھی حسب عادت فیض حاصل کرتے رہے۔ ایک سال مزید بیت گیا' شاہ حسین نے عمر عزیز کے ۳۲ ویں برس میں قدم رکھا تو حشر بپا ہو گیا مگر اس اجمال کی تفصیل سے پیشتر شاہ حسین کے ایک اور استاد کا ذکر بے حد ضروری ہے جس کے درس کے دوران یہ حشر بپا ہوا۔ دنیا اس ہستی کو شیخ سعداللہ استاد ملامت کے نام سے یاد کرتی ہے۔

شیخ سعداللہ کا اس دور میں طوطی بول رہا تھا اس لیے کہ وہ علم کا سمندر' عظیم الشان مکتب کے سربراہ ہونے کے علاوہ راہِ سلوک کے مستند شناور تھے۔ ان کو مسلک ملامتیہ کا استاد کہا جاتا تھا تو کچھ یونہی نہیں کہا جاتا تھا۔ مسلک ملامت کا خلاصہ یہی ہے کہ سالک اپنے زہد و تقویٰ اور مقام و مرتبے کی پردہ پوشی کرے اور اس کوشش میں ایسی حرکات کا ارتکاب کرے کہ گرفتار معصیت دکھائی دے۔ مثلاً جام و مینا میں پاکیزہ مشروب پینا جو دور سے شراب دکھائی دے۔ خوش گوار چہروں کی چاہت کا دم بھرنا جسے دنیا ''آوارگی'' تصور کرے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہو۔ سالک کا ہر پل' ہر لحہ یاد اللہ میں گزر رہا ہو جیسے 'ہتھ کار ول' دل یار ول' ہاتھ کام کاج میں مصروف ہوں دل یار کی طرف متوجہ ہو۔ لوگ اس مسلک کو آج تک ہضم نہیں کر پائے کیونکہ چشم تماشا کو جھٹلانا کوئی معمولی بات نہیں۔ جو کچھ آنکھ دیکھتی ہے اسی کے مطابق عدالت دماغ فیصلے صادر فرماتی ہے۔ آنکھ کی شہادت کتنی مضمر ہے؟ یہ الگ موضوع ہے اس کا تذکرہ اپنے مقام پر

Marfat.com

آ ئے گا۔اس سے بہرحال انکار کی گنجائش نہیں کہ یہ شہادت یہ گواہی بڑی غیر معمولی ہے لیکن اسے حرفِ آخر سمجھ لینا بھی نادانی ہے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

اور یہی فریب نظر بندے کو اکثر لے ڈوبتا ہے۔شیخ سعد اللہ ۹۲۱ھ میں ملتان کے ''قلندر خیز'' خطے میں پیدا ہوئے۔ابتدا میں اپنے والد ابراہم بن فتح اللہ ملتانی کی حلقہ بگوشی اختیار کی۔یہ وابستگی مختصر ثابت ہوئی۔۹۳۲ھ میں ابراہیم فقیر بے ریا سفرِ آخرت اختیار کر گیا تو تشنہ لب سعد اللہ نے لاہور آ کر شیخ عبدالرحمن بن عزیز اللہ کے حلقہ تدریس میں شمولیت اختیار کی۔جو کچھ لوح محفوظ پر مرقوم تھا حاصل کیا پھر بایزید پاپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور سندِ فضیلت حاصل کرنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔سلوک کی منازل طے کرنے کے لیے اسی زمانے میں شیخ حسین کاکو کے حلقہ ارادات میں آئے۔یہ عالم اور ہی رنگ ڈھنگ کا تھا۔یوں بھی ہوتا کہ شیخ سعد اللہ درس دے رہے ہوتے تو حالت جذب و سرور طاری ہو جاتا اسی مدہوشی میں کھانا پینا ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا' نمازیں قضا ہو جاتیں۔حالت صحو میں واپسی ہوتی تو خادم سے قضا شدہ نمازوں کا حساب ہوتا' سارا حساب بے باق کر کے پھر از سرِ نو درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے۔جب زندانِ دنیا سے جی زیادہ اچاٹ ہوتا تو قبرستان کا رخ کرتے اور کسی ٹوٹی پھوٹی ویران قبر میں چادر تان کر جا لیٹتے۔

ایک زمانے میں دین الہٰی کی ''بخ'' سے پہلے مغل شہنشاہ اکبر نے اجتہاد کا دعویٰ کیا تھا۔سامان دنیا سے زہد و تقویٰ کو آراستہ کرنا غنیمت ہے مگر زہد و تقویٰ سے دنیا سنوارنا پرلے درجے کی جہالت ہے۔مصیبت یہ ہے کہ زہد و تقویٰ ہی وہ مقام ہے جو خلق خدا کے دلوں پر حکمرانی کراتا ہے اور لوگ دنیاوی بادشاہت یعنی اجسام پر حکمرانی کے ساتھ دلوں پر بھی حکمرانی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔بنا بریں اکبر جیسے حماقت مآب شہنشاہ' عجیب و غریب حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔کبھی مجتہد بنے کبھی خلیفہ اور کبھی خدا لیکن یہ دامِ تزویر دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔اکبر کے دین الٰہی کی مثال ہمارے سامنے ہے جو مشتِ خاک کے زیرِ زمین جاتے ہی اپنی موت آپ مر گیا خیر! مغل شہنشاہ نے اجتہاد کا دعویٰ کیا۔علمائے سو نے اس دعوے کی تائید کی اور اپنی دنیا سنوار کر عاقبت خراب کر لی۔حاکم وقت نے شیخ سعد اللہ کو بھی ''گفت و شنید'' کے لیے طلب فرمایا۔مردِ قلندر عجیب و غریب تھے

Marfat.com

دھج سے دربار میں حاضر ہوا۔ گدڑی پوش پالکی میں سوار ہوا جو شہنشاہ سے طلب کی گئی تھی۔ مقصود یہ جتلانا تھا کہ تم جسموں پر حکمرانی کرتے ہو تو ہم دلوں پر شوق ملاقات ہے تو جیسا ہم کہتے ہیں ویسا ہی کرو ورنہ تم تخت پر خوش ہم تختے پر۔

مغل شہنشاہ کو دیکھتے ہی احترام پر مجبور ہو گیا۔ گفتگو کا آغاز ہوا تو حاکم وقت نے پوچھا ''یا شیخ! بندہ ''واصل بالحق'' کیسے ہوتا ہے؟''

''جیسے یہ حقیر پُرتقصیر بندہ دربار اکبری تک پہنچا'' شیخ سعداللہ نے معقول جواب دیا جو نا معقول بادشاہ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''یا شیخ! جواب الجھا ہوا ہے۔ کچھ وضاحت فرمائیں'' اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے نے اپنی جہالت کا اعتراف کیا۔

''دربار شاہی اور ایک عام بندے کے درمیان طبقہ امرا حائل ہے'' شیخ نے وضاحت پیش کی۔ ''یہ دربار تک حاضری کا وسیلہ ہے۔ میں نے خود ماضی بعید میں دربار تک رسائی کی کوشش کی تھی مگر کوئی وسیلہ کام نہ آیا۔ آج خود حاکم نے مجھے طلب کیا تو سارے وسیلے درمیان سے ہٹ گئے۔ اسی طرح انسان لاکھ کوشش کرے حیلے وسیلے اپنائے جب تک قادرِ مطلق کی رضا نہ ہو اس تک رسائی ممکن نہیں ''واصل بالحق'' ہونے کے لیے رضائے حق سرفہرست ہے۔ وسیلوں کی مثال ان پالکی بردار لوگوں کی سی ہے۔ ظاہر ہے یہ لوگ حاکمِ وقت کی رضا کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے تھے حالانکہ امرا کا درجہ ان سے بلند ہے مگر حاکم کی رضا شامل ہوئی تو یہ چھوٹے لوگ بڑے بن گئے'' بات کی وضاحت ہوئی تو مدعی اجتہاد حیران رہ گیا۔

''یا شیخ! کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیں'' اکبر نے ایک اور جال پھینکا۔

''آئندہ مجھ فقیر کو ملاقات کی زحمت نہ دی جائے'' درویش نے ملاقات شاہ کی حقیقت واضح کر دی۔ اکبر نے اجتہاد کے دعوے کی تائید کے لیے بلایا تھا' وہ بات ان کہی ہی رہ گئی اور شیخ سعداللہ کو عزت و احترام سے رخصت کر دیا گیا۔ فقیر رخصت ہوا تو مزاج شاہی کی آشنائی کا دعویٰ کرنے والے سگ دنیا نے شاہ کو اکسانے کی کوشش کی یہی کہ وہ ظل سبحانی ہے اور سارے ولی' غوث' قطب اسی سائے تلے ہونے چاہئیں وغیرہ وغیرہ مگر شہنشاہ اکبر کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔ وہ شیخ کی ملاقات کے ایک ایک پل پر غور کر رہا تھا۔ آخر وہ لب کشا ہوا ''اس مرد کامل سے سلف صالحین کی مہک آتی ہے۔''

Marfat.com

یوں تو شیخ موصوف کی عمر عزیز درس و تدریس میں بسر ہوئی مگر آخری عمر میں ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آیا۔ شیخ ایک مطربہ کے زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے۔ درس و تدریس قصہ پارینہ ہوئے۔ شیخ نے رندی اختیار کی تو سارے لاہور میں گویا زلزلہ آ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مشاہدہ حق کی گفتگو کے لئے بھی ساغر و مینا' شراب و کباب کی اصطلاحیں استعمال کرنا پڑتی ہیں مگر مسلک ملامت اور معصیت کے درمیان ایک مہین سا پردہ حائل ہوتا ہے اور اسے حائل رہنا چاہئے۔ اسی پردہ کی آڑ میں دکاندار قسم کے پیر فقیر سادہ لوح انسانوں کو لوٹ لے جاتے ہیں مگر کیا کیا جائے اس مہین سے پردے کی پہچان کے لیے بھی تو دیکھنے والی بلکہ دیکھ سکنے والی آنکھ درکار ہے۔ شیخ موصوف کے سلسلے میں واقعی سچ ثابت ہوا کہ

روک سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا

شرط یہ ہے کہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

شیخ سعد اللہ کے شاگردان رشید' بے چین تھے' پل بھر میں کیا سے کیا ہو گیا۔ آخر طلبا نے مل کر فیصلہ کیا کہ کوتوال شہر کی مدد سے اپنے استاد کو مطربہ کے چنگل سے نجات دلائی جائے چناں چہ ایک روز جب شیخ اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک مکان میں محو نا و نوش تھے تو طلباء کی کثیر تعداد محتسب کے ہمراہ دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئی۔ آلات غنا اور سامان مے نوشی توڑ پھوڑ دیئے گئے۔ مطربہ کی درگت بنی۔ محتسب شیخ کو گرفتار کرنے لگا تو اس نے مسکرا کر کہا ''میں نے ایک غیر شرعی فعل کا ارتکاب کیا ہے تو تم لوگ دہرے گناہ کے مرتکب ہوئے ہو۔ اول تو تم لوگوں نے تجسس سے کام لیا جس کی شریعت میں ممانعت ہے دوم تم لوگ بغیر اجازت مکان میں گھس آئے لہٰذا میری نسبت سزا کے زیادہ مستحق تم ہو۔''

معلوم ہوتا ہے اس دور میں واقعی شریعت کی بالادستی قائم تھی۔ محتسب اور طلباء کی بھری ہوئی جماعت میں شرمسار ہو کر لوٹ گئی مگر اتنا ضرور ہوا کہ شیخ کو دعوت فکر دے گئی۔ فقیر کی اصل نیک تھی لہٰذا توبہ کی توفیق شامل ہوئی اور وہ طوائف زادی کی زنجیریں توڑ کر اپنے ''پیشے'' کی طرف لوٹ آئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ بحال ہوا' شاگردوں نے سجدہ شکر ادا کیا۔

شیخ سعد اللہ سخی دل انسان تھے۔ معاش کے ظاہری اسباب نہ ہونے کے باوجود سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے۔ حلقہ تدریس میں شاہ حسین کے علاوہ شیخ منور لاہوری تھے جنہوں نے اکبر کے حکم سے مجمع البلدان کا فارسی ترجمہ کیا اور دین الٰہی سے اختلاف کے باعث پابند سلاسل

Marfat.com

ہوئے اور قلعہ گوالیار میں پس زندان ۱۰۱۱ھ میں راہی ملک عدم بقا ہوئے یعنی شاہ حسین کی وفات کے تین برس بعد۔ ان کے علاوہ شیخ سعد اللہ کے شاگردان رشید میں' ملا عبدالسلام لاہوری' شیخ منصوری لاہور اور حضرت میاں میر آسمان تصوف کے آفتاب و مہتاب بھی شامل تھے۔ یہی وہ دور ہے جب شاہ حسین نے آیات قرآنی کی انوکھے انداز میں تشریح کی اور وہ انداز چونکہ عام ڈگر سے ہٹ کر تھا لہٰذا لوگ اسے ہضم نہ کر سکے۔ ایک بار حلقہ درس میں یہ سوال اٹھا کہ نماز میں غیر اللہ کا تصور جائز ہے یا نہیں۔ سب کا یہی خیال تھا کہ تصور میں غیر اللہ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے مگر شاہ حسین نے کہا ''یہ بات دیہاتی گنوار عورتوں کو مبارک ہو'' سب لوگ حیران رہ گئے اور علماء میں بحث و تمحیص جاری ہو گئی۔ بظاہر یہی درست نظر آتا ہے کہ نماز میں ماسوا اللہ یعنی اللہ کے سوا کسی دوسرے کا خیال آتے ہی نماز ناقص ہو جانی چاہیے۔ مگر خشوع و خضوع کا جو مفہوم شاہ حسین نے بیان کیا اس سے سارے علماء لاجواب ہو گئے۔ ''نماز حق تعالیٰ سے مکالمت ہے'' شاہ حسین نے کہا ''اور گفتگو سوچ سمجھ کر نہ کی جائے تو وہ' یاوہ گوئی کے زمرے میں آتی ہے۔ جو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں اس کو سمجھنا بھی ضروری ہے یہی افضل ترین نماز ہے۔ تلاوت میں جس چیز کا ذکر ہو گا' وہ احاطہ ادراک میں ضرور آئے گی۔ الا یہ کہ قاری بصیرت سے بالکل کورا ہو' اگر تلاوت میں مردہ' خون اور خنزیر کے گوشت کی حرمت کا ذکر آئے گا تو صاحب بصیرت کے ذہن میں ان کا تصور بھی اجاگر ہو گا۔ دیہات کی گنوار خواتین البتہ اپنی بے بصیرتی کے باعث اس سے مستثنیٰ قرار دی جا سکتی ہیں۔ لیکن علما سے اس چیز کی توقع کرنا کہ وہ زبان سے ادا کئے جانے والے الفاظ کا مفہوم قوت مدرکہ میں ابھرنے نہ دیں' ناممکنات میں سے ہے۔ لہٰذا نماز میں غیر اللہ کا تصور جائز ہے بلکہ نماز کی صحت کا ضامن' نماز صرف خیالات کی آوارگی سے فاسد ہوتی ہے وہ بھی اس حد تک کہ خشوع و خضوع مجروح ہو جاتا ہے۔ بندے کا کام حتی المقدور کوشش کرنا ہے' کامیابی کے اسباب حق تعالیٰ فراہم کرتا ہے۔''

بات چونکہ معقول تھی لہٰذا علما کو ماننا پڑی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شاہ حسین کی علمی فضیلت کا ہر شخص معترف تھا بلکہ اساتذہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ افق درس و تدریس پر آفتاب عالمتاب طلوع ہو گا جو اپنی علمی موشگافیوں اور ضیا پاشیوں سے جہالت کے اندھیروں کو مٹا دے گا۔

جہالت کی شب بکھر جائے گی اور علم و آگہی کی سحر طلوع ہو گی ۔
ہے افق سے ایک سنگِ آفتاب آنے کی دیر

Marfat.com

ٹوٹ کر مانند آئینہ بکھر جائے گی رات

مگر سب کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ سارے خواب بکھر گئے انہونی ہو کر رہ گئی۔ سارا زمانہ شاہ حسین کی علمی فضیلت کا معترف تھا۔ وہ مقام ولایت پر بھی فائز ہو چکے تھے۔ یہ الگ بات کہ اس کا اعلان نہیں کیا گیا تھا مگر جاننے والے ان کے مقام و مرتبے سے آگاہ تھے۔ شیخ سعد اللہ استاد ملامت کا درس جاری تھا۔ شاگردان رشید علمی موشگافیوں پہ عش عش کر رہے تھے۔ یہ درس ''تفسیر مدارک'' میں سے دیا جا رہا تھا۔ زیر تشریح قرآنی آیت مبارک تھی'' وماھذہ الحیواۃ الدنیا الا لھوولعب'' (نہیں ہے یہ حیات دنیا مگر کھیل تماشا) جو تشریح استاد مکرم نے پیش کیا اس کا متن تھا کہ دنیاوی زندگی کی حیثیت کھیل تماشے سے زیادہ نہیں اور اسے سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے یعنی اس میں دل لگا کر اسی کا نہیں ہو جانا چاہیے مگر شاہ حسین کی زندگی اندر سے زیر و زبر ہو گئی۔ اس نے وہ مطلب اخذ کیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ سینے میں ایسا طوفان اٹھ کھڑا ہوا کہ گرد و پیش کا ہوش نہ رہا ''استاد مکرم' آپ کو خبر ہے ذات حق کا اشارہ کس طرف ہے؟'' شاہ حسین نے عجیب و غریب لہجے میں کہا ''حیات دنیا کھیل تماشا ہے یہی اسی کا فرمان ہے اور ہمیں اس کھیل تماشے سے جی بھر کے لطف و اندوز ہونا چاہیے''۔ بحث کا آغاز ہو گیا۔ شاہ حسین نے سارا احترام لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں دلائل کا انبار لگا دیا۔ سب سے بڑی دلیل یہی تھی ''فرمان الٰہی پر بغیر چون و چرا عمل پیرا ہونا چاہیے۔ ادراک و احساسات کی زنجیروں سے آزاد ہو کر بندے کے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں' اس کا فیصلہ صاحب بندہ کو کرنا ہے یا وہ بہتر سمجھ سکتا ہے مزید یہ کہ اس کھیل تماشے اور رامش و رنگ کی تشریح بندے کو اپنے عمل سے پیش کرنی چاہیے۔''

شاہ حسین کا مفہوم جب حاضرین پر آشکار ہوا تو سب حیران و ششدر رہ گئے۔ اس مفہوم کو ہضم کرنے کے لئے جس جرات رندانہ کی ضرورت تھی وہ کسی میں نہ تھی۔ اس وقت شاہ حسین عمر عزیز کے ۳۷ ویں برس میں قدم رکھ چکے تھے۔ یہ واقعہ ۹۸۱ ھ میں پیش آیا۔ اس وقت چراغ ولایت کو روشن ہوئے ایک یا ڈیڑھ برس کا عرصہ بیت چکا تھا۔ سینہ انوار الٰہی سے روشن ہو چکا تھا مگر دنیاوی چشم تماشا اس سے بے خبر تھی۔ حشر اس وقت بپا ہوا جب شاہ حسین دوران درس ہی اٹھ کر رقص فرمانے لگے اور اسی سج دھج سے ناچتے گاتے درس گاہ سے باہر نکل گئے' اسی پر ہی بس نہ کی بلکہ تفسیر مدارک جو سر پر اٹھا رکھی تھی وہ اس درسگاہ کے کنوئیں میں پھینک دی۔ شیخ سعد اللہ اور دیگر شاگردان رشید یہ دیکھ کر کف افسوس ملنے لگے۔ جو شیلے ہم مکتب حضرات نے اسے بے ادبی

Marfat.com

گرداننے ہوئے ''رقاص'' کو نرغے میں لے لیا۔شاہ حسین نے مخمور آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا'' کہ کیا چاہتے ہو؟ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے' مجھے ''یار'' کا کہا ماننے دو۔''

''تفسیر مدارک کو کنوئیں میں پھینک کر آپ نے بے ادبی کا ارتکاب کیا ہے'' سب نے بیک زبان کہا'' آپ پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔''

''تم لوگ نا سمجھ ہو' ہم تو ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں' میرا محبوب مجھے کیسے گزند پہنچا سکتا ہے'' یہ عشق میں ڈوبے ہوئے کلمات' سامعین کے سر پر سے گزر گئے۔کوئی ایک بھی الفاظ کی گہرائی تک نہ پہنچ پایا۔سب بضد تھے کہ ''تفسیر مدارک'' کو کنوئیں میں پھینک کر شاہ حسین بے ادبی کا مرتکب ہوا ہے۔آخر شاہ حسین کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا'' ہم اپنے ساجن کے نام کی بے ادبی کیسے کر سکتے ہیں وہ تو ہمارے روئیں روئیں اور رگ رگ میں رقص کر رہا ہے'' یہ کہا اور کنوئیں کی منڈیر پر کھڑے ہو گئے پھر چشم تماشا نے عجیب وغریب منظر دیکھا۔شاہ حسین نے ہاتھ بڑھایا اور کتاب یعنی تفسیر مدارک تہِ آب سے اچھل کر باہر آ گئی۔دستِ شاہ میں کتاب تھی مگر اس کا ورق ورق خشک تھا' پانی کی ایک بوند تک اسے چھونے نہ پائی تھی۔شاہ حسین نے بڑے احترام سے کتاب ہم مکتبوں کے حوالے کی'' اب ہم کتابوں کی منزل سے بہت دور جا چکے ہیں'' یہ کہا اور رقص کرتے ہوئے درس گاہ سے نکل گئے اس دور کا آغاز ہوا جسے لوگوں نے رندی و مستی کا دور کہا۔

لاہوری علما کے ہاں زلزلہ آ گیا کیوں کہ شاہ حسین نے داڑھی منڈوا دی' بھویں تک صاف کرا دیں۔سرخ کپڑے زیب تن کیے اور لاہور کے کوچہ و بازار میں سرعام جام و مینا تھامے رقص و نغمہ سے تہلکہ مچا دیا۔تماشائی ساری دنیا تھی' کوئی توبہ استغفار کرتا کوئی کانوں کو ہاتھ لگاتا 'کوئی کف افسوس مل کر کہتا'' سچے عالم دین بلکہ علم کے سمندر کو ابلیس اغوا کر کے لے گیا'' کوئی کہتا'' ذات کا جولاتھا نا تنگ ظرف ثابت ہوا اور علم دین کو غرق مے کر کے عطا کے نام پر دھبا لگا دیا'' مگر شاہ حسین اپنے حال میں مست اعلانیہ نغمات عیش وطرب گا گا کر لوگوں سے ملامتیں وصول کرتے رہے۔دور آغاز کے اشعار میں پیش خدمت کرنے سے پیشتر عرض ہے کہ کلام شاہ حسین ان کی وفات کے تقریباً تین صدی بعد منصۂ شہود پر آیا۔وہ اشعار جو بحر سے خارج سے نظر آتے ہیں ان کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ مستی و مدہوشی کے دوران تخلیق کیے گئے۔دوسرے ان کی زبان بھی آج کی مرّوجہ سرائیکی یا پنجابی کے کسی لہجے میں نہیں۔بعض الفاظ تو متروک یا بے حد قدیم

Marfat.com

ہیں بہرحال جو کلام اس وقت شاہ حسین کے نام سے موجود ہے وہ حاضر خدمت ہے۔

ہسن کھیڈن بھا اسانوں ‘دتا جی رب آپ آسانوں
اک رونڈے رونڈے رہ گئے اک ہس رس لے گئے گوئے میدانوں
چھوڑ تکبر پکڑ حلیمی کیہ وٹیو اس خودی گمانوں
کہے حسین فقیر سائیں دا صحیح سلامت چلے جہانوں

(ہم پر ہنسنا کھیلنا اللہ تعالیٰ نے خود فرض کر دیا۔ میدان سے گیند لے گئے (سرائیکی میں گوئے بمعنی گیند) تکبر چھوڑ کر حلیمی اپنا لے غرور اور اکڑ سے کیا حاصل ہوگا' اللہ کا فقیر حسین کہتا ہے ہم (اس کے احکام کی پابندی کر کے) جہان سے سلامتی کے ساتھ رخصت ہوئے)

نی مائے' مینوں کھیڈن دے میرا وت کھیڈن کون آسی
نشوہ گن ونتا بیا روپ چنگیرا انگ لائے کہ مول نہ لاسی

(اے ماں ہمیں کھیلنے دے (کیوں کہ یہ زندگی کھیل تماشا ہے) میرا کون اس جہاں میں پھر کھیلنے آئے گا۔ میرے ساجن سائیں میں ہزار گن ہیں اور اس کا حسن بھی بلند پایہ ہے مجھے کیا خبر کہ وہ مجھ پر مہربان بھی ہوگا کہ نہیں)

درگاہ وچ سہاگن سواری
جو کھل کھل نچ کھلوئی

(جو کھل کرناچے گی وہی اس کے گھر کی سہاگن ٹھہرے گی)

اسی انداز کا ایک اور شعر پیش خدمت ہے۔

اساں اندر باہر لال اے' اسا مرشد نالے پیار اے
اساں رل مل جھرمٹ پاونا' اسا ایہو ونج د پار اے

(چوں کہ ہمیں ساجن سے سچا پیار ہو گیا ہے لہٰذا کیف وسرور سے ہمارا رنگ اندر باہر سے سرخ ہو چکا ہے' مل جل کر رقص کرنا ہی ہمارا کاروبار حیات ٹھہرا)

شاہ حسین کی شاعری کے متعلق عرض ہے کہ صوفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے'' کافی '' مناسب ترین صنفِ سخن ہے' اس میں ترک دنیا کا درس اور ذات باری تعالیٰ سے عشق کا جو انداز ہے اس کا اپنا الگ سرور ہے۔ شاہ حسین پہلے صوفی شاعر ہیں جنہوں نے اس صنف سخن کو اپنایا اور اپنے کلام کی بنیاد راگ راگنیوں پر اس طرح استوار کی کہ سوز و گداز کی انتہا نہ رہی ۔ جوگ' بہاگ' بھیروی' اساوری ان دھنوں پر کافیوں کو الفاظ کا پیرہن زیب تن کرایا گیا۔ زمانہ گواہ ہے کہ موسیقی کے یہ رنگ جذبات کے تاروں کو چھیڑنے میں لاجواب ہوتے ہیں ۔ کل

Marfat.com

کافیوں کی تعداد ۱۳۹ ہے۔ ان میں چاہت میں وفا' الفت کی مجبوریوں اور ہجر کی کلفتوں کو من موہنے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پیکر خاک کو ''چرخے' اور'' کاتنے'' کو اعمال سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ کھیل تماشے سے مراد ریاضت و مجاہدے کی مستی اور کیف و سرور ہے۔ کافیوں کی زبان میں سرائیکی' سندھی' لہندی' پنجابی کے مختلف لہجے ہیں ۔(لہندی پنجابی اور ہندی کا ایک لہجہ ہے) ان'' کافیوں'' کی خاص بات یہ ہے کہ ہندی اور سندھی مزاج کے عین مطابق شاہ حسین نے اپنے آپ کو ہیر' بیوی یا محبوبہ تسلیم کیا ہے اور خالق کائنات کو کنت' رانجھن' شوہ اور ساجن کے نام سے یاد کیا ہے۔

اب پیش خدمت ہے مختلف ادوار کا منتخب کلام۔

گل وو کیتی خیال پئی گل وو نباہی لوڑیئے
شمع دے پروانے وانگوں جلایاں انگ نہ موڑیئے
ہاتھی عشق مہاوت رانجھا آنکس دے دے ہوڑیئے
کہے حسین فقیر سائیں دا لگڑی پریت نہ توڑیئے

(دل کی گہرائی سے سنجیدہ لہجے میں بات کر کے اسے نبھانا چاہیئے جیسے شمع پر فدا ہوتے وقت پروانہ پیچھے نہیں ہٹتا' عشق فیل بے زنجیر کی طرح ہوتا ہے مگر اس کا مہاوت رانجھا ہے جو آنکس مار مار کر اسے راہ راست پر لے آتا ہے' حسین اللہ کا درویش یہی نصیحت کرتا ہے کہ پریم کا بندھن توڑنا نہیں چاہیے)

اپنی بے سروسامانی اور نیک اعمال کی کمی کا اظہار بڑے دل کش انداز میں اس طرح کیا ہے۔

چھلڑیاں پنج پائے پروٹے جائے بجار کھلونویں کیوں
نال صرافاں جھیڑا تیرا لیکھا دیندی رونویں کیوں

(پانچ عدد پندیاں'' سوت کی چھلی'' اپنی ٹوکری میں ڈال کر بازار جا کھڑی ہوئی تیری تجارت تو صرافوں سے ہے (جو سونے چاندی کا بیوپار کرتے ہیں) اب حساب کتاب کا وقت آیا ہے تو کیوں گھبرا رہی ہے)

ساجن کی بے نیازی اور اپنی مجبوریوں' ہجر و فراق کی کیفیت کا اظہار کچھ اس طرح ہوا۔ غالب نے اس کیفیت کو بہت بعد میں الفاظ کا لبادہ اوڑھایا یعنی

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

اس سے ملتی جلتی کیفیت کو شاہ حسین نے اپنے انداز میں پیش کیا۔

قاضی ملاں متیں دیندے کھرے سیانے راہ دسیندے
عشق کیہ لگے راہ نال من اٹکیا بے پرواہ نال
ندیوں پار رانجھن دا ٹھاناں کیتا قول ضروری جانا
منتاں کراں ملاح نال من اٹکیا بے پرواہ نال

(قاضی وغیرہ نصیحتیں کرنے آجاتے ہیں مگر ہمارے عشق کو سیدھے ٹیڑھے راستوں سے کیا مطلب؟ ہماری آنکھ تو

Marfat.com

بے نیاز سے لگ چکی ہے۔ ہمارا ساجن ندیا کے پار رہتا ہے اور ہم ملن کا ''قول وقرار'' کر چکے ہیں۔ لہذا املاح کی منت ساجت کر رہے ہیں کیونکہ ایک تو ساجن کو ہماری پرواہ نہیں دوسرے ملنے کا وعدہ پورا نہ کیا تو جانے کیا ہوجائے)

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے کہ ہم نے جنات اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے تخلیق کیا ہے

۔اسی مفہوم کو شاہ حسین نے اس انداز میں بیان کیا ہے۔

بندہ بنایا جاپ کوں توں کیا لبھاناپاپ کیوں
تیں سہی کیا' کیا آپ کوں
اک شاہ حسین فقیر اے 'تسیں نہ کہو کوئی پیر
جگ چلتا ویکھ وہیر اے

(انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اس کے نام کی مالا جپتا رہے مگر تو نے گناہوں کو اپنا لیا' تو نے اپنے آپ کو کیا سمجھ لیا' شاہ حسین تو ایک بے سروسامان بندہ ہے لوگ اسے پیرومرشد مان رہے ہیں یہ دنیا بھی بس لکیر کی فقیر ہے ۔(وہیر قدیم سرائیکی بمعنی لکیر)

دنیا کی بے ثباتی اور سفر آخرت کی تلقین کا انداز ملاحظہ ہو۔

سدا نہ پھلے توریا سدا نہ لگے ساون
ایہہ جوبن ہے چار دیہاڑے کا ہے کو جھوٹ کماون
وت نہ دنیا آون
پیئو کڑے دن دیہاڑے چار دیہاڑے ابست ساہرڑے جان
شاہ حسین فقیر سائیں دا جنگل جائے سمان
وت نہ دنیا آون

(سرسوں ہمیشہ نہیں پھولتی اور نہ رم جھم برسات رہتی ہے' تمہارا رنگ وروپ بھی عارضی ہے جب دنیا میں واپس نہیں آنا (اعمال کی درستی کے لیے) تو معصیت کیوں اختیار کرتا ہے۔

۲۔اے لڑکی میکے میں قیام چندروز کا ہے آخر سسرال جانا پڑے گا۔شاہ حسین فقیر کو رونق دنیا سے کیا غرض وہ تو جنگل میں بھی بسرام کرسکتا ہے۔یاد رہے دنیا میں واپسی ممکن نہیں)

درج ذیل اشعار مزار شاہ حسین کی مشرقی دیوار پر لکھے ہوئے ہیں اور قابل غور ہیں ان میں رنگِ نصیحت اور قسم کا ہے۔

کدی سمجھ ناداناں! گھر کتھے ای کتھے جاناں

Marfat.com

آپ کمینہ' عقل کمینی کون کہے توں داناں
اپنیں راہیں جاندے ڈٹھڑے میر' ملک' سلطاناں
آپ مارے آپ جیوائے ارجائیل بہاناں
کہے حسین فقیر سائیں دا بن مصلت اٹھ جاناں

(نادان کبھی سوچ گھر کہاں ہے اور کدھر جانا ہے تو اور تیری عقل نا کارہ کمینی ہے' سفر آخرت پر میر' ملک سلطان' مقام و مرتبے کے لوگ جاتے دیکھے گئے۔ وہ خود سپرد موت کرتا ہے اور حیات بخش بھی وہی ہے۔ عزرائیل تو بس بہانا ہے (ارجائیل بمعنی عزرائیل) اللہ کا درویش حسین کہتا ہے مصلحت وغیرہ جانے بغیر یہاں سے کوچ کر جانا ہے (مصلت بمعنی مصلحت)

شاہ حسین کی ساری شاعری ویسے تو فنی اعتبار سے لاجواب ہے مگر یہ شعر راقم کو بطور خاص پسند ہے آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

ساجن تم رے روسڑے موئے آدر کرے نہ کوئی
دُرِدُر کریں سہلیاں میں تُر تُر تاکوں توئے

(ساجن تو جب سے خفا ہوا ہے مجھے کوئی پوچھتا ہی نہیں (آدر بمعنی آؤ بھگت' سنسکرت زبان کا لفظ) سہیلیاں دھتکار رہی ہیں مگر میں ہوں کہ تیری دلجوئی تلاش کر رہی ہوں)

اب صورت حال یہ تھی کہ شاہ حسین کے ساتھ ان کے ہم مشرب و ہم مسلک حضرات کی کثیر تعداد شہر کے گلی کوچوں میں رقص کرتی پھرتی۔ سرعام شغل مے نوشی ہوتا۔ شاہ موصوف کی آواز بھی سریلی تھی' فن موسیقی کے رموز سے آشنائی تھی' کچھ لوگ اشعار کے مفہوم سے جھوم جھوم جاتے کچھ سُروں کے طلسم میں گرفتار ہو جاتے۔ مختلف مکاتب فکر کے لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں پذیرائی کی۔ طبقہ علما البتہ صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس دور رنگین میں بھی شاہ حسین کا دن' راگ رنگ میں بسر ہوتا' احکام شریعت کی کھلی خلاف ورزی ہوتی مگر رات دریائے راوی کے ساحل پر تلاوت کلام پاک میں بسر ہوتی۔ حسب معمول ''الحمد سے والناس'' تک پورا قرآن ختم ہوتا۔ سامعین ساحل پر گم صم کھڑے اشجار ہوتے یا شوریدہ سر دریا کی لہریں۔

شیخ بہلول دریائی اس زمانے میں دلا بھٹی کے علاقے میں قیام پذیر تھے۔ لاہور میں ہونے والے دھماکے کی گونج وہاں تک بھی پہنچی۔ وہ اپنے روحانی فرزند کی کایا پلٹ سے باخبر ہوئے تو کشاں کشاں لاہور پہنچے۔ داتا دربار کے قریب شاگرد سے سربازار مٹھ بھیڑ ہوئی۔ شاگرد

Marfat.com

عالم مستی میں جھوم رہا تھا۔ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ استاد نے مسکرا کر کاندھے پر ہاتھ رکھا تو شاگرد نے مخمور آنکھوں سے دخل در معقولات کرنے والے کو دیکھا۔ رفتہ رفتہ آنکھوں میں شناسائی کی لہریں موجزن ہوئیں

''فرزند کیا حال ہے؟'' شیخ بہلول دریائی نے شاہ حسین کی ادھ کھلی آنکھوں میں جھانک کر کہا

''حضور! اندر باہر لال ہے'' شاہ موصوف نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ مرشد نے جو کچھ مرید کی آنکھوں میں دیکھا اسے پسند فرمایا۔ شیخ بہلول تاڑ گئے کہ شاگرد قید شریعت سے آزاد ہو چکا ہے اور کیفیت ''جذب'' میں ہے۔ مجذوب پر شریعت کی حد نافذ نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ تمام حدود و قیود سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے

''ایک نماز ہمارے ساتھ بھی پڑھ لو'' شیخ بہلول نے دلی خواہش کا اظہار کیا۔

''کیا مضائقہ ہے'' شاہ حسین نے ہتھیار ڈال دئے ''مگر اس حالت میں؟'' یہ اشارہ داڑھی اور اپنی ظاہر شکل و صورت کی طرف تھا۔ مگر شیخ بہلول نے مسکرا کر کہا

''فرزند! یہ چمتکار کسی اور کو دکھانا''۔ نماز کا وقت ہوا تو مرشد نے مرید باصفا کو امامت کا حکم اور تلقین کی ''فرزند! پورا قرآن سننے کی تمنا ہے اور لہجہ بھی ''وہ'' ہونا چاہیے'' اشارہ اس الوہی لہجے کی طرف تھا جو خضر علیہ السلام نے تعلیم کیا تھا

''جو حکم بندہ پرور'' شاہ حسین ہوش و حواس میں تھے۔ نماز کی نیت باندھی گئی۔ تلاوت کا آغاز ہوا' شجر و حجر میں جھومنے لگے' آسمانی لہجے سبب وقت کی رفتار تھم گئی۔ یہ لہجہ چشم فلک نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ جوں جوں ختم قرآن کی منزل قریب آتی گئی کیف و سرور میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۳۰ واں پارہ شروع ہوا' ہوتے ہوتے سورۃ ''الم نشرح'' کی باری آئی۔ پہلی دو آیات تلاوت کرنے کے بعد قہقہہ لگایا۔ نماز ختم کی اور کیف و مسرور مستی میں پھر ڈوب کر رقص کرتے مسجد سے باہر نکل گئے۔ اب کے یہ عالم تھا کہ شیخ بہلول دریائی بھی شاگرد کی واپسی پہ قادر نہ تھے۔ انہوں نے صدق دل سے شاہ حسین کو دعا دی اور سپرد خدا کرنے کے بعد لاہور سے کوچ کر گئے۔ یہ دونوں کی آخری ملاقات تھی۔ اس عالم کون و فساد میں دونوں پھر کبھی نہ ملے۔

مغل شہنشاہ اکبر نے ایک نئے دین کی بنیاد رکھی۔ علمائے سوء مادی منفعت کی خاطر مہر بہ لب ہو گئے مگر شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے شیر دل علما سیسہ پلائی دیوار کی طرح اس طوفان بدتمیزی کے سامنے ڈٹ گئے (اس کی تفصیل بڑی دکھ دہ اور

Marfat.com

المناک ہے مگر ہمارا موضوع نہیں بن سکتی) ایسے زمانے میں شاہ حسین کا وجود رندی و مستی کے باوجود نا قابل برداشت تھا۔ لہٰذا جبین شہنشاہ پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ وہ خود زہد و تقویٰ سے دنیا سنوارنے کی جدو جہد میں تھا لہٰذا اس نے کوتوال شہر ملک علی کو حکم دیا کہ شاہ حسین کو پابہ زنجیر دربار اکبری میں حاضر کیا جائے۔ عجیب صورت حال تھی۔ شاہ حسین بحیثیت مجرم ہر جگہ موجود تھا۔ گلیوں' بازاروں' میں رقص کرتا پھر رہا تھا مگر گرفتاری عمل میں نہیں آ رہی تھی۔ چھاپا مار ٹولی ہر بار ناکام و نامراد لوٹی۔ سراغ ملتے ہی قانون کے محافظ ''جائے وقوع'' پر پہنچتے مگر ''مجرم'' کو غائب پاتے۔ اس زمانے میں ایک اور حادثہ رونما ہوا جس نے حکومت وقت کو ہلا کے رکھ دیا۔ سرکار دربار کے تاریخ نگاروں نے اس کی شدت کو کم کر کے 'ایک سرپھرے انسان کی بغاوت کا نام دیا جسے جلال اکبری نے سختی سے کچل دیا حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ سرزمین پنجاب کے لوک گیتوں میں یہ داستان آج بھی جوں کی توں موجود ہے جس میں تخت مغلیہ کے لرزنے کی تفصیل محفوظ ہو چکی ہے۔ عام طور پر اسے دُلا بھٹی کی بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم نے اجمالاً ذکر کیا ہے کہ شاہ بہلول' دُلا بھٹی کے علاقے میں فروکش تھے۔ شاہ حسین' عبداللہ بھٹی' بہلول دریائی میں تعلق خاص کے متعلق تاریخ خاموش ہے یا خاموش کر دی گئی مگر لوک گیت چوں کہ کسی خاص شخص کی قلمی کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ گزرنے والے زمانے کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں لہٰذا بغیر تعصب' لوبھ و لالچ کے سچے واقعات کو محفوظ کر لیتے ہیں' شاہ حسین کی گرفتاری کا مقام اور حالات' شاہ بہلول کا دُلا بھٹی کے ہاں قیام اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اس ''تکون'' میں گہرا تعلق تھا۔ دلا بھٹی کے مختصر حالات سے اس بات کی وضاحت ہو جائے گی۔

لاہور کے کوتوال ملک علی کو شاہ حسین کی گرفتاری کا حکم مل چکا تھا مگر وہ قدم قدم پر ناکام رہا۔ اسی دوران دلا بھٹی والا معاملہ پوری شدت کے ساتھ منظر پر آیا۔ دُلا اصل میں عبداللہ کا بگاڑ ہے جسے مغل تاریخ نویسوں نے عمداً بطور تحقیر استعمال کیا مگر بعد میں یہی نام شہزوری کی علامت بن گیا' یہ گیت زبان زد خاص و عام ہوا۔

دلا نی جمن والیئے جم دتا ای لوہے دی لٹھ
اوہدی ایک للکار تھیں گئی مغلی فوج ترٹھ

(اے دلا جنم دینے والی خاتون' تو نے انسان نہیں آہنی لٹھ کو جنم دیا جس کی ایک للکار سے مغل فوج سہم جاتی ہے)

Marfat.com

سیاسی صورت حال کے علاوہ دلا بھٹی مزاج اکبری بشمولیت دین الٰہی کے خلاف پنجاب سے اٹھنے والی ایک خوف ناک آواز تھی۔ایک زمانے میں لاہور دریائے راوی کے مغربی کنارے سے لیکر دریائے سندھ کے کنارے دلے والا (دریا خان کے قریب) تک کا علاقہ ''دلے دی بار'' کہلاتا تھا۔وہ سارا علاقہ جو دلے کے دادا ''ساندل'' کے نام پر ساندل بار کہلایا اڑھائی سو سال تک بھٹی خاندان کے زیر تسلط رہا۔یہ حکمرانی ۱۳۲۲ء سے ۱۵۸۹ء تک رہی فیصل آباد، سرگودھا، شیخوپورہ کے درمیان پنڈی بھٹیاں اس علاقے کا صدر مقام تھا۔اپنے دور عروج میں بھٹی خاندان کی تین نسلوں نے مغل حکمرانوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔اس کا آغاز ساندل بھٹی سے ہوا۔جنگ فرید بھٹی سے ہوتی ہوئی عبداللہ بھٹی کے زمانے میں بام عروج تک پہنچی۔اس علاقے کے سارے کاشتکار اکبری دین الٰہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔بھٹی خاندان ان کا راہنما تھا۔اصل میں اس کشمکش کا آغاز اس وقت شروع ہو گیا جب ۱۶ ویں صدی میں تخت دہلی کی کمزوری کے سبب مغل فوج کی یلغار کا آغاز ہوا۔یہ لشکر اسی علاقے سے گزر کر دہلی کا رخ کرتا اور فصلوں، چراگاہوں کو تباہ و برباد کر کے مقامی باشندوں کی نفرت کو ہوا دیتا۔گھوڑوں کے لیے بزور بازو خوراک وصول کرنا اور مزاحمت کرنے والوں کو تہ تیغ کر کے لہلہاتی فصلوں کو نذر آتش کر دینا روزانہ کا معمول تھا۔دلا بھٹی کے دادا بجلی خان ساندل نے فوجی دستے منظم کئے اور مغلوں کے خلاف ایک طویل جدوجہد کا آغاز ہوا۔ساندل کا بیٹا فرید خان بھٹی جوان ہوا تو یہ جنگ عروج کو پہنچی۔مغلوں نے اسے بغاوت کا نام دیا۔جس دور میں اکبر نے بھٹی خاندان کے خلاف فوج کشی کی پنڈی بھٹیاں والا قلعہ مسمار ہوا، بھٹی سردار گرفتار ہوا اور لاہور میں دونوں باپ بیٹوں کو دار پر لٹکا دیا گیا۔اس پر بس نہیں ہوئی بلکہ مغلوں نے ساندل اور فرید بھٹی کی لاشوں میں بھس بھروا کہ ان کی سرعام نمائش کی تا کہ حکومت کے خلاف سر اٹھانے والوں کو دوسروں کے لیے عبرت بنا دیا جائے۔یہ خبر ساندل بار کے علاقے میں پہنچی تو عبداللہ ابھی بچہ تھا مگر دوسرے نوجوانوں کا خون کھول اٹھا اور وہ پہلے سے زیادہ، مغلوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔کسانوں کا استحصال، باپ دادا کا انتقام، دین الٰہی کے خلاف نفرت ان چیزوں نے عبداللہ کو وقت سے پہلے جوان کر دیا اور اس نے سارے علاقے میں گویا آگ لگا دی۔مغلوں کا کوئی قافلہ ادھر سے جا سکتا تھا نہ ادھر آ سکتا تھا۔عبداللہ نے اپنی جنگی طاقت میں اضافے کے ساتھ ساتھ زیر تسلط علاقے میں بھی وسعت کی۔میاں والی اور مظفر گڑھ کے درمیان دریا خان کے قریب ''دلے والا'' ایک قصبہ آج بھی

Marfat.com

موجود ہے۔ یہ علاقہ دُلّا بھٹی کی سرحد تھی۔ علاقے کے سارے سرکردہ سردار جب ''علم بھٹی'' تلے جمع ہو گئے تو اکبر نے پوری توجہ سے اس معاملے پر غور کیا اور بنفس نفیس لاہور آ ڈیرے ڈالے اور چھیڑ چھاڑ کا آغاز ہوا۔ اکبر کا اس مہم میں بنفس نفیس شریک ہونا اور لاہور میں مستقل قیام اس بات کا واضح دلیل ہے کہ معاملہ ایک 'فرد واحد' کی بغاوت نہ تھی بلکہ پیچیدہ صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ شاہ حسین کا معاملہ سیاسی ہل چل تلے دب گیا مگر ختم نہیں ہوا تھا۔

جس موقع کی تلاش اکبر کو تھی وہ بھی اس کے ہاتھ آ گیا۔ صوبے دار بکا ملکیرہ کی زیر سر کردگی بارہ ہزار نفوس پر مشتمل ایک قافلہ مغلیہ رسد لے کر ساندل بار کے علاقے میں داخل ہوا۔ دلا بھٹی اپنا لشکر لے کر آندھی طوفان کی طرح اس قافلہ پر حملہ آور ہوا اور قہر خداوندی بن کر مغل فوج پر ٹوٹ پڑا۔ مغل فوج کے سپاہی گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ قافلہ منتشر ہوا یا نیست و نابود کر دیا گیا مگر اس کا سپہ سالار ''بکا ملکیرہ'' جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ دلا بھٹی کو خبر ہوئی تو وہ تن تنہا اس کے تعاقب میں ہو لیا۔ تلاش بسیار کے بعد دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو دلے نے گفت وشنید میں وقت ضائع کیے بغیر تلوار کے ایک ہی وار سے بھگوڑے کا سر قلم کر دیا اور کٹے ہوئے سر کو خرجی میں ڈال کر اپنے جاں نثاروں سے آ ملا۔ اس علاقے میں ایک ''میدا'' نامی کھتری ایسی ہستی تھی جس کی مغل دربار تک رسائی تھی۔ دلا بھٹی نے اسے طلب کیا اور دشمن کا کٹا ہوا سر اس کے حوالے کرتے ہوئے حکم دیا ''یہ سر دربار اکبری میں لے جاؤ اور مغل شہنشاہ سے کہنا یہ عبداللہ بھٹی کی طرف سے تحفہ ہے۔ عبداللہ جو ساندل کا پوتا اور فرید خان بھٹی کا فرزند ہے۔ شاید ہماری ملاقات کسی میدان جنگ میں ''مردانہ وار'' ہو جائے۔ اکبر کو یہ بھی بتا دینا کہ میری اجازت کے بغیر جو شخص بھی میرے علاقے میں داخل ہوا اس کا یہی حشر ہو گا۔''

دُلّا بھٹی کے اپنے ''شریک'' دوست نما دشمن جو ہر زمانے میں ہر جگہ موجود ہوتے ہیں مغل سپہ سالار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شہر میں داخلے کے محفوظ مقامات کی نشان دہی کرنے لگے۔ اس طرح ''پنڈی بھٹیاں'' سرنگوں ہوا۔ مگر یہ داستان کا صرف آغاز تھا۔ دُلّا بھٹی کی والدہ اماں لدھی اور دو بیویاں 'پلھراں اور نوراں'' مغل فوج کی قید میں آئیں۔ مرزا نظام فتح ونصرت کے شادیانے بجاتا قیدیوں کو پابہ زنجیر لے کر عازم لاہور ہوا۔ مگر ساندل بار کے سرحدی گاؤں کا سردار لال خاں مغل فوج کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس کی غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ بھٹی خاندان کی خواتین 'دربار اکبری میں ذلیل و رسوا کی جائیں۔ یہ گویا سارے پنجاب کی رسوائی تھی۔ مغل

Marfat.com

سلطنت ویسے بھی کوئی اسلامی ریاست نہ تھی اکبر جیسے شہنشاہ کو ہم بھی بہ امر مجبوری حکمران کہتے ہیں ورنہ اسے کے ''کارناموں'' سے کون واقف نہیں۔ ہنود و یہود اس کی عظمت کے گن گاتے ہیں تو یہ بھی ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

لال خاں نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیز رفتار ہرکارہ دوڑایا اور دلا بھٹی کو اس کی خبر کر دی۔ عبداللہ اپنی فوج لے کر فوراً میدان جنگ میں پہنچا۔ اس کے آتے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ اس نے زبردست جنگی چال چلی جس سے مغل لشکر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گیا اور دُلا ان ٹکڑیوں کا صفایا کرنے لگا۔ معمولی جھڑپ نہ تھی۔ جس جنگ میں سولہ ہزار مغل فوج حصہ لے رہی ہو اسے معمولی جھڑپ قرار دینا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ بہرحال مغل لشکر تباہ و برباد ہوا تو مرزا نظام راہ فرار اختیار نہ کر سکا مگر اس کے پاس ترپ کا یکہ موجود تھا، وہی اس نے بڑی عقل مندی سے کھیلا۔ اس نے اپنا سر دلا بھٹی کی والدہ اماں لدھی کے قدموں رکھ دیا ''نیک دل خاتون' ماں بن کر مجھے اپنی پناہ میں لے لے'' مرزا نظام نے یہ التجا کچھ اس انداز سے کی کہ ''نیک دل خاتون'' کو اس پر رحم آ گیا اور اس نے مرزا نظام کو پناہ دے دی۔ دلا بھٹی کو خبر ہوئی تو اس نے صدائے احتجاج بلند کی' ماں کو سمجھایا مگر ماں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ادھر دُلا بھٹی شمشیر براں لیے کھڑا تھا ادھر مرزا نظام عمر رسیدہ خاتون کی پناہ میں تھر تھر کانپ رہا تھا صورت حال عجیب واہیات ہو گئی۔ دلا لاکھ بہادر سہی مگر ماں کے سامنے بلند آواز میں گفتگو کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کمزوری تھی یا سیاسی بصیرت کا فقدان' جو کچھ بھی تھا خوب بلکہ بہت خوب تھا۔

''عبداللہ! یہ تلوار نیام میں کر لو اور اس شخص کو گلے لگا کر اپنا بھائی بنا لو'' ماں نے گرج کر کہا۔ دلا بھٹی جانتا تھا کہ وہ سانپ کو گلے لگا رہا ہے مگر مجبوری تھی۔ اس نے تلوار نیام میں کر لی اور مرزا نظام کی نہ صرف جاں بخش دی بلکہ اسے گلے لگا کر بھائی تسلیم کر لیا۔ مرزا کی جان میں جان آئی اور اس نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور گواہ بنا کر عہد کیا کہ وہ تاحیات عبداللہ کا وفادار رہے گا۔ سیاست اور چرب زبانی میں چولی دامن کا کب ساتھ نہیں تھا؟ اور کب دلاوری اور چرب زبانی' دریا کے دو کنارے نہیں تھے۔ مرزا نظام نے چند دنوں میں دلا بھٹی کا اعتماد حاصل کر لیا مگر در پردہ مغل دربار سے بھی رابطہ رکھا۔ اکبر اعظم اپنی سیاسی بصیرت سے معاملے کی تہ تک پہنچ گیا اور زہر دینے کی بجائے حریف کو ''گُڑ'' سے ہلاک کرنے کے خیال سے مطمئن ہو گیا۔

عبداللہ بھٹی کو جنون کی حد تک شکار کا شوق تھا۔ مرزا نظام نے بھی شکار کو اوڑھنا بچھونا بنا

Marfat.com

لیا۔ دونوں ''بھائی'' جنگل بیلوں میں شوق کی تسکین کرتے رہتے۔ ایک روز مرزا نظام سپہ سالار مغل فوج اپنے منہ بولے بھائی کو اک ایسی جگہ لے گیا جہاں مغل فوج گھات لگائے بیٹھی تھی۔ مرزا نظام الدین نے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ مغل فوج اس کے اشارے کی منتظر تھی۔ دلا بھٹی کے اسپ تازی نے خطرے کی بو سونگھ لی مگر مالک کے اشارے پر دشمنوں کے جال میں پیش قدمی پر مجبور ہو گیا۔ دلا بھٹی کو ہوش اس وقت آیا جب وہ چاروں طرف سے دشمن کے تیروں کی زد پر آ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو منہ بولا بھائی غائب ہو چکا تھا۔

''گیدڑ صف لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں چپ چاپ ہتھیار ڈال دوں گا تو ان کی یہ حسرت کبھی پوری نہ ہو گی۔'' عبداللہ بھٹی نے گھوڑے کی ایڑ لگائی اور تلوار بے نیام کر کے دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ وہ چومکھی لڑ رہا تھا اور جدھر کا رخ کرتا سر کاندھوں سے کٹ کٹ کر گرنے لگتے۔ پنجاب میں فن شاعری کی صنف کو ''وار'' کہتے ہیں۔ اس میں کسی فرد کے بہادرانہ کارنامے گیتوں کی صورت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اس مقابلے کی تفصیل ان ''واروں'' میں آج بھی محفوظ ہے۔ دیکھیں کب کوئی قلم کار اسے موضوع سخن بناتا ہے اور یہ داستان منصۂ شہود پر آ کر تاریخی کرداروں سے انصاف کرتی ہے۔ ایک تنہا شخص مغل فوج سے برسرِ پیکار تھا۔ وہ کوئی مافوق الفطرت کردار نہیں تھا مگر جو کچھ اس روز پیش آیا' وہ حیرت انگیز ضرور ہے۔ دو سو گیارہ مغل فوجی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ دلا بھٹی کے جسم پر زخم سجتے رہے مگر وہ بدستور جنگ کرتا رہا۔ جب وہ سپاہیوں کے نرغے میں آ جاتا تو اس کا گھوڑا بلند چھلانگ لگا کر اسے دشمنوں کے نرغے سے نکال لے جاتا' ایسی ہی ایک کوشش میں وہ چھلانگ لگا کر زمین پر آیا تو دلدل میں پھنس گیا۔ ادھر دلا بھٹی بھی تھک کر چور ہو چکا تھا۔ حریف غیر متحرک ہوا تو مغل فوج نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس طرح اسے پابجولاں' مغل شہنشاہ اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔

مغل شہنشاہ نے اسے اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کیلئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ رنگین لالچ اور سنگین نتائج کی دھمکیاں' سارے حربے ناکام ہو گئے۔ دلا بھٹی نے صاف کہہ دیا ''میں کس کا طوق غلامی گلے میں پہنوں؟ باپ دادا کے قاتل اور اپنی دھرتی کے غاصب کا؟ یہ اس مٹی کا مزاج ہی نہیں جس سے میرا خمیر اٹھایا گیا ہے۔''

''دین الٰہی قبول کر لو' دنیا کو تمہارے لیے جنت بنا دوں گا'' اکبر نے نیا جال پھینکا مگر یہ جال نہیں زہر میں بجھا ہوا تیر تھا جو دلا بھٹی کے دل میں ترازو ہو گیا۔ پابند سلاسل کر بھی کیا سکتا

Marfat.com

تھا۔ بے بسی کی حد ہوگئی۔ اچانک بھرے دربار میں اس نے حاکم وقت اکبر اعظم کو ننگی شرمناک گالیوں سے نوازنا شروع کیا۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو موردِ الزام ٹھہرایا اور مغل اعظم کی ولدیت کو مشکوک قرار دیا جس کی نتیجے میں اسے دار پر لٹکا دینے کا حکم ہوا۔ ۲۶ مارچ ۱۵۸۹ء لاہور محلہ نخاس موجودہ لنڈا بازار کے قریب نولکھا بازار میں غیرت کے مجسمے' عبداللہ بھٹی کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔

شاہ حسین جسے قانون کے محافظ تلاش کرتے کرتے تھک چکے تھے' پنجاب کی غیرت کے مجسمے کا آخری دیدار کرنے' جانے کدھر سے نکل آئے۔ ہمدردوں نے درویش کو اس ''تماشے'' میں شریک ہونے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی مگر شاہ موصوف نے اپنے مست الست لہجے میں کہا'' دیکھنا یہ ہے کہ دیوانہ کس دھج سے مقتل جاتا ہے' یہ تو بڑے ثواب کا کام ہے اور پھر دُلا تو ہمارا یار ہے۔ کیا ہم یار کو الوداع کہنے بھی نہ جائیں۔''

ادھر عبداللہ کو سولی پر لٹکایا گیا ادھر شاہ حسین نے جھوم جھوم کر رقص کا آغاز کیا اور ایسے میں ایسے اشعار پڑھے جو تا قیامت اصناف سخن میں سنگ میل کا مقام رکھتے ہیں' ملاحظہ فرمائیں۔

یا دلبر یا سر کر پیارا
دے دے لعل لباں دے لارے
سولی پر چڑھ لے ہلارے
آن ملیسی دلبر یارا
یا دلبر یا سر کر پیارا

(یار دلدار سے پیار کر یا سر کو عزیز رکھ۔ تیرے سامنے لبوں کی سرخی جلوہ دکھا رہی ہے' اسے حاصل کرنے کی خاطر سولی پر جھول جا۔ یار خود بخود مل جائے گا)

اسی مضمون کو فیض احمد فیض نے اس طرح بیان کیا۔

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

کوتوال شہر کی توجہ جب شاہ حسین کی طرف مبذول کروائی گئی تو وہ بڑا حیران ہوا۔ وہ دلا بھٹی سے فارغ ہو چکا تھا۔ جو کچھ مصلوب ہونے والے نے جان کا نذرانہ پیش کرنے سے پہلے

Marfat.com

کہا اور کیا' وہ تاریخ میں محفوظ ہو گیا مگر ملک علی کی مسرت کا ٹھکانا نہ رہا جب اس نے نئے شکار کو نظروں کے عین سامنے دیکھا۔ شہنشاہ کے سامنے اپنی کارگزاری دکھانے اور سرخرو ہونے کا یہ سنہری موقع تھا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ شاہ حسین کو گرفتار کر لیا جائے۔ پیادے قریب آئے تو درویش نے مسکرا کر انہیں اپنی حد میں رہنے کا مشورہ دیا۔ ''تم لوگ اس معاملے سے دور رہو' کوتوال کو اپنے دل کی حسرت نکال لینے دو۔ دیکھتے ہیں یہ بدبخت کس حد تک جا سکتا ہے'' سپاہی اتنے مرعوب ہوئے کہ وہ واقعی پیچھے ہٹ گئے۔ کوتوال یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی رعونت سے آگے بڑھا اور ایک سپاہی سے ہتھکڑی لے کر شاہ حسین کو پہنانے لگا۔ مگر دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ کوشش بسیار کے باوجود وہ کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ''ملزم'' نے مسکرا کر کوتوال کو دیکھا اور کہا ''چلو ایک کوشش اور کر دیکھو'' بےخبر کوتوال کو چاہیے تھا کہ سبق حاصل کرتا اور اس فعل بد سے باز رہتا مگر اس نے غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر ہتھکڑی پہنا دی۔ شاہ حسین نے آہنی زیور کو بغور دیکھا تو وہ تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔ ہتھکڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر گئی۔ کوتوال بڑا حیران ہوا مگر اپنی حرکت سے پھر بھی باز نہ آیا۔ قریب کھڑے سپاہی سے اس نے دوسری ہتھکڑی طلب کی اور شاہ حسین کو پہنا دی مگر اس نئے زیور کا بھی وہی حشر ہوا۔ ملک علی سرعام تماشا بن گیا۔ غضب سے اس کا رنگ دہکتے انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کیلئے لب کشائی کی کوشش کی تو شاہ حسین نے متنبہ کیا ''کوتوال! سوچ سمجھ کر بات کرنا' کہیں تمہاری قسمت فیصلہ نہ ہو جائے۔''

''اوئے جادوگر' تو سمجھتا ہے' میں تیرے چمتکار سے مرعوب ہو جاؤں گا'' کوتوال نے گرج کر کہا ''میں تیری پیٹھ میں لوہے کی میخ ٹھونک دوں گا۔''

''او بدبخت' یہ تو نے کیا کہہ دیا'' شاہ حسین نے پُرتاسف لہجے میں کہا ''تو نے اپنی سزا کا خود اعلان کر دیا' حالانکہ اس فقیر نے تجھے منع بھی کیا تھا مگر شاید لوح محفوظ پر یہی لکھا تھا' اب کچھ نہیں ہو سکتا' شاہ حسین کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ تماشائیوں کو سانپ سونگھ گیا۔ خود ملک علی دھک سے رہ گیا۔ شاہ حسین جدھر سے آئے تھے اُدھر لوٹ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ساری دنیا نے دیکھا' چشم فلک بھی ورطہ حیرت میں ڈوب گئی۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ دلا بھٹی نے بھرے بازار میں ''مغل اعظم'' کو کھری کھری سنائی تھیں۔ شہنشاہ نے ''جرم وفا'' کی پاداش میں اسے دار کے حوالے کرنے کے ساتھ یہ ہدایت بھی جاری فرمائی تھی کہ مصلوب ہونے اور کئے جانے کی مکمل روداد تحریراً دربار اکبری میں پیش کی

Marfat.com

جائے۔یعنی ایک ایک پل کی مکمل رپورٹ، عوام الناس کا ردِ عمل اور مجرم کی کیفیت وغیرہ وغیرہ ۔جب عبداللہ بھٹی کو پھندا پہنایا جانے لگا تو اس نے اکبر اعظم اور اس کے خاندان کی شان میں ایسے ایسے کلمات ادا کئے ایسی شرمناک اور غلیظ گالیوں سے نوازا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ دلا بھٹی کو بخوبی علم تھا کہ مقتل سے آگے کوئی راستہ نہیں اور شہنشاہ جان لینے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ دنیاوی سازوسامان پر ملکیت جتانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان صرف ایک حد تک جا سکتا ہے ہر چیز اس کے بس میں نہیں ہوتی مثلاً

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
ہوا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم

لہٰذا مصلوب ہونے سے پیشتر اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور خوب نکالی۔ ادھر کوتوال کی بدبختی ملاحظہ ہو کہ اس نے ساری رُوداد من وعن، ایک ایک گالی، ایک ایک الزام، شاہ کا ایک ایک گناہ جو کچھ عبداللہ بھٹی کی زبان سے ادا ہوا لکھ کر دربار اکبری میں پیش کر دیا۔ جب یہ خرافات کا پلندہ بھرے دربار میں پڑھ کر سنایا گیا تو درباریوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ پڑھنے والے کی زبان لڑکھڑانے لگی اور ٹانگوں پر رعشہ طاری ہو گیا۔ ادھر مغل اعظم اچھل کر کھڑا ہو گیا'' اس نابکار کوتوال کی یہ جرات؟ یہ ہمت؟ دربار اکبری کے وقار کا ذرہ برابر پاس نہ لحاظ۔ کس نااہل نے اسے کوتوال کے مقام پر فائز کیا؟'' مغل شہنشاہ زخمی شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا۔ دلا بھٹی تو اس کے قبضہ قدرت سے نکل چکا تھا۔ قہر شاہی کا ہدف کوتوال ہوا'' اس نابکار کی پیٹھ میں ابھی اسی وقت لوہے کی میخ گاڑ دو تا کہ دنیا کو عبرت حاصل ہو اور ہر پل ہر سانس لوگ جلال اکبری کو یاد رکھیں'' یہ کہہ کر مغل بادشاہ دربار سے اٹھ گیا۔ فرمان شاہی پر حرف بہ حرف عمل کی گیا۔ شاہ حسین نے کہا تھا'' بدبخت تو نے اپنی سزا کا خود اعلان کر دیا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

تاریخ سے شغف رکھنے والوں کو یاد ہو گا کہ فرعون کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کے ہر خاندان میں سے پہلوٹھی کے اولاد نرینہ کے قتل کا حکم دے دیا تھا اور یہ اس کی اپنی سزا کا اعلان ثابت ہوا۔ ملک علی کوتوال شہر اپنے انجام کو پہنچا تو مغل شہنشاہ کو شاہ حسین کی پیش گوئی سے مطلع کیا گیا۔ وہ خود حیران و ششدر رہ گیا۔ بہرحال اس نے پیش گوئی کی تکمیل میں

Marfat.com

اہم کردار ادا کیا تھا۔اس نے شاہ حسین کو دربار اکبری میں حاضر ہونے کا حکم جاری کر دیا۔بات وہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو منوانے کی خاطر عجیب و غریب قسم کی مخبوط الحواسیوں کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اس پر نازاں بھی ہوتا ہے۔

شاہ حسین کا معمول وہی تھا سرخ کپڑے' رقص و سرور' سرے عام مے نوشی' داڑھی صاف' شریعت کے جملہ احکام طاق نسیاں ہو کر رہ گئے تھے لیکن ایک بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ طوق رسوائی گلے میں سجائے' اس شخص کی راتیں کیسے بسر ہوتی ہیں۔روز روشن میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب کے سامنے تھا اور جو کچھ سامنے تھا وہ قابل عبرت حد تک رندانہ تھا۔اسی زمانے میں شاہ حسین کا مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری سے ٹکراؤ ہوا۔

ملا عبداللہ سلطان پوری عہدِ اکبر کا عالم بے مثال' معقولات معروفہ کا ماہر' صرف ونحو' معانی ومنطق میں دانا' علم ریاضی' ہیت حکمت میں مہارت تامہ رکھنے والا' فقہ' تفسیر اور علم حدیث میں یکتا' دلائل و براہان کے دقیق مسائل کو چٹکی بجا کر حل کرنے والا شخص تھا۔ان صفات و خصوصیات کی بنا پر مغل شہنشاہ نے اسے ہندوستان کے مخدوم الملک کے عہدہ جلیلہ پر فائز کر رکھا تھا ۔ملا موصوف خلاف شریعت سرزد ہونے والے افعال کا بڑی سختی سے محاسبہ کیا کرتا تھا اور ملزم کو پل بھر میں مجرم ثابت کر کے فوراً سزا سنا دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔غیر شرعی حرکات کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے ملا موصوف کا وجود دہشت سے کم نہ تھا' ظاہر ہے شاہ حسین کے معاملے میں ایسی شخصیت آخر کب تک خاموش رہ سکتی تھی۔مخدوم الملک کی لاہور میں آمد ہوئی تو اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا ''فوراً اس نام نہاد درویش کو پکڑ کر حاضر کیا جائے'' درویش کو خبر ہوئی تو وہ علم کے سمندر سے مرعوب تو نہ ہوا مگر برضا و رغبت کارندوں کے ہمراہ ہولیا۔ہیئت کذائی میں البتہ کوئی تبدیلی نہ کی' صراحی اور جام کے ہمراہ عالم بے بدل کی عدالت میں رقص کرتا اور عشق و عاشقی کے گیت گاتا حاضر ہو گیا۔مخدوم الملک نے دیکھتے ہی استغفراللہ اور لاحول...... پڑھا پھر آتشِ غیظ و غضب میں سیخ پا ہو کر پوچھا ''یہ کیسی درویشی ہے؟ یہ جام و سبو شراب نوشی' ڈاڑھی کا صفایا' رقص و سرور' کون سی شریعت کی اتباع کر رہے ہو؟'' مخدوم الملک نے تادیبی کوڑا رسید کیا۔

''محترم' سوئے ظن سے اجتناب کریں کیوں کہ یہ اثم بھی اور عدوان بھی'' شاہ حسین نے قرآنی آیات کی طرف اشارہ کیا جس میں بدگمانی سے پرہیز کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ یہ گناہ بھی ہے اور زیادتی بھی۔

Marfat.com

سوئے ظن یعنی بدگمانی'' مخدوم الملک نے استہزائیہ لہجے میں دہرایا'' آنکھوں کی شہادت سے بڑھ کر بھی کوئی شہادت ہے؟'' عالم بے بدل نے درویش کو علم کلام کے خارزار میں گھسیٹنا چاہا۔

''بالکل ہے'' درویش نے بڑے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔'' اگر شہادت معتبر ہوتی تو بن دیکھے ایمان لانے کی تلقین نہ کی جاتی' آنکھوں کی گواہی نہائیت جھوٹی اور نا قابل اعتبار ہے'' یہ ایک ایسا مدلل جواب تھا کہ مخدوم الملک چاروں شانے چت ہو گیا۔

''تمہارا مطلب ہے میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں'' مخدوم الملک نے جز بز ہو کر کہا۔

''تمہارے پاس دیکھنے والی آنکھ ہی نہیں ورنہ تم میرے اندر جھانک کر دیکھ سکتے تھے ''شاہ حسین نے سنجیدگی سے کہا'' میرے ظاہر پر مت جاؤ تم عالم ہو اس لیے علم کے احترام میں' میں صرف تنبیہہ کر رہا ہوں۔''

''اس صراحی میں کیا ہے؟'' مخدوم الملک نے نیا سوال کیا۔

''چکھ کر دیکھ لو' شاہ حسین نے جام بھر کر ملا عبداللہ سلطان پوری مخدوم الملک کو پیش کیا ۔ملا بدک کر پیچھے ہٹ گیا مگر شاہ حسین مسکرا کر کہا'' پی کر دیکھو زبان ناپاک ہوئی تو سزا کا حقدار ٹھہرانا'' مخدوم الملک اس جھانسے میں آ گیا۔ وہ تو شریعت کی حد نافذ کرنا چاہتا تھا اور مجرم خود زیر دام آ رہا تھا۔ لہٰذا اس نے درویش کے ہاتھ سے جام لے کر ایک گھونٹ بھرا۔ عرق گلاب کا ذائقہ تھا مگر شیریں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شاہ حسین نے جام لے کر دوبارہ اسی صراحی سے بھر کر پیش کیا'' یہ دیکھیں کیا چیز ہے؟''

مخدوم الملک نے چکھا تو حیران رہ گیا۔ اس بار ذائقہ خالص شکر کے شربت کا تھا پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ اسی صراحی سے سات بار جام بھرا گیا۔ ذائقہ ہر بار مختلف تھا۔ خالص پانی' شکر کا شربت' سرکہ' قہوہ' چائے' عرق گلاب اور خالص دودھ۔

''درویش' یہ کیا راز ہے؟'' ملا سلطان پوری کا لہجہ یکسر بدل گیا'' کیا یہی شراب پی کر تم مست الست پھرتے رہتے ہو؟''

''ان تمام مشروبات کی اصل ایک ہے'' درویش نے وضاحت پیش کی'' اور یہی توحید ہے'' ایک موحد' دوئی کو مانتا ہے نہ تقلید کو یعنی ذائقہ تو ادراک کا تابع ہے اور میرا ادراک دوسرے کی

Marfat.com

تقلید بھی تسلیم نہیں کرتا اب دینی اعتبار سے جو جائز ہے تو کر گزر' شاہ حسین یہ کہہ کر مخدوم الملک کی عدالت سے نکل گئے مگر قاضی تادیر سرنگوں اپنے خیالات میں گم رہا۔ سر اٹھایا تو اس نے برملا کہا ''حسین نیک و بد کی اصل پہچان گیا ہے۔ خدا کا درویش جو کر رہا ہے وہ ناروا نہیں' یہ باہر سے زندیق مگر اندر سے مومن ہے۔''

اسی ٹکراؤ کو داراشکوہ نے ''حسنات العارفین'' میں ایک دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے۔ متن ملاحظہ فرمائیں۔

''مخدوم الملک' شاہ حسین کو سزا دینے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا' سر بازار دونوں کا ٹکراؤ ہو گیا تو شاہ حسین نے سوار کی لگام تھام لی ''اسلام کے پانچ ارکان ہیں'' درویش نے کہا ''توحید میں ہم دونوں برابر ہیں' حج اور زکوٰۃ تو نے چھوڑ رکھے ہیں اور نماز روزہ میں نے پھر سزا کا مستحق کیسے ہو گیا؟'' زکوٰۃ والا اشارہ بہت گہرا تھا جو صرف مخدوم الملک ہی سمجھ سکتا تھا۔ اصل صورت حال کی وضاحت مخدوم کی وفات ۹۹۱ھ کے بعد ہوئی جب اس کے گھر سے مصنوعی قبر میں دفن کیا ہوا سونا چاندی دریافت ہوا جس کی مالیت اس زمانے میں تین کروڑ روپے تھی۔ سر بازار مخدوم الملک کو لاجواب کر دینا صرف درویش شاہ حسین ہی کا نام تھا۔

اس ٹکراؤ کی گونج بھی دربار اکبری تک پہنچی۔ وہ ملا عبداللہ سلطان پوری کی ذہنی شکست کا سن کر ورطہ حیرت میں ڈوب گیا۔ سب اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ مخدوم الملک کو گفتگو میں لاجواب کرنا انسانی بس میں نہیں۔ اکبر بادشاہ' درویش کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم تو صادر کر چکا تھا مگر فکر یہ دامن گیر تھی کہ وہ شاہ حسین کا سامنا کیسے کرے گا۔ اس نے اپنے ایک خاص کارندے کو حکم دیا کہ وہ شاہ حسین کے ڈیرے پر جائے اور شریعت کی حد نافذ کرنے کی بحث چھیڑ کر صحیح صورت حال کا اندازہ لگائے۔ شہنشاہ وقت کا کارندہ شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار نکلا۔ اس نے جاتے ہی بڑے پُرغرور لہجے میں کہا ''شریعت میں داڑھی منڈوانا کہاں مرقوم ہے؟'' کیوں نہ اس جرم کی پاداش میں تمہیں زندان میں ڈال دیا جائے۔''

شاہ حسین فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئے اور بڑی رسان سے کہنے لگے ''بھائی' میں کب داڑھی منڈواتا ہوں' آپ حضرات کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''تو گویا آپ دروغ گوئی کے مرتکب بھی ہو رہے ہیں۔'' کارندہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ ''میں ابھی آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔''

Marfat.com

''خدا کے بندے' بات تو سنو' میری بات کا یقین کرو۔ میں نے شرع کے عین مطابق ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے' لو دیکھ لو' یہ کہہ کر درویش نے منڈھی ہوئی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور اسے کھینچ کر دراز کر دیا۔ یہ دیکھ کر کارندے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوا تھا۔ شاہ حسین کے چہرے پر جہاں پہلے کچھ بھی نہیں' اب شرع کے عین مطابق ''ریش مبارک'' موجود تھی۔

''اتنی لمبی ڈاڑھی کافی ہے یا اور ہونی چاہیے؟'' اللہ کے فقیر نے بغیر کسی استہزا کے پوچھا۔

''حضور! میری تقصیر معاف فرمائیں۔ میں آپ کے مقام سے آگاہ نہیں تھا'' وہ کارندہ درویش کے پاؤں میں گر گیا۔ (حقیقت الفقراء از محمد پیر میں کارندے کی جگہ دربار اکبری کا ''وزیر'' لکھا ہے متن میں کوئی فرق نہیں)

شہنشاہ اکبر کے فرستادے نے حقیقت حال گوش گزار کی تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ ملک علی کوتوال بھی شاہ حسین کو گرفتار کرنے میں ناکام رہا تھا بلکہ اس کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مخدوم الملک اپنی تمام تر علمیت سمیت لاجواب ہو گیا تھا۔ ادھر یہ فرستادہ عجیب و غریب بلکہ ناقابل فہم قسم کی ''کہانی'' سنا رہا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر حاکم وقت کا اشتیاق دوچند ہو گیا مگر برا ہو نشہ حکمرانی کا وہ جوں کا توں تھا۔ حکام ادنیٰ و اعلیٰ کو فرمان جاری ہوا ''شاہ حسین کو فوراً حالت رندی میں پیش کیا جائے' ما بدولت خود معاملے کی تہ تک پہنچنے کے خواہش مند ہیں۔'' اس فرمان نے حکام بالا و اعلیٰ کو مصیبت میں ڈال دیا۔ ایک طرف جلال اکبری تھا تو وہ دوسری طرف قہر شاہ حسین۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ شاہ حسین نے اپنے ہر کردار میں اپنی عظمت ہر خاص و عام سے تسلیم کرائی تھی۔ پہلے اپنے زہد و تقویٰ کے باعث لوگوں سے احترام کرایا' حالت رندی میں خرق عادت واقعات سے ان کی ذات کے گرد خوف و احترام کا ایک غیر مرئی ہالہ معرض وجود میں آ چکا تھا۔ کوچہ و بازار میں ایک ہی موضوع زیر بحث تھا ''ذات حسین۔'' اب ایسی شخصیت کی گرفتاری میں خطرے بھی تھے اور وسوسے بھی مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ شاہ حسین بہ آسانی نہ صرف دستیاب ہو گئے بلکہ دربار شاہی میں جانے کے لیے برضا و رغبت تیار بھی ہو گئے۔ بس تھوڑی سی بحث و تمحیص ہوئی۔ درویش نے بڑی نرم زبان اور لہجے میں کہا ''درویش اور دربار شاہی' دریا کے دو کنارے ہوتے ہیں۔ بہتر ہے مجھے دربار میں جانے پر مجبور نہ کرو۔''

مگر سپاہیوں نے بصد احترام اپنی مجبوری بیان کی ''حضور! آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا

Marfat.com

مگر ہمارا سب کچھ بگڑ جائے گا'' یہ سنتے ہی شاہ حسین اپنے سامانِ عیش وعشرت کے ساتھ اپنے خاص اندازِ دلربائی میں کارندوں کے ساتھ ہو لئے۔ان کے ہم پیالہ وہم نوالہ حضرات بھی دربار میں حاضر ہوئے۔کسی نے آلاتِ غنا اٹھا رکھے تھے' کسی نے پاس جام و مینا۔عجیب شانِ رندانہ سے یہ گروہ شاہ حسین کے جلو میں داخل دربار ہوا۔مغل بادشاہ کو تمام حالات سے مکمل آگاہی تھی۔اس نے درباری جی حضوریوں سے دریافت کیا ''کون سے دین دھرم اور کون سے مسلک میں یہ چنگ ورباب' سرعام شراب نوشی' فسق وفجور وغیرہ کی اجازت ہے؟ یہ تو کفر والحاد کی باتیں ہیں۔''

پیشتر اس کے کہ درباری لب کشادہ ہوں شاہ حسین نے خود گفتگو کا آغاز کیا۔

باطن اہل فقر راست یقیں
چہ شناسند قوم ظاہر بیں

''اہل فقر کی راست باز نگاہیں اندر کا حال جان لیتی ہیں۔ظاہر دیکھنے والی نگاہ کی رسائی وہاں تک نہیں ہو پاتی لہٰذا آنکھ کی گواہی نا معتبر ہے۔آنکھ تو بڑی دغا باز اور فریبی ہے۔جن اشیا کا تعلق ہماری ظاہری زندگی سے نہیں ان کو یہ بالکل نظر انداز کر دیتی ہے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ آنکھ سامنے والی شے کو نظر انداز کر دے'' حکمران وقت نے بزعم خود بڑی گہری بات کی۔

''تمام الہامی کتب سے ''تخلیقات لطیف'' کا وجود ثابت ہوتا ہے۔مثلاً جنات وغیرہ آنکھ کے مشاہدہ نہ کر سکنے کی بناء پر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ہزاروں اشیا ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں مگر وہ ہمارے گرد و پیش موجود ہیں تو کیا ایسی صورت میں ان کی نفی کر دی جائے گی؟ کیا یہ پرلے درجے کی جہالت نہ ہوگی؟'' شاہ حسین کا لہجہ ایسا تھا جیسے کوئی بزرگ بچوں کو ابتدائی باتیں سمجھا رہا ہو۔''باقی رہی آنکھ کی گواہی تو چاندرات میں اشیا کا رنگ وروپ چمکتے آفتاب میں مختلف کیوں ہوتا ہے' کیا اشیا کی ''ذات'' بدل جاتی ہے؟ ہرگز نہیں' تو پھر صفات کیوں بدل جاتی ہیں؟ صرف اور صرف نا معتبر گواہی کی بناء پر۔''

بات شہنشاہ اور اس کے درباری جی حضوریوں کی سمجھ میں آ چکی تھی مگر دنیاوی جاہ وجلال تسلیم حقیقت میں مانع تھا۔بھلا ایک بے سروسامان فقیر' فہم وفراست میں شہنشاہ کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا۔یہ بات ہمیشہ سچ رہی ہے اور رہے گی کہ خواہ حاکم کے گنبد سر میں عقل کے بجائے بھس بھرا ہوا ہو' وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے اور کبھی غلط نہیں ہوتا یہی تاریخ انسانی کا المیہ رہا ہے اور یہ اس سے بھی بڑا سچ

Marfat.com

ہے کہ سچائی جب جھک نہ سکے تو اس کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔

''شاہ حسین' تم اور یہ تمہارے حواری کھلے عام شراب نوشی کرتے پھر رہے ہیں اور تم ہمیں الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم لوگ پاکیزہ مشروب نوش جاں فرماتے ہو'' مغل شہنشاہ نے جھنجھلا کر کہا۔

''چند روز کی بادشاہت کے مالک' کون کہتا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں'' شاہ حسین نے بے خوف لہجے میں کہا'' پوچھ اپنے مخدوم الملک سے' وہ سامنے بیٹھا ہے' میری شراب کی ماہیت کیا تھی؟'' درویش نے صراحی میں جام بھرا'' تو بادشاہ ہے اور یقیناً شراب کے ذائقے سے آشنا بھی' لے چکھ میری شراب' مخدوم الملک نے سات بار آزمایا تو آٹھ بار آزما دیکھ۔''

درویش نے جام اکبر کو پیش کیا۔ سیال شے کا رنگ وروپ بنت عنب جیسا تھا مگر جب شہنشاہ نے تجسس سے مجبور ہو کر جام ہونٹوں سے لگایا تو بے ساختہ پکار اٹھا'' یہ تو صاف شفاف پانی ہے'' اب شہنشاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی'' اسی صراحی میں سے ایک جام اور پیش کیا جائے مابدولت بنفس نفیس اس تجربے سے گزرنا چاہتے ہیں۔''

شاہ حسین نے صراحی میں سے قلیل مقدار میں مشروب جام میں انڈیلا اور مغل شہنشاہ کو پیش کیا۔ اب مشروب کا نہ صرف ذائقہ بدل چکا تھا بلکہ رنگت بھی یکسر تبدیل ہو چکی تھی' وہ خالص دودھ بن چکا تھا۔ بادشاہ حیرت میں ڈوب کر ابھرا نہ تھا کہ شاہ حسین نے تیسرا جام پیش کیا' چکھا گیا تو وہ نہایت خوشبودار صندل کا شربت نکلا۔ اس طرح آٹھ جام پیش کیے گئے۔ ہر جام ذائقے' خوشبو اور رنگت میں مختلف نکلا اور خاص بات یہ کہ کوئی ایک بھی نشیلا نہیں تھا۔ شہنشاہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا'' درویش'' ایک صراحی میں آٹھ مختلف ذائقے اور رنگ کیسے سما گئے جو تیرے اختیار میں ہیں؟''

شاہ حسین نے جواب دیا۔

گفت گبراز ازیں ویچ مپرس

وحدت فقر بیں ویچ مپرس

(اس بات کو نظر انداز کر جا اور کچھ مت پوچھ' فقر کی وحدت کا نظارہ کر بغیر کسی سوال کے)

بھرے دربار پر سناٹا تھا۔ بادشاہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا کرتا تھا۔ اس بار سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا مگر وہ حاکم ہی کیا جو ہٹ دھرم نہ ہو۔ اسے ہی'' راج

Marfat.com

ہٹ'' کہتے ہیں۔ شاہ حسین تو بھرے دربار کو حیران ششدر چھوڑ کر اپنی راہ ہو لیے۔ شہنشاہ راج سنگھاسن پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے گرج کر حکم دیا ''یہ دربار اکبری کی توہین ہے۔ فقیر کو روک لیا جائے۔''

شاہ حسین زیب لب مسکرائے اور خود پلٹ کر تختِ اکبری کے سامنے آ کھڑے ہوئے

''مشروب کے ذائقے اور رنگ تبدیل کرنا' کیا یہی ''چمتکار'' ہیں درویش کے قبضہ قدرت میں؟'' شہنشاہ نے تمسخر اڑایا''۔ یہی چالاکی تو نے مخدوم الملک کو دکھائی' میں اس مکرو فریب میں آنے والا نہیں' کوئی کرامت ہے تو پیش کرو ورنہ''......!'' کچھ سوچ کر اکبر خاموش ہو گیا۔ شاید اسے کوتوال شہر' ملک علی کا انجام یاد آ گیا یا وہ تجسس برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

''بادشاہ! ضد نہ کر رسوائی سے دامن بچا اور مجھے جانے دے'' شاہ حسین نے بڑی نرمی سے سمجھایا۔ ''کرامت کا ظہور حق تعالٰی کی رضا سے ہوتا ہے فقرا کی مرضی پر منحصر نہیں ہوتا'' درویش کی گفتگو بے سود ثابت ہوئی اور شہنشاہ نے حکم صادر فرمادیا ''شاہ حسین کو زندان میں ڈال دیا جائے اور در زنداں اس وقت تک نہ کھولا جائے جب تک یہ نئی کرامت دکھانے پر راضی نہ ہو جائے۔'' عجیب واہیات صورت حال تھی۔ درویش مسکرا رہا تھا اور شہنشاہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اس طرح شاہ حسین کو قید خانے میں ڈال دیا گیا اور زندان کے گرد سخت پہرے کا انتظام کر دیا گیا۔ یہ کارنامہ سر انجام دے کر مغل شہنشاہ مکروہات زمانہ میں مشغول ہو گیا۔ شام کو دربار برخواست ہوا۔ رات گئے اکبر اعظم جب حرم میں داخل ہوا تو حیرت اس کی منتظر تھی۔ شاہ حسین حرم سرا کی نازنینوں کے جھرمٹ میں راجا اندر بنے بیٹھے ہیں اور عشوہ طراز حسینائیں ناز و ادا سے دلربائی میں مصروف ہیں۔ بادشاہ کا رنگ فق ہو گیا ''یہ فریب نظر ہے'' اس نے سوچا ''درویش اس حد تک نہیں جا سکتا'' پھر اسے شاہ حسین کی دربار والی تقریر یاد آئی ''آنکھ کی شہادت نامعتبر ہے'' بادشاہ مضطرب تھا' حیران و پریشان تھا اور پشیمان بھی۔ وہ الٹے پاؤں واپس ہوا' داروغہ زندان کو طلب کیا پھر خود بنفس نفیس بندی خانے کا معائنہ کرنے تشریف لے گئے۔ سارے قفل جوں کے توں لگے ہوئے تھے۔ زندان کے قریب پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ قفل کھولے گئے در زنداں وا ہوا مگر خالی کمرہ سب کا منہ چڑا رہا تھا ''قیدی آزاد ہو گیا مگر کیسے؟'' یہی ایک سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

''قیدی کو فوراً شہر میں تلاش کیا جائے اور پابجولاں حاضر کیا جائے'' یہ حکم دے کر شہنشاہ محل کو لوٹ گیا مگر حرام سرا میں جانے کی اس میں سکت نہ تھی۔ سارا معاملہ اس کی سمجھ سے بالاتر

Marfat.com

ثابت ہو رہا تھا۔ کسی کو ''شریکِ غم'' کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ بات ہونٹوں تک آ آ کر رک جاتی تھی۔ کسی کو خبر ہو جاتی تو غیرت تیمور کا جنازہ نکل جاتا۔ سارے شہر میں پیادے گشت کر رہے تھے۔ گوشہ گوشہ چھان مارا گیا مگر گوہرِ مقصود ہاتھ آنا تھا نہ آیا۔

نصف شب کے قریب بادشاہ حرام سرا میں داخل ہوا تو شاہ حسین ایک ستون کی آڑ میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ شہنشاہ اکبر ٹکٹکی باندھے درویش کو دیکھنے لگا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی پھر بھی پوچھے بغیر نہ رہ سکا ''درویش یہ...... یہ کیا معاملہ ہے؟''

''تو کرامت دیکھنے کا شوقین تھا۔ کیا مزید رسوا ہونا چاہتا ہے؟'' دونوں مہر بہ لب ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مہرِ سکوت پھر شاہ حسین نے توڑا ''میں تجھے کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا پھر تو مجھے کیوں تنگ کر رہا ہے؟ فقیر کا تیرے دربار سے کوئی تعلق واسطہ نہیں دوسرے میرے اعمال کا حشر میں، تو ذمے دار نہیں، نامہ اعمال سیاہ ہوگا تو میرا، جواب دہ میں ہوں گا۔ لوح محفوظ پر جو لکھا ہے اسے ہونے دے اور میرے راستے سے ہٹ جا۔ آئندہ مجھے دربار میں طلب کیا یا مجھ سے کرامت کی فرمائش کی تو رسوا ہو جائے گا اور یہ رسوائی سرِ عام ہوگی''، مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر ندامت سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پشیمان اس لیے تھا کہ شاہ حسین نے رسوائی والی بات بھرے دربار میں کہی تھی۔ مگر عقل سے پیدل بادشاہ کی سمجھ میں نہ آ سکی تھی اور عرق ندامت چھلنے والی صرف شان کریمی تھی جس کی رضا کے خلاف وہ عمل پیرا ہوا تھا۔ شاہ حسین بادشاہ کو اس کیفیت میں مبتلا چھوڑ کر حرم سرا سے نکل گئے۔ اب شہنشاہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خواجہ سراؤں کو درویش کی گرفتاری کا حکم دیتا۔ جب اس کے بنائے ہوئے زنداں کی چار دیواری ہی بے وفا ثابت ہوئی تھی اب وہ ہوا کے قلعے میں تو فقیر کو مقید کرنے سے رہا۔

دوسرے روز بادشاہ نے اپنی الجھن اپنے وزیر باتدبیر ابوالفضل سے بیان کی اور رات والا قصہ مناسب الفاظ میں اسے سنایا۔ ابوالفضل نے کہا ''سچا درویش حقیقت توحید سے آگاہ ہو جانے کے بعد ایسی صفات کا حامل ہو جاتا ہے جو احاطہ عقل سے باہر ہوتی ہیں اور وہ خرقِ عادت اعمال پر قادر ہو جاتا ہے۔ یہ مقام بے حد دشوار ہے مگر ناممکنات میں سے نہیں۔''

''مگر گناہ تو ہر حالت میں گناہ ہے''، مغل شہنشاہ نے نئی الجھن پیش کی۔

''فقرا اسے گناہ و ثواب کی دوئی کہتے ہیں، ان کے خیال میں، یہ دوئی بھی ناروا ہے مگر اصل بات یہی ہے کہ سچا درویش گناہ کا مرتکب نہیں ہو رہا ہوتا وہ گناہ کی اداکاری کر رہا ہوتا ہے جیسے

Marfat.com

حضور نے خود ملاحظہ فرمایا کہ شاہ حسین کا مشروب نشے سے پاک تھا۔"

بادشاہ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ نہیں' اس کے متعلق تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ کوتوال شہر ملک مخدوم الملک والے واقعات اور اپنی "آپ بیتی" کے پیش نظر اس کے دل پر شاہ حسین کی ہیبت طاری ہو گئی جسے اس نے "احترام" کا نام دیا اور پھر کبھی اسے دربار میں طلب نہیں کیا اور نہ وہ "مصلحت" کے پیش نظر دربار درویش میں حاضر ہوا۔ لوگوں میں یہی مشہور تھا کہ مغل شہنشاہ اکبر' شاہ حسین کا معتقد ہے۔ یہ بات بھی مستند ہے کہ اکثر مہمات کو سر کرنے سے پہلے اکبر بادشاہ نے شاہ حسین سے "دعا" کی درخواست ضرور کی۔

عوام الناس تو شاہوں کے "دین" پر ہوتے ہیں۔ شہنشاہ کے رجحان طبع کے پیش نظر درباری بھی شاہ حسین کے دم بھرنے لگے' کچھ صدق دل سے اور کچھ خوشنودی شاہ کی خاطر۔ شہزادہ سلیم تو فی الحقیقت شاہ حسین کا والہ و شیدا تھا۔ اس نے درویش کے فرمودات کو قلم بند کرنے کی خاطر اپنا ایک انشا پرداز مقرر کر دیا جس کا نام بہار خاں تھا۔ وہ ہر وقت شاہ حسین کی خدمت میں حاضر رہتا اور مختلف مواقع پر درویش کی زبان سے ادا ہونے والے کلمات کو سپرد قلم کر لیتا۔ یہی فرمودات بعد میں "بہاریہ" نامی کتاب کی شکل میں اشاعت پزیر ہوئے۔ مغل شہنشاہ اکبر نے بعد میں ایسے احکامات جاری کیے جن سے شاہ حسین کی قدر و منزلت میں (بزعم خود) اضافہ کیا مگر اس کے باوجود درویش کبھی دربار میں حاضر نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ شہزادہ مراد اور دانیال بھی حلقہ عقیدت میں شامل ہو گئے۔ حرم کی اکثر خواتین بھی ارادت مندی میں کسی سے کم نہ تھیں۔ وزراء و امراء میں شیخ ابوالفضل' خواجہ دولت خاں' شیخ عبدالرحمان' "خان خاناں مرزا عبدالرحیم' خان اعظم آصف خاں' جعفر بیگ زین خاں کوکلتاس (ترکی زبان میں کلتاش بمعنی شاہ کا دودھ شریک بھائی) شہباز خاں کنبوہ اور فلک موسیقی کا آفتاب تان سین ارادت اور عقیدت شاہ حسین میں سرفہرست ہیں۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں جن حالات میں حلقہ بگوش عقیدت ہوا اس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

مرزا موصوف' بیرم خان کا قابل صد افتخار فرزند ۱۵۵۶ء لاہور میں پیدا ہوا۔ ہوا۔ اس طرح شاہ حسین اور عبدالرحیم خان خاناں دونوں لاہوری تھے۔ اسی سن میں اکبر نے ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالی۔ عہد اکبری میں مغلیہ سلطنت کو استقامت بخشنے والی شخصیت بیرم خاں کی ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر کے ابتدائی دور میں بیرم خان نے جو خدمات سرانجام دیں وہ تاریخ

Marfat.com

کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ اکبر کے بھائیوں' چچاؤں کی بغاوتیں ہمو بقال سے جنگ' ان تمام مشکلات پر اکبر نے بیرم خاں کی مدد سے ہی قابو پایا۔ اس کے علاوہ مغل شہنشاہ اکبر سے بیرم خاں کا ایک اور رشتہ بھی تھا۔ اکبر اعظم کا باپ نصیر الدین ہمایوں کی ایک میواتی سردار کی صاحب زادی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا اسی سردار کی دوسری صاحب زادی' بیرم خاں کے عقد میں آئی اس طرح دونوں ہم زلف ٹھہرے۔ بیرم خاں فوت ہوا تو اس کا لخت جگر عبدالرحیم خان خاناں صرف چار برس کا بچہ تھا اس طرح مرزا موصوف کی پرورش اکبر کی زیر سرپرستی شاہی محل میں ہوئی۔ لہٰذا مرزا موصوف اپنے باپ کی طرح اکبر کا قابل اعتماد اور وفادار سپہ سالار ثابت ہوا۔ اس کی شادی بھی خان اعظم کوکا خان کی بیٹی ماہ بانو سے ہوئی۔ عبدالرحیم خان خاناں کا اصل عروج دکن کی مہمات سر کرنے کے بعد ہوا۔ سلطان مظفر گجراتی کو بھی عبدالرحیم خان خاناں ہی نے شکست دی اور پنج ہزاری منصب کے علاوہ ''خان خاناں'' کا خطاب حاصل کیا۔

مغل شہنشاہ اکبر ہر حیلے وسیلے سے سندھ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ تو یقیناً ملک گیری کی ہوس تھی مگر اس کے علاوہ بھی سندھ میں اکبر کی دلچسپی کی تین بڑی وجوہات قرار دی جاسکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ اسی سرزمین پر بمقام امرکوٹ پیدا ہوا۔ اس زمانے میں مغل شہنشاہ ہمایوں دربدر اور خاک بسر ہو رہا تھا۔ ستارے گردش میں تھے' حالات کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نومولود اکبر کے لیے جو لباس تیار کیا گیا وہ سید علی ثانی ایک درباری کے استعمال شدہ لباس سے بنایا گیا۔ اس بات کو اکبر کبھی فراموش نہ کرسکا۔ سرزمین سندھ میں دلچسپی کی وجہ وہاں کے مقامی حکمران کا ناپسندیدہ رویہ تھا اور تیسری وجہ غیر ملکی فرنگیوں یعنی پرتگیزوں کی سندھ میں مداخلت تھی۔ یہ آخری دو وجوہات تفصیل طلب ہیں۔

۱۵۵۵ء یعنی مغل شہنشاہ اکبر کے تخت نشین ہونے سے ایک برس پیشتر عیسیٰ خان ترخان ٹھٹھ کا حکمران بنا۔ یہ ایک بیدار حکمران تھا جو ہر حکمران کی طرح ملک گیری کی ہوس میں مبتلا تھا۔ چنانچہ جن دنوں اکبر اپنے ابتدائی دور کی مشکلات پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ حکام ٹھٹھہ نے اپنے جوشیلے بیٹے مرزا باقی خاں کے ساتھ مل کر بھکر کا محاصرہ کرلیا۔ ہند میں رفتہ رفتہ مستحکم ہونے والی مغلیہ سلطنت کو وہ تشویش کی نگاہ سے دیکھتا تھا لہٰذا مورخین کے بقول اس نے بیرونی طاقت پرتگیزوں سے ساز باز کر رکھی تھی۔ پرتگیزی فوج ''برتیو'' نامی کمانڈر کے زیر سرکردگی 'لاہری بندر عبور کرکے ٹھٹھہ پہنچی۔ یہاں سنہری موقع ان کا منتظر تھا یعنی شہر میں نہ حکمران تھا نہ

Marfat.com

فوج۔ نہتے شہریوں کو دیکھ کر پرتگیزی فوج کی نیت خراب ہوگئی اور گلی کوچوں میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔عیسیٰ ترخان کو خبر ہوئی تو وہ بھکر کو ادھورا چھوڑ کر ٹھٹھہ پہنچا مگر پرتگیزی لٹیرے اپنا کردار بخوبی ادا کر چکے تھے۔مغل شہنشاہ اکبر کیلئے پرتگیزی مداخلت لمحہ فکریہ تھی۔سندھ اگرچہ اس کی قلمرو کا حصہ نہیں تھا مگر بیرونی طاقت ہندوستان کے دروازے پر دستک دے چکی تھی ادھر مغل افواج میں بحری فوج کا تصور نا پید تھا۔لہٰذا حملہ آور کے تعاقب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ہر لحاظ سے یہ صورت حال مغل بادشاہ کے لیے ناخوشگوار تھی۔عیسیٰ خان ترخان کے عہد حکومت میں ناگزیر وجوہات کی بنا پر سرزمین سندھ مغلوں کی دسترس سے محفوظ رہی۔عیسیٰ خاں کے بعد مرزا باقی ٹھٹھہ کا حکمران بنا۔یہ بدترین انسان ثابت ہوا۔اس اذیت پسند شخص نے ظلم وستم کا بازار گرم کیا۔معمولی خطا کی پاداش میں ایذا رسانی کے نت نئے تجربات کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔اکبر کو حملے کا جواز میسر آ گیا۔عوام الناس نے بلا امتیاز مذہب وملت مرزا باقی کے ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جس کی گونج دربار اکبری میں سنائی دی مگر مغل حملے سے پیشتر مرزا باقی نے طاقتور شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی لاڈلی صاحب زادی ''سندھی بیگم'' کو قربان کر دیا۔دربار اکبری کے لیے جو تحائف بھیجے گئے ان میں ''سندھی بیگم'' بھی شامل تھی جو داخل حرم ہوئی۔اکبر نے دوسرے تحائف رد کر دیے اور سندھ پر حملے کا فیصلہ کیا۔اس بار یہ حملہ ممتاز درباری سید جلال کی مداخلت سے ملتوی ہوا۔سید جلال کی بات رد کرنا' مغل شہنشاہ کو ناپسند تھا کیوں کہ سید موصوف کے والد بزرگوار سید علی عثمان کے مستعمل لباس سے نومولود اکبر کا تن ڈھانپا گیا جسے مغل شہنشاہ' عمر بھر فراموش نہ کر سکا۔اکبر کو تخت نشین ہوئے انتیس برس ہو چکے تھے۔مغل فوج مرزا باقی کو خس وخاشاک کی طرح بہا لے جا سکتی تھی مگر ایسا نہ ہو سکا اور مرزا باقی نے ۱۵۸۵ء میں خودکشی کر کے زنجیر ستم کو اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا۔

مرزا باقی کے بعد مرزا جانی بیگ ٹھٹھہ کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔یہ مجموعہ اضداد قسم کی شخصیت کا حامل تھا۔جنگ جو اور انا پر مر مٹنے والا' مزاجاً خودمختار انسان تھا۔اکبر شہنشاہ کی دہشت اس پر بھی سوار تھی۔عنان حکومت سنبھالتے ہی اس نے دربار اکبری میں تحائف بھیجے۔اظہار نیاز مندی کے بعد مرزا جانی بیگ مطمئن ہو گیا۔پھر جانے کیا ہوا کہ جملہ اوصاف حمیدہ کو ترک کر کے 'ننگ انسانیت عادات واطوار میں مبتلا ہو گیا۔ایسے اطوار جن کے تصور سے ہی گھن آئے۔خوب رو لڑکوں کو نسوانی لباس پہنا کر محل کی زینت بناتا اور لواطت کا بڑے فخریہ انداز میں

Marfat.com

اعلان کرتا۔ان بدافعال کی رپورٹ بھی دربار اکبری میں پہنچی۔سلطنت مغلیہ کوئی اسلامی وفلاحی مملکت نہ تھی صرف شخصی حکومت تھی مگر مرزا جانی بیگ تو دائرہ انسانیت ہی سے خارج ہو چکا تھالہٰذا اس کی گوشمالی ضروری تھی۔اکبر نے بھکر کے حاکم محمد صادق خاں کو فرمان بھیجا کہ حاکم ٹھٹھہ کو قرار واقعی سزا دیجائے۔ادھر مرزا جانی بیگ کو خبر ہوئی تو مرنے مارنے پر تیار ہو گیا۔مغلیہ دہشت کا طلسم اس وقت ٹوٹ کر بکھرا جب جانی بیگ نے حریف کے دانت کھٹے کر دیئے اس کے حقیقی بھائی مرزا مظفر نے اختلاف کیا تو جانی بیگ نے اسے بھی نیست نابود کر دیا۔زبردست جنگ کے بعد نہ صرف اسے شکست فاش سے ہمکنار کیا بلکہ سندھ ہی سے بھگا دیا۔ان حالات میں مغل شہنشاہ اکبر نے اپنے ترکش کے تیروں کو جانچا پرکھا اور مناسب ترین تیر' مرزا جانی بیگ کی طرف چلا دیا۔اس طرح عبدالرحیم خان خاناں بھکر کا گورنر مقرر ہوا اور وہ پوری تیاری کے ساتھ سرزمین سندھ میں داخل ہوا۔

خان خاناں کو بخوبی علم تھا کہ مرزا جانی بیگ پر قابو پانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔لہٰذا اس نے اپنے استاد مکرم ابوالفضل سے مشورہ کیا۔دونوں اس بات پر متفق تھے کہ اس مہم کو سر کرنے کے لیے مغل فوج کے علاوہ روحانی معاونت کی بھی اشد ضرورت ہے۔خان خاناں' ابو الفضل کا بے حد احترام کرتا تھا۔اس نے مزید پوچھا۔''استاد محترم!اس وقت کون درویش بے ریا ہے جو میری مدد کر سکتا ہے۔''

ابوالفضل نے بلا تامل کہا''اس زمانے میں شاہ حسین ہی وہ مرد کامل ہے جو اگر تمہیں گالی سے بھی نواز دے تو سمجھو گوہر مقصود حاصل ہو گیا۔''

شاہ حسین کا نام سنتے ہی خان خاناں چونک کر ابوالفضل کی طرف دیکھا۔''استاد مکرم' وہ تو ننگی تلوار ہیں' دوسرے امراء وزراء سے ملنا گوارا نہیں فرماتے۔''

''اسی لیے تو ان سے ملاقات بے حد ضروری ہے۔''ابوالفضل نے سمجھانے والے انداز میں کہا''اگر وہ درباری سرکاری افراد کو منہ لگانے لگیں تو یقین جانو ہم دنیا دار لوگ ان کا جینا حرام کر دیں اسی لیے تو وہ حکام اعلیٰ وادنیٰ کو دھتکار دیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے اس معاملے میں شاہ حسین تمہیں مایوس نہیں لوٹائیں گے۔''عبدالرحیم خان خاناں کا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ درویش اسے کلمہ خیر سے ضرور نوازے گا لہٰذا ان دونوں حضرات نے دربار شاہ حسین میں حاضری کا فیصلہ کیا۔

Marfat.com

اتفاق سے اس رات شاہ حسین نے دوست احباب کی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا اور کام و دہن کی تواضع کے لیے میٹھے نان تیار کروائے تھے۔ محفل رقص و سرود بھی تھی۔ اچانک شاہ حسین نے اپنے ایک مرید خاص سے کہا۔ ''دو عدد نان بچا کر رکھ لیے جائیں۔'' یہ حکم خلاف دستور بھی تھا اور خلاف توقع بھی کیوں کہ آنے والے وقت کے لیے رزق وغیرہ بچا کر رکھنا یا رزق کی فکر میں مبتلا ہونا مسلک حسینی کے خلاف تھا۔ بہر حال مریدان باوفا یہ بھی جانتے تھے کہ حکم درویش میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے لہٰذا دو نان بچا کر رکھ لیے گئے۔ محفل نا ؤ نوش اختتام پذیر ہوئی۔ رات بھیگتی رہی' شاہ حسین مختلف موضوعات چھیڑتے رہے۔ نصف شب کے قریب دروازے پر دستک ہوئی تو درویش نے مسکرا کر کہا۔ ''دروازہ کھول دو نان کھانے والے آ پہنچے۔'' در حجرہ وا ہوا تو ابوالفضل اور عبدالرحیم خان خاناں بصد احترام اندر داخل ہوئے اور دست بستہ فقیر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''ابوالفضل! تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے؟'' شاہ حسین نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''آج اس سگِ دربار کو بھی ساتھ لے آئے۔''

''حضور! جہاں سے روٹی بوٹی کی امید ہو کُتے وہیں دُمیں ہلاتے آئیں گے۔'' ابوالفضل نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا! روٹی کھاؤ بوٹی کے متعلق سوچیں گے۔'' شاہ حسین نے زیر لب مسکرا کر کہا' جبین ناز کی شکن دور ہوئی تو ابوالفضل نے خان خاناں کو اشارہ کیا کہ حرف مدعا زبان پر لائے مگر اس سے پہلے شاہ حسین لب کشا ہوئے ''آوارہ کتے کی آوارگی حد سے تجاوز کر چکی ہے' ٹھٹھہ شہر کے درو دیوار بھی مغموم ہیں' نان کھاؤ بوٹی بھی مل جائے گی۔''

''حضور! بوٹی کے بغیر روٹی کی خیرات اس دربار کی شان کے خلاف ہے۔'' عبدالرحیم خان خاناں جرات رندانہ سے لب کشا ہوا۔

''ارے! اس سگِ دربار کو تو بھونکنا بھی آتا ہے'' شاہ حسین نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ''خوب مزہ آئے گا آگے آگے کایا ہوا غلیظ کتا پیچھے پیچھے ریشمی لباس پہنے شاہ۔''

''حضور' سگِ شاہ حسین زیادہ مناسب ہے۔'' خان خاناں نے سر نیاز فقیر کے قدموں پر رکھ کر کہا اور طلائی سکوں سے بھری ہوئی تھیلی بھی پیش کی۔

''رحیم کے بندے' ٹھٹھہ تمہارے نام ہو گیا مگر یہ رشوت والی حرکت اچھی نہیں' اٹھاؤ یہ

Marfat.com

تھیلی اور باہر بیٹھے ہوئے غرباء میں تقسیم کر آؤ۔'' درویش نے یہ نوید سنائی تو ابوالفضل طلائی سکوں سے بھری تھیلی لے کر باہر لپکا۔ ''مبارک ہو رحیم کے بندے (عبدالرحیم) مرزا جانی بیگ شکست سے ہم کنار ہوا۔ انشاءاللہ ٹھٹھہ تمہارے ہاتھوں فتح ہوگا۔'' جاتے جاتے ابوالفضل نے اپنے شاگرد کو خوش خبری سنائی۔ پھر دونوں نے بڑی رغبت سے نان کھائے اور مسرور و مطمئن حجرہ فقیر سے رخصت ہوئے۔ حقیقت الفقراء میں اس ملاقات کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

شیخ آگاہ بود کرد سلام داد شانان و داد ہم دشنام

(یعنی شاہ حسین نے دونوں کو نان بھی دیے اور گالیوں سے بھی نوازا۔ شیخ ابوالفضل انداز درویش سے بخوبی واقف تھا لہٰذا اس نے اظہار تشکر کے طور پر شاہ حسین کی خدمت میں سلام پیش کیا)

خانِ خاناں مسرور مطمئن لاہور سے روانہ ہوا۔ ملتان پہنچا تو اسے وسوسوں نے آ گھیرا۔ لہٰذا مزید معاونت کے لیے مزار بہاؤالدین زکریا پر حاضر ہوا اور فاتحہ خوانی کے بعد حرف مدعا زبان پر لایا۔ اس زمانے میں شیخ کبیر المعروف بالا پیر سجادہ نشین تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی خان خاناں نے طلائی سکوں کی تھیلی بطور نیاز پیش کی۔ بالا پیر نے وہ رقم قبول کر لی مگر دوسرے دن وہ تھیلی جوں کی توں واپس بھجوا دی۔ خان خاناں تو دھک سے رہ گیا۔ بھاگم بھاگ شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ''کیا ٹھٹھہ کی قسمت میری قسمت میں نہیں؟'' اس نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

''عزیزم! یہ بات نہیں۔'' شیخ کبیر نے تسلی دی۔ ''رات ہمارے پیر و مرشد (بہاؤالدین زکریا) نے عالم خواب میں مطلع کیا کہ شاہ حسین نے ٹھٹھہ کی حکمرانی تمہیں سونپ دی ہے اور اسی کے لیے تم نے پانچ سو روپے کی رقم فقراء میں بانٹ دی لہٰذا نذر قبول ہوئی اب اسی کام کے لیے جو پہلے ہی ہو چکا ہے' تمہاری نذر کیسے قبول کی جا سکتی ہے۔ یہ اصول کی خلاف ورزی ہے۔ ہم یہ رقم اپنے جداعلیٰ ہی کے حکم سے واپس کر رہے ہیں۔''

عبدالرحیم خان خاناں تو ورطہ حیرت میں ڈوب گیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس وسوسوں سے مکمل نجات مل گئی اور وہ درویش لاہور کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ مرزا جانی بیگ اور خان خاناں کی معرکہ آرائی کی مکمل تفصیل ''تاریخ سندھ'' کے اوراق میں محفوظ ہے۔ جس کا متن کچھ اس طرح ہے کہ مرزا جانی کو خان خاناں کی یلغار سے مطلع کیا گیا تو اس نے مجلس مشاورت طلب کی۔ بہی خواہوں نے مرزا باقی کی بیٹی بیگم سندھی کی معاونت سے (جو حرم شاہی میں داخل ہو چکی تھی) اس

Marfat.com

جنگ سے دامن بچانے کا مشورہ دیا مگر مرزا جانی بیگ نے اسے شیوہ مردانگی کے خلاف قرار دیتے ہوئے رد کر دیا۔ اس کے اصل الفاظ تھے "سخاوت وشجاعت کا دعویٰ کرنے والے عورتوں کا سہارا نہیں لیا کرتے۔ حکمرانی اور عیش وعشرت آنی جانی اشیا ہیں' وہ حضرات جو اس جنگ سے دامن بچانا چاہتے ہیں ان کو میری طرف سے اجازت ہے' جہاں چاہیں چلے جائیں۔"

مرزا جانی بیگ کی ان صفات کی بنا پر اسے مجموعہ اضداد شخصیت کا نام دیا گیا ہے۔ وہ دل کا سخی' بہادر بھی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ننگ انسانیت لواطت جیسی گھناؤنی حرکات کا مرتکب بھی۔ اس نے ایسے ایسے شریف خاندان کو رسوا کیا جن کا تذکرہ بھی (اس ضمن میں) سوئے ادب ہے۔ بہر حال ٹھٹھہ دربار میں مغل فوج سے ٹکرا جانے کا فیصلہ ہوا۔ مرزا موصوف نے اپنے دست راست رستم بیگ کو لشکر عظیم کے ساتھ سیہون شریف کی طرف روانہ کیا اور خود نصر پور موضع بوہری کے وسیع وعریض میدان میں فروکش ہوا۔ خان خاناں بھی پوری تیاری سے مقابل آیا۔ ۲ محرم ۱۰۰۰ء میں میدان کارزار گرم ہوا۔ کاندھوں سے کٹ کٹ کر سر جدا ہونے لگے۔ چوٹ برابر کی تھی۔ کبھی ایک کا پلہ بھاری ہو جاتا کبھی دوسرے کا۔ یہ جنگ بڑی طویل ثابت ہوئی۔ ہر طلوع ہونے والا سورج نیا تماشا دیکھتا۔ مرزا جانی بیگ نے قرب وجوار کے علاقوں میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص مغل فوج کے کسی سپاہی کا سر کاٹ کر پیش کرے گا اسے پانچ صد "کبر" بطور انعام پیش کیے جائیں گے۔ اس جنگی چال نے غضب ڈھایا۔ سندھ کے غریب عوام انعام کے لالچ میں مغل سپاہیوں کا "شکار" کرنے لگے۔ خشکی کے راستے سے آنے والے مغل فوج کا خزانہ بھی مرزا جانی بیگ نے لوٹ لیا اور دشمن کی دولت' دشمن کے خلاف استعمال ہوئی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ دونوں سربراہوں نے ایک دوسرے پر فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کر لیا۔ مرزا جانی بیگ کے سپاہیوں نے اپنی پگڑیوں میں درختوں کی سبز شاخیں سجالیں اور مغل فوج کے افراد نے اپنی پگڑیوں میں تیر لگائے تاکہ قتل وغارت کا بازار گرم ہو تو دوست دشمن کی پہچان ہو سکے۔ اس طرح دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہوئے۔ ابتدا میں مرزا جانی بیگ کا پلہ بھاری رہا۔ خان خاناں کا لشکر نیست ونابود ہو رہا تھا۔ میمنہ ومیسرہ پسپا ہو چکے تھے۔ سالار لشکر اندیشوں میں مبتلا تھا کہ انہونی کا آغاز ہوا۔

جانی بیگ کا ایک فیل مست جو دشمن کی صفیں درہم برہم کر رہا تھا اچانک پلٹ کر اپنی فوج میں گھس گیا اور ایسی تباہی مچائی کہ اپنے پرائے حیران رہ گئے۔ دوسری حیران کن بات یہ ہوئی کہ مرزا جانی بیگ کی فوج کے عین سامنے تیز وتند آندھی چلنے لگی جس کا رخ "مرزائی" فوج کی

Marfat.com

جانب تھا۔ یقینی فتح شکست میں تبدیل ہونے لگی۔ فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مرزا جانی بیگ نے راہ فرار اختیار کرنے سے صاف انکار کردیا مگر وفادار سرداروں نے منت سماجت سے اسے قائل کیا اور بذریعہ کشتی ''انٹر'' پہنچادیا۔ فوج کے پیشتر حصہ میدان جنگ میں کام آیا۔ باقی جو بچا وہ منتشر ہو گیا۔

مرزا جانی بیگ ہار ماننے والوں میں سے نہ تھا۔ اس نے پھر فوج کے منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع کیا اور ''انٹر'' کے گرد خندقیں کھود کر حریف کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ الغرض متعدد معرکہ آرائیوں کے بعد' عبدالرحیم خان خاناں حریف پہ قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ ۱۰۰۱ھ میں اسے دربار اکبری میں پیش کیا گیا۔ اکبر نے جانی بیگ کی عنایت ونوازش سے دل جوئی کی۔ منصب پنج ہزاری عطا کیا۔ جہانگیر کے بیٹے خسرو سے اس کی صاحب زادی کی شادی ہوئی۔ سیہون اور لاہری بندر سلطنت مغلیہ میں شامل کر کے باقی مفتوحہ علاقہ جانی بیگ کو بطور جاگیر عطا کر دیا گیا۔ ۱۰۰۹ء ھ یعنی شاہ حسین کی وفات حسرت آیات کے ایک برس بعد مرزا جانی بیگ کا برہان پور میں انتقال ہوا۔

عبدالرحیم خان خاناں اور شاہ حسین میں ایک قدر مشترک ایسی بھی تھی جس کی بنا پر درویش اسے پسند کرتا تھا۔ وہ فارسی' ہندی' سندھی اور میواتی زبان میں شاعری کرتا تھا۔ سخن شناسی کے علاوہ سخن پرست ایسا کہ شعرا کو دولت میں تول کو نوازتا۔ اس کی سخاوت کے قصے اس کی زندگی ہی میں زبان زدِ خاص و عام ہوئے۔ ایک روز ملا نظیری نیشاپوری نے عجیب وغریب خواہش کا اظہار کیا۔ ''جناب' یہ ایک لاکھ روپے کا ڈھیر کتنا بڑا ہوتا ہے' میں نے سن رکھا ہے کہ اس ڈھیر کے سائے میں کتا بیٹھ سکتا ہے۔''

''مولانا کتے وتے کے بیٹھنے کے متعلق یہ ناچیز کچھ نہیں جانتا البتہ لاکھ روپے کا ڈھیر ابھی دکھائے دیتے ہیں۔'' یہ کہا اور اپنے میر منشی کو ایک لاکھ روپیہ حاضر کرنے کا حکم دیا۔ کھلے میدان میں روپیہ ڈھیر کر دیا گیا۔ ملا نظیری ٹکٹکی باندھے اس ''جلوگی'' سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ''تو یہ ہے ایک لاکھ' واہ' صاحب واہ۔'' ''آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے میری تمنا پوری کی' خدا آپ کو خوش رکھے۔'' مولانا شکریہ ادا کر کے جانے لگے۔

''حضور' کہاں چل دیے؟'' خان خاناں نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ''اپنی اس چہیتی ''مصیبت بیگم'' کو بھی تو ساتھ لیتے جایئے۔'' اشارہ دولت کے انبار کی طرف تھا۔

Marfat.com

''کیا مطلب جناب؟ یعنی یہ ساری دولت گویا میری ہوئی؟'' مولانا کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر وہ ''مزاج خاناں'' سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔اس طرح لاکھ روپیہ باتوں ہی باتوں میں خان خاناں نے ''دان'' کر دیا۔شاہ حسین کو اپنے عقیدت مند کی یہ ادا دل سے پسند تھی۔

سندھ والی مہم کے دوران ایک روز عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ایک مقامی تک بند شاعر'خان خاناں کی سخاوت کا سن کر ایک قصیدہ لکھ لایا۔عبدالرحیم نے قصیدہ بڑے غور سے سنا۔مقامی شاعر نے اپنا تعارف کراتے وقت انکشاف کیا کہ وہ رحیم اور رحمان تخلص کرتا ہے۔یہ بڑی حیران کن بات تھی کیونکہ یہ دونوں تخلص خان خاناں کے تھے مگر شاعر کی بے تکی باتیں سن کر بھی وہ مروت میں خاموش رہا۔قصیدے کے اختتام پر مقطع میں پڑھنے سے پہلے تک بند شاعر نے واشگاف الفاظ میں کہا ''حضور! میرا مقطع ایک لاکھ روپے کا ہے'' اور پھر بڑی ڈھٹائی سے عبدالرحیم خان خاناں کا مشہور زمانہ شعر پڑھ دیا۔

یہن کاٹے دھوئیے' کھایئے آدھک پیاس
رحمٰن پیت سراہیے موئے میت کی آس

(مچھلی کاٹ کر صاف کی جائے تو پانی درکار ہوتا ہے۔کھائی جائے تو پیاس ستاتی ہے۔(گویا مچھلی پانی میں رہتی ہے اور مرنے کے بعد بھی پانی ہی طلب کرتی ہے) رحمٰن ایسی محبت پر آفرین جو فنا کے بعد بھی اتنی شدید طلب کی حامل ہو)

یہ دوہا آج بھی ضرب المثل کا درجہ رکھتا ہے مگر خان خاناں نے شعر سن کر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور شاعر کو ایک لاکھ روپیہ یہ کہہ کر عطا کر دیا۔''جناب' آپ کا مقطع واقعی ایک لاکھ روپے کا ہے۔'' اسی پر بس نہیں۔وہ تک بند شاعر دوسرے روز پھر آ دھمکا اور آتے ہی مژدہ سنایا۔حضور' آج میں ایک ایسا شعر پیش کرنے کی جسارت کرنے آیا ہوں جس کی قیمت دو لاکھ ہے۔آپ چونکہ حقیقی قدر دان ہیں لہٰذا پیش خدمت ہے۔

من سے نہیں رحیم نرپ' ورگ سے نہیں دوان
دیکھ نین چھ آ گرین من تھی تا بک جان

(اے رحیم دل جیسا کوئی شہنشاہ نہیں اور نگاہ سے بڑا کوئی دوست و ندیم نہیں جس کی عزت نگاہ کرے دل بھی اسی کے ہاتھ بک جاتا ہے)

یہ بھی خان خاناں کا مشہور و معروف دوہا تھا مگر مروت کی انتہا یہ ہوئی کہ عبدالرحیم نے

Marfat.com

شاعری کی تعریف کے بعد دو لاکھ روپے ادا کر دیئے۔ تیسرے دن وہ شاعر پھر آ موجود ہوا اور فرمانے لگا۔ حضور! آج میں آپ کو دو ایسے اشعار سناؤں گا جن کی مجموعی قیمت تین لاکھ ہے۔ پھر خان خاناں ہی کے دو دوہے پڑھ دیے۔

رحمن دھاگو پریم کا جن توڑو چٹکائے
توڑے سے یہ جرٹ نائیں بیچ گانٹھ پڑ جائے

(رحمن پریم کے دھاگے کو ہرگز نہ توڑ اول تو یہ جڑتا نہیں، جڑ بھی جائے تو اس میں گرہ ضرور پڑ جاتی ہے)

چھ رحیم تن من دیو کیو ہردے میں بھون
تا سے دکھ سکھ کہے گی، رہی کتھا اب کون

(جس کے سپرد تن من کر دیا اور اپنے من میں بسا لیا پھر اس سے رنج و راحت کا شکوہ کیسا۔ یعنی دکھ دے تو کیا سکھ دے تو کیا)

شاعر موصوف تو انعام اکرام لے کر رفو چکر ہو گئے۔ ایک روز بعد عبدالرحیم خان خاناں پانچ لاکھ کی رقم لے کر اس کے منتظر بیٹھے رہے۔ غروب آفتاب تک انتظار ہوتا رہا۔ میر منشی نے کہا ''حضور! وہ دھوکے باز اب نہیں آئے گا۔''

''منشی جی! وہ دھوکے باز ہی نہیں کم ظرف بھی تھا، ہم صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ آخر وہ کس حد تک گر سکتا ہے؟''

خان خاناں نے مسکرا کر جواب دیا۔

اب پیش خدمت ہے وہ واقعہ جو شاہ حسین کے اس عقیدت مند کی شخصیت کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

ایک بار خان خاناں بغرض شکار جنگل میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ آدھی رات کے قریب وہ محو خواب تھا کہ ایک دیہاتی اس کے خیمے میں گھس آیا اور کوئی سخت سی چیز اس کے پاؤں سے رگڑنے لگا۔ خان خاناں اچانک بیدار ہو گیا اور تلوار بے نیام کر کے گرجا۔ ''کون ہو تم؟''

وہ مفلس دیہاتی مارے دہشت کے لرزنے لگا۔ ''خدا رسول ﷺ کے واسطے مجھے مت مارنا۔'' اس نے دست بستہ عرض کی۔ ''میں ایک غربت کا مارا بدنصیب انسان ہوں۔''

خان خاناں نے حیران ہو کر دیکھا تو اس مفلس کی حالت واقعی ناگفتہ بہ تھی مگر سب

Marfat.com

سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس نے ہاتھ میں لوہے کا توا تھام رکھا تھا۔ ''یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اور تم اس وقت میرے خیمے میں کیا کر رہے ہو؟'' خان خاناں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''حضور میں نے سن رکھا تھا کہ عبدالرحیم خان خاناں کے جسم سے جو چیز چھو جائے وہ سونے کی بن جاتی ہے۔'' دیہاتی نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرنا شروع کیا۔ ''مجھ غریب کے پاس یہی لوہے کا توا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ یہ توا خان خاناں کے جسم سے چھو کر لے آؤ تو ہمارے دن پھر جائیں گے مگر افسوس کہ میری قسمت ہی خراب ہے۔'' پھر دیہاتی نے بغور آہنی توے کی طرف دیکھا۔ ''اگر میں اچھی طرح آپ کے پاؤں سے یہ توا رگڑ لیتا تو آج مفلسی سے نجات مل جاتی۔''

خان خاناں یہ عجیب وغریب حکایت سن کر بڑا حیران ہوا۔ ''سادہ لوح انسان! تم نے غلط سن رکھا ہے' میں کوئی.....''

''نہ حضور! ایسی بات منہ سے نہ نکالیں۔ ہمارے گاؤں والے سب یہی کہتے ہیں کہ خان خاناں ''پارس'' ہے۔'' دیہاتی گڑگڑانے لگا۔ ''اب ساری دنیا تو جھوٹ نہیں بول سکتی نا۔''

اپنے متعلق سادہ لوح دیہاتیوں کا عقیدہ اسے حیران کیے دے رہا تھا۔ وہ فوراً بات کی تہ تک پہنچا اور کہنے لگا۔ ''محترم! تم میرا مطلب نہیں سمجھ سکے' تم نے جو کچھ سن رکھا ہے اس میں تھوڑی سی ترمیم کر لو' خان خاناں کے جسم سے چھو جانے والا لوہا' سونے سے دس گنا قیمتی ہو جاتا ہے' آزما کر دیکھو۔'' اب دونوں مسکرا رہے تھے۔ دیہاتی کی آنکھیں تو خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''بس حضور تو پھر مجھے اپنی تقدیر بدلنے دیں' خدا آپ کو خوش رکھے' آپ کا اس میں ہرج ہی کیا ہے۔'' دیہاتی لپک کر آہنی توا خان خاناں کے جسم سے رگڑنے لگا۔

''اب توے کو اس کونے میں رکھ دو۔'' خان خاناں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''کل آ کر اپنی دولت لے جانا' اتنا سونا کہاں بیچتے پھرو گے میں خود اس کا بندوبست کر دوں گا۔''

''حضور! آپ واقعی بڑے اچھے انسان ہیں مگر سودا ذرا احتیاط سے کیجئے گا' سارے لوگ آپ جیسے تھوڑی ہوتے ہیں۔ اب مجھے اجازت دیں' میں یہ خوش خبری اپنی بیوی کو سنانا چاہتا ہوں۔ وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہوگی۔'' دوسرے دن وہ دیہاتی واقعی مفلسی کے دندان شکن حالات سے نجات حاصل کر گیا۔

Marfat.com

شاہ حسین نے خان خاناں کا نام اپنی شاعری میں استعمال کر کے اسے دوام بخشا۔

مادھولال حسینؒ اگر آفتاب عالم تاب تھے تو ان کے نظام شمس میں عطارد نصیب یا تعلق خاطر کے اعتبار سے قریب ترین دو شخصیات کو قرار دیا جا سکتا ہے جو علم و آگہی میں بھی ان کے ہم پلہ تھے۔ ابو اسحاق مہز نگ قادری اور شیخ داؤد شیر گڑھی۔ اول الذکر بحر معرفت کے غواص کا تعلق لاہور سے تھا۔ یہ تینوں حضرات ایک دوسرے کے محرم راز اور ظاہر و باطن سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ دو لاہور میں اور ایک شیر گڑھ میں' مگر نماز پنج گانہ کے اوقات پر تینوں سرزمین حجاز کے دل' کعبۃ اللہ میں تشریف فرما ہوتے۔ مسجد نبوی ﷺ میں بھی تینوں کو اکٹھے دیکھا گیا اور یہ دیکھنا دکھانا روزانہ کا معمول تھا۔ یہ روحانی تعلق یا اس دور میں پیش آنے والے محیر العقول واقعات' سطحی نگاہ رکھنے والے عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہو سکتے ہیں مگر چشم بینا کے لئے ظہور پذیر ہونے والا کوئی واقعہ' ناقابل فہم نہیں ہوا کرتا۔ خصوصاً آج جب کہ روحانیت بھی سائنس کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ بزرگان دین کی کرامات تعجب خیز نہیں ہونی چاہئیں۔ کیا عام زندگی میں یہ اصول کارفرما نہیں کہ دیکھنے والی آنکھ اور ہدف کا درمیانی فاصلہ مناسب نہ ہو تو اشیا کے خدوخال واضح نہیں ہوتے بلکہ غلط تاثر پیش کرتے ہیں۔ خوردبین سے دہی کا معائنہ کیا جائے تو انسان لاکھوں کروڑوں متحرک جرثوموں کو حلق سے نیچے اتارنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ یہی حال عام ہوا کا ہے جس سے ہماری سانسوں کا تسلسل قائم ہے۔ اگر ہم ہر اس چیز کو دیکھ لیں جو ہمارے اندر جا رہی ہے تو سانس لینے سے انکار کر دیں۔ یہ خالق کائنات کی خاص کرم نوازی ہے کہ ہم صرف حیات آور اشیا کو دیکھ سکتے ہیں اور حیات کش تمام اشیا کو پوشیدہ رکھا گیا ہے یا ہماری دسترس سے دور۔

آنکھ ناقص ہے وگرنہ اس جہاں کا اصل روپ
دیکھ لے اک بار جو وہ خوف سے مر جائے گا

ہمارے نزدیک دہریے کی جامع تعریف یہ ہے کہ "جو کُل کی نہ سمجھ میں آنے والی حالت کا انکار کر کے جزو کی قابل فہم حالت ہی کا ہو کر رہ جائے۔" ان تمام باتوں سے ایک ہی نتیجہ اخذ ہونا چاہیے کہ سمجھ میں نہ آ سکنے والی بات کا انکار یا اسے غلط قرار دینا' دانش مندی کا تقاضا نہیں۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

شیخ ابو اسحاق بن حسین قادری' شیخ داؤد گڑھی کے نامور خلیفہ اور لاہور کی علمی شخصیت

Marfat.com

تھے۔ان کی درس گاہ شہر لاہور سے دو میل کے فاصلے پر فیض عام کا مقام و مرتبہ رکھتی تھی۔فقہ حدیث کے علاوہ علم تفسیر کے تشنگان کا ہجوم ابواسحاق کو گھیرے رہتا۔وطن مالوف بخارا اور تعلق سادات خاندان سے تھا۔لاہور کے نواح میں یہ بستی ایک مغل سردار پیر عزیز نامی شخص نے بسائی تھی جو ابواسحاق کے قیام کی وجہ سے ''محلہ شاہ ابواسحاق مزنگ'' کے نام سے مشہور ہوئی اور آج اس جگہ کو ''مزنگ'' کہتے ہیں

ابواسحاق کا مزار بھی مزنگ ہی میں ہے۔اسی خانقاہ کے حجرے میں شاہ بلاول بھی مقیم تھے۔آج سے پچاس برس پیشتر تک مزار اچھی حالت میں موجود تھا۔ہر سال عرس منعقد ہوتا۔انجمن حمایت اسلام کے جنرل سیکرٹری شیخ عبدالعزیز کی رہائش گاہ مزار مقدس کے بالکل قریب تھی۔درویش کی آخری آرام گاہ لکھنو کے ایک متمول تاجر عبداللہ بن عبدالقادر کی سعی جمیلہ کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی۔عبداللہ موصوف کی اولاد لکھنو سے لاہور آ کر مزار کی مرمت اور آرائش و زیبائش کا اہتمام کیا کرتی تھی۔کسی زمانے میں ساڑھے سات بیگھہ زمین بھی اس مزار کی ملکیت تھی۔آج کل آبادی کا سیلاب ہر چیز کو بہا لے گیا ہے۔صرف مسجد اور چھوٹے گنبد والا مقبرہ محفوظ ہیں۔تاریخ وفات جو تربت درویش پر مرقوم ہے وہ فارسی کے اس مصرعے سے نکلتی ہے
شاہ عالی فقیر ابواسحاق ۹۸۵ھ شاہ ابواسحاق کی علمی فضیلت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف ہر دور میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یعنی ''آیت اللہ'' مشہور رہے۔تیز رفتاری کا یہ عالم کہ عالم پیری میں جب اپنے راہنما حضرت داؤد شیر گڑھی کی یاد ستاتی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاپیادہ ہنی وال (موجودہ چونیاں) چل دیتے اور راتوں رات چالیس کوس کا فاصلہ طے کر کے دیار یار کی دہلیز تک جا پہنچتے مگر اکثر و پیشتر ملاقات کے بغیر ہی واپس آ جاتے۔

اچھا ہوا جو تم نہیں آمادہ وصال
پھر کیا رہے گا دل میں جو حسرت نکل گئی

درویش اگرچہ آخری عمر میں گوشہ نشین ہو گیا تھا مگر لاہور کے گرد و نواح اور دور دور تک احترام کا ہالہ سا موجود تھا۔ہر مکتبہ فکر کے لوگ ابواسحاق کا نام سنتے ہی سر نیاز خم کر دیتے۔''منتخب التواریخ'' کے مصنف ملا عبدالقادر بدیوانی ایک بار عجیب و غریب تجربے سے دوچار ہوئے۔ملا موصوف ایک روز ابواسحاق سے ملنے آئے رات حجرہ درویش میں بسر کی۔دوسرے دن شیر گڑھ جانے اور شیخ داؤد کی زیارت سے مستفید ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔درویش نے بصد مسرت اجازت دی مگر اپنے

Marfat.com

ایک خادم کو بھی ہمراہ کر دیا۔

''حضور! اس کی کیا ضرورت ہے؟'' ملا عبدالقادر نے کہا۔'' راستے میں اگر چہ رہزنوں لٹیروں کی حکمرانی ہے مگر میں تو آپ کے آستانے سے شیر گڑھ جا رہا ہوں۔ مجھے فکر و اندیشے سے کیا غرض؟''

''سو تو ہے مگر اس تعلق کا اعلان اگر خود آپ کی جانب سے ہوا تو شاید کوئی یقین نہ کرے۔'' درویش نے وضاحت پیش کی۔'' اس بات کا اعلان کسی گواہ کی زبان سے ہو تو مناسب ہے۔''

اگر چہ دور عہد اکبری کے عروج کا تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ سرکشیاں اور بغاوتیں ہر زمانے کا حصہ رہی ہیں اور مغلیہ عہد حکومت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ملا صاحب' خادم کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوئے۔ شہر لاہور سے شیر گڑھ کا درمیانی علاقہ زیادہ گھنے جنگل پر مشتمل تھا۔ آج تو آبادی کا عفریت جنگلوں کو ہڑپ کر گیا ہے مگر اس دور میں واقعی ایسا نہیں تھا۔ لاہور کی حدود سے نکلتے ہی رہزنوں سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ اچانک ہی کہیں سے نمودار ہوئے اور دونوں مسافروں کو نرغے میں لے لیا۔ ملا موصوف کا رنگ فق ہو گیا۔ ڈراؤنی شکلوں والے مسلح افراد' سوال و جواب کے تکلف سے آشنا ہی نہ تھے۔ خادم نے بڑے رعب سے ان کے سرغنے کو ڈانٹ پلائی۔'' کچھ خبر بھی ہے کن لوگوں کے حضور کھڑے ہو؟ میں شاہ ابواسحاق کا خادم ہوں اور یہ ان کے مہمان اور ہم شیخ داؤد شیر گڑھی کی زیارت کرنے جا رہے ہیں۔'' خادم کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ سارے ڈاکو کفِ افسوس ملنے لگے۔

''جناب' ہم سے گستاخی ہو گئی۔'' ڈاکوؤں کے سردار نے معذرت پیش کی۔'' آج ہمیں مہمان نوازی کا شرف بخشیں کل ہم خود آپ کے سفر کا خاطر خواہ انتظام کر دیں گے۔''

مُلا عبدالقادر بدایونی کی جان میں جان آئی۔ رات ڈاکوؤں نے پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ بے تکلف ماحول میں ملا موصوف نے پوچھ ہی لیا۔'' آپ حضرات کا پیشہ راہزنی ہے پھر اس '' تکلف'' اور درویش کا احترام کا کیا مقصد؟''

''بات یہ ہے جناب۔'' ایک ڈاکو نے وضاحت کی۔'' اس دس کوس کے علاقے پر ہمارا راج ہے' مغل بچہ (شہنشاہ اکبر) اس حقیقت سے آشنا ہے اور ہم بھی مغل فوج سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر درویش سے ٹکرانے کی ہم میں تاب ہے نہ مجال۔ جن کے آپ مہمان ہیں وہی یا مَ

Marfat.com

تھے کہ آپ تو شیر گڑھ تشریف لے جا رہے ہیں۔ وہ درویش تو شاہ صاحب کے مرشد ہیں۔ ان حضرات کی بے ادبی میں جان کے ساتھ ایمان جانے کا بھی خطرہ ہے۔" عجیب منطق تھی ان رہزنوں کی۔ بہر حال بات ملا صاحب کی سمجھ میں آ گئی۔ دوسرے دن کا آغاز ہوا تو ڈاکوؤں کے سردار نے تلقین کی۔ "جونہی آپ حضرات اس قسم کی مشکل میں مبتلا ہوں' فوراً اپنا تعارف پیش کر دیں ورنہ جن لوگوں سے آپ کا واسطہ اب پڑنے والا ہے وہ ہماری طرح "رحم دل" نہیں وہ تو تن کے کپڑوں کے لیے بھی تن سے سر جدا کر دیتے ہیں۔"

چنانچہ شیر گڑھ تک کا سارا سفر اسی انداز میں طے ہوا۔ جونہی خطرناک "حضرات" سے ملاقات ہوتی' ملا موصوف فوراً پکار اٹھتے۔ "ہم شاہ ابو اسحاق کے مہمان تھے اب شیر گڑھ ان کے مرشد کے آستانے پر جا رہے ہیں۔" یہ سنتے ہی معاشرے کے وہ ناسور' وہ رہزن لٹیرے زیر دام آ جاتے۔ نہ صرف یہ کہ دستِ ستم' دستِ شفقت میں بدل جاتا بلکہ وہ "حضرات" خاطر تواضع کرنے پر اصرار کرتے۔ اس طرح وہ سفر جسے ابو اسحاق ایک رات میں طے کر لیا کرتے تھے تقریباً ایک ہفتے میں اختتام پذیر ہوا۔ شیر گڑھ پہنچے تو شیخ داؤد نے مسکرا کر استقبال کیا اور کہا۔ "خیل خوب' راستے میں بڑی خاطر تواضع ہوئی آپ لوگوں کی۔"

"جناب! آپ روشن ضمیر ہیں آپ سے کیا پردہ' خاطر بھی خوب ہوئی اور تواضع بھی۔" ملا صاحب بصد احترام اعتراف کیا۔

شاہ حسین کا ابو اسحاق سے ایک اور رشتہ بھی تھا۔ شیخ سعد اللہ ملامت جن کے آگے شاہ حسین نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا وہ بھی اسحاق ہی کے شاگردان رشید میں شمار ہوتے ہیں۔ اس طرح ابو اسحاق' شاہ حسین کے دادا استاد بھی ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ داؤد اور شاہ حسین میں بھی روحانی تعلق استوار ہو جاتا ہے۔

ایران کے شہر کرمان شاہ سے ایک زہد و شب زندہ دار قسم کا شخص' نقل مکانی کر کے ہند کے شہر سیت پور (موجود ضلع مظفر گڑھ) میں آ مقیم ہوا جس کے ہاں ۲۷ رمضان المبارک ۹۱۹ھ میں شیخ داؤد تولد ہوئے اس طرح انہیں "کرمانی" بھی کہا جاتا ہے۔ شیخ موصوف کی والدہ ست گھرا (ساہیوال) کے مشہور عالم دین حافظ محمد کی صاحب زادی تھیں۔ پیدائش سے پیشتر ہی فتح اللہ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ داؤد کرمانی کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد والدہ بھی راہی ملک عدم بقا ہوئیں۔ اس طرح یتیم و یسر بچے کی پرورش کا بوجھ ست گھرا میں مقیم' ماموں کے کندھے پر آ پڑا

Marfat.com

ایک روایت کے مطابق ان کی تعلیم کا آغاز جھنی وال میں ہوا پھر عروس البلاد لاہور کے عالم بے بدل شیخ اسماعیل سے اکتساب علم ہوا۔ شیخ اسماعیل کو مولانا عبدالرحمٰن جامی سے تلمذ تھا۔ شیخ اسماعیل عمر بھر اپنے استاد اور شاگرد (مولانا جامی اور داؤد کرمانی) سے تعلق خاص پر نازاں رہے۔

داؤد کرمانی کے زہد و تقوی کا یہ عالم کہ دن رشد و ہدایت میں بسر ہوتا تو رات کو رکوع و سجود میں۔ مغل شہنشاہ اکبر تک ملاقات کا متمنی ہوا کرتا تھا مگر درویش کے استغنا اور بے نیازی کی بناء پر مغل بادشاہ کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ شہباز خاں کنبوہ جیسا شاہی فرستادہ بھی درویش کو قائل نہ کر سکا کیوں کہ شاہ حسین کی طرح، داؤد کرمانی بھی شمشیر براں قسم کی شخصیت تھے اور مغل شہنشاہ مادھو لال حسین سے زچ اٹھا چکا تھا لہٰذا اکبر نے ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا۔ یہ درویش ڈھاوے کے صوفیوں اور علمائے سوء کے حق میں ننگی تلوار سے کم نہ تھے۔ اکثر فرماتے ''جن علماء اور صوفیاء نے شاہوں کو اپنا قبلہ بنالیا' ان سے وہ مکھی یقیناً ہزار درجے بہتر ہے جو نجاست پر بیٹھتی ہے۔''

درویش کی باتوں میں ایسا اثر تھا کہ جو سنتا اس کی کایا پلٹ جاتی۔ پنجاب کے علاقے ساندل بار اور اس کے گردونواح میں لا تعداد غیر مسلم قبائل' داؤد کرمانی کی مساعی جمیلہ' سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مثلاً ضلع گوجرانوالہ کے چھٹے' تارڑ' سنجرا' دھوتار' جیسے 'وڑائچ' گورائے مان' سانسی وغیرہ اور سیالکوٹ کے علاقے سے باجوے' بسرے' جیسے 'گھمن' کاہلوں' ساہی' سندھو ضلع ساہیوال کے اراڑ' ھسیانے' کولا کے' مجھیانے' مردانے' اور بلوچ۔ یہ تمام قبائل اس دور میں پنجاب کے جنگ جو قبائل تھے جو شیخ داؤد کرمانی کے زود اثر گفتگو سے راہ راست پر آئے۔

مادھو لال حسین کا ایک رشتہ شیخ داؤد کرمانی سے ایسا بھی ہے جو نہ صرف منفرد بلکہ ثقافت پنجاب میں مینار نور کا درجہ رکھتا ہے۔ پنجابی ادب میں ہیر رانجھے کا کردار سب سے پہلے شاہ حسین نے متعارف کرایا اور شیخ موصوف نے اسے موضوع سخن بنایا۔ یہ بات مستند ہے۔ پنجابی ثقافت کی جان اس داستان عشق کی طرح' شاہ حسین نے ڈالی پھر جو انداز اپنایا گیا اس کی پیروی ہر دور میں کی گئی۔ صوفی شعراء نے تو اتباع کا حق ادا کر دیا۔ اپنے آپ کو ''ہیر'' کے روپ میں پیش کر کے ''رانجھن'' کی جستجو و تلاش۔ وہی تڑپ وہی سوز و گداز' وہی اضطراب و بے چینی' وہی ہجر و فراق کی کسک' ان کرداروں کا طرہ امتیاز رہی۔ اس سے جل بن مچھلی ماہی بے آب وغیرہ کی تراکیب اردو شاعری میں در آئیں اور عظیم شعراء نے اسے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ شاہ حسین کے کلام' ہیر رانجھا'' کے انداز ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

رانجھن رانجھن کوک دی میں آپے رانجھن ہوئی
رانجھن مینوں ہر کوئی آکھے ہیر نہ آکھے کوئی

بعض کتب میں پہلے مصرعے کا آغاز ''ماہی ماہی کوک دی'' سے ہوا ہے۔ پھر مختلف ادوار میں اس شعر میں ترامیم بھی ہوئیں حتیٰ کہ یہ کلاسک کا درجہ اختیار کر گیا۔ بعض بے خبرے حضرات نے اس شعر کو وارث شاہ کی قلمی کاوش قرار دینے کی کوشش کی۔ ان کے متعلق ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں

پاپوش میں لگا دی کرن آفتاب کی
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

متعدد کافیوں میں شاہ حسین نے ہیر کا ذکر' مختلف انداز میں کیا ہے۔ مثلاً

لوکاں سنیاں دیساں سنیا ہیر بیراگن ہوئی
اِک سنیندا لکھ سنے میرا کیہ کرے گا کوئی

(لوگوں نے سنا' دیس' دیس بات پھیل گئی کہ ہیر بیراگن ہو گئی ہے۔ ایک سنے یا لاکھوں میرا کیا بگڑ سکتا ہے۔ یعنی یہ رسوائی تو اس تماشے کا حصہ ہے)

لوک گیتوں میں یہ مصرع زبان زدِ خاص و عام ہو چکا ہے۔

میں جھوک رانجھن دی جانا' نال مرے کوئی چلّے
(مجھے رانجھن کی بستی کی طرف جانا ہے کوئی ہے جو میرے سنگ جانے کو تیار ہو)

رانجھن ساہنوں کنڈیاں پائیاں دل وچ لگیا زور
(رانجھن نے اسی کانٹے دار زنجیریں ڈال دی ہیں جو دل میں اندر تک کھب چکی ہیں)

ایک اور انداز ملاحظہ فرمائیں۔

ہاتھی عشق مہاوت رانجھا آنکس دے دے ہوڑیے

!ایک انداز یہ بھی ہے

پارندی رانجھن دا ٹھانہ کیتا قول ضروری جانا

کلام شاہ حسین میں ذکر ہیر رانجھا کے یہ چند نمونے ہیں جو پیش خدمت کیے گئے۔ شیخ داؤد کرمانی 'درویشی مسلک کی جانب کس طرح راغب ہوئے اور وہ اس قصے کو کیا وجہ دیتے تھے۔ وہ کچھ اس طرح سے ہے۔ قصہ ہیر از دمودر کے دیباچے میں مرقوم ہے کہ ایک شخص دربار داؤدی میں آیا اور

Marfat.com

اس نے قصہ ہیر رانجھا بڑے سوز گداز سے بیان کیا۔ درویش نے بغور سن کر فرمایا۔ ''تم نے نیک لوگوں کا ذکر کیا خدا تمہاری پانچ نسلوں پر کرم فرمائے گا۔''

اسی طرح ولیا نامی ایک مغنی اس قصے کو خوش الحانی سے گاتا چلا جارہا تھا کہ شیخ پر وجد طاری ہو گیا۔ اپنے آپ کو سدھ بدھ نہ رہی اور دنیا کے سارے بکھیڑے تج کر جنگلوں کی طرف چل دیے۔

دنیا سے منہ موڑنے کے متعلق دوسری روایت کچھ اس طرح سے ہے کہ مرزا کامران پسر بابر مغل شہنشاہ کے دربار میں ایک ایرانی نژاد علم کلام کا ماہر آیا۔ اس نے ہندی ماہرین الٰہیات و مذاہب کو دعوت مناظرہ دی۔ مرزا کامران نے دیپال پور سے ملا بایزید کو بلا بھیجا شیخ داؤد ان دنوں دیپال پور میں ملا بایزید کے درس سے اکتساب علم کر رہے تھے۔ مرزا موصوف کی دعوت پہنچی تو استاد نے اپنے باصلاحیت شاگرد کی معاونت میں دن رات تیاری شروع کر دی۔ کتب قیل وقال کے مطالعے میں ایک روز مصروف تھے کہ کسی درویش کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے بڑے عجیب و غریب لہجے میں کہا۔ ''اللہ نے کس کام کے لیے تخلیق فرمایا اور تم کن بکھیڑوں میں الجھ گئے۔'' بس یہ سننا تھا کہ گریباں چاک، سب کچھ چھوڑ چھاڑ جنگل کی طرف چل دیئے شاہوں سے بیزاری ولا تعلقی کا انداز، شاہ حسین نے شیخ داؤد کرمانی ہی سے سیکھا پھر دونوں ایسے ''اِک مِک'' ہوئے کہ من و تو کا فرق مٹ گیا۔ عمر میں شیخ داؤد کرمانی شاہ حسین سے بہت بڑے تھے۔ ۹۸۲ھ بمطابق ۱۵۷۴ء جب شیخ داؤد نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو شاہ حسین عمر ۳۷ برس کی تھی یعنی کوچہ رسوائی میں ابھی قدم رکھا ہی تھا۔

شاہ حسین کے ایک اور ہم عصر بزرگ حسو تیلی ہیں جو منفرد نعرہ بلند کیا کرتے تھے ''حسو، حسین ہے اور حسین حسو۔'' شاہ حسین اور حسو کے ''ٹکراؤ'' کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ چوک جھنڈا لاہور میں حسو تیلی کی دکان تھی۔ یہ دکان محض ظاہر رکھ رکھاؤ کے لیے تھی اصل پیشہ تو درویشی تھا۔ شاہ حسین مجذوبانہ انداز میں رقص کناں اکثر دکان کے قریب سے گزرتے اور اسی انداز میں مزار علی ہجویری تک جاتے۔ ایک روز حسو تیلی سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ خرام ناز بکھیرتے ہوئے شاہ حسین سے مخاطب ہوئے۔ ''اے لڑکے کیا اچھل کود مچا رکھی ہے یہ انداز مرغوب ہے تو کسی اور راستے سے جایا کر۔'' پھر وہ اپنے احباب سے زیرلب مخاطب ہوئے۔ ''یہ لڑکا شور تو بہت مچاتا ہے مگر مسجد نبوی ﷺ میں مجھے کبھی نظر نہیں آیا۔'' شاہ حسین نے سنا تو مطلق

Marfat.com

توجہ نہ دی اور بدستور اسی راستے سے گزر کر دربار علی ہجویری پر حاضری دیتے رہے۔ تین دن متواتر یہی ''تماشہ'' ہوتا رہا۔ چوتھے روز والی شب کا ذکر ہے کہ حسو تیلی مسجد نبوی میں دربار رسالت ﷺ کی برکات سے فیض یاب ہو رہے تھے کہ اچانک ایک کم سن لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور آغوش رسول ﷺ میں بیٹھ گیا۔ حضور ﷺ پر نور نے لڑکے کے سر پر دست شفقت رکھا پھر وہ لڑکا حسو تیلی کی طرف آیا اور ہمک کر ان کی گود میں جا بیٹھا۔ حسو موصوف نے سنتِ نبوی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے لڑکے کو پیار کیا۔ نور احمد چشتی سید العارفین میں رقم طراز ہیں کہ ''لڑکے نے طفلانہ حرکت کرتے ہوئے حسو موصوف کی ڈاڑھی پر ہاتھ مارا اور چند بال اکھیڑ لیے۔ چند روز بعد ایک بار پھر شاہ حسین حسب دستور رقص کناں چوک جھنڈا سے گزرے تو بزرگ درویش سے پھر نہ رہا گیا اور سرزنش کرنے والے لہجے میں کہا۔ ''لڑکے، تم اپنی حرکت سے باز نہیں آؤ گے؟''

شاہ حسین یہ لہجہ سن کر خاموش کھڑے ہو گئے اور زیر لب مسکراتے ہوئے حسو تیلی کے قریب آ گئے، پھر اپنی مٹھی کھول کر دکھائی۔ اس میں وہی بال تھے جو مسجد نبوی ﷺ میں اس کمسن بچے نے درویش کی ڈاڑھی سے نوچ لیے۔ اپنی ڈاڑھی کے بال پہچان کر حسو موصوف کا رنگ فق ہو گیا۔ حقیقت حال کا انکشاف ہوا تو وہ دم بخود رہ گئے پھر لپک کر شاہ حسین کو گلے لگا لیا اور بے اختیار پکار اٹھے، حسو حسین ہے اور حسین، حسو ہمارے خدام پر احترام حسین واجب ہے۔''

''۱۰۰۲ھ میں شاہ حسین سے چھ برس پیشتر حسو موصوف کا انتقال ہوا۔ لاہور شاہ جمال بستی میں آج بھی مزار موجود ہے اور وہاں کے سجادہ نشین (مع تیلی برادری) مادھو لال حسین کا ادب واحترام، اپنے پیر ومرشد کی طرح بجالاتے ہیں۔

عموماً فقراء کے مابین منافقت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ درویشی کی اساس ہی ''انا'' کے نیست و نابود کر دینے پر استوار ہوتی ہے مگر اس کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ داستان شاہ حسین ایک ایسے ہی درویش کے ذکر کے بغیر یقیناً ادھوری رہ جائے گی۔ اس درویش کا نام شیخ ارزانی ہے۔ شیخ بہلول دریائی کے شاگردوں میں شیخ ارزانی ایک بلند مرتبت نام ہے۔ علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ صاحب کشف و کرامت کے بزرگ تھے مگر جانے کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ شاہ حسین کے سلسلے میں وسوسوں کا شکار ہو گئے۔ یہی خیال بار بار آتا کہ شاہ موصوف کا مقام و مرتبہ ان سے بلند ہو گیا ہے لہٰذا ان کو روحانی کمالات سے زیر کرنا ضروری ہے۔ یہ ٹھان کر وہ شاہ حسین کے ڈیرے پر پہنچے۔ شاہ حسین اپنے پیر بھائی کو دیکھ کر دلی مسرت کا اظہار کیا۔ شیخ بہلول

Marfat.com

کی بات چلی تو گویا ساری رات چلی۔ دونوں نے اپنی اپنی منزل سلوک کا حال بیان کیا۔ دونوں ایک ہی شخصیت کے پروردہ تھے۔ اخفاو راز والی کوئی بات ہی نہ تھی۔ باتوں باتوں میں شاہ حسین کو مہمان کی آمد کے مقصد کا پتا چل گیا۔ روحانی مقابلہ ہر لحاظ سے نامناسب بات تھی لہٰذا شاہ حسین صاف طرح دے گئے۔

''میں چاہتا ہوں کہ ہم قرب خداوندی کے تعین کی خاطر' ایک دوسرے سے باطنی معرکہ آرائی کریں'' ۔ شیخ ارزانی نے کھل کر حرف مدعا بیان کیا۔

''بھائی! یہ کوئی مناسب بات تو نہیں کہ یہ اندازہ لگانے کی خاطر کہ کون رب العزت کے زیادہ قریب ہے' روحانی زور آزمائی کرتے پھریں شاہ حسین نے مناسب الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی مگر شیخ ارزانی بضد تھے کہ یہ ''مقابلہ'' ضرور ہونا چاہیے۔

''ایسا ہے تو پھر مجبوری ہے۔'' شاہ حسین نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہے کہ میں غائب ہوتا ہوں' آپ مجھے تلاش کریں۔'' شیخ ارزانی نے وضاحت پیش کی۔ '' مجھے اختیار ہے جس ذی روح کی شکل میں چاہوں ظاہر ہو جاؤں۔''

''یہ چمتکار تو ''جوگی'' بھی دکھا سکتے ہیں۔'' شاہ حسین نے سمجھانے والے انداز میں کہا ۔''اس سے قربِ خداوندی کا اظہار کیسے ہوگا؟ یہ محض شعبدہ بازی ہے۔''

بہرحال جو کچھ بھی ہے' آپ مجھے تلاش کرلیں گے تو میں آپ کے مقام و مرتبے کو تسلیم کرلوں گا۔'' یہ کہتے ہی شیخ ارزانی پرندے کی شکل اختیار کر کے' فضا میں بلندیوں میں پرواز کر گئے ۔حقیقت الفقراء کے مطابق شاہ حسین نے فوراً شہباز کی شکل اختیار کی اور چند لمحوں کی تیز پرواز کے طفیل' شیخ ارزانی کو جا دبوچا۔ ''اگر میں چاہوں تو تجھے تحت الثریٰ کی سیر کرادوں۔'' شاہ حسین نے کہا۔ ''مگر یہ مسلکِ درویشی کی توہین ہے' ہم لوگ خاک نشینی اختیار کر چکے ہیں اور اس فروتنی و عاجزی ہی میں ہماری بڑائی ہے۔'' پھر شاہ حسین' شیخ ارزانی کو سبق سکھانے کی خاطر فضا کی پہنائی میں گم ہو گئے اور شیخ ارزانی سرتوڑ کوشش کے باوجود بھی سراغ نہ پا سکے اور اپنی ہار تسلیم کر لی۔ اس شکست کے باوجود شیخ ارزانی اپنی ضد سے باز نہ آئے' آخر شاہ حسین نے سرزنش کرنے والے انداز میں حکم دیا کہ وہ پنجاب کی حدود سے نکل کر پٹنہ چلا جائے۔ شیخ ارزانی کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

شاہ حسین کی وفات کے بعد شیخ ارزانی لاہور پہنچے۔ غالباً ان کے دل میں شاہ حسین کی

Marfat.com

خلافت تھی مگر یہ منصب شیخ مادھولال کو سونپا جا چکا تھا لہٰذا درویش پٹڑی سے اتر گیا اور تربتِ حسین کی بے حرمتی تک بات جا پہنچے۔ اس مزار پر حاضر ہو کر قبر کو ٹھڈے مارے اور نخوت بھرے انداز میں لب کشا ہوا ''او جلا ہے' زیرِ زمیں بے خبر سونے والے' دیکھ آج میں شیر اور تو گیدڑ بن چکا ہے اس لیے کہ تُو بے بس ہے۔'' شیخ ارزانی کے متکبرانہ الفاظ کا ارتعاش ابھی اختتام پذیر نہ ہوا تھا کہ فضا میں گونج سنائی دی۔

''ارزانی! تجھ سے یہ توقع نہ تھی' تُو فنا و بقا کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ بے خبر انسان 'میں جولاہا ضرور ہوں مگر اللہ کی جو رکھنے والا یعنی جو بندہ' متلاشی' تو میرے مرشد بہلول کا فقیر ہے اور یہی نسبت مجھے روکے ہوئے ہے بہر حال اب تو واپس پٹنہ چلا جا بلکہ تجھے زبردستی بھیجا جائے گا''

ان دنوں شاہ حسین کا مزار دریائے راوی کے آس پاس شاہدرہ کے قریب تھا۔ شاہ حسین نے مغل بادشاہ اکبر سے خواب میں ملاقات کی اور صورتِ حال کی وضاحت کے بعد کہا۔ ''شیخ ارزانی میری تربت پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے اسے پٹنہ بھیج دیا جائے۔'' مغل شہنشاہ' اس خواب سے حیرت میں ڈوب گیا۔ شاہ حسین کے مقام سے وہ بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے تحقیق کرائی تو بات پایہ ثبوت کو پہنچی۔ شیخ ارزانی وقعی پٹنہ سے آکر مزار حسین پر براجمان تھا۔ اس نے ناظم لاہور کو حکم دیا کہ شیخ ارزانی کو لاہور سے پٹنہ روانہ کر دیا جائے۔

ناظم لاہور نے جب فرمان شاہی' شیخ ارزانی کے گوش گزار کیا تو شیخ کے ہوش اُڑ گئے۔ شاہ حسین نے ایسا پائیدار بندوبست کیا تھا جس سے فرار کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ اکبر کے حکم سے سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر شیخ ارزانی اشکِ ندامت بہاتا' مزار شاہ حسین سے لپٹ گیا اور اپنی زیادتیوں اور گستاخیوں کی معافی مانگنے لگا۔ بہر حال شاہی ملازموں نے اسے بصد احترام پٹنہ پہنچا دیا جہاں اسے وہ تمام مراتب میسر آ گئے جس کی اسے خواہش تھی۔ بہلول دریائی اور شاہ حسین کے ارادات مندوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہو گئی۔ شیخ ارزانی کا انتقال ۱۰۱۵ھ پٹنہ ہی میں ہوا۔ مزار محلہ سلطان گنج میں واقع ہے۔

اب پیشِ خدمت ہے شاہ حسین کی مادھولال سے داستانِ عشق یا تعلق خاطر کی تفصیل۔ یہ بات مستند ہے کہ شاہ حسین کی زندگی میں لفظ مادھو یا مادھولال ان کے نام کا حصہ نہیں تھا۔ وہ شاہ حسین یا حسین ڈاہڈا کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ سفرِ آخرت اختیار کرنے کے چند برس

Marfat.com

بعد عوام الناس میں مادھولال' ان کے نام کے ساتھ مستعمل ہوا اور اس انداز میں یہ نام زبان خاص و عام ہوا کہ لوگ دونوں کے اصل ناموں ہی کو فراموش کر بیٹھے اور مادھولال سے مراد شاہ حسین کی شخصیت قرار دی جانے لگی۔ ان کی شاعری میں لفظ لال جس سے مراد مادھولال ہے صرف ایک بار مستعمل ہوا یعنی

پیارے لال کیا بھرواسا دم دا
اڈیا بھور تھیا پردیسی اگے راہ اگم دا

(پیارے مادھولال سانس کا کوئی اعتبار نہیں۔ طائر (روح) محو پرواز ہوا تو ان دیکھی دنیا اس کے سامنے ہوگی)

زندگی میں شاہ حسین کا نام حسین ڈاہڈا یا شاہ حسین تھا۔ ''مادھولال حسین'' ان کی وفات کے بہت بعد زبان زد خاص و عام ہوا۔ حسنات العارفین از دارشکوہ جو درویش کی وفات کے چھ برس بعد لکھی گئی' اس میں ''مادھولال حسین'' والا نام استعمال نہیں ہوا۔ اس داستان عشق کے متعلق دوسری اہم بات' حد سے زیادہ حاشیہ آرائی ہے۔ بعض حضرات نے مادھولال برہمن بچے کو ''کمسن لونڈا'' ظاہر کیا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مادھولال برہمن نوجوان سے پہلی ملاقات کے وقت شاہ حسین' عمر عزیز کے ۵۲ ویں برس میں قدم رکھ چکے تھے۔ گویا عالم پیری کا آغاز ہو چکا تھا اور ''حکم حضوری'' پہنچنے میں صرف سات برس باقی تھے۔ (شاہ حسین کا انتقال پر ملال تریسٹھ برس کی عمر میں ہوا)

راوی کے اس پار شاہدرہ میں ایک برہمن خاندان آباد تھا مادھولال اسی خاندان کا خوبصورت شادی شدہ نوجوان تھا جس کی عمر تقریباً اٹھارہ برس تھی۔ شاہ حسین ''کوچہ ملامت'' میں عرصہ بیس برس سے محو خرام تھے۔ ''ہندو بچے'' پر نظر پڑی تو دم بخود رہ گئے۔ اتنی نورانی صورت اور جہنم کا ایندھن بنے؟ بس اسی خیال سے دنیائے دل زیر و زبر ہوگئی۔ ادھر مادھولال بھی حسن جہاں سوز کے ساتھ گداز دل کا مالک تھا۔ شاہ حسین عالم سکر میں اپنے دوست احباب کے ہمراہ دریا پار تک جا پہنچے۔ مسلک ملامت تو پہلے ہی اپنا چکے تھے مادھولال کی قیام گاہ کا طواف شروع ہوا تو شہر میں گویا زلزلہ آ گیا۔ چھپن برس تک تجرد کی زندگی گزارنے والا جوگلی کوچوں میں مست الست رقص کناں گھومتا رہتا تھا' جسے دنیاوی حکمران زیر کر سکے نہ مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری جیسا عالم دین' لاجواب کر سکا' جس کے آستانے پر دربار اکبری کے نورتن حاضری دینا باعث عز و شرف

Marfat.com

گردانتے تھے' جو رات رات بھر' دریائے راوی کی موجوں کو تلاوت کلام پاک سے محفوظ و مسرور کیا کرتے تھا' ایک برہمن زادے کے عشق میں گرفتار ہو گیا اور وہ بھی عالم پیری میں۔ لاہور کے گلی کوچوں میں بس یہی موضوع سخن تھا۔ شاہ حسین نے مسلک ملامتیہ کے پیش نظر اس رسوائی کا طوق بھی دلی مسرت کے ساتھ زیب گلو کیا۔

شاہ حسین کا معمول تھا کہ رات ڈھلتے ہی برہمن زادے کے مکان کا طواف شروع کر دیتے اور اہل خانہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کی تفصیل' بہ آواز بلند' سر عام دہرا دیتے۔ یہ مادھو لال کے لیے لمحہء فکریہ تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا تجسس بیدار ہوا اور وہ اس رند مشرب درویش کی جانب مائل ہونے لگا۔ یہ جان پہچان گرویدگی میں بدل گئی اور برہمن زادہ بھی رندوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ کون سا جلوہ تھا' وہ کون سی کشش تھی جس نے مادھو لال کی کایا پلٹ دی؟ دنیا نے یہی دیکھا کہ خود مادھو لال بھی رنگ شاہ حسین میں رنگا گیا ہے۔ مسلسل دو برس اس تعلق کو برہمن زادے نے پوشیدہ رکھا مگر یہ ساری داستان خوشبو کی طرح پھیل گئی اور لوگوں نے اس داستان میں وہ سارے رنگ بھر دیے جو بھرے جا سکتے تھے' وہ سارے مفہوم اجاگر کر دیے گئے جو اجاگر کیئے جا سکتے تھے۔ ادھر برہمن خاندان ہدف ملامت ہوا۔ طعن و تشنیع' رسوائی اور تہمت کے قلعہ بند خاندان کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ اس دور ابتلاء میں لوگوں نے رائی کا پہاڑ اور بات کا بتنگڑ بنایا۔ دنیا تو کچھ نہ ہونے سے سب کچھ بنا لیتی ہے اور یہاں تو بنانے کے لیے بظاہر سب کچھ تھا۔ مادھو لال اور شاہ حسین دن رات اکٹھے رہتے تھے۔

بظاہر مٹی پانی اور ہوا اور گلاب میں کوئی قدر مشترک نہیں مگر ہم سب جانتے ہیں کہ پھولوں کی نمو ان ہی عناصر سے معرض وجود میں آتی ہے۔ پھول اپنی خوشبو اور رنگ' ان عناصر ہی سے حاصل کرتا ہے اور پھول پودے تلے کی مٹی بھی خوشبودار ہو جاتی ہے۔ یہ گلوں کی قربت کا اعجاز ہے۔ اسی طرح مادھو لال نے شاہ حسین کے سارے رنگ اخذ کر لیے اور ساری خوشبو فصیل جاں میں جذب کر لی۔ وہ مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا مگر اس اعلان کے لیے جس جرات رندانہ کی ضرورت تھی وہ اس میں موجود نہ تھی۔ اس معاملے میں راہبر بھی کام نہیں آتا۔ یہ سفر تنہا ہی طے کرنا پڑتا ہے۔ راہبر صرف دو گام سہارا دے سکتے ہے۔ اگر اعلان بھی راہبر ہی کی جانب سے ہو تو جبر و اکراہ والی بات بن جاتی ہے۔ اور دین میں اس کی اجازت ہے نہ جواز۔

برہمن خاندان اس طوق رسوائی سے تنگ آ گیا تو وہی فیصلہ کیا گیا جو حالات کا تقاضا تھا

Marfat.com

یعنی ''تنگ آمد بجنگ آمد'' مادھولال اور شاہ حسین کے قتل کا فیصلہ ہو گیا۔ شاہ کے مخالفین ہندو جو شیلے نوجوان کیل کانٹے سے لیس' دونوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ خبر ملی کہ شاہدرہ کے ایک مکان میں شاہ حسین اپنے حواریوں کے ساتھ ''رنگ رلیاں'' منا رہے ہیں۔ ایک کمرے میں مادھو لال اور درویش محو ناؤ نوش ہیں۔ دس مسلح افراد روز روز کی اس داستان کل کل کو ختم کرنے کے لیے آندھی طوفان کی طرح' اس مکان پر حملہ آور ہوئے۔ مکان کو نرغے میں لے لیا گیا مگر یہ دیکھ کر حملہ آور حیران و ششدر رہ گئے کہ اس مکان کا تو کوئی دروازہ ہی نہیں۔ سیدھی سپاٹ دیواریں' کھڑی ان کا منہ چڑھا رہی تھیں۔ ایسا تو کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ بستی کا وہ مکان سب کا دیکھا بھالا تھا۔ پڑوس کے لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی' سب نے اقرار کیا کہ مکان پرانا ہے اور اس میں دروازے کھڑکیاں موجود ہیں۔ یہ تماشا سب نے دیکھا اور ہجوم ورطہ حیرت میں ڈوبا۔ حملہ آور بے نیل مرام 'ناکام و نامراد' اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ بس پھر تو یہ تماشا اکثر و پیشتر دہرایا جانے لگا۔ لاہور شہر میں جہاں جہاں سے خبر ملتی کہ شاہ حسین اپنے منظور نظر کے ہمراہ ''رنگ رلیاں'' منا رہے ہیں' حملہ آور وہاں پہنچ جاتے۔ کبھی مکان غائب پاتے کبھی درو دریچہ غائب ہوئے۔

ہندوؤں نے اسے جادو قرار دیا لہذا اپنے ''ماہرین فن'' کی معاونت کے طلبگار ہوئے۔ مگر یہ جادو ایسا تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سب کچھ سب کے سامنے تھا مگر جادوگر بھی عاجز آ گئے۔ کسی کے پاس اس کا توڑ نہیں تھا۔ برہمن خاندان خون کے گھونٹ پینے پر مجبور ہوا۔ ادھر مادھولال اپنے عزیز و اقرباء سے سارے تعلق توڑ چکا تھا۔ اس کا مرنا جینا اب شاہ حسین کے ساتھ تھا۔ قبول اسلام کی خبر بجلی بن کر برہمن خاندان پر گری۔ مادھولال کے خاندان نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور اپنے ''کپوت'' سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ یہ ۱۰۱۵ھ کا واقعہ ہے شاہ حسین عمر عزیز کے ۶۰ ویں برس میں قدم رکھ چکے ہیں اور مادھولال بیس برس کا خوبرو نوجوان تھا۔

سانپ گزر جائے تو اس کی لکیر باقی رہ جاتی ہے اسی طرح مادھولال اپنے آبائی مذہب سے قطع تعلقی کے باوجود پرانی رسوم و قیود سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ ہولی بیساکھی وغیرہ آتے تو اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ شاہ حسین اس ''بچپنے'' پر مسکرا کر رہ جاتے۔ یہ بات مستند ہے کہ انہوں نے اپنے ''نو گرفتار'' بالک پر کبھی کوئی قدغن نہ لگائی بلکہ بسا اوقات اس ''کھیل تماشے'' میں خود بھی مادھولال کے ساتھ شریک ہوئے۔ ان کا مسلک ہی یہی تھا۔ بیساکھی کا تہوار آیا۔ برہمن خاندان شاہدرہ لاہور سے ''گنگا سفر'' پر روانہ ہوا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ گنگا اشنان

Marfat.com

سے ان کے پاپ ایسے جھڑ جاتے ہیں جیسے خزاں میں سوکھے پتے۔ یہ عقیدہ زیر بحث نہیں اسی کا نام تو اندھی تقلید ہے۔ اور جب بصارت ہی نہ رہے تو قوت مدرکہ محروم ہو جائے تو سب کچھ ''مرحوم'' ہو جاتا ہے خیر! مادھولال ''گنگا اشنان'' کی ضد کرنے لگا۔ اس بالک ہٹ پہ مرشد زیر لب مسکرایا۔

''گنگا اشنان کی آخر ضرورت کیا ہے؟'' شاہ حسین نے بڑی رسان سے پوچھا۔

''بس میرا جی چاہتا ہے کہ میں سب کے ساتھ مل کر گنگا میں نہاؤں۔'' مادھولال نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تو اس کے لیے کالے کوسوں کا سفر کرنا کوئی دانش مندی تو نہیں۔'' شاہ حسین نے عجیب وغریب حل پیش کیا۔ بات مادھو کی سمجھ میں آئی تو دھک سے رہ گیا اور حرف مدعا ہونٹوں تک آ ہی گیا۔

''گنگا ماتا تو سفر کرنے سے رہی۔ وہ تو کان پور کے اس پار ہے، بہت دور بہہ رہی ہے۔ ہم سفر نہیں کریں گے تو...... تو یہ سب کیسے ہوگا؟''

عزیزم! اگر گنگا ماتا سفر کرنے سے معذور ہے تو ہم بھی نہیں جائیں گے مگر تم گنگا اشنان ضرور کرو گے یہ میرا وعدہ رہا۔'' شاہ حسین کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ مادھولال خاموش ہو گیا۔ اس کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ کوئی انہونی بات ہونے والی ہے۔

''گنگا اشنان والے دن تم ہمیں یاد دلا نا دینا' تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔'' شاہ حسین نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

برہمن خاندان اور دوسرے ہندو سفر پر روانہ ہو گئے۔ گنگا اشنان والا دن آیا تو مادھولال نے دھڑکتے دل کے ساتھ شاہ حسین کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ ''آج سب لوگ گنگا میں نہار ہے ہوں گے۔''

شاہ حسین حجرے میں کھڑے ہو گئے اور اپنا پاؤں آگے بڑھا کر کہا۔ ''میرے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ کر آنکھیں بند کر لو۔'' مادھولال نے اس حکم کی تعمیل کی۔ ''اب آنکھیں کھولیں تو وہ کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے دریا گنگا بہہ رہا تھا اور مادھولال کا خاندان اس میں نہا رہا تھا۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے؟'' مادھو نے لکنت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہ راز ربانی ہے' بس تم خاموش رہو۔'' شاہ نے انگشت شہادت کھڑی کر کے اسے لب بستہ رہنے کی تلقین ''تم جا کر اشنان وغیرہ سے فارغ ہو لو' میں اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا

Marfat.com

ـ'' مادھولال کا خاندان بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ والدین کے دل میں یہ خیال آیا کہ شاید ان کا لخت جگر اپنے کیئے پہ پچھتا رہا ہے۔ پرانے تعلقات کو توڑنا اور رسوم وقیود سے رہائی حاصل کرنا 'بڑا ہی دشوار مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ رسم ورواج کی زنجیریں بڑی مضبوط ہوتی ہیں۔ سچائی کی طرف جانے میں سب سے بڑی رکاٹ یہی رسوم کی پابندی ہے۔ ہر دور کے افراد نے یہی بے تکا جواب دیا ''ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایسا ہی کرتے پایا' اب ہم اس کی مخالفت کیوں کریں۔ ہمارے اجداد کے افعال ہی ''سچائی'' ہیں۔''

مادھولال اشنان سے فارغ ہوا تو شاہ حسین نے حسب سابق اسے اپنے پاؤں پر پاؤں رکھنے کا حکم دیا۔ آنکھیں بند ہوئیں اور پل بھر بعد کھول دی گئیں۔ وہی لاہور تھا' وہی حجرہ' وہی طالب ومطلوب۔ پھر یوں ہوا کہ مادھولال گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ''اب کیا ہے عزیزم؟'' شاہ حسین نے مسکرا کر پوچھا۔

''وہ میری چھڑی گنگا کنارے ہی رہ گئی۔'' مادھولال نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''اب ہم گنگا کنارے نہیں جائیں گے'' شاہ نے عمداً تنگ کرنے والے لہجے میں کہا۔

''مگر میری چھڑی تو بڑی قیمتی ہے'' مادھو نے مایوسی سے کہا۔'' آرام سے بیٹھو' گنگا تمہاری چھڑی لے کر بس آتی ہی ہوگی۔''

''یہاں' یعنی اس حجرے میں؟'' مادھو نے بڑے حیرت سے اپنے رہنما کی طرف دیکھا ۔شاہ حسین نے مسکرا کر اپنے مصلّے کا کونا اٹھایا تو مادھو پھر ورطہ حیرت میں ڈوب گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہی کنارا ہے وہی گنگا گھاٹ اور اسے اپنی چھڑی بھی نظر آ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اپنی چھڑی قابو کی مگر اس بار ان محیر العقول واقعات کی تشریح بھی طلب کی۔ ''بڑی شے چھوٹی شے میں کیسے سما سکتی ہے'' مادھو نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''جیسے آسمان کی وسعتیں' آنکھ کی پتلی میں سما جاتی ہیں' میری آنکھوں میں دیکھو' تمہیں اپنا چہرہ میری آنکھ کے ''تل'' میں نظر آئے گا۔ اسی طرح دل بظاہر چھوٹی سی شے ہے مگر بے کراں کائنات' اس کے ایک گوشے میں سما جاتی ہیں'' شاہ حسین کی گفتگو سے مادھو مطمئن ہو گیا۔ وہ حجرے سے باہر آیا تو ایک بدلا ہوا انسان تھا۔ حق وباطل میں تمیز کرنے والا انسان اور اس میں تمیز کرنے کی جرات بھی پیدا ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس نے اپنے ''حلقہ بگوش اسلام'' ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان کے بعد بھی شاہ حسین نے اپنے منظور نظر پر پرانی رسومات ادا نہ کرنے کی

Marfat.com

پابندی عائد نہیں کی۔ بسنت، پنچمی، ہولی پر رنگ وغیرہ پھینکنا۔ ہولی دیوالی وغیرہ کے تہوار منائے جاتے رہے۔ دیوالی کے موقع پر چراغاں بسنت کے تہوار پر پتنگ بازی، ہولی کے ایک موقع پر تو مادھو نے اپنے مرشد کے لباس کو بھی رنگین کر دیا۔ احباب شاہ حسین، مادھو کی خوشنودی کے لیے ان تہواروں میں حصہ لیتے۔ پس مرگ مزار شاہ حسین پر میلہ چراغاں بڑی دھوم دھام سے لگا کرتا تھا۔ یہ میلہ چراغاں اس دور کی یاد تازہ کیا کرتا تھا۔ اس میلے کی باقیات آج بھی موجود ہیں مگر قیام پاکستان کے بعد رفتہ رفتہ جوش و ولولے میں کمی آتی چلی گئی۔ آج صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ پہلوانوں کے دنگل، بٹیروں کی پالیا اور دیگر رونقیں قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔

شاہ حسین کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بہت کچھ تعلیم کیا جا چکا تھا مگر بہت کچھ ابھی باقی تھا۔ ادھر وقت کہ پر لگا اُڑا جا رہا تھا۔ مادھو لال صاحب ''قال'' تو ہو چکا تھا مگر ابھی اسے صاحب ''حال'' بننا تھا۔ آخر جس لمحے کا شاہ حسین کو انتظار تھا وہ آ پہنچا۔ پہلے ظرف کی وسعت مقصود تھی ''دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر'' والی بات تھی۔ ظرف چھلک جائے تو اپنے ساتھ گردو پیش کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ بابو پورہ (موجودہ باغبان پور) کا بابو ڈھڈی بستی کا محترم رئیس اور شاہ حسین کا عقیدت مند تھا۔

''مادھو لال میرے عزیز! چلو بابو پورہ چلیں'' ایک روز شاہ حسین نے کہا ''کنج تنہائی میں باتیں ہو گئیں''۔

''اور کون کون ساتھ ہو گا؟'' مادھو نے بر سبیل تذکرہ پوچھا۔

''اس سفر میں ہم دونوں تنہا ہوں گے، گوشہ عافیت کا انتظام کر لیا گیا ہے'' شاہ نے معنی خیز مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''کوئے ملامت میں رسوائی بھی تو ہو گی'' مادھو لال نے سر جھکا کر یاد دلایا۔

''ان بکھیڑوں سے بہت دور جانے کا وقت آ گیا ہے۔ رسوائی، ملامت، تہمت ان باتوں کی پرواہ نہ کیا کرو۔'' مادھو لال کی تسلی ہوئی تو اس نے سر تسلیم خم کر دیا۔ ویسے بھی وہ اتنا کچھ دیکھ چکا تھا جو اس کی سات پشتوں کو حیرت زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ دونوں بابو پورہ پہنچے۔ بابو ڈھڈی دیدہ دل فرش راہ کیے بیٹھا تھا۔ اس نے تکمیل ارشاد میں الگ مکان کا بندوبست کر دیا اور سامان عیش و طرب بھی فراہم کیا۔ شاہ حسین اپنے منظور نظر کو لے کر کمرے میں داخل ہوئے اور اپنے عقیدت مند بابو ڈھڈی کو تلقین کی ''آج رات کوئی اس طرف نہ آئے، ہم مکمل تنہائی چاہتے

Marfat.com

ہیں'' شاہ کی یہ بات البتہ عقیدت مند کو ہضم نہ ہو سکی۔ عموماً محفل ناؤ نوش میں دوسرے بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اسے وسوسوں نے آ گھیرا'' یہ عمر رسیدہ درویش اور اس کا خوب رو مرید آخر تنہائی میں کیا کرنے والے ہیں؟'' بابو ڈھڈی کی دلی کدورت' خیالات کا لبادہ اوڑھنے لگی۔ انسان حسب منشا اشیا کو دیکھنے کا خواہش مند رہا ہے اور رہے گا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ انوکھی بات تو یہ بھی نہیں کہ تاریکی میں اپنے خیالات ہی مختلف روپ دھار کر ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ چشم تصور کی کرشمہ سازیوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔

شاہ حسین نے کمرے میں جلنے والا چراغ بھی گل کر دیا۔ مادھولال نے حیران ہو کر پوچھا'' یہ چراغ کیوں گل کر دیا؟''

'' اس کی ظاہری ضرورت آنکھ کو ہوتی ہے' ویسے بھی یہ بزم طرب ہے اور خوشی کی محفل میں جلنے والوں کا کیا کام؟'' جواب تو بڑا مدلل اور خوب صورت تھا مگر مادھولال کی تشفی نہ ہوئی لہٰذا مرشد نے چراغ روشن رہنے دیا۔ محفل راز و نیاز کا آغاز ہوا۔ ادھر بابو ڈھڈی اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا اور دروازے کے کیواڑ کی درز میں سے اندر جھانکنے لگا۔ جو کچھ اسے نظر آیا وہ ضرورت سے زیادہ تھا' شاہ حسین کے ہونٹ مادھولال کے رخسار کے قریب تھے۔ وہ اس دھماکہ خیز منظر کی تاب نہ لا سکا اور بھاگم بھاگ اپنے دوستوں کے پہنچا۔

'' اندر تو بڑی خرابی والی باتیں ہو رہی ہیں'' اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔ انہی احباب میں غالب جنگ نامی صاحب ظرف و شرف انسان بھی موجود تھا۔ اس نے بابو کو ٹوکا'' سوئے ظن سے پرہیز کرو۔'' آنکھ کی گواہی اکثر دھوکا دے جاتی ہے۔ پھر دوسروں کے معاملات میں مداخلت' شرفا کا شیوہ نہیں''۔

'' اچھا تو شریف انسان! تم خود جا کر سارا '' تماشا'' اپنی آنکھوں سے دیکھ لو''۔ بابو نے زہر خنداں سے جواب دیا'' اندر تو رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں''۔

'' مجھے دیکھنے کی ضرورت ہے نہ تمنا'' غالب جنگ نے عجیب سے لہجے میں کہا'' میں یہیں بیٹھے بیٹھے ہر چیز کا مشاہدہ کر سکتا ہوں''۔

'' تو گویا آپ بھی مقام ولایت پر فائز ہیں' اچھا بتائیں اندر کیا ہو رہا ہے؟'' بابو نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

'' شاہ حسین اپنے مرید کو رازہائے ربانی تعلیم کر رہے ہیں اور یہ بڑے نصیب کی بات

Marfat.com

ہے'' غالب جنگ نے تمسخرانہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا'' اگر یقین نہ ہو تو ایک بار پھر جا کر اندر جھانکو' تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔''

'' میں ایسا ضرور کروں گا کیوں کہ اب منظر اپنے '' عروج '' پر ہوگا'' ان الفاظ کے ساتھ بابو ڈھڈی در حجرہ پر پہنچا اور کیواڑ کے سوراخ سے آنکھ لگا کر اندر جھانکنے لگا۔ رفتہ رفتہ منظر کی دہشت سے ان کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ وہ بمشکل اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکا۔ اندر نہ مادھو لال تھا نہ شاہ حسین' بلکہ دو خونخوار شیر بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بابو گرتا پڑتا' اپنے دوستوں کے قریب آیا اور بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ غالب جنگ اسے ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے بابو ڈھڈی '' وقفہ تسلیم و رضا '' سے عالم مدہوش میں آیا تو شدت خجالت سے وہ زمین میں گڑا جا رہا تھا '' مجھ سے پہاڑ ایسی غلطی ہوئی '' اس نے ندامت سے سر جھکا کر اعتراف کیا'' خدا مجھے معاف فرمائے' میں نے کیا دیکھا اور کیا سمجھا؟ واقعی سوئے ظن' انسان کو تباہ و برباد کر دیتا ہے' اب خدا جانے میرا کیا حشر ہوگا؟''

شاہ حسین نے اپنے منظور نظر کو کیا کچھ تفویض کیا؟ اس کی تفصیل کون بیان کر سکتا ہے؟ اس بات کا دعوٰی کرنا تو مضحکہ خیز ہے البتہ بعد کے شواہد سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ مرد کامل کی نگاہ نے' مادھو کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ چند باتیں منظر عام پر ضرور آئیں مثلاً یہ کہ مادھو اس راز ربانی کی تا دم آخر حفاظت کرے گا۔ فقراء والے طور طریقے اپنائے گا نہ لباس ان جیسا زیب تن کرے گا' اور سب سے اہم بات کہ ایک عام دنیا دار کی طرح زندگی بسر کرے گا۔ رزق حلال کے لیے ملازمت اختیار کرنا پڑی تو وہ بھی اختیار کرے گا۔ شاہ نے اپنے مرید باصفا کو اپنے سفر آخرت کے متعلق بھی آگاہ کر دیا اور واضح الفاظ میں اڑتیس برس کی عمر تک درویشی سے دور رہنے کی تلقین کی۔

'' میری موت کے تیرہ برس بعد میرے مزار پر آ جانا'' شاہ نے دوٹوک الفاظ میں کہا'' اس وقت تمہاری عمر اڑتیس برس ہو گی اور یہی تمہاری درویشی کے ظاہری دور کا آغاز ہے۔'' اس طرح مادھو لال کی ساری زندگی کی منصوبہ بندی کی گئی۔ مادھو لال اب '' مقامات حیرت '' سے آگے نکل چکا تھا۔ اس نے ساری باتیں بغور سنیں اور ان پر حرف بحرف عمل پیرا ہونے کا وعدہ کیا۔ شاہ حسین نے اسے مغل فوج میں شمولیت اختیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ بات البتہ ناقابل فہم سی ہے۔ اس کی عقلی دلیل تو یہی دی جا سکتی ہے کہ شاہ حسین اپنے منظور نظر کو' لاہور سے دور بھیج

Marfat.com

دینا چاہتے تھے۔ ممکن ہے' مادھولال اور شیخ ارزانی میں ممکنہ چپقلش کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہو یا اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاہ حسین کی اپنی شخصیت متنازعہ فیہ بن چکی تھی اور وہ حاکم وقت' دین الٰہی کے موجد اور سر پھرے اکبر سے ٹکراؤ نہ چاہتے ہوں ایک بار تو حاکم وقت خفت سے دو چار ہو چکا ہے مگر دوبارہ ٹکراؤ کی صورت میں مادھولال بھی زد پر آ سکتا تھا۔ خلافت شاہ حسین پر شیخ ارزانی کی دیرینہ خواہش کا تدارک تھا یا معروضی حالات کا تقاضا' اس کے متعلق صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے بہر حال یہ بات مستند ہے کہ مادھولال افواج اکبری میں شامل ہو گیا۔ فوج کا یہ حصہ راجا مان سنگھ کی زیر کمان تھا۔ اور راجا مان سنگھ ان دنوں اڑیسہ سے ملحقہ علاقے 'دکن کو زیر کرنے میں مصروف تھا۔ یہ علاقہ لاہور سے کالے کوسوں دور تھا۔ مادھولال بادل ناخواستہ فوج میں بھرتی ہو کر راجا مان سنگھ کے پاس جا پہنچا۔

حکمت ربانی ملاحظہ ہو کہ شاہ حسین' مغل شہنشاہ اکبر سے دلی نفرت کے باوجود اس کی افواج کا دوبار مددگار ثابت ہوا۔ ایک جب ابوالفضل' عبدالرحیم خان خاناں کو لے کر دربار درویش میں حاضر ہوا اور دوسر بار تو اس نے اپنے منظور نظر مادھولال کو راجا مان سنگھ کے حوالے کر دیا۔ تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ معاونت' واقعی بر وقت اور اشد ضروری تھی۔ خان خاناں کے ہاتھوں فتح سندھ کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ دکن مہمات کے دوران مادھولال کے موجودگی بھی بے حد ضروری ثابت ہوئی۔ غیر منقسم ہندوستان کا یہ دور افتادہ علاقہ ہر دور میں نا قابل تسخیر نہیں تو خطرناک ترین علاقہ ضرور رہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بیرونی حملہ آور آرین تک یہاں نہ پہنچ پائے۔ علاؤالدین خلجی پہلا ارادے کا پکا انسان تھا جو اس علاقے پر حملہ آور ہوا۔ ان دنوں وہ اکڑہ (الہ آباد) کا گورنر تھا۔ جنوبی ہند یعنی دکن کے علاقے تک کی رسائی لیے پانچ رکاوٹیں عبور کرنا پڑتی تھیں۔ کوہ ست پڑا اور کوہ بندھیاچل دو پہاڑ' دو شوریدہ سر دریا یعنی دریائے نربدا اور تاپتی' ان کے بعد ایک مہیب گھنا جنگل تھا جسے ''ڈنڈک'' کہتے تھے

۔ اب یہ مہم راجا مان سنگھ کو سر کرنا تھی اور مادھولال' شاہ حسین کا منظور نظر' اس کی فوج کا ادنیٰ سپاہی تھا

راجا مان سنگھ افواج اکبری کا قابل اعتبار سپہ سالار' مزاجاً مسلمانوں کی طرف مائل تھا ۔ شہزادہ سلیم کا برادر نسبتی بھی تھا۔ دین اسلام کی طرف اس کے فطری رجحان کے سلسلے میں دو ایک مشہور واقعات سپرد قلم کئے جاتے ہیں۔ عہد اکبری ایک لادینی دور تھا۔ مذہبی رواداری اور چیز ہے مگر دین کی جڑوں پر وار کرنا چیزے دیگر است۔ ''مذاہب کا تقابلی جائزہ'' اس موضوع کے تحت

Marfat.com

مناظروں کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک اچھی رسم تھی مگر اس کا مآل اچھا ثابت نہ ہوا۔ خیر آمدن برسر مطلب' اسی قسم کے ایک مناظرے میں راجا مان سنگھ کو کرسئ انصاف پر بٹھا دیا گیا' یہ ایک سید اور برہمن کے درمیان' دلائل کی جنگ تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے دین کے حق میں دلائل دئے۔ ہندو برہمن کو پورا یقین تھا کہ فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔ مناظرے کے بعد جب راجا اپنا فیصلہ سنانے لگا تو وہ بھی مخمصے کا شکار ہو گیا۔ ایک طرف سچائی تھی تو دوسری طرف' تعصب' ایک طرف جذبات تھے تو دوسری طرف فہم و فراست۔ آخر اس نے فراست سے کام لیتے ہوئے کہا ''میں کوئی عالم فاضل شخص تو نہیں' عملی انسان ہوں۔ ہندوؤں میں ایک شخص خواہ کتنا ہی بلند مرتبت ہو' اس کی موت کے ساتھ ہی اس کے فیوض و برکات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ ہندو لاش کو جلا کر اس کی راکھ تک بہا دیتے ہیں گویا خود اس کی شخصیت کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا اہتمام کرتے ہیں' جب کہ مسلمانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس مذہب میں بلا امتیاز زندہ متقی' مرنے کے بعد' اس کی لاش کو بڑے احترام سے نہلا کر سپرد خاک کر دیا جاتا ہے۔ ہر شہر میں ایسے ایسے بزرگان دین کے مزار موجود ہیں جہاں ذہنی آسودگی کی خاطر مخلوق ہر پل ہر لحہ جا سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندو اپنے مرنے والوں سے دشمن جیسا سلوک کرتے ہیں اور مرنے والا بھی شاید اسی کا بدلہ لیتا ہے چنانچہ شمشان گھاٹ میں رات ڈھلتے ہی بھوتوں کا راج شروع ہو جاتا ہے۔''

راجا مان سنگھ نے اپنی عقل کے مطابق اسلام کی فوقیت کے حق میں فیصلہ دے دیا اور دلیل بھی لاجواب دی۔ اسی طرح چکرورتی راجا کی گوشمالی کے لیے جب مان سنگھ نے بنگال پر چڑھائی کی تو مونگیر کے مقام پر ایک صاحب حال و کمال شخص ''شاہ دولت'' کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب نے دعائے خیر و برکت کے بعد اس کے ذہنی رجحان کے مدِ نظر' راجا کو دین اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ مان سنگھ نے کہا ''شاہ صاحب! ختم اللہ علیٰ قلوبھم'' کے مصداق میرا دل مقفل ہو چکا ہے' آپ اپنی توجہ سے یہ قفل شقاوت کھول دیں' میں ابھی اسلام قبول کر لوں گا۔'' یہ کہا اور راجا مان سنگھ اسی جگہ پر دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ ایک دو دن نہیں پورا ایک ماہ گزر گیا۔ وہ ''مقفل'' کھلنا تھا نہ کھلا۔ بعض لوگ شاہ دولت کو دوش دیتے ہیں' بعض کے خیال میں' مان سنگھ بدنصیب تھا' امر واقعہ کیا تھا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

مادھو لال ایک عام سپاہی کے روپ میں مان سنگھ کے لشکر میں موجود تھا۔ جب مغل افواج کا دکنی فوج سے ایک زبردست معرکہ ہوا۔ اس وقت دکنی فوج کی سربراہی مشہور و معروف

Marfat.com

حبشی جرنیل ''عنبر'' کر رہا تھا جو فنون سپہ گری میں اپنی مثال آپ تھا۔ سالار باصلاحیت ہو تو فوج کی کارکردگی بے مثال ہوتی ہے۔ دکنی فوج اس بے جگری سے لڑی کہ مغل فوج کے پاؤں اکھڑ نے گئے' مان سنگھ کے تو ہوش اڑ گئے۔ فوج میں بھگدڑ' متعدی بیماری کا درجہ رکھتی ہے۔ دیکھا دیکھی سپاہی بھاگنے لگے۔ مان سنگھ گھوڑا دوڑائے کبھی ادھر جاتا کبھی اُدھر۔ اچانک محسوس ہوا کوئی نادیدہ ہاتھ' اس کے کاندھے پر موجود ہے۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو سوچا کہ میں تو گھوڑے پر سوار ہوں' اور کوئی شخص اتنا بلند قامت کیسے ہو سکتا ہے جو گھڑ سوار کے کاندھے پر ہاتھ رکھ سکے'' پھر اس کی نظر ایک ایسے سپاہی پر پڑی جو بڑی بے فکری سے میدان جنگ میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ یہ مادھولال تھا' مان سنگھ اس کے مقام و مرتبے سے قطعاً نا آشنا تھا۔ مگر اس کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یہ سپاہی کوئی خاص چیز ہے۔ ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' کے مصداق راجا نے رحم طلب نگاہوں سے مادھولال کی طرف دیکھا ''فکر و اندیشے کی کوئی ضرورت نہیں'' مادھو نے حرف تسلی سے نوازا۔ اب تو مان سنگھ کو یقین آ گیا کہ سپاہی کوئی غیر معمولی شخصیت ہے۔ وہ فوراً گھوڑے سے کود کر نیچے اترا اور مقام و مرتبے کو پسِ پشت پھینک کر دست بستہ' مادھو کے سامنے کھڑا ہو گیا ''مہاراج! مجھے تباہ و برباد ہونے سے بچالیں۔''

''راجا مان سنگھ' تم فوج کے سپہ سالار ہو' ہوش میں آ جاؤ۔'' مادھولال نے سرزنش کی ''اس بندہ ناچیز نے کہہ دیا ہے کہ کامیابی تمہارے نام لکھ دی گئی ہے' اور خدا اپنے حقیر بندے کو جھوٹا ثابت کر کے رسوا نہیں کرے گا۔''

''مگر حضور! یہ سارے بزدل تو بھاگے جا رہے ہیں' مان سنگھ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

مادھولال نے آنکھیں بند کر کے زیر لب کہا ''یا حضرت! اب کیا کروں؟''

شاہ حسین اس وقت لاہور میں دوست احباب کی محفل سجائے بیٹھے تھی۔ اچانک انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا' پھر اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے ''حضرت! میں تھوڑی دیر کیلئے بہ امر مجبوری باہر جا رہا ہوں'' انہوں نے حاضرین مجلس سے معذرت چاہی '' آپ لوگ تشریف رکھیں' میں ابھی حاضر ہوا۔''

''حضرت! کدھر کے ارادے ہیں؟'' یکے از حاضرین نے دریافت کیا۔

''بس ابھی کچھ ایسی ہی بات ہے'' یہ کہہ کر شاہ حسین تیز تیز قدم اٹھاتے محفل سے باہر

Marfat.com

نکل گئے اور دوسرے پل لاہور سے ہزاروں میل کے مسافت پر میدان جنگ پہنچ گئے۔

''عزیزم! کیا معاملہ ہے؟'' مادھولال نے اپنے مرشد کو سامنے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ پھر اس نے ساری صورت حال ان کے گوش گزار کی۔ دکنی فوج قہر خداوندی بن کر مغل فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھی' مغل فوج' سب سے اہم شئے' حوصلہ ہار چکی تھی۔

''اپنے سپہ سالار سے کہو دونوں ہاتھ بلند کرنے فوج کو آواز دے پھر اشارے سے لشکریوں کو بلائے'' شاہ حسین کی تجویز پر فوراً عمل کیا گیا۔ مان سنگھ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بھاگتے ہوئے سپاہی پلٹ کر زخمی شیروں کی طرح حملے کرنے لگے۔ ایک تازہ دم فوج میدانِ جنگ میں آ موجود ہوئی اور دکنی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ دکنی فوج شکست فاش سے ہم کنار ہوئی۔

''لاہور میں دوست احباب میرے منتظر ہیں لہٰذا عزیزم خدا حافظ'' یہ کہہ کر شاہ حسین لاہور پہنچ گئے۔ ہر چیز پہلے کی طرح جوں کی توں موجود تھی' محفل ناؤنوش کا از سر نو آغاز ہوا۔

جنگ ختم ہوئی تو راجا مان سنگھ' مادھولال کو لے کر اپنے خیمے میں آیا اور بے اختیار اس کے قدموں میں سر رکھ دیا ''حضور! میں آپ کے مقام و مرتبے سے قطعاً ناآشنا تھا لہٰذا میری خطا معاف فرمائیں۔ آپ کے طفیل شاہ حسین کی زیارت بھی ہوگئی یہ میری خوش نصیبی کی انتہا ہے۔''

''مان سنگھ' ہم کیا ہماری بساط کیا' یہ سب اللہ کا کرم اور اس حبیب کی کرم نوازی ہے'' مادھولال نے انکساری سے جواب دیا' یہ ملازمت میں نے مرشد کے ایما پر کی تھی لیکن اب یہ راز فاش ہو چکا ہے اور ہم دونوں کی بہتری اس میں ہے' مجھے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے' اب میں بقیہ زندگی لاہور' اپنے پیرو مرشد کی مصاحبت میں گزارنا چاہتا ہوں۔

راجا مان سنگھ نے مادھولال کے سفر کا مناسب اہتمام کیا اور وہ لاہور شاہ حسین کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ۱۰۰۸ھ میں شاہ حسین کا وصال ہوا تو مادھولال ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ شاہ حسین کی وصیت کے مطابق راوی کنارے شاہدرہ میں انہیں دفن کیا گیا۔ مادھولال کا حال بعینہٖ وہی ہو رہا تھا جیسا شیخ نظام الدین اولیاء کے وصال کے بعد امیر خسرو کا ہوا تھا۔ وہ دن رات تربت سے لپٹ کر روتا رہا۔ آنکھ دریچوں سے رس رس کر جان خارج ہوتی رہی' کوئی حرف تسلی کارگر ہوتا نہ غم خواروں کی قربت سکون بخشتی۔ سب کو یقین تھا کہ مادھولال اس غم سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ مسلسل ایک برس یہی کیفیت رہی۔ تربت حسین سے ایک پل بھی جدائی گوارا نہ تھی ایک

Marfat.com

رات وہ تربت یار سے لپٹ کر روتے روتے سو گیا۔ عالم خواب میں شاہ حسین آئے۔ جانِ من! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' انہوں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''موت' زندگی کا اختتام نہیں' یہ تو اصل زندگی کا آغاز ہے۔ یہ دوریاں' یہ فاصلے' ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ تم اپنی ملازمت پر واپس چلے جاؤ' مان سنگھ تمہارا منتظر ہے۔ یاد ہے تم نے وعدہ کیا تھا؟''

آنکھ کھلی تو پہاڑ ایسا بوجھ سر سے اتر چکا تھا۔ دوسرے روز مادھو لال حسب ارشاد ملازمت پر روانہ ہو گیا۔ سنگھ نے بصد احترام استقبال کیا۔ ۱۰۲۱ھ میں مرشد کے حکم کے عین مطابق وہ مدت ملازمت پوری کر کے دوبارہ لاہور آیا۔ شاہ حسین کی پیش گوئی کے عین مطابق ۱۴ برس بعد نعش مبارک کو شاہدرہ سے موجودہ مقام پر منتقل کیا جا چکا تھا۔ (اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی) مادھو عمر عزیز کے ۳۸ ویں برس میں قدم رکھ چکا تھا۔ یہی سال اس کی ولایت کے اظہار کا تھا۔ مزار پر خاکی نامی نومسلم جوگی موجود تھا۔ اس نے متعدد امانتیں مادھو کے سپرد کیں اور روایت ہے کہ وہ زندہ زمین میں سما گیا۔ اس زمانے میں یہ مثل مشہور ہوئی ''مادھو آیا خاکی سمایا'' ۳۵ برس تک مادھو تربت حسین پر مجاور بن کر خدمات سرانجام دیتا رہا۔ ۱۰۵۲ھ میں ۳۷ برس کی عمر میں وہ اپنے پیرو مرشد سے جاملا دونوں کی تربتیں ساتھ ساتھ بالکل ایک جیسی سنگِ سفید سے تعمیر کی گئی ہیں۔ سنگی کتبے پر مرقوم ہے۔

''رازِ حسین کا امین' معشوق و محبوبِ نازنین حضرت شیخ مادھو قادری۔''

شاہ حسین اور مادھو لال کا تعلق ویسے تو صرف سات برس پر محیط تھا مگر یہ سات برس کی طوالت صدیوں پر بھاری معلوم ہوتی ہے۔ یک جان دو قالب والی مثال سے بڑھ کر معاملہ تھا۔ مادھو لال حسین کے نام پر ہی غور کریں۔ دو تہائی مادھو لال ہے اور صرف ایک تہائی حسین لیکن اس کے باوجود اس سے مراد شاہ حسین ہی تھا' ہے اور رہے گا۔ لفظ ''شاہ'' قربان کر کے' مادھو لال اپنایا گیا۔ ہے کوئی ایسی مثال تعلقِ خاطر کی؟

شاہ حسین اول تو کسی کو مرید ہی نہ بناتے تھے اگر بہ امر مجبوری ایسا مرحلہ طے کرنا پڑ جاتا تو شرائط بڑی کڑی ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً پہلے ڈاڑھی منڈواؤ اور جام قبول کرو۔ جب مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی' صدق دل سے مرید ہونے گئے تو درویش نے مسکرا کر کہا ''تم ٹھہرے قیل و قال والے مُلا' مجھے دنیا میں رسوا کر دو گے یہ نبھاؤ ممکن نہیں۔''

مُلا موصوف کی علمی فضیلت کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس دور میں لوگ

Marfat.com

ان کو بوعلی سینا اور ابونصر فارابی کا ہم پلہ قرار دیتے تھے۔ایسے لوگ اگر شاہ حسین کو مرشد راہبر ماننے کے لیئے بے چین تھے تو شاہ حسین کا علمی مقام ومرتبہ کیا ہوگا؟ یہ موضوع بذات خود ایک مکمل قسط کا متقاضی ہے۔ملاحظ فرمائیں شاہ حسین کے نزدیک لفظ فقر اور درویش کا مفہوم۔بقول درویش، حرف

''ف'' سے مراد فقر و فاقہ وفا، فرائض حق ادا کرنا اور فسق وفجور سے مکمل پرہیز کرنا۔

ق۔قناعت، قصد اور قرب حق کی تمنا۔

ر۔ریاضت، رضائے الٰہی پر راضی ہونا اور روئے دل ماسوا (غیر خدا) سے پھیرنا۔

لفظ درویش کی تشریح شاہ حسین نے کچھ اس طرح کی۔

د۔دردِ دل۔

ر۔ریاضت میں مگن رہنا اور رو ریا کو ترک کرنا، رخصتِ ماسوا۔

و۔وحدت، وداع وجود اور واصل باالحق۔

ی۔یقین محکم یاری صرف حق سے 'یاد حق سے ایک پل غافل نہ رہنا' یک رنگ و یک دل یعنی شرک سے مکمل پرہیز کر کے صرف ذات حق کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے۔

ش۔شکر ادا کرنا (ہر پل، ہر سانس) شکوہ شکایت سے دور رہنا، شرم وحیا۔

ان حروف کی تشریح پر غور کیا جائے تو شاہ حسین کی ذاتِ والا صفات کھل کر سامنے آجا تی ہیں اور ان تمام فسق وفجور سے بھرپور غیر شرعی افعال کی قلعی کھل جاتی ہے۔یہ ایک نا قابل تردید ثبوت ہے کہ شاہ حسین کے حجرہ دل میں ذات حق کا بسیرا تھا۔باقی ساری باتیں مسلک ملامتیہ کے زمرے میں آتی ہیں۔

شاہ حسین سفر کے عادی نہ تھے۔ایک ضعیف روایت کے مطابق لاہور سے امرتسر کا سفر کیا جس کا متن کچھ اس طرح ہے۔جس زمانے میں گورو ارجن دیو ''گرنتھ صاحب'' کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے، اسی زمانے میں کاہنا بھگت، چھجو بھگت، پیلو بھگت، اور شاہ حسین لاہور میں موجود تھے۔(گورو ارجن دیو کا زمانہ ۱۵۶۳ء سے ۱۶۰۶ تک کا ہے) ''گورو بلاس کے مولف کا بیان ہے کہ گورو ارجن دیو کی شہرت سن کر یہ چاروں درویش، گورو جی سے ملنے امرتسر پہنچے اور ''سرودر'' نامی وسیع وعریض تالاب کے کنارے ملاقات ہوئی۔گورو ارجن دیو نے کہا۔

''بڈیا کرپا'' ہم پر کری، دیودرس ایہہ وار'' (آپ حضرات نے مجھے درشن دے کر بڑی

Marfat.com

مہربانی سے نوازا) پھر انہوں نے تمام ''بھگتوں'' سے کلام کی فرمائش کی۔شاہ حسین کی باری آئی تو انہوں نے اپنی ''کافی'' سنائی

شاہ حسین تب کیہ سناوے بولن دی ایتھے جا نا ہے

چپ وے اڑیا چپ کر جاوے

(تب شاہ حسین نے کہا یہ بولنے کی جگہ نہیں اس لیے اے دل' خاموش ہو جا)

شاہ حسین کا سن ولادت اور سکھ مذہب کے بانی گورو بابا نانک کا سن وفات ایک ہی ہے یعنی ۱۵۳۸ء۔اس بات کی سکھوں کے ہاں بڑی اہمیت ہے۔وہ اسے طرح طرح کے رنگ دیتے۔گورو بابا نانک چونکہ اہل تصوف کی طرح ہر مکتبہ فکر میں مقبول تھے لہٰذا اس ''ولادت و وفات'' والی بات کا یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ ۱۵۳۸ء میں گورو جی کی ''فکری ولادت'' ہوئی۔گورو بابا نانک نہ صرف پنجابی کے قادرالکلام شاعر تھے بلکہ مستند روایات کی رو سے انہوں نے بابا فرید گنج شکر کے مزار پر حاضری دی اور ان کے ''دوہوں'' کو محفوظ کر لیا۔بہر حال شاہ حسین کے امرتسر میں حاضری والی بات اس لیے قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ گرنتھ صاحب میں' شاہ حسین اور بابا فرید گنج شکرؒ کا کلام موجود ہے۔ہمارے لیے اعزاز والی بات ہو نہ ہو' سکھوں کے نزدیک گرنتھ صاحب میں شاہ حسین کا کلام' موصوف کے لیے قابلِ صد افتخار بات ہے۔لاجونتی رام کرشن نے پنجابی صوفی پوئٹس میں واضح الفاظ میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ''گورو گرنتھ'' میں شاہ حسین کی شاعری شامل کی گئی۔

مادھولال کے علاوہ شاہ حسین کا حلقہ احباب جن حضرات پر مشتمل تھا ان میں میاں شعبان' ابراہیم' ملا محمود' شیخ یعقوب' بہار خان' بابو ڈھڈی' قاضی شاہ' بابا حاجی' عبدالسلام' شہاب الدین کالوئیسن اور محمد صالح سر فہرست ہیں۔یہ لوگ گویا مقبولان شاہ حسین میں شمار ہوا کرتے تھے اور ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی یہی حضرات تھے۔

کرامات شاہ حسین میں' حاجی یعقوب کا قصہ سر فہرست ہے۔اس شخص نے عمر عزیز کا پیشتر حصہ سرزمین حجاز میں بسر کیا۔مسجد نبوی اور خانہ کعبہ' ان دو مقامات مقدسہ پر سجدوں سے لطف واندوز ہونا' اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ایک روز اس کی ملاقات شاہ حسین سے ہوگئی۔یہ جان پہچان دوستی کے مراحل طے کرتے کرتے انسیت میں بدل گئی۔فریضہ حج دونوں نے اکٹھے ادا کیا۔یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔برس ہا برس تک دونوں طواف کعبہ اور روضہ رسول ﷺ پر

Marfat.com

حاضری دیتے رہے۔حاجی یعقوب' شاہ حسین کے خشوع وخضوع سے بڑا متاثر ہوا۔کئی سال بعد گردش زمانہ کے زیر اثر وہ لاہور آ گیا۔شاہ حسین کو سر بازار محو رقص وسرود دیکھا تو پہچان ہی نہ سکا ۔آخر اس نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی سے پوچھا۔یہ ڈھول کی تال پر رقص کرنے والا فاسق وفاجر چہرہ مجھے آشنا لگتا ہے مگر یہ کون ہے؟''

''یہ گدائے رسول ﷺ اور عاشق خدا' شاہ حسین ہے'' اس شخص نے جواب دیا۔

'لاحول ولا...... یعقوب بے اختیار پکار اٹھا'' تلاش حق کا یہ کون سا طریقہ ہے؟'' شاہ حسین کے نام پر حاجی صاحب کی یادداشت میں سرزمین حجاز والے یار غار کا چہرہ ابھرا اور وہ لپک کر محو رقص شخص کے سامنے جا کھڑا ہوا۔'' اگر میرا حافظہ بے وفائی نہیں کر رہا تو ہم دونوں کافی عرصہ سرزمین حجاز پر رکوع وسجود سے لطف واندوز ہو چکے ہیں' مگر یہ کیا خرافات ہیں؟ تم نے ابلیس کی پیروی میں سب کچھ بھلا دیا۔کیا وہ رنگ بالکل کچا تھا؟''

''میرے بھائی' خاموش رہو'' شاہ حسین نے سرگوشی کی'' اگر تم میں صلاحیت ہے تو میرے اندر جھانک کر دیکھو' تمہاری تسلی ہو جائے گی۔''

''میں ان چمتکاروں کا قائل نہیں' تم نے بڑے سستے داموں اپنی عافیت بیچ ڈالی' افسوس صد افسوس۔'' حاجی یقوب دلی رنج سے کفِ افسوس ملنے لگا۔شاہ حسین اس کی تشویش سے بڑے متاثر ہوئے۔

''اچھا میرے بھائی' ذرا آنکھیں بند کر کے چشم تصور سے تماشا کرو۔''

حاجی یعقوب نے آنکھیں بند کیں تو نظارگی میں ایسا محو...... ہوا کہ انہیں کھولنا ہی بھول گیا۔مسجد نبوی اپنے پورے تقدس کے ساتھ سامنے تھی اور روضہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سامنے تھی اور روضہ رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر' شرعی لباس اور وضع قطع میں شاہ حسین وہاں موجود تھے۔

''بھائی' اب آنکھیں کھول دے' شاہ حسین نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا'' مفت میں اتنا نظارہ کافی ہے۔''

حاجی صاحب نے آنکھیں کھولیں تو مارے حیرت کے گنگ ہو چکا تھا'' یہ سب کیا تھا ؟'' اس نے لکنت بھرے لہجے میں پوچھا'' ہم نے اتنے برس طواف کعبہ اور مسجد نبوی میں بسر کئے ' آپ وہاں بھی موجود ہیں اور یہاں بھی اور اس حال میں!''

Marfat.com

''حاجی صاحب! آپ زبان بند رکھیں' بیتے دنوں کا پاس تھا جو میں آپ کی تسلی کرنے پر مجبور ہوا' ورنہ یہ طوق رسوائی میں نے اپنی رضا و رغبت سے زیب گلو کر رکھا ہے۔ ایک آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' یہ ساری گفتگو سرگوشی میں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد شاہ حسین تماشائیوں سے مخاطب ہوئے ''اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے بھلا میں اور حج بیت اللہ ؟ میں جو گرفتار حرص و ہوا ہوں مجھے یثرب سے کیا کام' ان الفاظ کے ساتھ شاہ حسین اپنے حواریوں کو لے کر رخصت ہو گئے۔ مگر حاجی یعقوب نے شور و غل سے آسمان سر پر اٹھا لیا ''لوگو! یہ شخص برسوں میرے ساتھ مسجد نبوی اور خانہ کعبہ میں مقیم رہا۔ آج بھی یہ وہاں موجود ہے اور ......اور یہاں بھی'' لوگ قہقہے لگا رہے تھے اور وہ اپنی بات بار بار دہرا رہا تھا'' یہ شاہ حسین فسق و فجور کے بہروپ میں' بلند مرتبت ولی ہے۔ آپ لوگ میری بات کا یقین کریں' آپ لوگ کچھ نہیں جانتے مگر میں حقیقت سے آشنا ہوں۔''

حاجی یعقوب چلا چلا کر اعلان کر رہا تھا اور تماشائیوں کی اکثریت اسے پاگل قرار دے رہی تھی۔ آخر خاموش ہو گیا اور دیوانہ وار شاہ حسین کی تلاش میں چل نکلا۔ دن ڈھلا' شام آئی غبار شب اترا مگر اس کے دل کی مراد پوری نہ ہو سکی۔ کئی روز وہ لاہور کے کوچہ و بازار میں مارا مارا پھرتا رہا مگر شاہ حسین سے ملاقات کی حسرت پوری نہ ہوئی' یہ بذات خود نا قابلِ فہم سی بات تھی۔

اسی زمانے میں مُلّا سعید خان لاہوری' عالم بے بدل اور زاہد و شب زندہ دار۔ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ ایک روز مُلّا موصوف کے کان میں درد کی اتنی شدید لہر اٹھی کہ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہو گیا۔ وید' حکیم سیانے سب ناکام ہو گئے۔ سعید خان کی زندگی مبتلائے عذاب تھی کسی نے اسے در درویش پر حاضری کا مشورہ دیا مگر ''علمی فضیلت'' راستہ روکے کھڑی تھی'' ''عالم بے بدل اور ایک فاسق و فاجر کے در پر جائے' یہ کیسے ممکن ہے؟'' بس یہی خیال دامن گیر تھا۔ جب درد لا دوا نے بالکل عاجز کر دیا تو ملا موصوف نے دل کو تسلی دینے کا جواز تلاش کیا۔ شاہ حسین شرابی کبابی ہے تو کیا ہوا؟ مریض کے لیے تو حرام اشیا بھی حلال ہوتی ہیں لہٰذا میرا فاسق و فاجر کے ہاں جانا شرعی اعتبار سے جائز ہے۔

درویش اس وقت بوریئے پر بیٹھا احباب سے مصروف گفتگو تھا۔ سعید خان کو دیکھا تو حیرت زدہ سے لہجے میں پوچھا ''محترم' علم کے نور سے چہرہ روشن ہوتا ہے۔ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی' کہیں کوچہ عشق سے تو تعارف نہیں ہو گیا؟''

Marfat.com

''بس جناب! جان عذاب میں ہے' کان کے جان لیوا درد سے زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔''

''محترم! یہ تو صحت کی زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ بندے کو ہنسی خوشی ادا کرنی چاہیے'' شاہ حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر اس درد کی کوئی حد بھی تو ہو' سکھ چین کے لمحے تو گویا خواب ہو کر رہ گئے ہیں' برائے کرم اس عذاب سے نجات دلائیں۔''

''مولانا توبہ کیجئے توبہ'' شاہ حسین نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''عذاب تو گناہ گاروں کا نصیب ہے اور آپ ٹھہرے زاہد شب زندہ دار۔'' پھر تھوڑی دیر کچھ سوچ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ قریب ہی ایک کھردرے سے کاغذ کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ شاہ حسین نے اس کی طرف اشارہ کیا ''یوں کریں' وہ کاغذ اٹھا کر کان میں رکھ لیں۔''

یہ ''ٹونکا'' بھی آزما چکا ہوں'' سعید خان نے لیت و لعل سے کام لیا ''یہ تو ناکارہ سا کاغذ ہے' نرم و ملائم عمدہ ترین کاغذ آزمائے گئے' کوئی افاقہ نہ ہوا۔''

''ایک پتھر بت خانے میں ہوتا ہے ایک کعبہ میں'' شاہ حسین نے بڑی گہری بات کی ''ایک کی تعظیم جہنم کا راستہ دکھاتی ہے جبکہ دوسرے کا احترام' مناسک حج میں سے ہے' اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

''جناب! اس مثال کا میرے درد سے کیا تعلق؟''

''تعلق یہ ہے کہ جس جگہ یا مقام پر کوئی شے موجود ہو' اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے' جیسے صنم خانے کا پتھر اور کعبے کا حجر اسود۔ نرم و ملائم ریشم ایسے کاغذات دربار شاہی میں پائے جاتے ہیں مگر یہ کاغذ' ایک فقیر پُر تقصیر کی جھونپڑی میں موجود ہے دونوں میں کچھ تو امتیاز ہونا چاہیے۔'' بات سعید خان کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے لپک کر فرشِ خاک سے کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا اور جھٹ اپنے کان میں ٹھونس لیا۔ پل بھر میں درد کا نام و نشان نہ رہا۔ مریض کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی تو شاہ حسین نے چوٹ کی ''مولانا شرک سے اجتناب کیا کریں' کاغذ یا کسی دوا میں تاثیر سمجھنا اور اسے نجات دہندہ قرار دینا' شرک ہے اور یہ سوچ اوپر والے کو پسند نہیں'' یہ اتنی گہری بات تھی کہ سعید خان جیسا عالم اجل بھی ششدرہ رہ گیا۔ ایک اور عجیب بات یہ ہوئی کہ ملا سعید' درویش بے ریا کا ایسا معتقد ہوا کہ زندگی بھر اس کی کفش برداری کو اعزاز سمجھتا رہا' علاوہ ازیں' علمی دقیق مسائل کا

Marfat.com

حل بھی وہ آستانہ شاہ حسین سے پاتا' درویش اس کے دل کی ہر خلش' سوچ کی ہر سلوٹ دور کر دیتا ۔ملا سعید خاں کہا کرتا تھا" شاہ حسین کے پاس علم لدنی کا سمندر ہے۔"

شاہ حسین کے پڑوس میں یعقوب نامی کیمیا گر تھا عمر بھر کی ریاضت اور جنگلوں پہاڑوں کی خاک چھاننے کے بعد وہ اپنی کاوش میں کامیاب ہو گیا۔ایک تولہ اکسیر تیار ہوا تو کیمیا گر خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ اس سے برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔وہ اپنی کامیابی و کامرانی کا ثمر' رنگین کاغذ میں لپیٹ کر درویش کی خدمت میں حاضر ہوا" دیکھیے' میرے خوابوں کی تعبیر روئے زمین پر اتنی بڑی کامیابی کسی کو نصیب نہیں ہوئی" کیمیا گر نے سونے کی ڈلی شاہ حسین کو دکھائی۔فقیر نے تاسف بھرے لہجے میں کہا" بدنصیب انسان! تو نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ برباد کر ڈالا۔اتنے خلوص سے تُو تلاش حق میں مصروف ہوتا تو سوچ کیا کچھ حاصل کر لیتا؟ باقی رہی یہ سونے کی ڈلی تو اس کی وقعت استنجے کے ڈھیلے سے زیادہ نہیں۔"

"جناب' یہ خالص سونا ہے سونا" کیمیا گر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔شاہ حسین دوست احباب سے معذرت کرتے ہوئے بزم سے اٹھے' کیمیا گر کو ساتھ لیا اور ایک گوشے میں بیٹھ کر فرش خاک پر پیشاب کر دیا اور واپس آ کر یعقوب کیمیا گر سے کہا" جا اس مٹی کو بغور دیکھ" کیمیا گر نے مٹی کو پرکھا تو حیران رہ گیا۔وہ سو فیصد خالص سونا بن چکی تھی۔

"تیرے خیال میں' میں کیمیا گر ہوں؟" شاہ حسین نے ورطہ حیرت میں ڈوبے یعقوب سے پوچھا۔میرے پاس سبب نہیں' مسبب الاسباب ہے۔تُو بھی اسی کو تلاش کر' یہی اصل کیمیا گری ہے۔یعقوب نے کیمیا سازی سے تائب ہو کر دستِ حق شناس پر بیعت کی اور مقبولان شاہ حسین کے مقام و مرتبے فائز ہوا۔(یہ واقعہ سلطان العارفین باہوؒ سے بھی منسوب کیا جاتا ہے ۔ایک جیسی کرامات کا اظہار دو بزرگوں سے بھی عین ممکن ہے)

ایک دور ایسا بھی آیا کہ شاہ حسین کا مستقل ٹھکانا کہیں نہ تھا۔بقول دارا شکوہ اچانک کسی گلی کوچے میں ناچتے گاتے نظر آ جاتے۔اسی زمانے میں ایک "مقلد" (چار ائمہ یعنی امام مالکؒ امام اعظمؒ' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل میں سے کسی ایک کی تقلید کرنے والا مسلمان) شاہ حسین کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔جہاں جاتے وہ ساتھ ہو لیتا اور شور مچانے لگتا" تم غیر مقلد ہو اور گمراہ ہو مجھ سے مناظرہ کر و' یا قائل ہو جاؤ' یا قائل کر لو۔"

درویش نے پہلے تو کوئی توجہ ہی نہ دی پھر اس سے بڑی نرمی سے سمجھایا" مسلک کا

Marfat.com

اختلاف تہذیب کے دائرے میں رہے تو باعثِ رحمت ہوتا ہے' اسی سے دینی مسائل میں ترویج و ترقی ہوتی ہے مگر مناظرے میں چوں کہ ہر حیلے وسیلے سے حریف کو زیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لہٰذا افہام وتفہیم کے بجائے' کج بحثی کا رواج ہو جاتا ہے۔اس لیے عزیزم ''مناظرہ بازی'' سے دور رہنا چاہیے'' مگر وہ مقلد اپنی ضد سے باز نہ آیا۔تنگ آ کر ایک روز شاہ حسین نے ہتھیار ڈال دیئے اور مناظرے کی دعوت قبول کر لی۔جس مقام پر مناظرے کا انعقاد ہوا اس کے قریب ایک آہن گر کی دکان تھی۔لوہار دہکتی بھٹی سے سرخ انگارے جیسا لوہے کا ٹکڑا نکالتا اور اسے ہتھوڑے کی چوٹوں سے حسب منشا شکل میں تبدیل کر دیتا ''ہم چوں کہ دینی مسائل کے متعلق گفتگو کرنے والے ہیں لہٰذا کم از کم ہونٹوں کا وضو کر لینا چاہیے'' شاہ حسین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''ہونٹوں کا وضو! وہ کیا ہوتا ہے؟'' مقلد نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آؤ' میں دکھاتا ہوں ہونٹوں کا وضو کیا ہوتا ہے؟'' یہ کہہ کر شاہ حسین نے دہکتے' سرخ انگارہ لوہے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔اس آتشیں بوسے کے بعد مقلد کو دعوت دی۔''لو اب اسی انداز میں تم بھی ہونٹوں کا وضو کر لو تا کہ بحث کا آغاز ہو سکے۔''

مقلد تو آہوئے مرگ دیدہ کی طرح بدک کر بھاگنے لگا مگر شاہ حسین نے مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔پھر تپتے لوہے کو دوبارہ بوسہ دیا اور اسے حیران و ششدر لوہار کے حوالے کر دیا۔(دہکتے لوہے سے متعلق اسی نوعیت کی ایک حکایت حضرت موسیٰ آہن گر سے بھی منسوب ہے 'انہوں نے دہکتی ہوئی سلائی اپنی آنکھوں میں پھیر لی اور آتش و گلزار والی سچی داستان کی یاد تازہ کر دی تھی)۔

شاہ حسین اور بارانِ رحمت کے عنوان سے جو واقعہ مشہور ہوا اس کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے۔ایک رور شرق پور کے قریب منڈیاں والا کی سیر وسیاحت کی غرض سے شاہ حسین اپنے دوست احباب کو لے کر لاہور سے روانہ ہوئے۔رندوں کے گروہ نے' نان اور گھی شکر کی فرمائش کی۔فقیر نے مسکرا کر فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کر لیا مگر یاد دلایا کہ عسر اور یسر دونوں ساتھ ساتھ ہوتے ہیں (قرآنی آیت کی طرف اشارہ یعنی آسانی اور تنگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے) بات آئی ہو گئی۔مطلوبہ بستی آئی تو گروہ فقیر منتشر ہو گیا اور گلی کوچوں میں مٹر گشتی ہونے لگی۔اس بستی کا رئیس بہار خان منڈہ بڑا چالاک ہوشیار انسان تھا۔اسے مطلع کیا گیا کہ لاہوری درویشوں کا ٹولہ گاؤں میں اودھم مچا رہا ہے اور ان کا سرغنہ شاہ حسین ہے جو سنا ہے مقام ولایت پر فائز ہے۔اتفاق

Marfat.com

سے وہ علاقہ خشک سالی کا شکار تھا بہار خان کے دل میں عجیب وغریب منصوبہ تشکیل پانے لگا۔اس نے دیہاتی نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور سارے فقیروں کو رسیوں سے باندھ کر ایک کمرے میں بند کر دینے کا حکم دیا۔منصوبہ یہ تھا کہ شاہ حسین اپنے احباب کو چھڑانے آئے گا تو فقرا کی رہائی باران رحمت سے مشروط کر دی جائے گی۔جب حسب منصوبہ بارش برسنے لگے گی تو درویشوں کو آزاد کر دیا جائے گا۔بس پھر کیا تھا۔نوجوانوں نے گلیوں میں ناچتے گاتے فقیروں کو دھڑا دھڑ پکڑنا شروع کیا اور سب کو ایک وسیع وعریض مکان میں قید کر دیا۔حسب توقع شاہ حسین بہار خان کے پاس آئے اور اس نازیبا حرکت پر احتجاج کیا۔

''جناب! میں سیدھی سادی دوٹوک بات کرنے کا عادی ہوں' ہماری فقرا اسے کوئی دشمنی نہیں مگر خشک سالی کا شکار ہیں۔سنا ہے آپ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں' بس بارش برسا دیں اور اپنے حواریوں کو لے جائیں'' بہار خان نے صاف صاف اپنی شرط پیش کر دی۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟ بارانِ رحمت تو رب العزت کے قبضہ قدرت میں ہے' ہمارا اس سے کیا تعلق؟'' شاہ حسین نے سمجھایا۔

''تعلق ہو یا نہ ہو' بارش کے بغیر فقیروں کی رہائی ممکن نہیں'' بستی کے سردار نے کہا۔

''دیکھو خدا کے بندے' بارش دستِ قدرت کا کرشمہ ہے۔ہماری دعاؤں یا اعمال کا نتیجہ نہیں' انسانی اعمال کے نتیجے میں تو آسمان سے آگ برسنی چاہیے'' دونوں اپنے موقف پر قائم رہے۔آخر شاہ حسین نے تجویز پیش کی ''ایک صورت ہے' تم ان درویشوں کو نان اور گھی شکر کھلاؤ' یہ خوش ہو کر دعا کریں گے اور امید ہے اللہ ان بھوکے ننگے مفلسوں کی دعا کو شرف قبولیت بخشے گا۔''

''ٹھیک ہے' ہم خورد ونوش کا اہتمام کرتے ہیں مگر یاد رہے اگر بارش نہ برسی تو ان تمام حضرات کے منہ کالے کر کے' گدھوں پر بٹھا کر جلوس نکالا جائے گا۔'' سر پھرے سردار نے نئی شرط نکالی تو شاہ حسین نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اگر تم نے فقیروں کی حسب منشا خورد ونوش کا انتظام نہ کیا تو بارش کی بجائے فلک سے انگارے برسیں گے۔''

الختصر فقراء کو آزاد کیا گیا' دعوت کا اہتمام ہوا۔سب نے حسب طلب کھانا کھایا تو ان کو شاہ حسین کے ''عسر ویسر'' والے الفاظ یاد آئے۔کھانے کے بعد شاہ حسین نے ان کو رقص کرنے کا حکم دیا۔ادھر رقص کا آغاز ہوا اُدھر آسمان پر گھٹائیں چھا گئیں۔ایسی بارش ہوئی کہ بستی اور اس کے

Marfat.com

گردونواح کا علاقہ جل تھل ہو گیا۔ جب یہ رحمت ''زحمت'' میں بدلنے لگی تو بستی کا سردار جو قائل بھی اور گھائل بھی ہو چکا تھا دست بستہ ملتمس ہوا ''بس جناب! مزید بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں ''اپنے ساتھیوں کو رقص بند کرنے کا حکم دیں ورنہ ساری فصلیں تباہ و برباد ہو جائیں گی'' بارش ختم ہوئی تو بہار خان ایک بار پھر شاہ حسین سے ملتجی ہوا ''اگر یہی رقص مجھے بھی سکھا دیں تو بڑی کرم نوازی ہوگی۔''

''مفت میں تو رسوائی بھی نہیں ملتی'' درویش نے مسکرا کر کہا۔

''مجھ میں اس کی قیمت ادا کرنے کی ہمت ہے'' بہار خان منڈا نے سنجیدگی سے کہا۔

''جانتے ہو اس کی قیمت؟''

''ترک تعلقات'' رئیس بستی نے سر جھکا کر جواب دیا۔ شاہ حسین واپس لاہور آئے تو گروہ میں ایک اور درویش کا اضافہ ہو چکا تھا۔ بہار خان نے سرداری اپنے بیٹے کو سونپی اور تلاش حق میں نکل کھڑا ہوا۔ بہار خان منڈا مقبولان شاہ حسین میں ایک سرکردہ نام ہے

تریسٹھ برس کی عمر میں درویش کو ''حکم حضوری'' کی آہٹ سنائی دی۔ ۱۰۰۸ھ کا ذکر ہے۔ شاہ حسین اپنے احباب باصفا کے ہمراہ شہر سے نکلے۔ کشتی کے ذریعے دریا عبور کیا۔ وہی دریا جس کی شوریدہ سر لہریں بارہا درویش کی زبان سے کلام الٰہی سن چکی تھی مگر ان کا اضطراب جوں کا توں تھا۔ رخ سفینہ اس وقت شاہدرہ کی جانب تھا جب راستے میں ''بریتہ'' حائل ہو گیا۔ بس حضرات 'اپنی منزل آ گئی' درویش نے بڑے عجیب لہجے میں ساتھیوں سے کہا۔

''جناب' منزل تو ابھی دور ہے' نہ آر نہ پار' بھلا یہ کون سی منزل ہوئی؟'' ایک ساتھی نے کہا۔

''اگر کوئی دوست بڑی چاہت سے بلائے تو کیا کرنا چاہیے؟'' شاہ حسین نے پوچھا۔

''بڑی مناسب بات ہے' وفا کا تقاضا بھی یہی ہے'' یہ کہا اور ایک چادر ریت پر بچھائی پھر بڑے سکون سے چادر لپیٹ کر نیلے آسمان کی وسعتوں کو بغور دیکھنے لگے اور زیر لب کچھ پڑھتے رہے۔ دوست احباب کھیل تماشے میں مصروف تھے۔ کہ طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا ''حیات دنیا میں کھیل تماشے کے سوا کچھ بھی نہیں'' کی انوکھی تشریح کرنے والا ہنستے کھیلتے سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔

جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی

Marfat.com

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شاہ حسین نے اپنے عارضی مدفن کی نشاندہی اپنی زندگی ہی میں کر دی تھی ۔راوی کنارے سرسبز و شاداب درختوں کا جھنڈ تھا جہاں ایک کنواں کھدوایا گیا تھا۔پیش گوئی کے مطابق انہیں تیرہ برس زیر زمین استراحت فرمانا تھی اور پھر اپنے مدفن' بابو پورہ منتقل ہو جانا تھا اور اسی جگہ ان کے منظور نظر' مادھو لال کو اظہار ولایت کے بعد قیام کرنا تھا۔ساری منصوبہ بندی ہو چکی تھی ۔اس میں تبدیلی صرف اس قدر ہوئی تھی کہ مادھو لال اپنی ملازمت کو خیر باد کہہ کر واپس آ گیا تھا مگر عالم خواب میں وصول ہونے والی ہدایات کے مطابق ایک برس بعد دوبارہ افواج اکبری میں چلا گیا تھا ۔مادھو لال کی عدم موجودگی میں دریائے راوی نے اپنا فریضہ سرانجام دیا ۔ایسا بپھرا کہ مغربی کنارے کے اس پار والا علاقہ زیر آب آ گیا ۔مزار کے گرد و پیش پانی ہی پانی تھا ۔عقیدت مندوں کو فکر لاحق ہوئی ۔ان کو پیش گوئی بھی یاد آ گئی ۔لہٰذا قبر کھو کر ''خالی پنجرے'' کو موجودہ مزار والی جگہ منتقل کرنے کا اہتمام ہوا ۔تربت میں شگاف ڈالا گیا تو سارے دھک سے رہ گئے ۔قفس عنصری کا نشان تک نہ تھا ۔ہڈیاں' ناخن' بال کوئی شے موجود نہ تھی ۔یہ ایک حیران کن بات تھی ۔نہ کسی نے ایسا دیکھا نہ سنا ۔سیکڑوں برس بعد بھی زیر زمین سونے والے کے آثار باقی رہتے ہیں' یہی لوگوں کا تجربہ تھا۔

لوگوں کو شاہ حسین کے شاعری میں ''پیکر انسانی اور خاک زمیں'' سے متعلق اشعار یاد آئے

کہے حسین فقیر سائیں دا انت خاک وچ رلنا

کہے حسین فقیر نمانا آخر خاک سماوَ رے

اسی طرح ایک بار کہا

کہے حسین فقیر نمانا آخر خاک سمانا

ایک بار جنگل کا ذکر بھی کیا تھا اور عارضی مدفن کی مشابہت جنگل ہی سے ملتی تھی ۔

شاہ حسین فقیر سائیں دا جنگل جائے سماون

''کہیں ایسا تو نہیں کہ درویش نے ان اشعار کا عملی ثبوت پیش کر دیا ہے'' ہر دل میں یہی سوال تھا ہر ذہن میں اسی کی بازگشت' عقیدت مندوں نے شگاف بند کرنے کے متعلق سوچا ۔غور و فکر کے لیے ایک ہی جگہ اکٹھے ہوئے ۔اچانک تربت میں سے رنگین شعاعوں کا اخراج ہوا

Marfat.com

دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ چشم تماشا' جلوگی کا منتظر' ہر متنفس پردہ غیب سے کسی انوکھے تماشے کا انتظار کر رہا تھا مگر مخلص وفادار محمد صالح دیوانہ وار قبر میں کود گیا۔ "محتاط حضرات" منع کرتے رہ گئے۔ احتیاط اچھی چیز ہے مگر کبھی کبھی اسے بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔ ایسی صورت میں جست جنوں خیز ہی کام آتی ہے۔ محمد صالح روشنی میں نہایا کھڑا تھا اور سارے عقیدت مند دم بخود کھڑے یہ خلاف عقل "واردات" ملاحظہ فرمارہے تھے۔ اسی کی ساعت سے شاہ حسین کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ صدا جسے محمد صالح' آوازوں کے ہجوم میں بھی پہچان سکتا تھا۔ "عزیزم! میرا جسد خاکی' رضائے الٰہی سے خوشبودار رنگین پھولوں کے روپ میں اسی جگہ موجود ہے' یہی میرے پیکر خاک کی باقیات ہیں اور اسے ہی نئی جگہ دفن ہونا ہے' مگر اس گلدستے کو سونگھنے کی کوشش نہ کرنا کہ کوئی قوت شامہ (سونگھنے کی قوت) اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی ایک راز ربانی ہے۔"

قبر کے اندر ریحان کی مہک تھی اور محمد صالح نے دیکھا کہ پھولوں کا ایک گل دستہ واقعی وہاں موجود ہے پھر دوسری سرگوشی سنائی دی "مجھے دیکھنے کے تمنائی' مادھو کی زیارت کریں وہی میری مشابہت کا حامل ہوگا' میں نے اپنی شکل وشباہت اس کے سپرد کی" سرگوشیوں کا سلسلہ ختم ہوا

"شد گل گور گل زنور حسین" (خاک تربت حسین کی روشنی سے گل وگلزار ہوئی) محمد صالح ودیگر عقیدت مندوں نے یہی "گلدستہ" جنازے کی صورت میں بابو پورہ پہنچادیا۔ موجودہ مدفن پر جنازہ پہنچا تو ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ جگہ گورکھ ناتھی جوگیوں کے قبضے میں تھی۔ پیر گورکھ ناتھ اپنے چیلوں کے ساتھ یہاں مقیم تھا۔ وہ اس جگہ سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے "یہ ہماری جگہ ہے" ہم ٹھہرے ہندو اور یہاں مسلمان کی تدفین ممکن نہیں' جوگی بحث وتکرار سے پرہیز کرو اور اس جگہ کو کھود کر دیکھو اندر کیا ہے؟ سارے ثبوت تجھے مل جائیں گے" قبر کھودی گئی تو جوگی دنگ رہ گیا۔ ایک سرخ دستار تھی' ایک تسبیح' ایک قرآن شریف اور ایک عدد مصلا۔ جوگی مقام مدفن سے برضا ورغبت دست بردار ہوا اور ملتجی لہجے میں کہنے لگا "جناب' یہ جگہ تو ہوئی آپ کی مگر میں کہاں جاؤں گا؟"

"تمہارا قیام ٹلہ گورکھ ناتھ میں ہونا چاہیے" محمد صالح اور دیگر عقیدت مندوں کو ہدایت دی گئی "مادھو لال آئے تو سرخ دستار اسے سونپ دی جائے۔"

یہ خلاف عقل باتیں دیکھ' سن کر جوگی مہاراج کا سب سے چہیتا دھرنا مار کر وہیں بیٹھ گیا

Marfat.com

گورو نے ساتھ چلنے کا حکم دیا تو اس نے آہ بھر کر کہا ''اب کوچہ یار سے کون جائے۔''

یہ وہی چیلا ہے جو مشرف بہ اسلام ہوا اور ''خاکی دیوان'' کہلایا۔ مادھو لال کی عدم موجودگی میں یہی مزار کا مجاور تھا اور اسی نے سرخ دستار شاہ حسین کے منظور نظر کو پیش کرنا تھی اور اسی کے متعلق مشہور ہوا تھا ''مادھو آیا خاکی سمایا'' (دیوان خاکی کی قبر مزار کے قریب کافی عرصہ موجود رہی)

مزار شاہ حسین 'شالامار باغ کے مغرب میں تھوڑے فاصلے پر موجود ہے۔ عظمت شاہ حسین کا اعتراف مغلیہ خاندان میں سب سے پہلے' داراشکوہ نے کیا۔ اس نے تو بہادر خان نامی شخص کو یہ فرض سونپ رکھا تھا کہ فرمودات درویش کو سپرد قلم کرتا رہے۔ شہنشاہوں میں اکبر اور جہانگیر بھی عقیدت مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ عہد شاہجہاں میں 'شالامار باغ معرض جود میں آیا تو انجنیئر خلیل اللہ کو اس معروف زمانہ باغ کی تعمیر و آرائش کے فرائض سونپے گئے۔ صرف مزار کی موجودگی کے سبب' دیوار گلستاں کو روک دیا گیا ورنہ باغ کی وسعت شمال مغربی جانب' مزار سے آگے تک تجویز کی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ جہاں نے بھی عظمت درویش کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ معزالدین جہاندار شاہ جب اپنے بھائیوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب تخت سے معزول ہوا تو اس نے مزار پر عالی شان عمارت بنانے کی منت مانی۔ چناں چہ تخت شاہی پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد اس نے منت پوری کی۔ بہادر شاہ ظفر (معظم شاہ عالم) کے چار بیٹوں 'معز الدین' رفیع الدرجات 'عظیم الشان اور رفیع الدولہ شاہجہاں ثانی' آپس میں دست و گریباں ہوئے اور غیرت تیمور کا جنازہ نکلا۔ جہاندار شاہ سب کو نیست و نابود کر کے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا مگر یہ جلوگی تادیر قائم نہ رہ سکی۔ ۱۷۱۳ء میں مقتول ہوا۔ شاہ حسین اور جہاندار شاہ میں ایک قدر مشترک' شاعری تھی۔ مشہور زمانہ شعر

آخر گل اپنی صرف درِ مے کدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اسی مقتول شہنشاہ دہلی کا ہے۔ شاہ حسین کی وفات کے تقریباً ایک صدی بعد' لاہور کے مغل گورنر نواب زکریا خان نے ۱۱۴۴ء میں مزار کے احاطے میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی۔ مغل بادشاہ محمد شاہ کی عقیدت بھی اس میں شامل تھی۔ اسی زمانے میں شاہ حسین یا حسین ڈاہڈیا دونوں نام پس منظر میں چلے گئے اور ''مادھو لال حسین'' نام منظر پر آیا۔ یہ عوام الناس کی عقیدت کا کرشمہ تھا

Marfat.com

جو طالب و مطلوب کو الگ الگ ناموں سے یاد کرنے کے روادار نہ تھے۔ ۱۱۵۱ھ بمطابق ۱۷۳۹ء نادر شاہی فوج نے لاہور کی اینٹ سے اینٹ سے بجادی۔ شاہ حسین کا مزار بھی محفوظ نہ رہ سکا اور قیمتی دستاویزات وغیرہ تلف ہوگئیں۔ رہی سہی کسر احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ حسین کی زندگی کے اکثر گوشے تاریکی میں گم ہوگئے اور منظر عام پر نہ آسکے۔ یہ حالات درجنوں کتب میں ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں اور محققین کو دعوت فکر و عمل دیتے ہیں۔ عہد سکھا شاہی میں لاہو کو جی بھر کے لوٹا گیا مگر حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ رنجیت سنگھ عقیدتِ حسین میں ڈوبا ہوا تھا۔ بسنت کا تہوار اس انداز میں منایا جاتا کہ چشم فلک حیران ششدر رہ جاتی۔

دربار سے منسلک ہر ادنیٰ و اعلیٰ فرد مہاراجا رنجیت سنگھ کے حکم سے ''بسنتی'' لباس زیب تن کرتا' حتیٰ کہ فوج کا لباس بھی زرد رنگ کا ہوتا۔ گھوڑوں کی زینیں' ہاتھیوں کی ہودج' سامان حرب و ضرب' ہر چیز بسنتی رنگ میں ڈوبی ہوتی۔ مزار کے گرد و نواح میں اسی رنگ کے خیموں کا شہر بسایا جاتا اور بسنتی پوش ہجوم' شاہی محل سے مزار اقدس کے راستے پر شاہی سواری کا منتظر ہوتا۔ دو بجے دوپہر توپوں کا گھن گرج میں مہاراجا کی سواری' سوئے مزار چل نکلتی' پانچ سو گھڑ سوار' ساٹھ ستر ہاتھی' دو رجمنٹ پیدل فوج گویا شاہی قلعہ لاہور سے بسنتی رنگ کا دریا رواں ہوتا اور باغبان پورہ کا رخ کرتا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ مٹھیاں بھر بھر کر طلائی سکے ہجوم پر نچھاور کرتا۔ یہ سلسلہ مزار تک جاری رہتا' مزار کی حدود میں داخل ہونے سے پیشتر' مہاراجا سواری کو چھوڑ کر پا پیادہ سفر طے کرتا اور عقیدت و احترام کا مظاہر کرتا ہوا تربت حسین پر حاضری دیتا۔ جشن مسرت اس وقت بام عروج پر پہنچتا جب رنجیت سنگھ' اپنی فوج کو ایک ماہ کی تنخواہ (بطور بونس) ادا کرنے اعلان کرتا۔ غروب آفتاب تک مہاراجا موجودہ مقام مدفن پر موجود رہتا۔

ہیرا منڈی کی مشہور زمانہ طوائف ''موراں'' نے ایک عظیم الشان مسجد کا اضافہ کیا۔ فرنگی دور کا آغاز ہوا تو مزار کی شان و شوکت کے تنزل کی ابتدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ مزار سے ملحقہ وسیع و عریض اراضی سکڑتی چلی گئی۔ نواب زکریا خاں کی مسجد کا نقشہ تبدیل ہوا۔ مسجد مائی موراں کا نام و نشان نہ رہا۔

قیام پاکستان کے بعد بھی مزار کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ مجاور اپنی من مانیاں کرنے لگے۔ کسی زمانے میں ستر سے زائد بلند مرتبت فقراء کی قبور موجود تھیں' احاطے کی چار دیواری کے اندر انواع و اقسام کے ایک ہزار اشجار لہلہاتے اور بہاریں دکھاتے تھے۔ چھروز' نیم' کریر' برنا' سکھ چین

Marfat.com

شریہہ پھر پھل دار درخت الگ تھے۔ آج گنتی کے چند درخت موجود ہیں۔ شجر ثمر بار تمام بیخ و بن سے اکھڑ چکے ہیں۔ حالات حد سے زیادہ دگرگوں ہوئے تو لاہور کے شعرا نے تاریخ میں پہلی بار عظیم صوفی شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے کا اہتمام کیا۔ مجلس شاہ حسین کا قیام عمل میں آیا۔ محکمہء اوقاف نے مزار کو اپنی تحویل میں لیا تو انتظام و انصرام گویا بے ہنر بندوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ رہی سہی کسریں پوری ہوئی۔ ۱۹۸۴ء میں پنجابی کے شہرہ آفاق شاعر چراغ دین المعروف استاد دامن کو ان کی وصیت کے مطابق مزار شاہ حسین کے قریب دفن کیا گیا۔ استاد دامن نے زندگی کا بیشتر حصہ اسی مسجد کے حجرے میں بسر کیا تھا جس میں شاہ حسین نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ استاد ابو بکر بھوی اور بہلول دریائی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ (یہ مسجد آج بھی ٹکسالی گیٹ کے آغاز میں موجود ہے)

مزار شاہ حسین جہاں' جہاں داروں کے سر تسلیم خم ہوا کرتے تھے' آج موجود تو ہے مگر وہ شان و شوکت' وہ عظمت رفتہ' قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ لوح مزار پر تاریخ وفات تک غلط ہے۔ غفلت ملاحظہ ہو کہ تاریخ وفات ۱۰۵۸ھ درج ہے جب کہ قریب لیٹے ہوئے شیخ مادھو قادری کی تاریخ وفات ۱۰۵۲ء مرقوم ہے۔ حالانکہ وہ پچیس برس تک اپنے پیر و مرشد کے مزار پر مجاور بن کر بیٹھے رہے۔ شاہ حسین کی تاریخ وفات میں پچاس برس کی غلطی نا قابل فہم سی بات ہے۔ عمارت کے دیواروں پر لکھے ہوئے سب اشعار بحر سے خارج اور غلطیوں کا شہکار ہیں' یہ سب کیا ہے؟ یہی نا کہ مزار کے کارکنان قضا و قدر پر لے درجے کے جاہل مطلق ہیں۔ ان تمام باتوں سے درگزر کا جواز ہو سکتا ہے مگر وہ مجرمانہ غفلت جو نا قابل معافی و تلافی گناہ ہے' وہ قرآنی عبارت کو غلط املا یا ''غلط نویسی'' ہے چبوترے پر چڑھتے ہی جس آیت مبارکہ پر نگاہ پڑتی ہے وہ ہے گیارہویں پارے گیارھویں رکوع کی دوسری آیت جس کا آغا یوں ہوتا ہے۔

''اِلاّ اِنّ اولیــــاللہ...... الخ'' حالانکہ اصل آیت مقدسہ کا آغاز لفظ ''الا'' سے ہونا چاہیے۔ اِلّا کا ترجمہ ''مگر'' اور اَلا بمعنی ''خبردار'' ایک استثنا ہے دوسرا ''تنبیہ'' یہ غلطی جرم و گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔ کلام الٰہی پر تو اعراب کی تبدیلی بھی نا قابل برداشت ہونی چاہیے مگر یہ سب کچھ سب کے سامنے ہو رہا ہے۔ جو لوگ ان دو الفاظ میں امتیاز نہیں کر سکتے وہ خواہ مجاور ہوں خواہ کارکنان مذہبی امور کمیٹی' ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ دینی معاملات میں دخل انداز ہوں۔ موجودہ مجاور اللہ رکھا جو اوقاف کا ملازم بھی ہے اور عرصہ بائیس برس سے مزار کا منتظم بھی' جب اس کی توجہ

Marfat.com

راقم نے ان امور کی طرف مبذول کرائی تو ''آئیں بائیں شائیں'' کرنے لگا۔ تاریخ وفات کی اصلاح کا وعدہ اس نے ضرور کیا۔ رنجیت سنگھ دربار کے ایک شاعر نے تفنن طبع کے لیے ایک شعر کہا تھا جو محکمہء اوقاف مجاور اور دیگر کارکنان کے حسب حال ہے۔

گل گئے گلشن جنگلی دھتورے رہ گئے
چل بسے عاقل جہاں سے بے شعورے رہ گئے

O......☆......O

Marfat.com

اللہ لوگ

حضرت محمد امیر المعروف میاں میر بالا پیرؒ

Marfat.com

سلسلہ قادریہ کے مھتاب درخشاں 'آفتاب معرفت'و اقف اسرار زماں و مکاں "محمد میر "جو برصغیر میں حضرت میاں میر 'بالا پیر'میاں جیو اور شاہ میر کے اسمائے گرامی سے مشھور ھوئے . آپ نجیب الطرفین "فاروقی "تھے . 957ھجری میں جب آپ نے اس عالم میں آنکھ کھولی تو عھد اکبری کا سیاہ دور تھا .شاھان وقت آستانہ درویش پر برھنہ پا حاضر ھونا توشہ آخرت سمجھتے تھے .اگرچہ مرد قلندر اور ابدال وقت 'حضرت خضر سیوستانی نے بحیثیت مرشد آپؒ کی روحانی تربیت کی مگر آپ اویسی بھی تھے .بلا امتیاز مذھب و ملت عوام کے دلوں میں آپؒ کی محبت موجزن تھی .جس کا اعتراف گرو ارجن نے دربارصاحب کی خشت اول آپؒ سے رکھوا کر کی اور آج بھی مزار بالا پیرؒ پر بلاامتیاز مذھب و ملت عقیدت مند دیکھے جاسکتے ھیں .آپ ترک تجرید کا نمونہ تھے .فقر محمدیؐ کی دلنشیں تفسیر 'درویش بے ریا کی سختی سے اتباع سنت ھی عشق رسول اللہ کا نتیجہ تھی .

Marfat.com

بالا پیر

شب سیاہی کے پس منظر میں' بے کراں آسمان پر چمکنے والے ستارے بہت شوخ دکھائی دے رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کی چمک ماند پڑنے لگی تو صبح کاذب کے آثار ہویدا ہوئے۔ یہ وقت غافلوں کے لیے گہری نیند میں ڈوب جانے کا ہوتا ہے جب نفس امارہ انسان کو تھپک تھپک کر راحت پہنچاتا ہے مگر راہِ عشق کے مسافر اس وقت راز و نیاز کے آخری مراحل میں ہونے کی بنا پر چاق و چوبند ہوتے ہیں۔ یہی نورانی گھڑیاں تھیں جب وہ پارسا خاتون' کرب تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھی' بستی والے اس خاتون کو رابعہ ثانی کہتے تھے۔ واقعی اس کی پاک دامانی کا یہ عالم تھا کہ'' دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔''

زچگی کے مراحل سے گزرنے والی یہ صاحب بصیرت و بصارت خاتون مقام ولایت پر فائز تھی۔ اس پر کیا موقوف' سارا گھرانا دولتِ دین سے مالا مال تھا۔ سنت نبوی ﷺ کی اتباع ان کا اوڑھنا بچھونا اور زہد و تقوی توشہء آخرت تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ خاتون' فصیل جاں میں اٹھنے والے درد کے سیلاب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر رہی تھی۔ اچانک اس کی سماعت سے اپنے مشفق باپ قاضی قادن کی آواز ٹکرائی۔ بات تو ماضی بعید سے تعلق رکھتی تھی مگر اس کا ایک ایک لفظ رابعہ

Marfat.com

ثانی کو صاف سنائی دے رہا تھا۔

"بیٹی میں نے تیرا نام بنتِ رسول ﷺ کے نام پر رکھا ہے اب اس "نسبت" کی لاج رکھنا" قاضی قادن زاہد و شب زندہ دار نے کہا "دنیا میں فاطمۃ الزہرا خواتین میں مقام و مرتبے میں لاثانی ہیں۔"

بیٹی کے دل پر یہ بات نقش ہو کر رہ گئی کہ اسے بنتِ رسول ﷺ کے نام کی لاج رکھنا ہے۔ پھر اس نے شعور کی آنکھ کھولتے ہی حُبِ رسول ﷺ کو زندگی کا شعار بنا لیا۔ سن بلوغت میں قدم رکھا تو اپنے ہی خاندان کے ایک صالح نوجوان قاضی سائیں اللہ دتہ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی پہلے بچے کی ولادت ہوئی تو فاطمہ خاتون نے چشم بصیرت سے نومولود کی پوری زندگی کا مشاہدہ کیا اور مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ دنیاوی اعتبار سے بچے کی زندگی کامیاب و کامران تھی مگر اس میں نہ شان قلندری تھی جس کے آگے شان فغفوری جھک جاتی ہے نہ عشق الٰہی کا مطلوبہ رنگ۔ قرآنی آیت "ومن احسن من صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہے؟) کے مطابق خاتون کی دلی تمنا تھی کہ اس کی اولاد رنگِ خدا سے ڈوبی ہوئی ہو۔ چنانچہ اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی "اے ربِ کائنات، مجھے ایسی اولاد سے نواز جس کا ہر سانس، ہر پل تیری رضا کے لیے وقف ہو۔ میں اپنی اولاد کے لیے نہ مال و زر کی خواہش مند ہوں نہ دنیاوی جاہ و جلال کی، بس اپنی اور اپنے محبوب کی محبت میں سرشار اولاد میرے نصیب میں لکھ دے۔"

یہ دُعا دنیاوی زیب و زینت کے طلبگاروں کے لیے بے شک عام ڈگر سے ہٹ کر یا منفرد نوعیت کی تھی مگر وہ جو راہِ حق کے مسافر ہوتے ہیں ان کی سوچ ایسی ہی ہوتی ہے۔ سیم و زر کی حقیقت ان کی نگہ بلند میں پرکاہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ادھر دل کی رغبت اور روح کے میلان سے نکلی ہوئی دعا کے لیے ہاتھ بلند ہوئے ادھر رحمتِ خدا جوش میں آئی اور دعا کو شرف قبولیت حاصل ہوا۔ طلوع سحر سے ذرا پہلے سائیں اللہ دتہ کی زوجہ فاطمہ خاتون کرب تخلیق کا خندہ پیشانی سے استقبال کر رہی تھی۔ قبولیت کی مبارک گھڑی در پر دستک جو دے رہی تھی۔

اس داستان کا آغاز سندھ کے موجودہ شہر دادو کے علاقے سیوستان (سیون شریف) میں ہوا۔ رابعہ ثانی نے اپنے نومولود لختِ جگر کی پیشانی پہ نظر ڈالی پھر چشم بصیرت سے لوح محفوظ کا مشاہدہ کیا تو حیرت میں ڈوبتی چلی گئی۔ اس بے نیاز نے دست کرم اتنا کشادہ کر دیا تھا کہ فاطمہ خاتون کو تنگئ داماں کا احساس ہونے لگا۔ بچہ پیدائشی ولی تھا۔ رابعہ ثانی نے رات کو گھپ اندھیرے

Marfat.com

میں اچانک طلوع ہونے والا ایسا آفتاب عالم تاب دیکھا جس کی ایک ایک کرن، ظلمت کدے کو روشن کرنے والی تھی۔ بچے کی اپنے جد اعلیٰ سیدنا عمر فاروقؓ سے لہو کی نسبت تھی جو اندھیرے اجالے میں امتیاز کر رہی تھی۔ نومولود کا سلسلہ اٹھائیس واسطوں سے امیر المومنین عمر فاروقؓ سے جو مل رہا تھا۔ وہی عمر فاروقؓ جن کے متعلق اس کائنات کے سب سے عظیم انسان کا ارشاد ہے کہ عمرؓ فاروق حق و باطل میں امتیاز کرنے والا یعنی فاروق ہے، مزید یہ کہ جس راہ سے یہ ہستی گزر جائے ابلیس اس راہ سے بھاگ جاتا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ کا انداز ملاحظہ فرمائیں ''واشدفی امر اللہ عمر'' (خدائی معاملات میں سب سے شدید ترین ہستی عمر فاروقؓ کی ہے۔)

نومولود کا نام ''محمد میر'' تجویز ہوا یعنی محمد ﷺ ہی کاروان کائنات کا امیر و رہنما، مالک و مختار کل ہے۔ یہی محمد میر برصغیر کے کونے کونے میں حضرت میاں میر، بالا پیر، میاں جیو اور شاہ میر کے اسماء گرامی سے مشہور رہوئے۔ لفظ ''میاں''، صاحب کا مترادف ہے اور ''جیو''، کلمہ توقیر۔ آپ کے دادا قاضی قلندر بھی سرزمین سندھ میں بلند مرتبت ہستی تھے۔ قاضی اللہ دتہ تو سندھ کے عالم بے بدل تھے اور زہد و تقویٰ میں اپنا جواب آپ تھے۔ اس طرح بالا پیر ننھیال ددھیال سے نجیب الطرفین ہستی اور ''فاروقی''، تھے۔ اس میں شک و شبے کی کوئی بات نہیں کہ اگرچہ حضرت میاں میرؒ کی کم و بیش ساری زندگی سرزمین پنجاب میں بسر ہوئی اور آخری آرام گاہ کے لئے آپ نے شہر اولیاء لاہور پسند فرمایا مگر آپ پیدائشی سندھی تھے اور آپ کی مادری زبان بھی سندھی تھی۔ مقام ولائت اور نور ہدائت کے جس مقام پر بالا پیر فائز تھے اگرچہ وہاں جگہ مقام کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی کہ مینار نور کی ضیاپاشیاں چاروں طرف ایک جیسی ہوتی ہیں پھر بھی علم آگہی کے لیئے آپ کی جائے پیدائش کا تذکرہ ضروری تھا۔ محترمہ رابعہ ثانی کی دعا مقام ''قبولیت'' سے دو قدم آگے نکل گئی اور ان کے ہاں ایک ایسی بچی بھی تولد ہوئی جو اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مقام ولائت پر فائز ہوئی۔ یعنی بی بی جمال خاتون۔ فاطمہ خاتون کے بطن سے بالا پیر کے تین بھائی اور دو ہمشیر گان تولد ہوئیں، اسماء گرامی درج ذیل ہیں

قاضی بولن، قاضی عثمان، قاضی طاہر۔ ان اولاد نرینہ کے علاوہ بی بی جمال خاتون اور بی بی جمال بادی۔ بی بی جمال خاتون اور قاضی لطف اللہ توام پیدا ہوئے تھے۔ قاضی لطف اللہ کم سنی میں ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔

بالا پیر کے سن ولادت کے متعلق دو آراء پائی جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ پیدائش ۹۳۸ ھ

Marfat.com

بمطابق ۱۵۳۲ کو ہوئی۔ اس طرح یہ مغل شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں کا پہلا دور حکومت بنتا ہے یعنی شیر شاہ سوری سے شکست کھانے سے پہلے۔ دوسری رائے جس پر اکثر لوگ متفق ہیں وہ ۹۵۷ھ بمطابق ۱۵۵۰ء جو مغل شہنشاہ اکبر کا دور حکومت ہے۔ البتہ سن وفات متفقہ طور پر ۱۰۴۵ھ ربیع الاول بروز سہ شنبہ بمطابق ۱۶۳۵ء مانا جاتا ہے۔ اس طرح جب حضرت میاں میرؒ نے شعوری آنکھ کھولی تو عہد اکبری کا آغاز تھا۔ پھر نورالدین جہانگیر کا عہد گزرا اور شہاب الدین شاہ جہاں کے زمانے میں آپ کا وصال ہوا۔ ان بادشاہوں کی اولادیں بھی آپ کی غلام ہوئیں۔ بالا پیرؒ واقعی بادشاہوں کے پیر تھے۔ درویش کی حیات مبارک اس بات منہ بولتا ثبوت فراہم کرتی ہے اور درویشی میں اگر سچائی ہو تو شان فغفوری اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔ آستانہ درویش پر وقت کے شہنشاہ برہنہ پا حاضر ہوا کرتے تھے اور اس حضوری کو توشۂ آخرت تصور کرتے تھے۔

محمد میر کا بچپن سیوستان کے گلی کوچوں میں گزار۔ سرزمین سندھ میں چوں کہ دین فطرت کا بیج سب سے پہلے بویا گیا تھا لہذا فضائیں اس کی مہک سے نسبتاً زیادہ عطر بیز تھیں۔ ان ہواؤں میں لیا جانے والا ہر سانس بچے کی بنیاد مضبوط کر رہا تھا اور اس کے مقامات بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ ننھے سے کورے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے سوالات جنم پذیر ہوتے۔ قاضی اللہ دتہ علم لدنی کی روشنی میں لختِ جگر کی تسلی و تشفی کرتے۔

بالا پیر جب کم سنی میں ایسے سوالات کرتے جو اُن کی عمر سے لگا نہیں کھایا کرتے تھے تو وہ سننے والے جو واقفِ حال نہیں تھے' ورطہ حیرت میں ڈوب ڈوب جاتے' البتہ بچے کی حقیقت سے آشنا سماعتیں حیرت زدہ ہونے کی بجائے لطف اندوز ضرور ہوتیں۔ چھ سات برس کی عمر میں میاں جیوؒ نے پہلی مرتبہ علم لدنی کا مظاہرہ کیا اور واقفِ حال لوگوں کو بھی حیران کر دیا۔ انداز بیاں گرچہ شوخ نہیں تھا مگر تقریر کا ہر لفظ سامعین کے دلوں میں اتر گیا یہی اکتسابی اور لدنی علم میں فرق ہوتا ہے۔ مسئلہ تقدیر زیر بحث تھا اور سائیں اللہ دتہ دل کش انداز میں نقطہ نظر کی وضاحت فرما رہے تھے۔ یک از سامعین نے سوال کیا اگر قسمت کا لکھا ہر صورت ہونا ہے تو انسان مجبور محض ہوا لہذا اجزا اور سزا چہ معنی دارد؟۔" سوال اگرچہ صدیوں پرانا تھا مگر اس کی تلخی بہر حال ناگوار حد تک محسوس کی جا سکتی تھی۔

"تقدیر اندازے کا نام ہے" کم سن بچہ تلخی کو برداشت نہ کر سکا "انسان کا علم چونکہ محدود ہوتا ہے۔ لہذا اس کا اندازہ ناقص ہو سکتا ہے مگر قادرِ مطلق کا علم اس کی اپنی ذات کی طرح ہر نوع

Marfat.com

کے نقص سے پاک ہوتا ہے۔لہذا اس کا اندازہ بے عیب اور ہر نقص سے پاک ہونا چاہیے۔جب ہم کہتے ہیں کہ تقدیر اٹل ہے تو اصل میں ہم اپنے رب کے علم کی تعریف و توصیف کرتے ہیں جس نے خیر و شر تخلیق فرمانے کے بعد انسان کو برے بھلے کا شعور بھی دیا اور اندازہ لگا کر لوحِ محفوظ پر لکھ بھی دیا کہ میرا یہ بندہ اس راستے کا مسافر ہوگا اور اپنے روّیے کے مطابق سزا یا جزا کا مستحق ٹھہرے گا۔''

تقدیر کی یہ سادہ مگر جامع تشریح سن کر قاضی اللہ دتہ بھی حیران رہ گئے۔فاطمہ خاتون کو خبر ہوئی تو اس نے لختِ جگر کی پیشانی پر بوسہ دیا اور سمجھایا ''میرے فرزند! اپنی عمر کے مطابق بات کرنا ہی دانش کا تقاضا ہے ورنہ رازِ ربی کا اخفا ممکن نہیں۔''

''امی جان: میں آئندہ محتاط رہوں گا'' بالا پیرؒ نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔یہ بات مستند ہے کہ بالا پیر اپنے والد بزرگوار سے زیادہ والدہ رابعہ ثانی کی فکر رسا سے فیض یاب ہوئے۔

سات برس کی عمر میں اس ہستی کو دنیاوی سائے سے محروم کر دیا گیا جسے خود آگے چل کر شاہ و گدا کے لیے شجر سایہ دار بننا تھا۔قاضی اللہ دتہ نے دمِ آخر ڈوبتی نگاہوں سے اپنے لاثانی لختِ جگر کو شریکِ حیات کے سپرد کیا اور ان کی داستانِ حیات کا عارضی باب اختتام پذیر ہوا۔ایک زندگی کی شام ہوئی دوسری کا آغاز ہوا۔موت کو زندگی کا اختتام سمجھنا پرلے درجے جہالت ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوامِ زندگی

رابعہ ثانی نے اپنے فرزندِ محمد میر کو سلسلہ قادریہ سے باقاعدہ متعارف کرایا۔ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ علم باطن تعلیم کیا۔طلب و عطا کا یہ سلسلہ پانچ برس تک جاری رہا۔

بارہ برس کی عمر میں بچے پر عالم ملکوت کے اسرار ظاہر ہونے لگے۔والدہ کی ذات با برکت اور زہد و تقویٰ پشت پناہی کو موجود تھے۔عطا میں خلوص کی انتہا نہ تھی۔راہِ سلوک کا مسافر برق رفتاری سے منازل طے نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔میاں میرؒ اس لحاظ سے خوش بخت واقع ہوئے تھے کہ راہبر' حقیقی معنوں میں دل و جاں فدا کرنے والا تھا۔پروردگار نے بھی ماں کی محبت ہی کو معیار قرار دیا ہے۔(اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رب کائنات اپنے ہر بندے پر ستر ماؤں سے زیادہ محبت نچھاور فرماتا ہے۔)

بالا پیرؒ اکثر راہبر سے اجازت لے کر سیوستان کی پہاڑیوں میں یا کسی مناسب گوشہ

Marfat.com

تنہائی میں عبادت اور غور و فکر کی خاطر چل دیتے۔ اضطراب حد سے بڑھ جاتا تو یہ پہاڑی سلسلہ "گرفتارِ نو" کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔

"امی جان! جانے کیوں مجھے ان پہاڑیوں میں پہنچ کر دولتِ سکون و اطمینان میسر آتی ہے" ایک روز محمد میر نے والدہ سے کہا۔

"فرزند! اس بات کا جواب تمہیں عنقریب مل جائے گا۔ بس اتنا یاد رہے کہ جہاں آب و دانہ ہو وہیں پرندہ چہچہاتا ہے" رابعہ ثانی (فاطمہ خاتون) نے زیرِ لب مسکرا کر فرمایا۔

"آب و دانے کے ساتھ صیاد کے جال کی موجودگی کا احتمال بھی تو ہوتا ہے" ماں بیٹے یا پیر و مرید میں اشارے کنائے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ والدہ نے چونک کر لختِ جگر کی طرف دیکھا۔

"بیٹا' جال سے تمہاری مراد اگر شیطانی وسوسے ہیں تو ان کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن جن شاہینوں کے پروں میں دم خم ہو وہ کبھی زیرِ دام نہیں آتے۔ خدا کے فضل و کرم سے تمہاری رگوں میں فاروقی خون رواں دواں ہے اور پشت پناہی پر غوث الثقلین' پھر ابلیس لعین سے کیوں خائف ہو؟"

"امی حضور میں خائف نہیں بلکہ اس لعین سے دو دو ہاتھ کرنے کو بے تاب ہوں" محمد میر اصل مدعا زبان پر لے آیا۔

دن گزرتے رہے بچے کا اضطراب بڑھتا رہا۔ جو کچھ والدہ ماجدہ کے پاس تھا وہ حاصل ہو چکا تھا۔ شاہین کو رنگین ابر پارے 'دعوت پرواز دے رہے تھے۔ وہ آسمان سلوک کی بے کراں وسعتوں میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔ رابعہ ثانی اپنی ظاہری آنکھ اور باطنی چشم بصیرت سے سب کچھ ملاحظہ فرما رہی تھیں۔ آخر ایک دن روز جدائی کی گھڑی نے آ دستک دی۔

"امی آپ کی اجازت ہو تو میں سفر اختیار کر جاؤں" "محمد میر" کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی "آپ کی دعاؤں کے طفیل اب میں بے سر و سامان نہیں رہا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی مجھے کافی کچھ حاصل کرنا ہے"۔

"ہاں میرے فرزند ابھی تمہاری منزل واقعی بہت دور ہے۔ میں نے تجھے خدا کی امان میں دیا" پھر فاطمہ خاتون نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگایا' چند وظائف بطور خاص عنائت فرمائے اور لختِ جگر کو سفر کی اجازت دے دی۔ آپ میں ابھی تک بلوغت کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے مگر قلب و نظر میں وسعت ہو چکی تھی۔

Marfat.com

محمد میرؒ نے قلب سلیم کو راہبر تسلیم کیا (قلب سلیم جس میں تقویٰ ایمان عرفان تینوں صفات پیدا ہو چکی ہوں) دل تھا کہ سیوستان کی پہاڑیوں کی طرف جانے کو بے قرار ہو رہا تھا ''اس میں ضرور کوئی مصلحت تھی'' راہ سلوک کے مسافر نے سوچا'' ورنہ یہ بے تابی بلا جواز نہیں ہو سکتی ''پہاڑیوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ دولت قناعت سے مالا مال تھے۔ رخت سفر کی حاجت ہی نہ تھی۔ پنچھی اور درویش جب سفر اختیار کرتے ہیں تو ''رزق'' کے بکھیڑے نہیں پالا کرتے' صرف رازق کے بھروسے چل نکلتے ہیں اور بالا پیر کی قناعت کا تو یہ عالم تھا کہ غبار شام کے اترتے ہی کوزے کا پانی گرا دیتے اور فرماتے'' مجھے اس رزاقی پر ایمان کامل ہے اور ایمان ہی کا تقاضا ہے کہ ضرورت سے زیادہ پانی کی ''ذخیرہ اندوزی'' نہ کی جائے۔

بھوک زیادہ ستاتی تو کسی درخت کا پھل استعمال میں لے آتے۔ تشنگی دور کرنے کے لیے پہاڑوں کے پتھروں سے پانی حاصل ہو جاتا۔ سورج نصف النہار پہ تھا جب ایک باریش ہستی سے محمد میر کی ملاقات ہوئی۔

''یہ عمر اور زہد و تقویٰ کا یہ عالم'' باریش بزرگ نے توصیفی کلمات سے آپ کو مخاطب کیا۔ ''اپنی عبادت کے طفیل ہی تم اس ویرانے میں زندہ سلامت موجود ہو۔''

لڑکے نے چونک کر اجنبی کو دیکھا۔ پل بھر کے لیے تعریفی کلمات سے فصیل جاں میں سرور کی لہری اٹھی مگر فوراً ہی مثبت سوچ نے اسے دبا دیا۔

''آپ کی تعریف؟'' محمد میر نے شائستہ لہجے میں اجنبی سے پوچھا۔

''میں رب کائنات کی جانب سے بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہ راست پر لانے کے لیے مامور کیا گیا ہوں'' اجنبی نے دراز ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''مگر تمہاری پیشانی نور عبادت سے منور ہے تمہیں ''راہ راست'' کی ضرورت ہی نہیں''۔

''راہ راست کی ضرورت تو ہر فرد بشر کو ہر پل رہتی ہے۔ محترم یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟'' محمد میر نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''برخوردار' خالق کائنات کی بے ریا عبادت جسے تم زندگی کا شعار بنا چکے ہو بہت بڑی بات ہے۔ اس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ عبادت ہی تو بندے کی بخشش کا وسیلہ ہے'' اجنبی نے بڑے دل کش انداز میں رنگین جال پھینکا۔ ''اور بخشش ہی کی ساری اہمیت ہے یہی تو جنت میں داخل ہونے کا شہادت نامہ ہے میں تمہیں چند ایسے وظائف تعلیم کرنا چاہتا ہوں جو تقرب الٰہی کی

Marfat.com

لیے تیر بہ ہدف کا درجہ رکھتے ہیں'' اجنبی اپنی رو میں کہتا جا رہا تھا مگر میر کے ہونٹوں پر عجیب نوعیت کی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''محترم: میں آپ کو اچھی طرح پہچان گیا ہوں۔آپ سے ملاقات کا تو میں ایک عرصے سے تمنائی تھا'' لڑکے نے بے باک لہجے میں کہا'' رہی بخشش والی بات تو کان کھول کر سن لو اس کا دارومدار عبادت پر نہیں خواہ بے ریا ہی کیوں نہ ہو۔ بخشش صرف اور صرف اس کی رحمت اور کرم نوازی کا نتیجہ ہوگی ورنہ جس انسان کی تخلیق کا آغاز' ناپاک حیض والے خون سے ہو وہ کس منہ سے اپنے تقدس کا راگ الاپ سکتا ہے' کبھی آپ نے انسان کی ہڈیوں کو پہنائے ہوئے لباس پر غور فرمایا؟ ہمیں صرف ''نکال'' عطا کر کے اور اندر کی غلاظتوں کی پردہ پوشی فرما کر ربِ کائنات نے کتنی بڑی کرم نوازی فرمائی۔ ہم کس منہ سے عبادتِ بے ریا کا ڈھنڈورا پیٹیں اور اپنی عبادت کو بخشش کا وسیلہ قرار دیں؟ ہم جو غلاظت کا ڈھیر ہیں اپنے تقدس پر کیوں کر اترائیں؟'' لڑکے کا انداز بیاں' باڑ پر آئی ہوئی ندی کے مانند' اجنبی کے فلسفے کو بہا لے گیا اور اجنبی حیران و ششدر اسے دیکھنے لگا۔

''آپ کے وظائف کا جواب میں صرف ایک فقرے سے دیتا ہوں اور وہ ہے ''لاحول ولاقوۃ'' محمد میرؒ کے ہونٹوں سے یہ کلمات ادا ہوئے تو دراز ریش اجنبی چیختا چلاتا دُم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس پہاڑی علاقے میں فرزندِ رابعہ ثانی کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ابلیس نے کیسے کیسے رنگین جال پھینکے اور کون کون سے داؤ آزمائے۔ یہ ایک طویل داستان ہے مگر راہِ سلوک کے جواں ہمت مسافر کے پائے استقامت میں ذرّہ برابر لغزش نہ آئی اور یہ ربِ کائنات کی خاص کرم نوازی سے ممکن ہوا۔ اسی علاقے میں ایک روز محمد میر کو ایک ایسی شے دکھائی دی جس کی موجودگی کا وہاں کوئی جواز نہ تھا۔ پھرتے پھراتے محمد میرؒ ایک ایسے مقام پر پہنچے جو فرش زمیں پر جنت کا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا۔ پھل دار اشجار پر طائرانِ خوش گلو چہچہا رہے تھے مگر ایک کونے میں تنور تھا جس کا منہ پتھر سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ حیرت زدہ اس تنور کو دیکھنے لگے......

''سبزہ و گل اور پرندوں کی موجودگی کے سبب اس جگہ کو آباد قرار دیا جاسکتا ہے مگر انسانوں کی عدم موجودگی اسے ویران بنائے دے رہی ہے'' محمد میرؒ نے دل میں سوچا۔ ''اس تنور سے پرندے تو استفادہ کرنے سے رہے۔ تو پھر اس کی یہاں موجودگی کا سبب؟ کون یہاں روٹیاں

Marfat.com

پکاتا ہے؟'' روٹیوں والے سوال کو دل نے رد کر دیا تو دھڑکتے دل سے انہوں نے آگے بڑھ کر تنور کا ''ڈھکنا'' اٹھایا' اندر ایک بڑا سا پتھر دکھائی دیا جو اندرونی تمازت سے گرم تھا۔ ساری صورت حال کی وضاحت ہوگی۔ کم از کم دل نے یہی وضاحت پیش کی'' یہ ضرور کسی تنہائی پسند مرد درویش کا ٹھکانا ہے'' محمد میر بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ راہِ سلوک کے مسافر اسے ''ترک و تجرید'' کا نام دیتے ہیں۔ یعنی مکروہات زمانہ حاصل کر کے گوشۂ تنہائی میں پوری یکسوئی سے' یاد الٰہی میں مصروف ہو جانا۔ واضح ہو جوگ سنیاس اور ترک تجرید بظاہر ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں مگر ان میں واضح فرق ہوتا ہے۔ ترک و تجرید جو بالا پیرؒ کا طریقہ کار رہا' زمانے سے نہیں' مکروہات زمانہ سے قطع تعلق کا نام ہے۔ ورنہ خلق خدا کو جتنا فیض بالا پیرؒ نے پہنچایا اس سے ایک زمانہ آشنا ہے۔

''اس مرد قلندر سے ملاقات ہونا چاہیئے'' یہ سوچ کر میاں میرؒ اس تنور کے پاس بیٹھ گئے۔ غبار شام اترا' شب سیاہ نے ہر چیز کو ڈھانپ لیا۔ سطح سمندر سے بلندی کے سبب' خنکی شدت اختیار کرتی چلی گئی...... دل میں خیال آیا تنور کی تمازت سے راحت حاصل کی جائے مگر مرد قلندر کی جگہ پر بیٹھنا سوئے ادب کے زمرے میں آتا ہے۔'' یہی سوچ کر تنور میں بیٹھنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ خیال تو خیال راہ عشق کے مسافر تو بے ادب دل کو سینے سے نکال باہر کرتے ہیں۔ سینہ عشاق تو مثل مدینہ ہوتا ہے اور مدینہ میں بے ادب کا کیا کام؟

کل شب دل آوارہ کو سینے سے نکالا

یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا

رات تنور سے باہر سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے گزاری۔ طلوع آفتاب کے بعد سردی سے تو نجات مل گئی مگر بھوک ستانے لگی۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی معلوم ہوا' آج کا رزق ابھی تک نہیں اترا۔ سجدہ شکر ادا کیا گیا۔ اچانک پھل دار درختوں پر نگاہ پڑی قدم قریب ترین درخت کی جانب اٹھے اور بے اختیار ہاتھ پھل کی طرف بڑھا' مگر اچانک محمد میر نے ''دست دراز'' کو روک لیا۔

یہ اشجار ممکن ہے کسی کی ملکیت ہوں۔ مالک کی اجازت کے بغیر پھل توڑنا اور آتش شکم بجھانا گویا لقمہ حرام نگلنا ہوا'' یہ سوچ کر راہ سلوک کا مسافر پھر اپنی جگہ پر آن بیٹھا۔ سارا دن اسی انتظار میں گزر گیا پھر ہر چیز نے شب سیاہی کی چادر اوڑھ لی' مرد درویش کو آنا تھا نہ آیا مگر محمد میرؒ پوری استقامت سے محو انتظار رہے۔ انتظار ''طویل شب فراق'' سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ تین راتیں اور تین دن اسی آزمائش میں گزر گئے۔ دل کہتا تھا کہ آنے والا ضرور آئے گا اور اچانک

Marfat.com

آئے گا۔ بھوک پیاس کو شکست فاش دی جا چکی تھی اس فساد کی جڑ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تو اندر کا شور قدرے کم ہوا۔ خدا خدا کر کے مرد قلندر تشریف لائے۔ یہ چوتھے دن کی روداد تھی۔

درویش کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بے تابی دل کو قرار سا آ گیا۔ شاید اسی ''قرار'' کی خاطر'' اتنے شب و روز دل سپرد اضطراب رہا تھا۔

السلام وعلیکم' یا حضرت'' محمد میر'' مودبانہ نے لہجے میں اٹھ کر استقبال کیا۔

''وعلیکم السلام! محمد میر کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو'' آنے والے نے نام لے کر سلام کا جواب دیا تو محمد میر کو منزل دو قدم پر دکھائی دینے لگی۔ جیسے تپتے صحرا میں راہ گم کردہ مسافر شاداب نخلستان تک آ پہنچے' جیسے تشنہ لب مسافر جھیل کے کنارے آ جائے

''حضور بھٹکنے والی بات قصہ پارینہ ہوئی' اب تو منزل مراد تک رسائی ہو گئی' چنتا' فکر' اندیشے پیچھے رہ گئے''۔

''محمد میر زیادہ گفتگو سے اجتناب کیا کرو'' آنے والے نے زیر لب مسکرا کہا۔

''حضور! آپ میری دلی کیفیت سے بخوبی واقف ہیں' میری کیفیت امام غزالی والی ہو رہی ہے۔''

مرد قلندر نے چونک کر شاہین صفت لڑکے کی طرف دیکھا جس نے ایک فقرے میں پوری داستان بیان کر دی تھی کوزے میں دریا نہیں' بلکہ سمندر بند کر دیا تھا۔

ایک بار موسیٰ کلیم اللہ کو سرور کائنات ﷺ سے شرف گفتگو ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری امت میں ایسے ایسے بلند مرتبت علماء ہوں گے جن کا مقام دوسری امتوں کے انبیاء جیسا ہو گا'' کلیم اللہ نے پوچھا ''میں آپ کے کسی ایسے ہی امتی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

سرور کائنات ﷺ نے روح امام غزالیؒ کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ موسیٰ کلیم اللہ نے بغور امام غزالیؒ کو دیکھا اور فرمایا ''تمہارا نام؟''

''ابو حامد محمد بن محمد الطوسی' اور دنیا مجھے امام غزالیؒ کے نام سے جانتی پہچانتی ہے' میرا پیشہ''...... امام غزالیؒ تفصیل بیان کیے جا رہے تھے کہ موسیٰؑ نے مداخلت کی۔

''میں نے صرف نام پوچھا تھا' تم نے لمبی چوڑی غیر ضروری گفتگو شروع کر دی'' موسیٰؑ نے امام غزالیؒ کو روکتے ہوئے فرمایا۔

''آپ سے بھی اللہ تعالیٰ نے صرف یہ دریافت فرمایا تھا' موسیٰ تیرے دائیں ہاتھ میں

Marfat.com

کیا ہے؟ آپ کو صرف اتنا کہہ دینا چاہیے تھا۔ ''یہ میرا عصا ہے مگر آپ کا جواب تھا۔ یہ میرا عصا ہے میں اس پر سہارا لیتا ہوں اور اسی سے اپنی بکریاں ہانکتا ہوں' بھلا اس گفتگو کی کیا ضرورت تھی؟''

''حامدٌ حذِ ادب تم کلیم اللہ سے ہمکلام ہو'' سرورِ کائنات ﷺ نے سرزنش کی اور اپنے پائے مبارک سے امام غزالیؒ کی ٹانگ پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔ امام غزالیؒ کا جواب' بیشک لاجواب تھا مگر شانِ پیغمبری میں سوئے ادب کے زمرے میں آتا تھا۔ عالم ارواح میں سرورِ کائنات ﷺ کی رسید ہوئی ''ٹھوکر'' کی بنا پر امام غزالی ایک ٹانگ سے ہلکا سا لنگڑا کر چلا کرتے تھے۔ (موسیٰ کی رب کائنات سے مکالمت قرآن مجید میں ہے)

مردِ درویش کو محمد میر کی گفتگو اتنی پسند آئی کہ بے اختیار آگے بڑھ کر نوعمر لڑکے کو سینے سے لگا لیا۔ یہ ایک پائیدار رشتے کا اعلان تھا' وہی رشتہ جو راہِ سلوک میں مرید و مرشد کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ درویش' ترک و تجرید میں یکتا' متوکلوں کے امام اور سلسلہ قادریہ کے یگانہ آفاق بزرگ حضرت خضر سیوستانیؒ تھے۔ بالا پیرؒ ان کو غوث وقت کہا کرتے تھے۔

ابدال وقت حضرت خضر سیوستانیؒ سے روحانی سلسلے کے علاوہ بالا پیر سرور کائنات ﷺ کے اویسی بھی تھے۔ اویسی ان بزرگان دین کو کہتے ہیں جن کو ظاہری مرشد و راہبر کی حاجت نہ ہو اور وہ بلاواسطہ حضور اکرم ﷺ سے فیض یافتہ ہوں۔ تصوف کی بلند پایہ تصنیف ''نفحات الانس'' میں شیخ فریدالدین عطار نے اس کی بڑی دل نواز تشریح فرمائی ہے۔

''بعض اولیاء اللہ کو مشائخ طریقت ''اویسی'' کہتے ہیں۔ ان ہستیوں کو رسالت پناہ ﷺ بلاواسطہ اپنی عنایت کی حمایت میں پرورش فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت اویس قرنیؒ کی پرورش فرمائی لہذا ان کو کسی دوسرے مرشد و راہبر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سنت نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہو کر بعض اولیاء اللہ نے جو حضور ﷺ کے تابعین میں سے تھے' اپنے بعض طالبوں کی روحانی تربیت فرمائی۔ وہ بھی ''اویسی'' کہلاتے ہیں۔'' اس اعتبار سے حضرت میاں میرؒ رسول اکرمؐ کے ''اویسی'' قرار دیئے جاتے ہیں۔

''عزیزم! یہاں کب سے محوِ انتظار ہو؟'' خضر سیوستانیؒ نے گرفتار نو سے پوچھا۔

''حضور! تین روز سے یہاں بیٹھا ہوں مگر نا امید ہرگز نہ تھا۔''

''مگر میں تو شاید کل رات اسی جگہ موجود تھا یا شاید نہیں تھا۔'' یہ عالم استغراق کی کیفیت تھی۔

''حضور! آپ کو یہاں سے غائب ہوئے تین روز گزر چکے ہیں۔''

Marfat.com

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔''

خضر سیوستانیؒ توکل کے منفرد مقام پر فائز تھے۔موسموں کی شدت نظر انداز کرتے ہوئے صرف ایک تہمند زیب تن ہوتا جوناف سے زانو تک ستر پوشی کے کام آتا اس کے علاوہ ایک لوٹا اور ایک بوریا' دنیاوی سازوسامان تھا۔لوگ اسے بے سروسامانی قرار دیتے مگر

کچھ خوف احتساب نہ سودو زیاں کا ڈر

یہ فائدہ تو بے سروسامانیوں کا ہے

کے مصداق آپ کی نگاہ دنیاوی سازوسامان کے سود زیاں پر تھی طہارت کا خاص اہتمام ہوتا۔اس کے لیے لوٹا بے حد ضروری تھا۔''ترک وتجرید'' پر سختی سے کاربند تھے۔آبادی سے دور پہاڑی مقام پر بسیرا تھا۔کبھی کبھی آبادی کا رخ کرتے اور حقوق العباد کی ادائیگی کے بعد اپنے ٹھکانے کو لوٹ جاتے۔موسم کی خنکی اگر شدت اختیار کر جاتی تو تنور دہکا کر اس میں بیٹھ جاتے۔جب خالق کائنات سے محو راز و نیاز ہوتے تو گرمی سردی کا احساس مٹ جاتا۔یہی وہ تنور جس پر بالا پیر کی نظر پڑی تھی۔

اس دور میں خضر سیوستانیؒ مقام ''استغنا'' کو بہت پیچھے چھوڑ چکے تھے۔جب حاکم سیوستان ملاقات کو حاضر ہوا۔درویش دھوپ میں بیٹھا تھا۔حاکم وقت سامنے آکر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

''یہاں تشریف لانے کا سبب؟'' درویش نے حاکم وقت کے لباس فاخرہ کو ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میری تمنا ہے کہ آپ کسی خواہش کا اظہار فرمائیں اور میں تعمیل ارشاد میں خدمت بجا لاؤں۔''

''جہالت' کدورت' گمراہی کے علاوہ تم مجھے کیا عطا کر سکتے ہو کیوں کہ یہی اشیا بافراط تمہاری ملکیت میں ہیں۔'' فقیر بے ریا نے بیباکی سے جواب دیا۔

''حضور' پھر بھی خدمت کا موقع تو عطا فرمائیں۔''

''اگر کچھ دینا ہی چاہتے ہو تو سورج کی آنے والی کرنوں کے راستے سے ہٹ جاؤ۔یہ بڑا لمبا سفر طے کر کے مجھ تک پہنچ رہی ہیں'' درویش نے ناگواری سے کہا' حاکم وقت خجل خجل سا ایک طرف ہٹ گیا۔اس نے خضر سیوستانیؒ کی بے نیازی کے متعلق سن رکھا تھا مگر سننے اور دیکھنے

Marfat.com

ں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

''حضور کم از کم مجھے اپنی دعاؤں ہی میں یاد رکھیں۔''

''خدا وہ وقت نہ لائے جب میرے دل میں پل بھر کے لیے بھی ماسوا کا خیال پیدا ہو اب تم یہاں سے جا سکتے ہو' مجھے اس خسارے کو پورا کرنا ہے جو تم جیسے سگِ دنیا سے محو کلام ہو کر اٹھا چکا ہوں۔''

حاکم سیوستان کھسیانا ہو کر آستانہ فقیر سے لوٹ آیا۔

جن کو آسمان جیسی وسیع و عریض چھت' زمین جیسا کشادہ فرش' خدمت کے لیے آفتاب و مہتاب کی کرنیں میسر ہوں' ان کو اور کیا چاہیے؟ خضر سیوستانی بھوک پیاس مٹانے کے لیے جنگلی پھلوں کو استعمال فرماتے۔ اس بلند مرتبہ فنا فی الذات کا مزار سکھر ریلوے اسٹیشن کے قریب دریائے سندھ کے وسط میں سادھو بیلہ کے مقام پر موجود ہے۔ مزار کے قریب ایک مندر اور ایک گوردوارہ بھی ہوا کرتا تھا۔ (قیام پاکستان تک مندر اور گوردوارہ دونوں موجود تھے' آج کی خبر خدا جانے)

مغل شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں حضرت بالا پیر کے مرشد کا وصال ہوا۔ ۹۹۴ھ بمطابق ۱۵۸۶ء تاریخ وصال کے لیے مفتی غلام سرور لاہوری کا فارسی مصرع ہے۔

آفتاب عارفاں' حق بگو

۹۹۴ھ

سیوستان کی پہاڑیوں میں بالا پیر کی تربیت کا اعلیٰ دور شروع ہوا۔ خضر سیوستانی نے دل کھول کر عطا کیا۔ ادھر طلب کی شدت بھی انتہا کی تھی۔ عمروں میں طے ہونے والی منازل دنوں مہینوں میں طے ہونے لگیں۔ راہوار سرپٹ دوڑا تو زمان و مکان کی گویا طنابیں کھنچ لی گئیں۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا' ایک تو میاں جیو' اویسی تھے دوسرے مرشدی سلسلہ تذکرۃ الفقرا کے حوالے سے غوث الثقلین تک جا پہنچتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت میاں میر مرید شاہ خضر ابدال سیوستانیؒ مرید شاہ سکندرؒ قادری کیتھلیؒ مرید کبیر اولیاء خواجہ شاہ کمالؒ مرید سیّد علی قادریؒ مرید حضرت شاہ جمال مجذوبؒ مرید حضرت لال شہباز قلندرؒ مرید حضرت ابو اسحاق ابراہیمؒ مرید شیخ مرتضی سبحانیؒ مرید شیخ احمد بن مبارکؒ مرید شیخ عبدالقادر جیلانیؒ غوث الثقلین۔

Marfat.com

ان روحانی روابط کے علاوہ جو سلسلہ ہر مکتبہ فکر کے بزرگان مستند قرار دیتے ہیں وہ ختمی مرتبت حضور ﷺ تک بڑے دل نواز طریقے سے پہنچتا ہے۔ اس کی ہر کڑی عظمت بیکراں کا مظہر ہے یہ مقام یہ مرتبہ کمایا نہیں جا سکتا' قادرِ مطلق کی خاص کرم نوازی ہی حاصل ہوتا ہے۔ چشم بصیرت وا کر کے ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت میاں میرؒ قادری خلیفہ خضر ابدال سیوستانیؒ خلیفہ سید احمد ولیؒ ' سید عابد کبیر قادریؒ شیخ ابوالقاسم قادریؒ شیخ موسیٰ حلبیؒ ' شیخ ابو بکر مقبولؒ شیخ داؤد کریمؒ شیخ سلیمان قادریؒ شیخ حفص ابو بکرؒ خلیفہ شیخ حسن علی قرشیؒ قطب آلا فاق شیخ عبدالرزاق جیلانیؒ خلیفہ محبوب سجانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ' خلیفہ ابو سعد مخرومیؒ شیخ ابوالحسن ہنسکاریؒ ابوالفرح طرطوسیؒ شیخ عبدالواحد تمیمیؒ شیخ ابو بکر شبلیؒ شیخ ابوالقاسم جنید بغدادیؒ خلیفہ حضرت سری سقطیؒ حضرت معروف کرخیؒ حضرت داؤد طائی' حضرت حبیب عجمیؒ حضرت حسن بصریؒ خلیفہ اسداللہ الغالب علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ مولائے کائنات فخر موجودات حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

بیٹا جی' پر سکون بہتے دریا میں سیلاب آجائے تو کیا کرنا چاہیے؟'' ایک روز خضر سیوستانیؒ نے اپنے مرید باصفا سے فرمایا۔

دریا کی گزرگاہ کو گہرا کر دینا چاہیے'' محمد میرؒ نے مودب لہجے میں جواب دیا۔

اگر یہ ممکن نہ ہو تو؟'' مرشد نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

''دریا کی روانی کو متبادل راستہ بھی فراہم کر دینا چاہیے تا کہ سیلاب کا زور ٹوٹ جائے اور خلق خدا اس سے مستفید ہو سکے'' بالا پیر نے بصد احترام جواب دیا۔ مرشد کا مفہوم سمجھ کر ان کا دل دھڑکنے لگا۔

''عزیزم تم نے سچ کہا' جدائی کی گھڑی سر پر آچکی ہے' اب تم مدینۃ الاولیاء لاہور کی طرف کوچ کر جاؤ۔ یہی لوح محفوظ پر لکھا ہے لہٰذا رضائے الٰہی کے آگے ہمیں سر تسلیم کر دینا چاہیے۔

۱۵۷۵ء میں حضرت میاں میرؒ نے سرزمین لاہور پر قدم رنجہ فرمایا۔ یہ جلال الدین محمد اکبر مغل شہنشاہ کا دور حکومت تھا۔ نصیر الدین ہمایوں سفر آخرت اختیار کر چکا تھا۔ واضح ہو مغل شہنشاہ اکبر ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک بغاوتوں تک کو کچلنے اور شورشوں کو رفع کرنے کی غرض سے لاہور قیام پذیر رہا۔ اس دور خرابی میں مسلمان قدرے کمزور اور اقلیت میں تھے۔ ہندومت نے اس وقت پر پرزے نکالے' بھگتی تحریک کا آغاز اسی زمانے سے ہوا۔ یہ ایک خالص ہندو تحریک تھی جو مسلمانوں کے

Marfat.com

انہدام اور اسلام کے ہندومت میں ادغام کے لئے معرض وجود میں آئی۔ ہندوؤں نے حاکم وقت کی سیاسی اغراض کا بغور مطالعہ کیا اور اسے غرضوں کے رنگیں بستر فراہم کیے۔ یہ سیدھا سادہ سیاسی ضروریات کا مسئلہ تھا جس کی بنا پر اکبر اعظم ہندومت کی گود میں جا بیٹھا۔ ہندوؤں نے اسے مہابلی بنا دیا اور مہابلی نے رشتہ داریوں سے ان کی وفاداریاں خرید لیں اور روح اسلام کے زخموں کو نظرانداز کر دیا۔

علمائے سو اور درشنی' ریاکار صوفیا کا گروہ' سرکار دربار سے منسلک ہو گیا۔ ان پر انعام واکرام کی بارش ہوئی اور اہلِ دل حضرات پسِ دیوارِ زنداں' عتاب کی چکی میں پسنے لگے۔ دنیا کے عشاق و طلب گار اکبر کی جھنڈے تلے جمع ہو کر اپنی اپنی ڈفلیاں بجانے لگے۔ اسی رقص ابلیس کی روشنی میں جسے اندھیرا کہنا زیادہ مناسب ہے' اکبر نے وحدتِ ادیان کے نام پر دین الٰہی کی بنیاد رکھی۔ یہ ایک ایسی عمارت تھی جس کی بنیاد میں زلزلے قیام پزیر تھے اس کا زمیں بوس ہونا تو یقینی امر تھا مگر وقتی طور پر اہل دنیا کو اس نے مرعوب ضرور کیا۔ جہاں تک دل والوں کا تعلق ہے تو وہ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہنے لگے۔

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو' ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

علمائے حق اور مشائخ سروں پہ کفن باندھ کر اس طوفانِ بدتمیزی کے سامنے ڈٹ گئے۔ مجدد الف ثانیؒ شیخ احمد سرہندیؒ حضرت باقی باللہؒ اور دیگر سلسلہ قادریہ کے بزرگان نے مل کر ''جرگہ محمدان اسلام'' قائم کیا اور خیر و شر میں نبرد آزمائی کا آغاز ہوا۔ حضرت میاں میرؒ نے اپنے منفرد انداز میں اس کا مقابلہ کیا۔ احیائے ملت کا یہ انداز اتنا دلفریب تھا کہ بلا امتیاز مذہب و ملت' عوام الناس ان سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرنے لگے۔ درویش کے قیام لاہور پر روشنی ڈالنے سے پیشتر اس عقیدت و احترام کی صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات پایہء تکمیل تک جا پہنچی ہے کہ سکھ مت کے پانچویں گروہ' ارجن دیو' حضرت میاں میرؒ کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ کرنل بھولا ناتھ نے تاریخ لاہور میں ان کو بالا پیر کا متریقی دوست لکھا ہے۔ ۱۵۸۸ء میں گرو ارجن دیو کو سکھوں کی مقدس ترین عبادت گاہ دربار صاحب (ہرمندر) کی تعمیر کا خیال آیا تو اس کا سنگ بنیاد رکھنے کیلئے غور و خوض ہوا ''بنیادی پتھر اس دور کی عظیم ترین ہستی کے دست مبارک سے رکھوایا جائے گا'' گوروارجن دیو نے اعلان کیا چنانچہ حضرت میاں

Marfat.com

میرؒ سے درخواست کی گئی۔اس رسم ادائیگی کے وقت ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔

مقدس تالاب بنوانے کے بعد گوروارجن دیو اپنے دھرم کی مقتدر شخصیات کے ساتھ دربار صاحب کا سنگ بنیاد رکھے جانے کے منتظر تھے۔حضرت میاں میرؒ نے اپنے دستِ مبارک سے پہلی اینٹ رکھی تو وہ اتفاقاً الٹی رکھی گئی۔(یہ محض اتفاق تھا یا عمداً ایسا کیا گیا۔اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا) معمار اپنے تجربے کے زعم میں تھا اس نے جھٹ اسے سیدھا کر دیا۔ظاہر ہے اینٹ کو سیدھا کرنے کے لیے اصل جگہ سے ایک بار اکھیڑنا پڑا۔گوروارجن دیو تڑپ کر آگے بڑھے مگر ہونی ہو چکی تھی۔اینٹ اپنے مقام سے اکھیڑ کر دوبارہ اسی جگہ رکھی جا چکی تھی۔ارجن دیو کا رنگ فق ہو گیا رفتہ رفتہ انکی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

''ظالم انسان یہ تو نے کیا غضب ڈھایا' مقدس ہاتھوں کی رکھی ہوئی اینٹ کو الٹ کے رکھ دیا' اب کوئی شکتی اس مقدس عمارت کو تباہ و برباد ہونے سے نہیں بچا سکے گی۔یہ برباد ہو کر پھر آباد ہو گی۔یہی اس کا مقدر ہے' میرا امرتسر سے لاہور کا سفر رائیگاں گیا۔'' گوروارجن دیو نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

کیا یہ محض اتفاق تھا کہ ۱۷۶۱ء میں یعنی ایک سو تہتر برس بعد' احمد شاہ ابدالی نے اس مقدس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔''ہرمندر'' تباہ و برباد ہوا اور ارجن دیو کی پیش گوئی کے عین مطابق چار برس بعد از سر نو آباد ہوا۔

سکھوں نے یہ سارے واقعات اپنی اتہاس (تاریخ) میں محفوظ کر لیے۔

جون ۱۹۸۴ء میں بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے حکم سے آپریشن بلیو اسٹار OPRATION BLUE STAR کے ذریعے ایک بار پھر دربار صاحب امرتسر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔چوں کہ اس بار آتشیں اسلحے کا استعمال بڑی بے رحمی سے ہوا تھا لہذا اس تباہی کی مثال نہیں ملتی۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عمارت جس کا سنگ بنیاد بالا پیرؒ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے رکھا اور کتنی بار تباہی کا سامنا کرے گی؟ کہیں گوروارجن دیو کی پیش گوئی کا مفہوم یہ تو نہیں تھا کہ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا؟

دربار صاحب کے سنگ بنیاد والا قصہ گوروارجن دیو اور حضرت میاں میرؒ کے تعلقات کی وضاحت کر دیتا ہے۔قدیم گرنتھ بابا گورونانک میں تو یہاں تک مرقوم تھا کہ ''ہرمندر'' امرتسر کا سنگِ بنیاد اس دور کا بہترین انسان رکھے گا۔اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ کام حضرت

Marfat.com

بالا پیرؒ کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ دربار صاحب کے صدر کے قریب ''مقام میاں میر'' تھا جہاں شاہ جیوؒ بابا فرید گنج شکرؒ اور دوسرے بزرگان دین کے تبرکات محفوظ تھے۔ (بعد میں یہ مقام رہا نہ تبرکات) ۱۹۷۹ء تک دربار صاحب آرٹ گیلری میں حضرت میاں میرؒ کی تصویر بھی آویزاں تھی جو سوبھا سنگھ مصور کی کاوش کا نتیجہ تھی اس کے بعد کی ہمیں خبر نہیں۔

واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کی خاطر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قصے کے مزید حالات بھی بیان کر دیے جائیں۔ عہد جہانگیر میں ہندو نژاد دیوان چندو مل کا دربار جہانگیر میں بڑا اثر ورسوخ تھا۔ یہ شخص بوجوہ گوروارجن کا جانی دشمن تھا۔ اس کی ریشہ دوانیاں رنگ لائیں اور ارجن دیو کو پابند سلاسل ہونا پڑا۔ گورنر لاہور کے علاوہ شہنشاہ جہانگیر کو یقین دلایا دیا گیا کہ گوروارجن کی آزادی سلطنت مغلیہ کے مفاد میں نہیں بلکہ آتش فساد کا باعث بن سکتی ہے۔ مطلق العنان شہنشاہ کی جبیں شکن آلود ہوئی۔ گوروارجن دیو کی زندگی کا چراغ گل کر دینے کا فیصلہ ہوا۔ بالا پیرؒ کو گورد موصوف کی بے گناہی کا یقین تھا۔ لہذا مداخلت ناگزیر تھی۔ درویش کو دربار جہانگیر تک جانا پڑا۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ جہانگیر خود ورطہء حیرت میں ڈوب گیا۔ جلال پادشاہی' نگہ درویش کا سامنا نہ کر سکا۔

''حضور! خیریت باشد؟'' جہانگیر نے مؤدب لہجے میں استفسار کیا۔

''تمہارے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنا مقصود تھا۔ اس لیے فقیر کو دربار میں حاضر ہونا پڑا''

بالا پیر نے سنجیدگی سے کہا

''حکم کیجیے' تعمیل ارشاد ہوگی۔''

''ارجن دیو بے گناہ ہے' اس کے خون ناحق سے باز رہو۔''

شہنشاہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ایک طرف ملکی استحکام کا تقاضا اور سیاست' دوسری طرف حکم درویش' نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ عجیب صورت حال ہوگئی۔

''اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ ارجن دیو سلطنت مغلیہ کا دشمن نہیں۔'' درویش نے حاکم وقت کی مشکل آسان کر دی۔

'پیر و مرشد' تعمیل ارشاد ہوگی'' جہانگیر نے ارجن دیو کے قتل کا حکم واپس لے لیا لیکن بات یہیں ختم نہ ہوئی۔ چندو مل اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہ آیا اور موقعہ میسر آتے ہی اپنا وار کر دیا۔ گوروارجن کو ایک بار پھر پس دیوار زنداں ہونا پڑا۔ چنانچہ ان کا انتقال بندی خانے میں

Marfat.com

ہوا۔اس کے انتقال کے پیچھے بھی ایک داستان ہے۔

اس زمانے میں دریائے راوی قلعہ لاہور کے نیچے سے بہتا تھا۔یعنی گزرگاہ فصیل کے ساتھ تھی ۔ گوروارجن اس قلعہء اکبر میں مقید کیا گیا تھا۔ایک بار انہوں نے اشنان کی خواہش کا اظہار کیا۔پانی میں قدم رکھا تو دریا برد ہو گئے ۔بھری ہوئی موجیں ان کو بہا کر جانے کہاں لے گئیں ۔عہد رنجیت سنگھ میں عین اسی جگہ ان کا گوردوارہ تعمیر ہوا۔ بہر حال دریا برد ہوئے یا طبعی موت تھی سفر آخرت قید خانے میں اختیار کیا ۔ گوروارجن کے بعد ان کا فرزند گدی نشیں ہوا۔حضرت میاں میر کی معاونت سے یہ مقدمہ پھر دربار شاہی میں پیش ہوا۔اس بار انداز قلندرانہ اور قسم کا تھا۔''ہماری ضمانت کی تمہاری نظر میں کیا حیثیت تھی۔''فقیر نے صرف ایک سوال کیا۔دربار جہانگیر سے تحقیق کا حکم صادر ہوا تو چندولل مجرم ثابت ہوا۔جہانگیر آتش زیر پا ہو گیا۔ایک طرف قہر درویش کا خیال اور دوسری طرف چندولل کی مکاری۔ جہانگیر بھرے دربار میں گرجنے لگا۔''چندولل کی منقولہ وغیر منقولہ جائداد ضبط کی جاتی ہے'' شاہی اعلان دربار میں گرجنے لگا''اس کی جاگیر ہرگوبند کو دی گئی اور......''اس کے بعد فیصلے کا آخری حصہ تاریخ میں محفوظ ہے' کسی کو انکار کی جراءت نہیں''۔چندولل مجرم کو' ہرگوبند کے حوالے کیا جائے' وہ جو سلوک چاہے اس ناہنجار سے کرے'' اس طرح گورو ہرگوبند کی اشک شوئی کی گئی۔انہوں نے اپنے باپ کے'' قاتل'' کو قتل کر کے اپنی آتش انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔

جلال الدین محمد اکبر کو تخت نشین ہوئے انیسواں برس تھا جب بالا پیرؒ لاہور تشریف لائے ۔ استقبال کو مساجد کے دروازے کھلے تھے اور یہی درویش بے ریا کی پسندیدہ قیام گاہ تھی ۔لاہور کی مختلف مساجد میں قیام پذیر ہوئے ۔عوام کچھ عرصہ اس شخصیت سے بے خبر رہے کہ کس مقام مرتبے کی شخصیت شہر میں وارد ہو چکی ہے ۔ بے شک موصوف اس زمانے میں ایسے مقام پر فائز ہو چکے تھے جہاں ایک سجدہ سارے شہر کو عذاب الہیٰ سے بچا سکتا تھا۔دنیا کی لاعلمی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔حضرت اخفائے راز کی جی جان سے کوشش اس لیے بھی فرماتے کہ علوم ظاہری کا اکتساب مقصود تھا۔یہ بات واقعی حیران کن ہے کہ حضرت میاں میرؒ بحر حقیقت میں غوطہ زن پہلے ہوئے اور علوم ظاہری کا حصول بعد میں ہوا۔

لاہور میں مولانا سعد اللہ کی درسگاہ مینار نور کا درجہ رکھتی تھی' اسی جگہ سے شاہ حسین نے فیض حاصل کیا مگر راہ دگر کے مسافر بنے......محمد میرؒ بڑی سختی سے شریعت کی پابندی کرنے والے

Marfat.com

تھے۔ پابند صوم وصلوٰۃ، زاہد شب زندہ دار۔

تھوڑے ہی عرصے بعد ''علوم معقول'' میں مہارت تامہ حاصل ہوئی۔ مولانا سعد اللہ کے علاوہ ان کے شاگرد مولانا نعمت اللہ سے بھی فیض حاصل کیا...... بعد میں مولانا موصوف اظہار حیرت کیا کرتے تھے ''میاں جیوؒ نے ایک عرصہ تک ہمارے درس میں شرکت کی۔ ہم نے سب کچھ ان کے تعلیم کردیا مگر ان کے مقام سے بے خبر رہے۔''

مولانا سعد اللہ لاہور کی درسگاہ (جب حضرت میاں میر نے اس میں شرکت کی) علاقہ نخاس (محلہ داراشکوہ لنڈا بازار) میں تھی مولانا موصوف ''منتخب التواریخ'' کے مطابق مقام ولائت پر فائز تھے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے والد بزگوار مولانا فتح اللہ دانش مند سے حاصل کی مگر سند فضیلت دیپال پور کی مشہور درسگاہ بایزید سے ملی۔ اسی دوران شیخ اسحاق کاکوؒ کے دست حق پرست پر بیعت کر چکے تھے۔ جو حضرت شاہ کاکو چشتیؒ کے فرزندار جمند تھے۔

مولانا موصوف پر بعض اوقات درس دیتے دیتے حالات استغراق طاری ہو جاتی 'اس کیفیت میں دنیا و مافیہا سے بیگانے ہو جاتے۔ دو دو تین تین روز تک تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ خورد و نوش کیا' نمازیں تک فوت ہو جاتیں۔ حالت 'صحو' میں آتے تو خدام سے پوچھ کر قضا نمازیں ادا کی جاتیں۔ اکبر نے دین الٰہی کی تائید کے لئے رنگین جال پھینکا مگر سچائی کی خوشبو ان زیر دام نہ آسکتی تھی۔

ہوا کی مست خرامی تہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم

مولانا اس آزمائش میں ثابت قدم رہے اور بادشاہ کو لاجواب کر کے لوٹے۔ اکبر بے اختیار پکار اٹھا ''اس مرد حق سے سلف الصالحین کی مہک آتی ہے''۔ امام غزالی کی شہرہ آفاق تصنیف ''جواہر القرآن'' کی شرح لکھنے کا اعزاز بھی آپ ہی کو حاصل ہے۔

لاہور کی ایک اور شخصیت جن کے آگے محمد میرؒ نے زانوائے تلمذ تہ کیا وہ مولانا عبدالسلام لاہوری تھے۔ عظیم الشان درس گاہ ''وراثت'' میں ملی اور مولانا موصوف نے وراثت کا حق ادا کر دیا۔ لشکر اکبری میں مفتی تعینات تھے۔ اس عہدہ جلیلہ کو خیر آباد کہہ کر درس تدریس کی طرف متوجہ ہوئے۔ مسجد مفتیاں اندرون موچی دروازہ حویلی میاں خان کے خطیب بھی تھے۔ پورے پچاس برس علم کی روشنی تقسیم کرتے رہے۔ اکبر کے دین الٰہی پر ضرب کاری مارنے والوں

Marfat.com

میں مولانا پیش پیش تھے ۔رعب وجلال کا یہ عالم تھا کہ کسی ابلیسی طاقت کو ٹکرانے کا حوصلہ نہ ہو ۔زندگی بھر علم دین ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے رہے۔توشہءآخرت میں بھی یہی روشنی تھی۔

لاہور میں درویش نے مستقل قیام کے لئے محلہ باغ باناں کا انتخاب کیا جو بعد میں خانی پورہ کہلایا۔(محلہ خانی پورہ جہاں اب انارکلی بازار واقع ہے)اور زندگی کے آخری لمحات تک اسی جگہ قیام پذیر رہے۔اسی حجرے میں کم وبیش ساٹھ برس تک احباب واصحاب رونق افروز ہوتے رہے ۔مقدس محافل کا انعقاد ہوا اور اسی جگہ شاہان وقت دست بستہ حاضری دیتے رہے۔ نورالدین جہانگیر' شہاب الدین' شہزادہ داراشکوہ' نواب وزیر خان' کیسے کیسے صاحبان جلال و جمال ناصیہ فرسائی کا اعزاز حاصل کرتے رہے۔کتب قدیم کی ورق گردانی شاہد ہے کہ حجرہ دو منزلہ تھا جس کا بالاخانہ بھی تھا اس حجرے کا موجودہ محل وقوع ہر صاحب دل کو سپر د اضطراب کر دیتا ہے۔خصوصاً اس کی کیفیت 'بڑی ہی دکھ دینے والی' ہے۔عجائبات دنیا' شاہی محلات وغیرہ کے نام ونشان مٹ جائیں تو اداسی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔مگر آفتاب عالم تاب جیسا آستانہءدرویش جہاں سے دولت اطمینانی تقسیم ہوتی رہی' اس کی ویرانی دیکھنے کے لئے پتھر کا دل اور فولاد کا جگر درکار ہوتا ہے۔راقم جب اس حجرے کی تلاش میں نکلا جہاں شاہ گدا دین و دنیا سنوارنے کیلئے حاضر ہوا کرتے تھے اس کے آثار دیکھ کر غم واندوہ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔جو کچھ ان آنکھوں سے دیکھا من وعن پیش خدمت ہے

بازار نئی انارکلی کے آغاز سے پہلے' پرانی انارکلی کی جانب' بائبل سوسائٹی کے متصل فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں اور رسائل کی دکانیں ہیں۔آخری دکان سے دو قدم آگے جوتوں کی دکان ''ڈلہوزی شوز'' کے نام سے مرکز نگاہ بنتی ہے اوپر کسی گمنام ہستی کی رہائش گاہ ہے۔ڈلہوزی شوز اور سنی شوز کے درمیان والا علاقہ کسی زمانے میں آستانہءحضرت میاں میرؒ ہوا کرتا تھا جوتوں کی ان دکانوں کے درمیان بھی ''پاپوش فروش'' کے مراکز واقع ہیں۔یعنی ونر شوز' یونی شوز' ریلے شوز' اور جولی شوز اور ان دکانوں کے اوپر' زیب وزینت سے مبرا' ننگی اینٹوں والا بالاخانہ خاموشی سے کھڑا ' .....محو نوحہ خوانی' ہے۔ان دکانوں کے عقب میں غیر مسلم آباد ہیں۔سلیم مسیح اپنی تیسری پشت سے آباد ہے۔اس کے پردادا کا لگایا ہوا بڑ کا چھتنا ور درخت ان کوارٹروں پر سایہ فگن ہے۔کچھ سایہ ڈائریکٹر ایجوکیشن کے دفتر پر بھی پڑتا ہے جو ایک عرصہ سے سرخ اینٹوں والی عمارت میں قائم ہے ۔شجر سایہ دار' بلا امتیاز ہر شخص کو راحت فراہم کرتا ہے۔بالکل اسی انداز میں جیسے ''بالا پیر'' فراہم کیا

Marfat.com

کرتے تھے۔

ان پاپوش فروشوں کے ہاں خریداروں کا ہجوم ایک عام سی بات ہے۔ عین ممکن ہے جس جگہ خریدار کھڑا ہوا سی جگہ ''شہنشاہ جہانگیر' شاہ جہاں اور داراشکوہ دربار قلندر میں کھڑا رہ چکا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے اس جگہ پر بیٹھ کر حضرت میاں میرؒ ارشادات عالیہ سے نواز چکے ہوں۔ انقلاب ہیں زمانے کے۔ یہ بات البتہ ذہن میں رہے! اسی حجرے میں آپ کا وصال ہوا اور جنازہ بھی اس مقام سے اٹھا۔ خلق خدا کا ہجوم اس وقت بھی ہوا کرتا تھی مگر ہجوم...... ہجوم میں فرق ضرور ہے' صرف اہل بصیرت کے لئے۔

جس زمانے میں بالا پیرؒ لاہور میں قیام پذیر تھے مغل شہنشاہ اکبر بھی تیرہ چودہ برس لاہور میں قیام پذیر رہا۔ دین الٰہی کے خلاف مشائخ لاہور نے بھرپور کردار ادا کیا۔ بالا پیرؒ ان میں پیش پیش تھے۔ اس مخالفت کی پاداش میں لاہوری علماء کو ملک بدر بھی کیا گیا۔ کئی ایک زیر عتاب آ کر پابند سلاسل بھی ہوئے مگر بالا پیرؒ اور ان کے ہمنواؤں کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ اکبر کے زیر تسلط ہندوستان کے بائیس صوبوں میں اس دین کو ماننے والوں کی تعداد ایک ہزار سے اوپر نہ ہو سکی۔ ان میں سے ایک سو آٹھ درباری تھے اور باقی اکبر کے دوست احباب جو مروت میں مارے گئے یا سیم و زر کی چمک سے اندھے ہو گئے۔

۱۶۰۵ء میں جلال الدین اکبر اپنے تمام تر تزک و احتشام کے ساتھ پیوند خاک ہوا اور نورالدین جہانگیر کے دور کا آغاز ہوا۔ جہانگیر صوفیا و مشائخ کے خلاف بغض و عناد رکھنے میں اپنے پیش رو سے دو قدم آگے تھے۔ ان کے در پے آزار رہنا اور حیلے بہانے سے گزند پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کو قلعہ گوالیار میں قید کیا گیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ' مرزا حسام الدین مرید مجدد الف ثانی کی ملک بدری کے احکام جاری کئے گئے۔ حضرت میاں میرؒ کی شہرت جہانگیر تک پہنچی تو دستور عادت ملاقات کا تمنائی ہو۔ اکبر آباد (آگرہ) سے بطور خاص ایلچی درویش کی خدمت میں روانہ کیا۔ خط کی عبارت بھی مزاج جہانگیر کی طرح مودبانہ وفدویانہ تھی۔

''حضور والا! قیام لاہور کے دوران آپ کا اسم گرامی سن پاتا تو ضرور خدمت میں حاضر ہوتا۔ اب چوں کہ لاہور سے آگرہ آ چکا ہوں اور سفر لاہور ممکن نہیں۔ آپ کی نوازش ہو گی اگر آپ یہاں تشریف لا کر ممنون فرمائیں۔''

Marfat.com

درویش نے دعوت جہانگیری قبول فرمالی۔ عام نقادوں اور قلمکاروں کا یہی خیال ہے کہ بالا پیرؒ نے یہ دعوت حضور اکرمؐ کی حدیث کی روشنی میں قبول فرمائی یعنی ''جو دعوت دے اسے مایوس مت کرو'' لیکن اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو اس دعوت کو شرف قبولیت بخشنے کی ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ تھی جلال بادشاہی کے کس بل نکالنا۔ جہانگیر کا رویہ میاں میرؒ کے سامنے تھے۔ ملاقات کے دوران جو کچھ پیش آیا وہ ہمارے خیال کی تائید کا بین ثبوت ہے۔ حاکم وقت نے عزت واحترام سے استقبال کیا۔ دوران گفتگو حضرت میاں میرؒ نے اپنے منفرد انداز سے پند و نصائح سے نوازا۔ شہنشاہ کے جلال کی فلک بوس عمارت مختصر سے وقت میں مسمار ہو گئی۔

''جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ آپ کی مصاحبت اختیار کرلوں اور بقیہ زندگی آپ کے زیر سایہ یاد الٰہی میں گزار دوں'' جہانگیر اپنی سابقہ زندگی پر منفعل سا ہو گیا......

''سچے درویش کی نگاہ میں سیم وزر اور سنگ خشت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہوتا۔'' حضرت نے زیر لب مسکرا کر کہا ''اب چونکہ تم مال و متاع دنیا کو ترک کر دینے کے لئے تیار ہو تو گویا تمہاری نظروں میں' اس سرو سامان کی حقیقت' سنگ وخشت کے برابر ہے لہٰذا تم درویش ہو۔ درویش کامل کی پہلی شرط پر پورے جو اتر رہے ہو۔''

''اب آپ دلائل سے کر مجھ گناہ گار سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں'' جہانگیر نے اداس لہجے میں کہا۔

''تمہیں رعایا کی پاسبانی اور خلق خدا کی حفاظت کا فرض سونپا گیا ہے۔ تمہارے عدل وانصاف کے نتیجے میں درویش' قلندر اور زہاد پوری یکسوئی سے اپنے وظائف میں مصروف رہتے ہیں یہی تمہاری فقیری اور یہی تمہاری درویشی ہے لہٰذا اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہو اور راہ سلوک کا خیال اپنے دل سے نکال دو''۔

''حضور! پھر بھی آپ ''توجہ'' فرمائیں۔'' بادشاہ اس نگاہ کا طلب گار تھا جو کایا پلٹ کے رکھ دیتی ہے۔ حضرت نے بڑی رسان سے دیکھا۔''

''ٹھیک ہے تم اپنے جیسا کوئی اور خلق خدا کا محافظ فراہم کر دو' میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہوں۔''

حضرت نے شرط عائد کر دی۔ بادشاہ لاجواب ہو گیا اور سر جھکا کر سوچنے لگا ''شاید خوش نصیبی میرے در پر دستک دیتے دیتے رہ گئی'' اس نے زیر لب کہا اور نگاہ اٹھا کر بڑے عجیب

Marfat.com

انداز میں فقیر کی طرف دیکھا۔

''میری دلی تمنا ہے کہ آپ کسی خواہش کا اظہار فرمائیں اور میں اسے پورا کروں''

بادشاہ اپنے مزاج کے مطابق لب کشا ہوا۔

''جو کچھ طلب کروں' دلی رغبت سے دو گے؟'' درویش نے اپنے مزاج کے مطابق کہا۔

آپ حکم تو کریں اپنی بساط سے بڑھ کر پیش نہ کروں تو کہیے گا۔''

مجھے صرف جانے کی اجازت دے دو۔''

فقیر کے ایک ہی وار سے شہنشاہ وقت چاروں شانے چت ہو گیا ۔لیکن حسب وعدہ وہ آپ کو رخصت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ جہانگیر نے دو خطوط آپ کی خدمت میں ارسال کیے ۔دونوں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں ۔ایک ملاقات سے پیشتر اور ایک بعد میں۔ پہلے خط کے الفاظ من وعن پیش خدمت ہیں۔

ترجمہ: بندہ مخلص سلام و نیاز کے بعد اپنا خلوص پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے اور تمنائی ہے کہ آپ سے ملاقات نصیب ہو۔

نوشتہ جہانگیر ابن اکبر بادشاہ۔ حضرت پیر دستگیر شیخ میرؒ کے نام۔''

دوسرا خط درج بالا ملاقات کے بعد لکھا۔ جب والیء ایران نے قندھار پر حملے کا ارادہ کیا یا کر دیا۔ خط کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

''حضرت پیر دستگیر کی خدمت عالیہ میں' بارگاہ الٰہی کے نیاز مند جہانگیر کی طرف سے سلام و نیاز کے بعد عرض ہے کہ گاہے گاہے بندے کو اپنی دعاؤں میں یاد فرمایا کریں ۔ایک اور گزارش ہے کہ بندگان خدا کو ظالم کے ہاتھوں سے نجات دلائیں' امید ہے کہ بد عہد شخص قہر الٰہی کا سزا وار ہو گا۔ آمین۔''

اس خط کا سیاسی پس منظر زیر بحث لانا موضع سے ناانصافی والی بات ہے کیوں کہ اس کا ''داستان میرؒ'' سے کوئی تعلق نہیں ۔توزک جہانگیر میں البتہ جس انداز میں جہانگیر نے آپ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے' وہ پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے۔

جہانگیر نے سفر آخرت اختیار کیا تو ۱۶۲۸ء میں شاہ جہاں تخت ہند پر جلوہ افروز ہوا۔ حضرت میاں میرؒ عہد شاہ جہاں میں سات برس تک بقید حیات رہے۔ اس دوران کم از کم دو یا تین مرتبہ شہنشاہ ہند' زیارت درویش سے فیض یاب ہوا۔ اور ہر ملاقات کے وقت دارا شکوہ ساتھ

Marfat.com

تھا۔رموز و نیاز کی باتیں جو دین و دنیا کے بادشاہوں کے درمیان ہوئیں' الطاف کلام اور پندو نصائح کے دلنواز مرقع تھیں۔شاہ دنیا کے کان ایسی رسیلی گفتگو سے نا آشنا تھے۔شہاب الدین محمد شاہجہاں کو محسوس ہوا جیسے پاگلوں کے شور کی جگہ کانوں میں الوہی نغمات سے رس ٹپکایا جارہا ہو۔

بادشاہ چار افراد کے ہمراہ حجرہ درویش میں داخل ہوا۔درویش نے آنے والوں کا زیر لب مسکراہٹ سے استقبال کیا۔آنے والے مودب اور لب بستہ کھڑے ہو گئے۔درو دیوار سے ایسا جلال ٹپک رہا تھا۔جبین ناز پر مسکراہٹ رقصاں ہوئی تو زائرین کو حوصلہ ہوا گویا حضوری کو شرف قبولیت بخشا گیا۔

''خلق خدا کی خوشحالی' مملکت اور رعایا کی پاسبانی' عادل بادشاہ کا طرہ امتیاز ہونا چاہیے۔''

درویش نے گفتگو کا آغاز ان الفاظ سے کیا''گڈریا اگر ریوڑ کی حفاظت نہ کر سکے تو اسے اپنے مقام سے ازخود دست بردار ہو جانا چاہیے۔گڈریے کی نگاہ اگر بھیڑیئے میں امتیاز نہ کر سکے تو وہ کور نظر کہلائے گا۔رعیت کی خوشحالی حاکم وقت کے اپنے مفاد میں ہوتی ہے۔اس سے لشکر آسودہ حال اور خزانہ معمور ہوتا ہے اور جہانداری کے لئے یہ دو وسیلے بے حد ضروری ہوتے ہیں۔''

شاہ اور اس کے حواریوں کو بیٹھنے کا اذن حاصل ہوا۔وہی فرش زمیں جہاں درویش تشریف فرما تھا لباس فاخرہ زیب تن کیے ہوئے حاضرین اسی جگہ مودب بیٹھ گئے۔بعد میں شاہ جہاں کے دل کی بات ہونٹوں تک آ ہی گئی۔''ترک و تجرید' بے نیازی اور دانش مندی کا دلنواز خلاصہ حضرت میاں میر ولی وقت سے بڑھ کر میری نظروں سے نہیں گزرا۔'' یہی اس نے حجرے سے نکل کر کہا۔ایک بار دارا شکوہ سخت علیل ہو گیا۔کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا تھا۔سب کوششیں رائیگاں ہوئی تو شاہجہاں اپنے لخت جگر کو لے کر آستانہ فقیر پر حاضر ہوا اور شہزادے کو درویش کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا۔''یہ دل و جاں سے آپ کا معتقد ہے۔آپ کی توجہ ہی اس کے دکھوں کا مداوا ہو گی' اس سے زیادہ بندہ ناچیز کیا عرض کرے۔''

''یہ عقیدت مند تو ہمیں بھی دل و جان سے عزیز ہے۔'' حضرت نے شہزادے کے زرد چہرے پر نگہ التفات ڈالی۔''''کوزہ گر کی کاریگری کا کمال ہے۔مٹی ذرا روگی ہو چکی ہے۔خیر علاج بھی مٹی ہی سے ہونا چاہیے۔'' پھر اپنے زیر استعمال مٹی کا پیالہ آب خنک سے لبالب بھر کر شہزادے کو پیش کیا۔''عزیزم! فصیل جاں میں درد لادوا مت پالا کرو۔جرعہ جرعہ یہ پیالہ پی جاؤ اور قادر مطلق کا شکر بجا لاؤ۔''

Marfat.com

شہزادے کوآب سادہ پینے سے پہلے ہی اپنی صحت مندی کا یقین آ گیا' بقیہ کاروائی رسمی سی تھی۔اس پانی نے وہ کام کیا جو حکماء کے تیر بہ ہدف نسخے اور مروارید و جواہر ملی دوائیں نہ کرسکیں ۔یہ سادہ پانی کب تھا۔فقیر کی دعا بھی تو اس میں شامل تھی۔شہزادہ روبصحت ہوا اور تا عمر اسی آستانے کا غلام بن گیا۔

۱۹ اپریل ۱۶۳۴ء والے دن ایک بار پھر شاہجہاں کولذت ملاقات آستانہ درویش تک کھینچ لائی۔یہ ملاقات نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھی۔بے تکلفی کی جانب پیش رفت ہو چکی تھی۔فقیر بھی پہلے سے زیادہ مائل بہ کرم تھا۔

''حضور! دعا فرمائیں' مکروہات زمانہ کو تج کر آپ کے نقش قدم پر روانہ ہو جاؤں''۔بادشاہ ترک دنیا کی باتیں کرنے لگا۔

''جب آپ ملت اسلامیہ کے مفاد میں کوئی کام کریں تو اس گھڑی تقرب الٰہی میں لاثانی ہوں گے اور وہی قبولیت کے لمحات ہوں گے۔اس گھڑی خود دست دعا بلند کریں۔اس کے سوا اور کوئی شے طلب نہ کریں' انشاء اللہ دعا قبول ہوگی۔'' درویش نے طریقہ کی وضاحت فرما دی مگر چشم بصیرت اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ شہنشاہ جذبات کی رو میں ان خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔آپ نے زیرلب مسکرا کر یہ شعر پڑھا۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں

ایں خیال است و محال است و جنوں

(ہم خدا اور دنیا کو بیک وقت طلب کرتے ہیں۔یہ خیال خادم دشوار ہے' حد جنوں تک) اسی ملاقات میں شاہجہاں نے خدمت فقیر میں ایک قیمتی دستار اور تسبیح پیش کی۔دستار تو حضرت نے معذرت کے ساتھ واپس کر دی' تسبیح کو البتہ شرف قبولیت بخشا وہی تسبیح بعد میں داراشکوہ کو عطا کر دی گئی۔یہ ملاقات اس بالا خانے میں ہوئی جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے اس ملاقات میں ایک اور واقعہ پیش آیا تھا جو شہزادے کی عقیدت کا منہ بولتا ثبوت بن گیا۔

ملاقاتی جب بالا خانے کی طرف چلے تو داراشکوہ جوتے اتار کر برہنہ پا ہو گیا۔بادشاہ سے ملاقات کے دوران حضرت میاں میر لونگ چبا چبا کر پھینکتے جاتے تھے۔شاہ جہان اور دوسرے زائرین کی طبع نازک پر یہ بات ناگوار گزری مگر داراشکوہ اس ''پھوک'' کو احترام کے ساتھ اکٹھا کر کے کھاتا جاتا تھا۔اس طرح لونگوں کا پھوک نوش جاں کرنے کا شرف خواجہ بہاری اور میاں محمد

Marfat.com

مراد قادری کو بھی حاصل ہوا۔

بادشاہ نے تقرب درویش کی خاطر آگرہ منتقل ہو جانے کی درخواست بھی پیش کی مگر فقیر کو مدینۃ اولیاء سے جدائی گوارہ نہ تھی۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے بھی ''اسرار خودی'' میں شاہجہان صاحب قرآن کی بالا پیرؒ سے ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ گولکنڈہ اور بیجاپورہ کی مہمات درپیش ہوئی تو حاکم وقت فتح و نصرت کی دعا کے لئے آستانہ فقیر پر حاضر ہوا۔ بادشاہ حرف مدعا زبان پر لایا تو حضرت خاموش رہے اتنے میں ایک مفلس وقلاش حاضر خدمت ہوا۔ آستانہ بلا امتیاز شاہ وگدا مرجع خلائق تھا۔ ہر شخص ہر پل حاضر ہو سکتا تھا۔

''حضور! یہ میری رزق حلال کی کمائی ہے' قبول فرمایئے'' مفلوک الحال شخص نے چاندی کا ایک سکہ بطور نذرانہ پیش کیا۔

''آپ کے خیال میں کیا میں اس کا مستحق ہوں؟'' فقیر بے ریا نے بڑی رسان سے کہا۔ ''عزیزم! اس رزاق نے مجھے مال وزر کی حاجت سے بے نیاز کر رکھا ہے البتہ یہ سکہ تم اس بادشاہ کی نذر کر سکتے ہو۔ آج کل یہ بہت زیادہ حاجت مند ہے۔ سارے ہندوستان کے خزانے اس کی ملکیت میں ہیں' ''ہوس زر'' پوری ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اب گولکنڈہ اور بیجاپور میں کشت وخون کا بازار گرم کرنے والا ہے۔ کاندھوں سے کٹ کٹ کر سر گریں گے' خلق خدا اس کی ہوس پر قربان ہوگی۔''

شاہجہاں دعائے فتح ونصرت کے لیے آیا تھا' اپنا سا منہ لے کر چل دیا۔ حضرت میاں میرؒ کی شاہان مغلیہ سے ملاقاتوں کا مفصل حال اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ آج یہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ شاید ہم سب اپنے گریبانوں میں ایک پل جھانک سکیں اور برے بھلے میں تمیز کے قابل ہو جائیں۔

شاہ میر بالا پیر کو لاہور میں قیام پذیر ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ مولانا سعد اللہ اور عبدالسلام لاہوری کی درس گاہوں سے اسناد فضیلت حاصل کرنے کے بعد فیض عام جاری ہو چکا تھا۔ اطراف واکناف میں آپ کے زہد وتقویٰ کی دھوم مچ چکی تھی۔ آسمان تصوف کے کیسے کیسے درخشندہ ستارے' مہتاب تاباں کے گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ حاجی نعمت اللہ قادری سرہندیؒ' ملا ابراہیم روحیؒ' سید اشرفؒ ' میاں نتھا المعروف بہ نتھے شاہؒ' حضرت بہار لنگؒ' شیخ احمد سامیؒ' ملا شاہ

Marfat.com

بدخشائی“ ایک طویل فہرست ہے۔

حضرت اپنے احباب کے ساتھ لاہور شہر کے نواح میں کسی سرسبز و شاداب مقام پر نکل جاتے۔سب حضرات اپنی اپنی پسند کا گوشہ تنہائی منتخب کرتے اور خالق کائنات سے محو راز و نیاز ہو جاتے۔نماز کا وقت ہوتا تو تمام حضرات یکجا ہو کر نماز باجماعت ادا کرتے پھر غروب آفتاب تک اپنے اپنے کنج تنہائی میں جا بیٹھتے۔یہی درویشوں کا معمول تھا۔شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک روز دل بے تاب و سپرد اضطراب ہو گیا۔آپ نے فوراً قرآنی آیت ”سیروفی الارض“ پر عمل پیرا ہونے کا ارادہ کر لیا اور سرہند شریف کی طرف کوچ کر گئے.....اس سفر کے اختیار کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی سرزمین لاہور میں خلق خدا اُمڈی چلی آتی تھی۔انتہا یہ ہوئی کہ آپ کی عبادت و ریاضت میں خلل واقع ہونے لگا۔آپ نے یہی مناسب خیال فرمایا کہ کچھ عرصے کے لیے مقام دگر پر توجہ مبذول کی جائے۔

سرہند پہنچے تو گھٹنوں میں شدید درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ٹانگوں نے فیصل جاں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔چند روز بعد دوسرے امراض نے بھی آ گھیرا۔یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔دوست احباب کے جھرمٹ تھے نہ وہ رونقیں، مصیبت کا احوال، مونس و غم خواروں سے کہنا، ناگوار خاطر تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ طہارت تک کرنا ممکن نہ رہا۔حاجی نعمت اللہ سرہندی کو کسمپرسی کی خبر ہوئی تو پروانہ وار بھاگتا چلا آیا۔یہ مرید باصفا خلوص کا پتلا تھا۔تن من سے خدمت گزاری میں مصروف ہو گیا اور ایسی خدمت بجا لایا کہ غلامی کا حق ادا کر دیا۔بول و براز تک کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتا۔

”نعمت اللہ تو واقعی رب العزت کی عطا کردہ نعمت بلکہ نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا“ درویش نے ایک روز دلی جذبات کا اظہار کیا۔”ایسی خدمت تو عزیز و اقربا بھی بجا نہیں لاتے۔“

”حضور! وہ رشتے دار ہوتے ہیں غلام نہیں۔جب طوق غلام پہن کر اعلان اسیری کر دیا تو باقی کیا رہا؟“ حاجی صاحب نے الا جواب، جواب دیا۔

ایک روز جب شاہ میرؒ کی طبیعت حد سے زیادہ ناساز ہو گئی تو حاجی نعمت نے کہا ”حضور! ناگوار خاطر نہ ہو تو کچھ عرض کروں۔“

”حقیقی غم گساروں کو مدعا بیان کرنے کے لئے نہ اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ان کی کوئی بات ناگوار گزرتی ہے۔“

Marfat.com

''آپ اپنی صحت کے لئے دست دعا بلند نہیں فرماتے؟''

نعمت اللہ' میرے عزیز! ہمیں دوست سے حیا آتی ہے۔ برسوں صحت مند رہے' اب چند روز ابتلا کے آئے ہیں تو حرف شکایت زبان پر لانا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔''

''حضور! شکایت کیسی؟ آپ ''ضد'' کریں' رب العزت ضرور آپ کے ناز اٹھائیں گے۔''

''حاجی صاحب! آپ تو بڑے دانش مند ہوتے جا رہے ہیں۔'' میاں جیوؒ نے مسکرا کر کہا۔

''حضور! گل کی قربت سے گلِ بھی مہک اٹھتی ہے بندہ ناچیز تو پھر بھی حیوان ناطق ہے۔''

اس رات حضرت شاہ میرؒ نے اپنی صحت یابی کے لیے دعا فرمائی۔ دعا ایسی قبول ہوئی کہ آپ کو اپنی علالت پر رشک آنے لگا۔ غوث الثقلینؒ اور خضر علیہ بیمار پرسی کو تشریف لائے۔ شیخ عبدالقادری جیلانیؒ نے اپنا دست مبارک آپ کے جسم پر پھیرا اور مشروب خوش ذائقہ سے لبا لب بھرا پیالہ عطا فرمایا ''فرزند! اسے پی لو' ساری بیماریاں رخصت ہو جائیں گی۔''

مشروب کا حلق سے اترنا تھا کہ آپ گویا ہوا کے دوش پر اڑنے لگے۔ ''کیفیت'' کے گزرتے ہی بیماری کا نام نشان تک نہ رہا۔ صبح حاجی نعمت اللہ بھی حیران رہ گئے۔

''عزیزم! ہمارے پاس دنیاوی سروسامان تو نہیں ہے کہ تم کو عطا کر دیں' بالا پیرؒ اپنے مرید باصفا سے مخاطب ہوئے۔ ''جس انداز سے تم نے ہماری خدمت کی ہے' اس کا تقاضا ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے اس میں تمہیں بھی شریک کر لیا جائے۔''

''پیر و مرشد! دنیاوی سامان بھی کوئی اترانے والی چیز ہے؟ جو کچھ آپ کی ملکیت میں ہے' اس کا تو ایک ذرہ بھی ہفت اقلیم کی دولت سے بڑھ کر ہے۔''

اس طرح حضرت میاں میرؒ نے حاجی نعمت اللہ کو اپنی خاص توجہ سے نوازا اور چند روز میں ذرے کو آفتاب بنا دیا۔ یہ بالا پیرؒ کا پہلا باقاعدہ مرید تھا۔

حاجی صاحب پہلے بھی لاہور میں قیام کر چکے تھے مگر گوشہ گمنامی میں رہے۔ اس بار لاہور آئے تو کچھ اور ہی عالم تھا۔ آپ سے پہلے آپ کی شہرت کوچہ و بازار میں پہنچ چکی تھی۔ اسی دوران حاجی موصوف پر عالم ملکوت منکشف ہوا۔ جو چیز باآسانی میسر آ جائے' نگاہ میں اس کی قدر و

Marfat.com

منزلت نہیں ہوتی۔حاجی صاحب نے ایک درویش کو شریک راز کیا اور یہ تک کہہ دیا ''مجھ پر ایک ایسے عالم کا انکشاف ہوتا ہے جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ نفرت سی ہونے لگی ہے۔''

''جو کیفیت آپ نے بیان کی ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم ملکوت نہیں بلکہ عالم جنات ہے یہ تو بڑی نقصان دہ چیز ہے۔'' شریک راز درویش نے اپنی دانش کے مطابق تبصرہ کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی صاحب کا اعتقاد ہی اٹھ گیا۔مرشد کا تعلیم کیا ہوا عمل بھی ترک کر دیا۔ساری لذت جاتی رہی۔دل سپرد اضطراب ہوا۔آخر حج بیت اللہ کے ارادے سے آستانہ مرشد پر حاضر ہوئے اور اجازت طلب کی۔

''حاجی صاحب خیر باشد؟'' حضرت میاں میرؒ نے پہلی نظر ہی میں ''فنی خرابی'' کو پہچان لیا مگر اظہار سے گریز فرمایا۔حاجی صاحب نے ساری کیفیت بیان کی تو شاہ میرؒ زیر لب مسکرانے لگے۔

''حضرت! مجاہدے کے بغیر حاصل شدہ چیز کی کون قدر کرتا ہے'' میاں میرؒ لب کشا ہوئے ''وہ عالم ملکوت ہی تھا آپ کو ورغلایا گیا ہے۔''

''پیرو مرشد! اب تو اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہو جائے۔''

''اگر آپ کو اسی جگہ حج کرا دیا جائے تو کیسا رہے؟''

حضور! پھر تو بس مزہ ہی آ جائے'' حاجی صاحب نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو آج شب یہ ''اسم'' پڑھنا۔'' حضرت میاں میرؒ نے جگہ مقام کا تعین بھی فرما دیا......دوسرے روز حاجی صاحب دیوانہ وار مرشد کے قدموں سے لپٹ گئے۔

''عزیزم' حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی؟''

''پیرو مرشد' ایک ایک منزل طے ہوئی' سارے مناسک ادا کیے۔''

مشائخ فرماتے ہیں ''مرید کے لئے اکیلا رہنا آفت میں مبتلا ہونے والی بات ہے۔''

حضرت میاں میرؒ عام سا لباس زیب تن فرماتے۔خرقہ و گودڑی وغیرہ کو عمر بھر ہاتھ تک نہیں لگایا۔گنبد سر کی زینت کم قیمت کپڑے کی دستار' موٹے کپڑے کا کرتہ اور اسی قبیل کا تہبند باندھ لیتے۔سرسری نظر سے درویش کے مقام و مرتبہ کو پہچاننا تقریباً ناممکن تھا۔یہی ان کا مقصد ہوا کرتا تھا ''فقیری کی تشہیر کرنے والا فقیر نہیں' ۔بہروپیا ہوتا ہے'' حضرت میاں میرؒ اکثر

Marfat.com

فرماتے...... گودڑی کو "پابند رسوم" حضرات کا لباس قرار دیا۔طاقیہ اور خرقہ سے بھی اجتناب فرمایا۔اگر اندر روشن ہو تو ہر "قبا" "عبا" ہے ورنہ گودڑی بدبختی کی نشانی ہے۔" یہ خیالات حضرت علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ کے ہیں۔

حضرت میاں میرؒ کے احباب میں سے "حاجی محمد" بڑا بے تکلف لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے۔لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا "مرشد کی توجہ سے جب میں صاحب حال ہو گیا تو گودڑی پہن لی جو وقت کے ساتھ بوسیدہ ہو گئی۔ایک روز سر بازار میں تماشا بن گیا۔لوگوں کا ہجوم میری گرد و پیش تھا کہ اچانک حضرت میاں میر تشریف لے آئے۔"

"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟" شاہ میرؒ نے مجھے ناپسندیدگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"حضور! یہ میرے اختیار میں نہیں۔" میں نے عرض کی۔

"اس پہناوے کو اتارنا تو بس میں ہے" حضرت نے سرزنش کی۔"سادہ لباس پہنو تا کہ خلق خدا پہچان ہی نہ سکے۔"

"بس اسی روز سے میں نے گودڑی کو خیر باد کہا اور سادہ لباس پہن لیا"۔

لباس کے علاوہ شاہ میرؒ کی ہر چیز سے سادگی کا اظہار ہوتا۔حجرے کا فرش پرانے بوریے پر مشتمل تھا۔فقر کو اہل ثروت پر ہمیشہ ترجیح دی۔ایک بار تو یہاں تک فرمایا "شیخ بہاؤالدین زکریاؒ ملتانی کس قسم کے فقیر تھے۔بہتر ہوتا کہ دنیا میں دوبارہ واپس آ کر مجھ سے آداب فقیری سیکھے۔"

"فقر بہتر ہے یا غنا؟" مشائخ کی اس کے متعلق مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔مثلاً ابن عطارؒ فرماتے ہیں۔"تونگری" مفلسی سے بہتر ہے کیوں کہ یوم حشر میں دولت مند لوگ حساب دیں گے اور بوقت احتساب بے وسیلہ کلام ہو گا اور روبرو کلام سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے۔"

اس کے جواب میں حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔"تونگروں سے حساب لیا جائے گا تو فقرا سے "عذر" کیا جائے گا (یعنی مفلسی کا جواز فراہم کیا جائے گا) اس طرح "عذر" حساب کی نسبت بدرجہا بہتر ہے۔"

بہر حال ان مشائخ کا پلہ بھاری ہے جو "فقر" کو بہتر قرار دیتے ہیں کیوں کہ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے "میری امت کے فقراء دولت مندوں سے پانچ سو سال پہلے بہشت میں داخل ہوں گے۔" اس دلیل کے بعد لب کشائی کی ہرگز گنجائش نہیں رہتی۔

Marfat.com

''تونگر صاحب صدقہ ہوتے ہیں۔'' ایک شخص نے میاں میرؒ سے کہا۔

''اور فقرا صاحب صدق'' آپ نے لاجواب' جواب دیا۔ ''صدق' صدقہ سے بدرجہ بہتر ہوتا ہے۔''

یہ بات بھی مستند ہے کہ شاہ میرؒ تسبیح کو بھی دکھاوا کہا کرتے تھے چنانچہ آپ اور آپ کے احباب نے کبھی بھی ہاتھ میں تسبیح نہ لی۔ آپ نے شاہجہان کی پیش کی ہوئی تسبیح بھی داراشکوہ کو بخش دی تھی۔ محفل سماع کے متعلق بھی آپ کا رویہ معتدل تھا۔ راگ راگنیوں سے مکمل واقفیت تھی' سماع کو پسند بھی فرماتے۔ پرتاثیر کلام پر ریش مبارک کا ایک ایک بال کھڑا ہو جاتا اور چہرہ دہکتے شعلے کی طرح چمکنے لگتا۔

ملت اسلامیہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ وقت کے امام المحد ثین تھے۔ حضرت میاں میرؒ کے مقام سے کماحقہ' شناسائی' موصوف کا طرہ امتیاز مانا جاتا ہے ۔عہد جہانگیری میں ہند کی اصل حکمرانی ملکہ ہند نور جہاں کے زیر تسلط تھی' اس بات سے بھی انکار کی گنجائش نہیں۔ عمر عزیز کے آخری دور میں شیخ موصوف اور ملکہ نور جہاں میں اختلاف کی گہری جھیل حائل ہوگئی۔ یہ فکری تضاد کا شاخسانہ تھا جسے اہل ہوس نے کسی اور ہی رنگ میں جہانگیر کے گوش گزار کیا۔ جبین شاہ' شکن آلود ہوئی تو تعلقات کی فلک بوس عمارت' زمیں بوس ہوگئی۔ جہانگیر اس زمانے میں اپنی محبوبہ دل نواز کے ہمراہ کشمیر میں مقیم تھا۔ امام المحد ثین کی ملک بدری کے احکام صادر ہو گئے۔ شیخ موصوف کے لخت جگر شیخ نور الحق بھی اس حکم کی لپیٹ میں آ گئے۔ چنانچہ حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق دہلی سے کابل روانگی ٹھہری۔ باپ بیٹا لاہور پہنچے تو آستانہ درویش پہ حاضری دی۔

''شیخ صاحب! اس تفکیر کا سبب؟'' حضرت شاہ میرؒ اپنے عقیدت مند کو پریشان حال دیکھا تو خود بھی پریشان ہو گئے''۔ آپ تو نور محمدی صلعم سے ظلمت کدے کو روشن کرنے والے انسان ہیں یہ تفکیر کیسی؟''

''حضور! اس عالم پیری میں سفر کی صعوبت اور وہ بھی عتاب شاہی کے نتیجے میں'' پھر شیخ صاحب نے داستان الم' بالا پیرؒ کے گوش گزار کی۔ ''اصل وجہ ملکہ نور جہاں سے فکری تضاد ہے'' عبدالحق محدث دہلوی نے وضاحت پیش کی۔ ''اب آپ ہی انصاف فرمائیں' میں مضطرب نہ ہوں تو کیا خوشی کے شادیانے بجاؤں؟'' شیخ موصوف کے قابل صد افتخار فرزند بھی اس محفل

Marfat.com

میں لب بستہ بیٹھے تھے۔ درویش کی جبیں پر بھی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اب یہ معاملہ شیخ و شاہ کا نہ رہا۔ فقیر اور شہنشاہ کا ٹکراؤ ہو گیا۔

''جور و کے اس غلام کو بھی دیکھ لیں۔'' حضرت شاہ میرؒ نے زیر لب مسکرا کر کہا ''شیخ صاحب! کابل جانے کی کوئی ضرورت نہیں' اسی جگہ درویش کی کوٹھڑی میں قیام فرمائیے۔''

اب گویا امام المحدثین' حضرت میاں میرؒ کی پناہ میں تھے۔ دنیا کے بادشاہوں نے طاقت و دولت کا سہارا لے کر کیسی کیسی حماقتیں فرمائی ہیں۔ کبھی فلک بوس اہرام تعمیر کیے تا کہ مرنے کے بعد بھی سربلند رہیں۔ کبھی کاندھوں سے سر قلم کرائے لیکن وہ ایک بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ خلق خدا وقتی طور پر غلط فیصلہ صادر کر سکتی ہے دوام اس فیصلے کو حاصل ہوتی ہے جو بغیر جبر و اکراہ کے صادر ہوا اور وہ ہمیشہ کے لیے ''مبنی بر حقیقت'' ہوا کرتا ہے۔ سچائی کے رخ روشن کو ہمیشہ کے لئے زیر نقاب نہیں رکھا اور نہ ہی آفتاب عالم تاب کی کرنوں کو ہتھیلیوں کی اوٹ سے تا دیر روکا جا سکتا ہے۔ شیخ موصوف اطمینان قلب کے ساتھ لاہور میں قیام پذیر رہے اور چند روز بعد اطلاع آ گئی ''نور الدین جہانگیر' سلطان ابن سلطان دنیا سے کوچ کر گئے اور جسد خاکی تزک و احتشام سے لاہور لایا جا رہا ہے۔''

کہیں ایسا تو نہیں کہ حکم جہانگیری کے مقابلے میں ایک حکم درویش نے بھی صادر فرمادیا ہو' جس نے شاہی حکم پر خط تنسیخ کھینچ دیا اور اس کی تعمیل بادشاہ کے بے روح خاکی جسم کو کرنا پڑی۔ (یہ محض راقم کا قیاس ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں مگر ایسا ہوا ضرور) جب حکم دینے والا ہی چل بسا تو ملک بدر کون ہوتا۔ جہانگیر کی مشت خاک تو خود پیوند زمین ہونے لاہور تشریف لا رہی تھی۔

حضرت شاہ میرؒ نے تو یہاں تک فرما دیا تھا ''شیخ صاحب! خاطر جمع رکھیں' یہ ذمے داری اب اس فقیر پر تقصیر کی ہے۔ بادشاہ نے آپ کو طلب فرمایا ہے مگر یہ ملاقات ناممکنات میں سے ہے۔ آپ وطن عزیز میں اپنے اہل و عیال میں رہیں گے۔''

درویش اس سے زیادہ اور کیا کہتا یا کرتا؟ بر سبیل تذکرہ نور جہاں اور شیخ صاحب میں ''چپقلش'' کا آغاز اس طرح ہوا کہ ملکہ نے امام المحدثین کو اپنے حضور طلب فرمایا۔ شیخ موصوف نے جواب دیا ''فقیر کا شاہوں اور خصوصاً ان کی بیگمات سے کیا تعلق؟ کار لائقہ سے مطلع فرمائیں' اسے سرانجام دینے کی حتی المقدور کوشش کی جائے گی'' یہ واقعہ ۱۶۲۷ء کو پیش آیا خیر! جہانگیر رزق

Marfat.com

زمیں ہوا تو تخت ہند تک رسائی کے لئے اس کی اولاد میں ''کشمکش'' کا آغاز ہو گیا۔ ہم صرف وہ واقعات زیر بحث لائیں گے جن کا تعلق داستان شاہ میرؒ سے ہے ورنہ موضوع سے ناانصافی ہو گی۔

شہزادہ شہر یار نے جو نور جہاں کا داماد بھی تھا' لاہور میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شہر یار' لاڈلی بیگم سے رشتہ ازدواج میں منسلک تھا جو نور جہاں کے سابق شوہر' علی قلی استجلو المعروف' شیر افگن کے صلب سے تھی۔ تخت شاہی پر متمکن ہونے کے بعد اس نے اپنا ایلچی درویش کی خدمت میں بھیجا اور ملاقات کے لیے شاہ میرؒ دربار میں طلب کیا۔

''میرا اس فساد سے کوئی تعلق نہیں' اپنے شاہ سے کہنا فقیر کو بادشاہ سے ملاقات کی کوئی حاجت نہیں''۔ حضرت میاں میرؒ نے ایلچی کو واپس لوٹا دیا۔ شہر یار شاید مزاج درویش سے ناآشنا تھا۔ پہلے تو حیران ہوا پھر غیظ و غضب میں بھڑک اٹھا۔ مگر حقیقی خیر خواہوں نے نااہل شہزادے کو احمقانہ اقدام سے باز رکھا۔

''درویش سے مخاصمت جناب کو تباہ و برباد کر دے گی' ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔'' یہی خواہوں کی بات شہزادے کی اوندھی کھوپڑی میں آ گئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ سر کے بل چلتا دربار فقیر میں حاضر ہوتا مگر وہ دھونس دھاندلی سے درویش کی خوشنودی حاصل کرنے لگا۔ ''بادشاہ کا فرمان ہے کہ اگر آپ دربار میں تشریف لانے سے معذور ہیں تو خیر و برکت کے لئے اپنی دستار مبارک ہمارے حوالے کر دیں'' شاہی فرستادے نے شہر یار کی احمقانہ خواہش فقیر کے گوش گزار کی۔ حضرت میاں میرؒ کو غصہ آ گیا۔ تاریخ انسانی میں ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے حمقا کے واقعات سے اوراق سیاہ ہیں۔ اہل دل کے زیر استعمال اشیا میں' خیر و برکت والی بات سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں مگر یہ ''من مانے'' کا سودا بھی تو ہے' اس میں سینہ زوری کا کیا کام۔ شہزادہ شہر یار' رضائے درویش کے بغیر دستار فقیر کا طلب گار تھا۔ یعنی ذات کا انکار اور صفات کا اقرار یہ مخبوط الحواسی کی کتنی شاندار مثال ہے۔

حضرت میاں میرؒ نے سر سے دستار اتاری اور عالم طیش میں فرستادے کے منہ پر دے ماری۔ کہتے ہیں دستار کا کچھ حصہ خاک آلود بھی ہو گیا۔ ''عزیزم! یہ دستار اٹھاؤ اور میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور غریب خانے پر دوبارہ تشریف نہ لانا۔'' درویش عالم غیظ و غضب میں بھی مناسب الفاظ کا استعمال کر رہا تھا۔ ایسے میں ''واہی تباہی'' سے گریز' واقعی اہل دل حضرات ہی کا کام ہے۔ فرستادہ شہر یار' دستار لے کر کامیاب و کامران دربار میں حاضر ہوا۔ نااہل شہزادے نے گویا

Marfat.com

میدان مار لیا مگر اسی غلط فہمی میں مارا گیا۔

الختصر! ملکہ ہند کے سگے بھائی آصف خان نے اپنے داماد شاہجہاں کی خیر خواہی' میں تلوار بے نیام کی شہریار کو شکست ہوئی اور قلعہ لاہور میں اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہ ۱۶۲۸ء کے خونی واقعات ہیں۔ آصف خان نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس نے اپنے داماد کی راہ میں حائل ہونے والا ہر کانٹا جلا کر راکھ کر دیا۔ جن شہزادگان کی لاشیں دہلی روانہ ہوئیں ان میں شہریار' داور بخش' پسر شہزادہ خسرو۔ شہزادہ گشتاسپ بن خسرو' شہزادہ طہورث بن دانیال اور ہوشنگ بن دانیال شامل ہیں ۔آصف خان نے گویا کام پائیدار کیا تھا۔

عقیدت و احترام کے نتیجے میں' تقرب میاں میرؒ کے اعتبار سے جو مقام شہزادہ داراشکوہ کو حاصل ہوا' وہ مغلیہ خاندان میں کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ مناقب مشائخ کی کتب میں تو داراشکوہ کو باقاعدہ ''قادری'' لکھا جاتا ہے اور یہ نسبت بذات خود اس کے بلند مرتبے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ زیارت میرؒ کے بعد جب شاہجہاں حجرہ درویش سے باہر نکلا تو داراشکوہ تنہائی میں ملاقات کا اشتیاق لے کر دیوانہ وار حجرے میں داخل ہوا اور سر نیاز فقیر کے قدموں میں رکھ دیا ......شہزادے کا برہنہ پا آنا اور پھر یہ ادا' بالا پیر کو قائل و گھائل کر گئی۔ فقراء کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے عاجزی وانکساری......ایک موثر ہتھیار ہے۔ یہ ہتھیار ہر ''مقام ادب'' پر کارگر ثابت ہوتا ہے۔ درویش نے دست مبارک اس کے سر پر رکھا گویا دامن عافیت میں پناہ دے دی۔ تعلقات کی پہلی اینٹ سیدھی رکھی گئی تو عمارت کیوں نہ من پسند انداز میں استوار ہوگی۔

''عزیزم! اب اٹھ جاؤ در فقیر سے مایوس نہیں لوٹو گے'' شاہ میر کے الفاظ داراشکوہ کے لیئے ہفت اقلیم کی دولت سے کم نہ تھے۔ رفتہ رفتہ نوازشات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملا صالح' شفیع احمد اور حاجی محمد نبیاؒ تشریف فرما تھے خود حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''داراشکوہ ہماری خصوصی توجہ کا حقدار قرار پایا ہے' تم لوگ اس کا خیال رکھو۔'' کرم نوازی کی انتہا ملاحظہ ہو کہ داراشکوہ کا ملازم خدمت فقیر میں حاضر ہوا تو شاہ میرؒ نے قربت خاص سے نوازا اور مسکرا کر ارشاد فرمایا۔

''اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری''

(اے پھول' تجھے دیکھ کر دل خوش ہوا کہ تو کسی کی خوشبو لئے ہوئے ہے'')

ایک روز خلاف معمول حضرت نے ہاتھ میں تسبیح لے رکھی تھی۔ خواجہ بہاری جو دن رات حاضر خدمت رہتے' حیرت پر قابو نہ رکھ سکے۔ ''حضور! آپ کے ہاتھ میں یہ تسبیح پہلی دفعہ نظر

Marfat.com

آ رہی ہے' بات سمجھ میں آنے والی نہیں۔"

"یہ داراشکوہ کے لئے پڑھ رہا ہوں۔" شاہ میرؒ نے زیر لب مسکرا کر فرمایا۔" کیوں کہ وہ جانم ہمارا نور بصر ہے۔" اس خوش نصیب شہزادے پر فقیر کی کرم نوازی عالم رویا میں بھی جاری رہی اور بعد از وصال بھی۔ عالم خواب میں ایک بار دونوں کی ملاقات ہوئی۔ داراشکوہ نے دست بستہ سلام نیاز مندی پیش کیا تو آپ نے تبسم فرما کر کہا۔" عزیزم! میرے قریب آؤ۔" پھر اس کا سینہ برہنہ کیا اور اسے سینے سے لگا لیا' دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے' دل درویش سے انوار کا شوریدہ سر دریا رواں ہو کر" قلب مطلوب" کی جانب سے بہنے لگا۔ بقول داراشکوہ" میں جی بھر کے سیراب ہوا حتی کہ مجھے تنگی داماں کا احساس ہونے لگا۔ آنکھ کھلی تو میری کیفیت ہی کچھ اور تھی علم عرفان اور آگہی کا سمندر میرے سینے میں موجزن تھا۔"

۱۶۴۲ء میں وصال درویش کے سات برس بعد حضرت میرؒ کی توجہ اور ان کے تصرف بعد از وصال کے فیض سے شہزادہ موصوف کو لیلتہ القدر کی نظارگی بھی نصیب ہوئی۔ ماہ رمضان' رات کے پچھلے پہر وہ قبلہ رو بیٹھا مشغول وظائف تھا کہ کمرے میں نور کا سیلاب آ گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کے سامنے ایک دل کش منظر تھا۔ وسیع و عریض سرسبز و شاداب میدان میں ایک عالی شان عمارت تھی۔" یہ تو حضرت میرؒ کا روضہ اطہر ہے" اس کے دل نے گواہی دی۔ وہ دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا۔ بالا پیرؒ مزار سے باہر نکلے اور ایک زرد جواہر سے مزین کرسی پر بیٹھ گئے۔ شہزادے نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور بصد احترام آنکھوں سے لگا لیا۔ شاہ میرؒ نے شیرینی عطا کی اور چند وظائف تعلیم کیے۔ سکینتہ اولیاء میں داراشکوہ نے یہ واقعہ دل کش انداز میں رقم کیا ہے۔

شاہ میرؒ کا وصال ہوا تو شہزاد موصوف اکبر آباد میں تھا۔ (جس کا اسے زندگی بھر قلق رہا) عالم خواب میں زیارت درویش نصیب ہوئی اور انہوں عجیب و غریب خواہش کا اظہار فرمایا۔" عزیزم! اٹھو اور ہماری نماز جنازہ ادا کرو" پھر درویش نے اصرار پر شہزادے نے ان کی نماز جنازہ ادا کی۔ کیفیت اضطراب ناقابل برداشت ہو گئی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا..... چند روز بعد لاہور سے اطلاع وصول ہوئی کہ عین اسی روز اور اسی پل جب شہزادے نے خواب دیکھا تھا' حضرت میاں میرؒ سفر آخرت اختیار کر گئے تھے۔

ممتاز محل کے بطن سے تولد ہونے والا شاہجہاں کا پہلا فرزند جس کا نام" داراشکوہ" اس

Marfat.com

کے دادا جہانگیر نے تجویز کیا ابتداء ہی سے تصوف کی طرف مائل تھا۔ سکینۃ الاولیاء کی تدوین اس کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ سفینۃ الاولیاء بھی شہزادہ موصوف ہی کی قلمی کاوش ہے لیکن جس عرق ریزی سے اس نے سکینۃ الاولیاء تصنیف کی اس کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے قرآن حکیم' احادیث مختلف تفاسیر (جن کی تعداد بیس کے قریب بنتی ہے) سب کو بنظر غور مطالعہ اور ان کے حوالہ جات سے اپنی تصنیف کو مزین کیا پھر سینکڑوں مریدان میرؒ سے فرداً فرداً تبادلہ خیالات تقریباً پچاس بزرگان دین کے اقوال و فرمودات بھی اس نادر الوجود کتاب میں منقول ہیں ۔ یہ کدو کاوش واقعی ایک کارنامے سے کم نہیں۔ اس تفصیل و تمہید کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ حضرت میاں میرؒ کے اس عاشق زار اور عقیدت مند کا انجام بڑا ہی المناک ہوا۔ اس المناک انجام کی بدولت دشمنان اسلام اور مخالفین نے پہلے تو اورنگ زیب عالم گیر کو ہدف تنقید بنایا پھر ''فکر اسلام'' بحیثیت مجموعی زد پر آئی۔ اسلام کے نام لیواؤں کو اندھی تقلید کرنے والے' بنیاد پرست' متعصب تنگ ظرف دل جانے کیسے کیسے ''خطابات' کا سزاوار ٹھہرایا گیا۔''

داستان میاں میرؒ کے اس عجیب و غریب کردار پر مفصل روشنی ڈالنا وقت کی اہم ضرورت کے علاوہ ہندو داستان طرازوں کو مدلل جواب پیش کرنے کے لیے بھی اشد ضروری ہے ان داستاں طرازوں سے متاثر ہو کر ہمارے قلم کار بھی ایسی ایسی بے پر کی ہانک جاتے ہیں کہ بس سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے لہٰذا قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ اس تحریر کو تعصب کی عینک اتار کر پڑھیں۔ نتیجہ اخذ کرنے میں ہر شخص کو آزادی ہے اور ہونی چاہیے۔ حضرت میاں میرؒ کا وصال ۱۰۴۵ھ بمطابق ۱۶۳۵ء ہوا۔ ٹھیک پانچ برس بعد ۱۰۴۹ء یعنی وصال میر کے چار برس بعد سفینۃ الاولیاء یا منصۂ شہود پر آئی۔ یہ کتب تصوف میں قراں قدر اضافہ تھا۔ تین برس بعد یعنی ۱۰۵۲ھ میں سکینۃ اولیاء منظر عام پر آئی تو گویا تہلکہ مچ گیا۔ صورت حال بڑی خوشگوار اور ایمان افروز تھی پھر چند برس بعد شہزادہ گویا پٹری سے اتر گیا اور بدقسمتی سے بنارس کے پنڈت' یوگی اور ہندو دانش ور اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان سے تبادلہ خیالات ہوا تو شہزادہ موصوف ہندو مذہب کی ''رنگینی'' کا شکار ہو گیا۔ کشادہ دلی اور وسعت ظرف کی آڑ میں کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ وصال میاں میرؒ کے ٹھیک بیس برس بعد ۱۰۶۵ھ میں اس نے ''مجمع البحرین'' تصنیف کی۔ اس کا موضوع نام ہی سے ظاہر ہے دو دریاؤں یا سمندروں کا ملاپ۔ اسلام اور ہندو مت کو (جو کوئی مت ہی نہیں) ایک وحدت ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش میں وہ حد سے تجاوز کر گیا۔ یہ وصال شاہجہاں سے تین برس

Marfat.com

پہلے کا ذکر ہے۔اہل ہنود نے خوشیوں کے شادیانے بجائے۔شاہجہاں کا فرزند اکبر ہونے کی رو سے تخت دہلی کا وہی وارث تھا۔پکے ہوئے پھل کی طرح وہ ہنود کی جھولی میں آ گرا تو وہ گھی کے چراغ کیوں نہ جلاتے۔یہ بات کوئی راز نہیں کہ ہندو بحیثیت مجموعی داراشکوہ کو تخت دہلی پر متمکن دیکھنا چاہتے تھے۔انہوں نے تو نئی ''جودھابائی'' (زوجہ اکبراعظم) کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔

دو برس بعد داراشکوہ نے ایک اور دھماکہ کیا اور ''سر اکبر'' لکھی پہلے تو اسلام اور ہندو مت کو ایک شجر کی دو شاخیں ثابت کیا گیا تھا۔مگر ''سر اکبر'' میں اس نے اس سے بھی بڑی جسارت کر ڈالی۔اس نے مختلف دلائل سے ثابت کیا کہ قرآن حکیم کی سورہ واقعہ میں ''کتاب مکنون'' سے مراد لوح محفوظ نہیں بلکہ ہندو کے اپنشد ہیں (تلفظ اپ۔ن۔شد) یہ ہندوؤں کی وہ مقدس کتب ہیں جن میں ویدوں کا خلاصہ یا انتخاب درج ہے۔یہ بڑی المناک صورت حال تھی۔

پہلے جلال الدین اکبر کے دین الٰہی سے طوفان بدتمیزی بپا ہوا' اب یہ ایک نئی مصیبت در پہ دستک دے رہی تھی۔حضرت مجدد الف ثانیؒ جنہوں نے دین الٰہی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور اسے اکبر کے محل تک محدود کر دیا تھا سفر آخرت اختیار کر چکے تھے مگر ان کے فرزند اور جانشین خواجہ محمد معصوم زندہ سلامت موجود تھے۔داراشکوہ کی اس جسارت سے بحر الم میں ڈوب گئے۔خواجہ معصومؒ کا عالم پیری آڑے آ رہا تھا مگر کچھ نہ کچھ کرنا بھی ضروری تھا اس عالم پیری میں انہوں نے حضور اکرم ﷺ کے روضہ اطہر پر حاضری کا فیصلہ کیا۔

ہر شخص اپنی اپنی دانش مندی کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے خواجہ معصومؒ نے یہ مقدمہ ''عدالت عالیہ'' میں پیش کر دیا۔''روضۃ القیومیہ'' میں کمال الدین محمد احسان رقم طراز ہیں کہ خواجہ معصومؒ مراقبے میں گئے اور داراشکوہ کی ہندو نواز جسارتوں کی روداد حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کی۔اس بات کا بطور خاص ذکر کیا کہ داراشکوہ کفر کا احیا چاہتا ہے اور سلسلہ مجددیہ کا سخت مخالف ہے۔روضۃ القیومیہ کے علاوہ ''خزینۃ الاصفیاء'' میں بھی مرقوم ہے کہ حضور اکرم ﷺ شمشیر بدست نمودار ہوئے اور فرمایا ''جو شخص تمہارا دشمن ہو وہ ہمارا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے یہ شمشیر قہرالٰہی ثابت ہوگی۔''

خواجہ معصومؒ مراقبے سے باہر تشریف لائے تو بے اختیار پکار اٹھے ''خس کم جہاں پاک داراشکوہ ہندوستاں میں کیفر کردار کو پہنچ''

ہمارا مقصد سیاسی تاریخ بیان کرنا نہیں۔مختصراً عرض ہے کہ سامو گڑھ میں شکست فاش

Marfat.com

کے بعد داراشکوہ قندھار کی طرف بھاگا۔ درہ بولان کے نواح دادر کے مقام پر ملک جیون نے اسے گرفتار کر لیا اور افواج اورنگ زیب کے سپرد کر دیا۔ دہلی پہنچنے پر ''مجمع البحرین'' تصنیف کرنے کی بنا پر مقدمہ چلا اور اسے واجب القتل قرار دیا گیا۔ اس طرح سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیاء جیسی کتب کا مصنف ایک قادری شہزادہ ''مجمع البحرین'' اور ''سر اکبر'' جیسی دل دکھانے والی کتب لکھنے کی پاداش میں المناک انجام کو پہنچا...... اورنگ زیب عالم گیر کن ذرائع سے تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوا؟ اپنی دانش کے مطابق اس پر متضاد تبصرے ہوئے اور ہوتے رہیں گے اس بحث میں الجھنا نا مناسب ہے لیکن اس سلسلے میں ایک معتبر گواہی پیش خدمت کرنے کی جسارت ہم ضرور کریں گے۔

دور میاں میرؒ برصغیر میں سلسلہ قادریہ کے عروج کا دور ہے ان کی عمر عزیز کے آخری دور میں اسی سلسلے کے ایک شہباز طریقت' سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ ہوتے ہیں (۱۰۳۹ھ تا ۱۱۰۲ھ) یہ اورنگ زیب کا عہد حکومت تھا۔ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان کشمکش ان کے سامنے کا واقعہ ہے وہ اپنی تصنیف ''نور الہدیٰ خورد'' میں اورنگ زیب کو ''خلائق پناہ محی الدین'' غازی' عادل' زاہد' واقف اسرار ربانی اور آگاہ عالم سبحانی'' قرار دیتے ہیں۔ اپنے رسالے ''قرب دیدار'' کے آغاز میں انہوں نے یہ شعر لکھا۔

عمل شاہی عبید اللہ است
کہ اورنگ زیب غازی بادشاہ است

اس کے علاوہ سلطان العارفین نے اپنی دوسری تصانیف میں بھی اورنگ زیب کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سلطان باہو جیسا بیدار مغز راہ سلوک کا شہسوار کیا واقعی داراشکوہ اور حضرت میاں میرؒ کے روابط سے نا آشنا تھا؟ عقل اسے ہرگز تسلیم نہیں کرتی۔ اس کا ایک ہی مفہوم ہے کہ وہ اورنگ زیب کو واقعی حق پر اور داراشکوہ کو قابل گردن زنی سمجھتے تھے...... ان تمام شواہد کی موجودگی میں ہم آپ لب کشائی کی جسارت کیسے کر سکتے ہیں؟

عشق رسول ﷺ حضرت میاں میرؒ کا اوڑھنا بچھونا قرار دیا جائے تو ہرگز مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ عمر بھر کوئی ایسا کام نہ کیا جو اسوہ حسنہ کے عین مطابق نہ تھا۔ نشست و برخاست سے لے کر خلق خدا سے حسن سلوک تک نقش پائے رسول ﷺ کا اتباع ہر پل ہر گھڑی کیا۔ جہاں تک معرفت الٰہی کا تعلق ہے تو شاہ میرؒ نے اس کے تین طریقے تعلیم کیے۔ انہیں درجات و مقامات کہنا زیادہ

Marfat.com

مناسب ہے۔آپ نے فرمایا احکام شریعت کی پابندی سالک کے لیے اہم ترین شے ہے۔اس میں کامل ہونے کے بعد "طریقت" کا راستہ دکھائی دیتا ہے' نفس کی اصلاح کا آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے۔طریقت کے جملہ لوازمات بطریق احسن پورے ہوں تو راز حقیقت عیاں ہوتا ہے۔ بری خصلتوں سے نجات اور اندر کی پاکیزگی اس کے نتائج ہوتے ہیں' تب جا کر دل کی آنکھ سے بشریت کے پردے اٹھتے ہیں اور مکمل "انسان" معرض وجود میں آتا ہے۔

شاہ میرؒ "ترک و تجرید" کا بہترین نمونہ تھے' اس کے باوجود مریدان باصفا کو عام زندگی گزارنے کی تلقین فرماتے۔"اس خارزار کی سیاحی ہرکس وناکس کے بس کی بات نہیں" پہلا درس یہی ہوتا ہے اگر کوئی صاحب ظرف مل جاتا جس میں "مشغول حق" ہونے کی جملہ صفات موجود ہوتیں تو اس کی حوصلہ افزائی فرماتے۔

شیخ حامد گوجر آپ کے ایک صاحب ثروت وظرف مرید تھے۔ایک عرصے تک ترک و تجرید کی ضد کرتے رہے۔آخر کار' عمر عزیز کے آخری دور میں ان کو "مشغول ذکر" کر دیا گیا۔ان کی بیوی نے شیخ داؤدؒ سے عرض کی۔"آپ کی رسائی دربار میرؒ تک ہے' میرے شوہر نے زندگی ہی میں مجھے بیوہ بنا دیا ہے۔گھر کے در و دیوار سے ویرانی ٹپکنے لگی ہے۔ذرا مناسب الفاظ میں شاہ میرؒ کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں تاکہ اس گھر کی رونقیں بحال ہو جائیں۔"

حضرت میاں میرؒ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا۔"حامد گوجر نے زندگی کا پیشتر حصہ مکروہات زمانہ میں بسر کر دیا۔اس کا اپنا بھی' اس پر کوئی حق ہے اب وہ بہت دور جا چکا ہے لہٰذا وہ اہل وعیال کے کام کا نہیں رہا۔"

"دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

کے مصداق آپ عام انسانوں کو ترک وتجرید سے دور رکھتے۔

محفل احباب واصحاب رنگ پر تھی۔ارشادات عالیہ سے محفل لطف واندوز ہو رہی تھی اچانک ملا سعد اللہ نے مسئلہ رویت چھیڑ دیا۔(رویت بہ معنی مشاہدہ حق ننگی آنکھ سے ذات باری تعالیٰ کو دیکھ سکنا) "ہم تو صرف جسمانی صورت کو "مکان" خاص پر ہو تو دیکھ سکتے ہیں۔ذات باری تعالیٰ لامکانی ہے تو ایسی صورت میں جلوگی کا نظارہ کیسے ممکن ہے؟"

"آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اہل بہشت کی پنڈلیوں کا گودا ستر کپڑوں کی تہ تلے سے بھی دکھائی دے گا۔" حضرت میاں میرؒ نے تشریح کا آغاز کیا۔"گویا اس جسد خاکی کی ہر

Marfat.com

شے نور کا درجہ اختیار کر جائے گی۔ گویا بصارت 'بصیرت میں تبدیل ہو جائے گی دوسرے الفاظ میں ہمارا جسم کثیف 'لطیف بن جائے گا اور لطیف 'لطیف کا مشاہدہ کر سکتا ہے (صفات باری تعالیٰ میں لطیف وخبیر اہم صفات ہیں) حضور اکرم ﷺ نے ذات باری تعالیٰ کا دیدار کل گیارہ مرتبہ کیا۔ دو مرتبہ کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے اور نو مرتبہ کا احادیث سے۔ شب معراج رکعتوں کی تخفیف کے سلسلے میں آنخضرت محمد ﷺ نو بار ''مقام عروج'' میں تشریف لے گئے اور واپس آئے اس آمد و رفت میں دیدار الٰہی سے فیض یاب ہوتے رہے۔ واضح ہو یہ نظارگی کیفیت اعتدال کی تھی۔ ایک روز شاہ میرؒ نے عجیب وغریب بات کہہ دی۔ ''غفلت' کفر سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہے۔'' احباب نے تشریح طلب نگاہوں سے دیکھا تو آپ نے فرمایا۔ ''کفر کا علاج کلمہ پڑھنے سے ہو جاتا ہے لیکن اہل دل کے ہاں غفلت لاعلاج مرض ہے۔''

فرمودات میرؒ کے مطابق مردان حق کا ''تصرف'' زندگی اور موت کے بعد بھی ایک جیسا رہتا ہے بلکہ موت کے بعد چوں کہ تمام پردے اٹھ جاتے ہیں لہٰذا ''تصرف'' کا دائرہ وسیع ہو کر صاحب تصرف کے لئے آسانی کا باعث بن جاتا ہے۔۔

ایک بار علمائے شہر نے استفسار کیا کہ ''آنخضرت محمد ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ عالم پیر میں بندے کی حرص بڑھ جاتی ہے تو کیا اس کلیے کا اطلاق انبیاءؑ پر بھی ہوتا ہے؟''

آپ نے اس کا ایسا شافی اور مکمل جواب ارشاد فرمایا جو تا قیامت مشعل راہ رہے گا۔ ''بے شک اس کا اطلاق انبیاءؑ پر بھی ہوتا ہے مگر اس کی تشریح کچھ اس طرح سے ہے' مکروہات زمانہ میں گرفتار ایک عام آدمی کو دنیاوی ساز و سامان کی حرص ہوتی ہے جو عالم پیری میں بدرجہا بڑھ جاتی ہے مگر انبیاء علیہ السلام اور مردان حق زندگی بھر خلق خدا کو راہ راست پر لانے کی حرص میں مبتلا رہتے ہیں اور عمر عزیز میں اضافے کے ساتھ اسی نوعیت کی ''حرص'' میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے' ان کے پیش نظر صرف یہ بات ہوتی ہے کہ وقت کم رہ گیا ہے اور کام بہت زیادہ ہے اس لیے ان کو ''حریص'' کہا جاتا ہے لیکن حرص 'حرص میں امتیاز ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ انبیاء علیہ السلام پر عام حرص کا گمان پرلے درجے کی گمراہی اور باعث ہلاکت ہوتا ہے۔''

نمود و نمائش اور شہرت کی خاطر آپ کسی کو مرید نہیں بناتے تھے' ملاقات کی تمنا لے کر آنے والے کی دلجوئی فرماتے لیکن طلب حق کے خواہش مند کو آزمائش میں ضرور ڈالتے۔ ملا شاہ بدخشانی کی طرف پورے تین برس تک ملتفت نہ ہوئے۔

Marfat.com

جاہ پسندی کو ترک کرنے کی سختی سے تلقین کرنا شاہ میرؒ کی عادت تھی۔ ان کے نزدیک درویشی کو تباہ و برباد کرنے میں جاہ پسندی سر فہرست تھی۔ ایک بار خواجہ ملا بہاری اپنے احباب کے ساتھ حجرے میں تشریف فرما تھے۔ اچانک انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا اور احباب کو حجرے سے نکل جانے کا حکم دیا ''چھت گرنے والی ہے فوراً باہر تشریف لے جائیں۔'' اصحاب تعمیل ارشاد میں باہر دوڑے مگر ملا موصوف اسی جگہ بیٹھے رہے۔ چھت گرنے کے آثار دکھائی دیئے تو بہ آواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔ دھڑام سے چھت نیچے آ گری، مگر دو مضبوط کڑیاں آپ پر گویا سایہ فگن ہو گئیں۔ آپ ان کڑیوں کے نیچے محفوظ رہے۔ حضرت میاں میرؒ کو اس حادثے کی خبر ہوئی تو بے اختیار پکار اٹھے ''ہائے جاہ' وائے جاہ'' اس نامراد جاہ پسندی کا خیال دم آخر بھی جان نہیں چھوڑتا۔ ملا بہاری کو کلمہ طیبہ بہ آواز بلند نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔ یہ تو درویشی کی دھاک بٹھانے والی بات ہوئی۔''

اس حقیقت سے تو ایک زمانہ آشنا ہے کہ سلسلہ قادریہ میں خرقہ ''میر شاہی'' حضرت میاں میرؒ سے منسوب ہے۔ آپ کا حلیہ مبارک کتب مشائخ کے مطابق، رنگ گندمی، پیشانی کشادہ، ابرو ایک دوسرے سے پیوستہ، آنکھیں درمیانی، اعضا متناسب، ریش مبارک مٹھی برابر اور قد درمیانہ تھا گویا ''خیر الامور اوسطہا'' کی منہ بولتی تصویر تھے۔ گفتگو مدلل اور کم سے کم الفاظ پر مشتمل ہوتی۔ طرز استدلال کی بہترین مثال پیش خدمت ہے۔

جہانگیر کے عہد حکومت میں وزارت عظمیٰ کا قلمدان نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کے پاس تھا۔ جہانگیر کے دل پر حکمرانی بھی ملکہ ہند کی تھی، دونوں اثنا عشری مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح سرزمین ایران سے مجتہد حضرات کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ دربار پر تسلط بھی ان ہی کا تھا۔ ملکہ ہند کا والد اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ، نواب آصف جاہ، نواب صادق خان طہرانی، نواب جعفر خان وغیرہ یہی حضرات کلیدی عہدوں پر فائز تھا۔ لاہوری علما نے اس طرف خصوصی توجہ مبذول فرمائی لیکن جو کارنامہ حضرت میاں میرؒ نے سرانجام دیا وہ منفرد قرار دیا جا سکتا ہے۔

نواب آصف جاہ کی دختر ممتاز محل شاہجہاں کی چہیتی بیوی تھی۔ دونوں کے ایما پر ایران سے ایک ذہین وفطین مجتہد کو مدعو کیا گیا تاکہ سنی علماء سے مناظرے کا بازار گرم کیا جائے۔ مجتہد موصوف لاہور تشریف لائے تو حضرت میاں میرؒ سے بطور خاص ان کی ملاقات کروائی گئی۔ آپ

Marfat.com

نے برسبیل تذکرہ پوچھا ''کیا آپ کربلائے معلیٰ کی زیارت سے فیض یاب ہوئے ہیں؟''

''الحمدللہ! بارہا اس سعادت سے مستفیض ہو چکا ہوں۔'' مجتہد نے جواب دیا۔

''اس سرزمین کے فضائل کی تشنگی دور فرمایئے'' شاہ میر نے بصد احترام کہا۔

''اس سرزمین کی ادنیٰ فضیلت یہ ہے کہ اس کے نواح میں سات سات کوس تک مدفون حضرات روزمحشر بغیر حساب داخل جنت ہوں گے۔''

''کیا یہ فضیلت انبیائے کرامؑ کی آرام گاہوں کو بھی حاصل ہے؟'' حضرت میاں میرؒ نے پوچھا۔

''ہر نبی کے مرقد کے گرد دس دس کوس میں مدفون حضرات بھی بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے۔'' ایرانی مجتہد نے بے ساختہ جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت محمد ﷺ کے پہلو میں مدفون دو بزرگوں کی بخشش بھی عین ممکن ہے۔''

ایرانی مجتہد کی کی تسلی ہو گئی اور برصغیر میں شیعہ سنی مناظروں کا بازار گرم ہوتے ہوتے رہ گیا کیوں کہ ایرانی عالم واپس لوٹ گیا...... اس طرح شاہ میرؒ نے مومنانہ فراست سے حالات پر قابو پالیا (خدا ملت اسلامیہ کو جاہ پسند لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ خواہ ان کا تعلق کسی بھی مسلک سے ہو)

''خوارق عادات و کرامات'' ان واقعات کا ظہور اولیائے کرام کا خاصہ رہا ہے مگر شاہ میر اس سلسلے میں حد سے زیادہ محتاط تھے اور گریز کی حد تک اجتناب فرماتے اور اکثر یہ مصرع زیر لب دہراتے۔

کرامت اولیارا اضطراب است

(اولیاء کے لئے کرامات باعث اضطراب ہوتی ہیں) ان کے بقول ''اس نوعیت کے واقعات دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ اختیاری اور اضطراری۔ اسمائے الٰہی کے ورد کے نتیجے میں اختیاری کرامات کا ظہور ہوتا ہے تا کہ منزل مراد کا حصول آسان ہو جائے۔ حصول مراد بذات خود ایک کرامت ہے کہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔''

''اضطراری کرمات من جانب اللہ ہوتی ہیں۔ ان کا ظہور اس مقام پر ہوتا ہے جہاں بندے کے اعمال رب العزت کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں۔ یہ تقرب الٰہی کا بلند ترین مقام

Marfat.com

ہوتا ہے اور ''ایں سعادت بزور بازو نیست۔''

دارا شکوہ کے استاد مکرم اخوند میرک شیخ نے ایک روز زیارت میرؒ کی خواہش کا اظہار کیا۔ دارا شکوہ نے اپنی طرف سے خط استاد مکرم کے خدمت میں پیش کیا۔ جو شیخ موصوف نے اپنی دستار میں رکھ لیا۔ درویش نے بصد احترام اخوند کا استقبال کیا' کمال مہربانی سے پیش آئے۔ بڑی رسان سے احوال دریافت فرمایا۔ دوران ملاقات شیخ کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ ''بالا پیرؒ کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا مگر یہ تو عام سے انسان ہیں' کشف و کرامات والی کوئی بات ہی نظر نہیں آ رہی۔'' ادھر ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال ابھر رہا تھا ادھر درویش نے چونک کر مہمان کو دیکھا' ہونٹوں پر تبسم رقصاں ہوا اور آپ نے ہاتھ بڑھا کر وہ تعارفی خط جسے شیخ موصوف نے پیش کرنا یکسر بھول چکے تھے' اچک لیا اور ساتھ ہی سرسری لہجے میں فرمایا ''سوئے ظن سے حسن ظن کا مقام یقیناً بلند ہوتا ہے' اور شہزادے کا خط بغور پڑھنے لگے واضح ہو کہ اس زمانے میں عالم پیری کی بنا پر بصارت حد سے زیادہ کمزور ہو چکی تھی مگر بصیرت یقیناً اوج ثریا سے بھی اونچے مقام پر فائز تھی۔ شیخ اخوند نے شدت خجالت سے سر جھکا لیا۔

دریائے راوی کے کنارے باغ مرزا کامران میں حضرت میاں میرؒ اکثر تشریف لے جاتے۔ سنت نبوی کی اتباع میں سرسبز مقامات سے آپ کو عمر بھر رغبت رہی۔ اسی باغ میں ایک روز لیٹے ہوئے تھے۔ شیخ عبدالواحد نبیائیؒ پاؤں دبا رہے تھے۔ اچانک تھوڑے فاصلے پر ایک ناگ پھن پھیلائے کھڑا نظر آیا۔ شیخ صاحب کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ درویش نے عقیدت مند کو گھبرائے ہوئے دیکھا تو چونک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ ناگ اس وقت شاید اشتعال میں تھا وہ پھنکارنے لگا۔

''حضور! اب کیا ہوگا؟'' شیخ موصوف نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا مگر یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ بالا پیرؒ ناگ کو قریب آنے کا اشارہ فرما رہے ہیں۔ ناگ قریب آیا تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے' ناگ نے باقاعدہ ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھا پھر قریب ہی اپنے منفرد انداز میں بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا...... سب کچھ شیخ عبدالواحد عبائیؒ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا مگر دل آنکھوں کی معتبر گواہی کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ شیخ صاحب کو محسوس ہوا جیسے ناگ آپ سے محو کلام ہو۔ حیرت کی انتہا اس وقت ہوئی جب حضرت میاں میرؒ نے مسکرا کر کہا ''اچھا! تو پھر یونہی سہی گویا سانپ کی کسی بات سے آپ متفق ہو گئے۔ ناگ پھن سمیٹ کر تھوڑی دیر بیٹھا رہا پھر......

Marfat.com

بڑے اطمینان سے آپ کے گرد چکر لگانے لگا۔ انداز طواف کرنے کا سا تھا۔ شیخ عبدالوحد کے خوف پر حیرت غالب آ چکی تھی۔ ناگ نے تین طواف کیے اور اطمینان سے اپنی راہ ہولیا۔

''حضور! یہ کیا راز تھا؟'' ناگ غائب ہوا تو شیخ صاحب اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکے۔

''عزیزم! سانپ نے مجھ سے کہا۔ ایک عرصے سے میں آپ کی زیارت کا مشتاق تھا اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلی ملاقات پر آپ کے گرد طواف کروں گا۔ آج مجھے اس سعادت سے محروم نہ رکھیں۔ اور میں نے اس کی اجازت دے دی۔'' یہ کہہ کر شاہ میرؒ پھر فرش زمین پر لیٹ گئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ باغ زین خان میں پیش آیا۔ اس روز بھی شیخ عبدالواحد آپ کے ہمراہ تھے۔ ایک شجر سایہ دار پر معصوم فاختہ اپنے انداز میں نغمہ سرا تھی۔ آپ نے پسندیدگی کی نگاہ سے اس فاختہ کو دیکھا اور کہا ''سبحان اللہ! کس خوش الحانی اور کیسی رغبت سے رب العزت کی تسبیح کر رہی ہے؟'' اس وقت آپ کے چہرے سے دلی مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اچانک کہیں سے ایک پتھر آ کر فاختہ کو لگا کر وہ شاخ سے گر کر تڑپنے لگی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک شخص نظر آیا جس کے ہاتھ میں غلیل تھی۔ صورت حال کی وضاحت ہوگئی۔ یہ کاروائی شکاری کی تھی۔ آپ بڑے کبیدہ خاطر ہوئے اور بڑے دکھ سے فرمایا۔ اتنا تھوڑا سا فائدہ اور اتنا خسارہ؟''

''عزیزم! اس جاں سوختہ کو اٹھالاؤ'' آپ نے شیخ عبدالواحد سے کہا۔

مردہ فاختہ بالا پیرؒ کے سامنے پڑی تھی اور آپ بڑے پیار سے اس کے بال و پر چھو رہے تھے اور زیر لب کچھ پڑھتے بھی جا رہے تھے۔ اچانک فاختہ کے تن مردہ میں زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ درویش کے ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فاختہ پھڑ پھڑا کر اڑ گئی اور شاخ شجر پر بیٹھ کر حسب سابق اپنے وظیفے میں مشغول ہوگئی۔ اتنے میں وہ شکاری اپنی غلیل سمیت پھر آ گیا اور فاختہ کو زد پر لے آیا۔

''عبدالواحد! اس غافل انسان کو روکو۔ فاختہ بالکل بے قصور ہے'' آپ نے اپنے عقیدت مند سے کہا...... وہ شکاری یقیناً مقام درویش سے بے خبر تھا۔ اس نے شیخ موصوف کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور ہدف پر کھینچ کر پتھر مارا۔ کیوں اور کس طرح ہوا؟ اس کے متعلق تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر کیا ہوا؟ یہ سب کے سامنے تھا۔ غلہ اس کے اپنے ہاتھ پر لگا اور شکاری کی چیخ نکل گئی۔ اسی پر بس نہیں وہ شکاری باقاعدہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ یہ بھی ایک ناقابل فہم سی بات تھی

Marfat.com

غلیل سے نکلنے والا غلہ اتنا طاقتور کیسے ہو گیا کہ ایک تنومند نوجوان ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جائے۔ خیر! شکاری کے ہوش وحواس بجا ہوئے تو اس کے بازو میں درد کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قریب ترین جائے پناہ کی طرف بھاگا۔ جس فقیر کو اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا تھا۔ اسی سے درد لازوال کی دوا کا تمنائی ہوا۔ اس طرح اسے زیارت میرؒ کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔

''فاختہ نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو آپ اس کے درپے آزار ہوئے'' شاہ میرؒ نے شکاری سے پوچھا۔

''جناب ٹھوکر لگنے ہی سے آنکھ کھلتی ہے'' شکاری بات کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ ''اپنی سزا میں تخفیف کی صرف درخواست ہی کر سکتا ہوں ظاہر ہے مجھ میں مقابلے کی تاب ہے نہ مجال۔''

''در توبہ میں داخل ہوتے ہی ''تاب ومجال'' کا حصول ہو جاتا ہے'' بالا پیرؒ نے بڑے میٹھے لہجے میں فرمایا۔

''جناب! اس درد کے طوفان سے تو نجات دلائیں' توبہ تو میں کب کا کر چکا'' شکاری نے ہتھیار ڈال دیے۔ بالا پیرؒ نے کمال مہربانی سے درد لیے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ شکاری کے دل کو قرار آ گیا۔

لاہور میں طاعون کی وبا پھیلی تو خلق خدا کو خدا یاد آ گیا۔ ہر بستی سے آہ وفغاں بلند ہوئی۔ موت کا رقص عام ہوا اس وبا کی تباہی کا دورانیہ کافی طویل تھا۔ شیخ پیر میرٹھیؒ خدمت درویش میں حاضر ہوئے اور وبا کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ آپ نے فرمایا ''عزیزم! اہل قضا میں دعا سے گریز کرنا چاہیے' پیر میرٹھی کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس رات گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر خود مشغول دعا ہوئے۔ دست دعا بلند کرتے ہی ہوش وحواس سے بیگانے ہو گئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے اندھے کنوئیں میں گرے جا رہے ہیں۔ یہ کیفیت تین دن تک رہی ان ایام میں نمازیں تک قضا ہو گئیں۔ چوتھے روز حواس ٹھکانے آئے تو بھاگم بھاگ خدمت درویش میں حاضر ہوئے۔ آپ نے دیکھتے ہی تبسم فرمایا ''حضرت! اتنی بے باکی نامناسب ہوتی ہے۔ وہ تو اتفاقاً فقیر کو خیال آ گیا تھا ورنہ اس اندھے کنوئیں سے کون واپس آتا ہے'' بات اشارے کنائے سے کی گئی مگر پیر مرٹھی سمجھ چکے تھے۔

بالا پیر کسی مجذوب کو برہنہ حالت میں دیکھ لیتے تو کبیدہ خاطر ہو اٹھتے اور ستر پوشی کا حکم دیتے۔ ایسا ہی ایک مجذوب سر بازار نظر آیا تو آپ نے ستر پوشی کی تلقین کی مگر مجذوب تو مجذوب

Marfat.com

ہوتا ہے' کہتے ہیں اس پر شریعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔

''درویش! ہوش میں آؤ ستر پوشی فرائض کے زمرے میں آتی ہے'' بالا پیرؒ نے سرزنش کی مگر برہنہ مجذوب مسکرانے لگا۔آپ نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔مسکراہٹ برہنہ شخص کے ہونٹوں پر منجمد ہوگئی۔عجیب صورت حال تھی وہ فقیر بس مسکرائے جا رہا تھا۔جیسے کوئی سنگتراش کسی بت کے چہرے پر مسکراہٹ ''نقش'' کردے......مجذوب ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ایک شخص نے چادر پیش کی۔مجذوب نے فوراً ستر پوشی کی اور حالت ''اعتدال'' میں آ گیا۔

''جتنا ظرف ہو اتنی ہی پینی چاہیے۔'' بالا پیرؒ نے مجذوب کو تلقین کی۔

باغ نولکھا میں مشغول راز و نیاز تھے کہ آپ نے اپنے ایک مرید کو طلب فرمایا۔''جاؤ' اس سامنے والے درخت سے ''ورد'' کا سلیقہ سیکھو اور واپس آ کر بتاؤ وہ کیا وظیفہ کر رہا ہے''مرید حیران و ششدر شجر سایہ دار کے قریب گیا۔واپس آیا تو حیران دو چند ہو چکی تھی۔''حضور! درخت نے کہا ''یا نافع'' کا ورد کر رہا ہوں۔''

یہ درخت سرس کا تھا اور عہد اورنگ زیب تک باغ نولکھا میں قائم و دائم تھا۔لوگ اسے دیکھتے تو حضرت میاں میرؒ کی یاد تازہ ہو جاتی۔ایک روز آپ نے محفل احباب و اصحاب کو ایک عجیب و غریب حکایت بیان فرمائی۔اس کے راوی میاں حاجی محمد عیاضؒ ہیں۔

''سیوستان کے پہاڑی علاقے میں چار درویش سفر کر رہے تھے۔مسلسل تین روز تک کوئی حلال شے کھانے کو میسر نہ آ سکی۔بھوک سے بے تاب ہوئے تو ذکر و فکر میں خلل کا اندیشہ ہوا'

''آپ حضرات اجازت دیں تو میں آگے جا کر کھانے پینے کا بندوبست کروں۔'' ان میں سے ایک نے تجویز پیش کی۔بھوک سے سب کا برا حال تھا ان کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔اس طرح اجازت کا طلب گار فقیران سے جدا ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد پیچھے رہ جانے والوں کو ایک ایسا درخت نظر آیا جس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی تھیں پھل ایسا خوش رنگ اور جاذب نظر تھا کہ سب کے دل باغ باغ ہو گئے۔حیرت انگیز بات یہ تھی کہ شجر ثمر بار کے نزدیک ہی ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔تینوں فقراء نے خوب سیر ہو کر پھل کھائے اور ٹھنڈے پانی سے تشنگی دور کی۔آتش شکم ٹھنڈی ہوئی تو ان کو بچھڑے ہوئے ساتھی کی یاد آئی۔

''اس کے لئے بھی تھوڑا پھل رکھ لینا چاہئے'' ایک نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ویسے بھی یہ پھل اس زمین کا دکھائی نہیں دیتا' جنت کا میوہ معلوم ہوتا ہے۔ہمارا ساتھی اس نعمت سے

Marfat.com

کیوں محروم رہے؟''

تھوڑی دیر چلے تو چوتھے درویش سے ملاقات ہوگئی۔انہوں نے وہ پھل پیش کیے مگر درویش نے مناسب الفاظ میں پھل کھانے سے معذوری کا اظہار کیا۔

''یا حضرت! کیا وہ فقیر بھوک سے بے تاب نہیں تھا؟'' حاجی محمد عیانی نے پوچھا۔

''وہ شجر ثمر بار'وہ چشمہ' خود فقیر ہی تو تھا۔بالا پیرؒ نے دھیمے لہجے میں کہا پھر جیسے بیتے دنوں کی یاد میں کھو گئے۔بقول حاجی محمد عیانیؒ وہ فقیر دراصل خود میاں میرؒ ہی تھے۔

سیوستان اور بھکر کے بلوچوں میں ایک رسم تھی کہ جب تک کسی خاندان کے پاس زرو مال کے علاوہ مال مویشیوں کا غلہ نہ ہوتا کوئی ان سے لڑکی کا رشتہ طلب نہ کرتا۔ایک علاقے کا سردار سفر آخرت کر گیا تو پس ماندگان مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔بیوہ کا سامان دنیا صرف ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب لڑکی تھی مگر مفلسی نے گھر میں قدم رکھا تو عزیز و اقارب دور ہو گئے۔سردار کی زندگی میں درجنوں اس رشتے کے خواستگار تھے مگر اب کوئی پرسان حال نہ تھا۔اسی بستی میں ایک فقیر مقیم تھا۔جانے کہاں سے آیا تھا اور کہاں اسے جانا تھا۔بس روزانہ اس مفلس و قلاش گھرانے کی گویا خبر لینے آجاتا۔لڑکی کو ایک نظر دیکھتا اور کچھ کہے سنے بغیر چل دیتا۔

''اماں! اگر مناسب سمجھو تو اس درویش سے معاونت کی درخواست کی جائے'' ایک روز لڑکی نے اپنی دل گیر ماں سے کہا۔

''بیٹی جو خود فقیر ہے وہ کسی کو کیا عطا کر سکتا ہے؟ البتہ اس سے مفلسی طلب کی جا سکتی ہے۔اس کی ہمارے پاس پہلے ہی کمی نہیں'' ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

''مگر میں نے اس درویش کو کسی کے آگے جھولی پھیلاتے نہیں دیکھا۔جن شفقت بھری نظروں سے وہ مجھے دیکھتا ہے...... تو بس ابو کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔'' دوشیزہ نے اپنے نقطہ و نظر کی وضاحت کی۔دوسرے روز جب فقیر آیا تو اس مفلس بیوہ نے اپنی دکھ بھری داستان درویش کے گوش گزار کی۔

''تم لوگوں کو کسی قسم کی مدد درکار ہے'' درویش نے داستان الم سننے کے بعد پوچھا۔

''بس رسم و رواج کے مطابق بچی کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔مجھے لالچ تو ہے نہیں 'عزت و آبرو سے اس فرض کی ادائیگی چاہتی ہوں۔''

''تو چلو میرے ساتھ'رب العزت بہتر صورت حال پیدا کرے گا۔''

Marfat.com

درویش نے اس بیوہ کو لے کر ایک اجنبی بستی میں آیا اور ایک تاجر کی دکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''جس شے کی ضرورت ہو اس سے طلب کر لینا مگر دیکھو' بغیر ضرورت کے کوئی چیز حاصل نہ کرنا' یہ ذخیرہ اندوزی' ایمان ناقص کو ظاہر کرتی ہے۔''

بیوہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے' فقیر اپنی راہ ہولیا۔ بیوہ نے تاجر کی دکان دیکھی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسی ایسی نادر الوجود اشیاء وہاں موجود تھیں جن کے نام تک وہ بھول چکی تھی۔ اسے اچھے دن یاد آ گئے جو قصہ پارینہ ہو چکے تھے۔ بیوہ نے ضرورت کا سامان حاصل کیا۔ مویشیوں کے لئے رقم بھی طلب کی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ تاجر نے اس کی مطلوبہ شے سن کر تھوڑی دیر سوچتا اور پھر خاموشی سے اس کی مطلوبہ شے فراہم کر دیتا...... گھر میں اشیاء کی فراوانی ہوئی تو عزیز واقربا کو بھی بھولے ہوئے روابط یاد آ گئے۔ عام خیال یہی تھا کہ مرحوم خاوند کا مدفون خزانہ بیوہ کے ہاتھ آ گیا ہے۔ دوشیزہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

ایک روز بیوہ کے دل میں خیال آیا۔ ''سال بھر کا اناج اور ضروریات کی دیگر اشیا کی ایک ہی دفعہ حاصل کر لینا چاہیئے کون روز روز چکر لگاتا پھرے۔'' تاجر سے ملاقات ہوئی تو اس نے مطلوبہ اشیاء فراہم کر دیں مگر زیر لب مسکرانے لگا۔ وقت گزرتا رہا۔ بیوہ ایک روز کسی غرض سے اسی دیکھی بھالی دکان پر پہنچی تو حیران رہ گئی...... بستی تو یقیناً وہی تھی مگر دکان کا کہیں نام و نشان نہ تھا بے نیل ومرام واپس لوٹ آئی۔''

ایک روز اسی فقیر نے پھر دروازے پر آ کر دستک دی...... بیوہ نے ساری صورت حال اس کے گوش گزار کی تو درویش مسکرانے لگا۔ ''خاتون غلاظت پر مکھیاں بھنبھناتی ہی ہیں۔ تمہارے عزیز واقربا کا تمہاری طرف راغب ہو جانا سمجھ میں آنی والی بات ہے مگر تمہیں ذخیرہ اندوزی کا خیال کیوں کر آیا؟''

''مگر وہ نیک دل تاجر آخر کون تھا اور کہاں غائب ہو گیا؟'' بیوہ نے کف افسوس ملتے ہوئے پوچھا۔

''خاتون' وہ تاجر' وہ دکان اور سارا ساز و سامان تو تمہارے سامنے کھڑا ہے۔'' یہ کہہ کر درویش یکلخت آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ خوش نصیبی نے بیوہ کے در پر دستک دی مگر اس نے طلب کیا کیا؟ بے حقیقت پتھر؟

درج بالا واقعہ بھی حضرت میاں میرؒ نے محفل احباب واصحاب میں بیان فرمایا۔ حاجی

Marfat.com

محمد نبیائیؒ نے استفسار کیا۔

''پیرومرشد وہ درویش کون تھا؟''

''جو کوئی بھی تھا تمہیں اس سے کیا غرض؟ خبردار اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا'' شاہ میرؒ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ فقرا کے نیاز مند بھی کچھ کم نہیں ہوتے...... حاجی صاحب نے ایک روز شاہ میرؒ سے کہلوا کر دم لیا...... ''درویش یہی فقیر پر تقصیر تھا۔''

''مگر حضور! اس پردہ داری کی ضرورت کیا تھی؟'' نیاز مند نے پیش رفت جاری رکھی۔

''سنت صیرفی'' درویش نے نا قابل فہم سا فقرہ ادا کیا۔

''حضور! ناچیز کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ یہ 'صیرفی'' کون ذات شریف ہیں؟''

حاجی صاحب کے سوال پر حضرت میاں میرؒ نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان فرمایا۔ متن پیش خدمت ہے ''میرا بھائی ایک روز کافی عرصے بعد مجھے ملنے لاہور آ پہنچا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی مگر فکر بھی دامن گیر ہوئی۔ مہمان نوازی کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

میرے حجرے میں بیٹھو' میں تمہارے خورد و نوش کا اہتمام کرتا ہوں'' میں نے اپنے بھائی سے کہا اور خود باغ میں کشادہ جگہ پر آیا۔ طہارت کے بعد دو رکعت نماز ادا کی اور اپنا مقدمہ کائنات کی سب سے بڑی عدالت میں پیش کر دیا۔ رب العزت! گھر میں مہمان آیا ہے اور میں سامان دنیا سے بالکل تہی دامن ہوں۔ میں تیرے سہارے اسے کمرے میں بٹھا آیا ہوں کیوں کہ تیرے سوا کسی کے آگے دامن دراز کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ میں نے ابھی دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ ندائے غیب سنائی دی۔ دعا سے پہلے ہی تیری آرزو ہم نے پوری کر دی ہے۔

اس دوران میرا بھائی' قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا'' آپ کے باہر نکلتے ہی ایک شخص انواع و اقسام کے کھانے لے کر حجرے میں داخل ہوا' اب وہ آپ کا منتظر ہے' چلیے اس سے ملاقات کر لیجئے۔''

میں کمرے میں داخل ہوا تو ایک اجنبی خوب صورت نوجوان کو محو انتظار پایا۔ وہ سلام کے بعد بڑے دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ ''اللہ تعالیٰ نے اپنی کرم نوازی سے یہ طعام خاص اور کچھ نقدی بھیجی ہے اور فرمایا ہے کہ بعد ازیں جو خواہش ہو ہم سے طلب کر لینا' ہم قبول فرمائیں گے۔''

آپ اپنا تعارف تو کرا دیجئے کہ کون ہیں؟'' میں نے اجنبی سے کہا۔

''میں اللہ کا ایک بندہ ہوں جس کے ذمے ایسے ہی کام ہوتے ہیں'' یہ کہہ کر وہ خاموش

Marfat.com

ہوگیا۔ہم نے دلی رغبت سے کھانا کھایا کیوں کہ اس کی لذت ہی کسی اور قسم کی تھی۔اجنبی نے برتن سمیٹے اور سلام کر کے رخصت ہوگیا۔اجنبی کے بارے میں میرے دل میں تجسس پیدا ہوا آخر مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ 'صیر فی'' تھا۔''

بہجت الاسرار میں 'صیر فی'' کے متعلق غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی' کی زبانی مرقوم ہے کہ 'صیر فی'' ایک فرشتہ ہے جو اولیائے کرام کے قرض چکانے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مامور ہے۔

حضرت میاں میر جیوؒ تین چیزوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔کم سونا' کم بولنا اور کم کھانا۔

نور محمد خادم خاص نے شاہ میرؒ کے متعلق ایک حیران کن واقعہ بیان کیا'' عالم پیری میں آپ نے جنگلوں' بیابانوں میں جا کر محو راز و نیاز ہونا ترک کر دیا تھا۔بالا خانے ہی میں مصروف عبادت رہتے۔موسم گرما میں چھت پر تشریف لے جاتے۔ایک بار مجھے حکم ہوا' پانی کا کوزہ' پنکھا اور جوتے چھت پر رکھ آؤ اور جا کر سو جاؤ' اتفاق سے میں پانی کا کوزہ رکھنا بھول گیا۔نصف شب گزری تو مجھے غلطی کا احساس ہوا۔میں پانی کا کوزہ لے کر چھت پر جا پہنچا تو آپ وہاں موجود نہ تھے میں نے ہر ممکن جگہ تلاش کیا مگر حضرت مجھے کہیں دکھائی نہ دیئے۔یہ بڑی حیران کن بات تھی۔میری رات اسی پریشانی میں گزری۔الصباح حضرت نے مجھے آواز دی۔''نور محمد' پانی کا کوزہ لاؤ' میں مسواک اور وضو کا پانی لے کر حاضر ہوا۔بار بار دل کی بات زبان پر آئی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حرف مدعا کا آغاز کیسے کروں؟

''کہو کیا کہنا چاہتے ہو'' شاہ میرؒ نے میری مشکل آسان فرما دی۔''حضور آپ رات کو کہاں غائب ہو گئے تھے۔میں چراغ لے کر آپ کو تلاش کیا مگر......''

''عزیزم! میں تو ادھر ہی موجود تھا۔تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا۔''

''حضور! یہ خواب نہیں عالم بیداری کا قصہ ہے'' میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔بار بار اصرار کیا تو آپ نے مسکرا کر فرمایا۔

''اگر تم رازداری کا وعدہ کرو تو بتائے دیتا ہوں۔''

میں نے اخفائے راز کا وعدہ کیا تو آپ نے کہا'' کل شب میں ''غار حرا'' میں تھا۔جو سکون' طمانیت اور کشائش وہاں ایک پل میں میسر آجاتی ہے کسی دوسرے مقام پر چالیس برس کے

Marfat.com

ذکروفکر سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔"

ملا سنگین اوستائی درویش کا عاشق زار اور مرید تھا ایک طویل مدت خدمت فقیر میں قیام پذیر رہا۔ ایک روز اچانک میاں جیوؒ نے فرمایا" ملا وطن لوٹ جاؤ اور لواحقین کی خبر لو۔"

"حضور! اب اس در کو چھوڑ کر کون جائے' اب تو اسی آستانے سے سفر آخرت اختیار ہو گا" عاشق زار نے عرض کیا۔

"عزیزم' تمہارا اوستاق جانا اشد ضروری ہے بلکہ ابھی روانہ ہو جاؤ" درویش کے لہجے میں اضطراب سا تھا' دوسرے یہ مشورہ نہیں حکم تھا لہٰذا ملا سنگین فی الفور بدخشاں کی جانب روانہ ہو گئے۔ (اوستاق' بدخشان کا ایک قصبہ تھا) غروب آفتاب کے بعد ملا موصوف اپنی بستی میں پہنچے۔ ایک عرصے بعد آشنا در و دیوار اور دیکھے بھالے کوچہ و بازار نے استقبال کیا۔ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو بڑی رونق اور چہل پہل دکھائی دی۔ خلق خدا کا ہجوم' روشن شمعیں۔

"یاالٰہی' یہ ماجرا کیا ہے؟" ملا صاحب نے ایک شخص سے دریافت کیا۔

"اس حویلی میں ملا سنگین رہا کرتا تھا جو عرصہ آٹھ برس سے بلاد ہند کوچ کر گیا۔ پچھلے دنوں اس کی وفات کی تصدیق ہو گئی۔ آج اس کی فاتحہ خوانی ہے اور......" یہ کہہ کر وہ شخص زیر لب مسکرانے لگا۔

"اور کیا بھائی' بات تو مکمل کرو" ملا سنگین اپنی وفات کی خبر سن کر ورطہ حیرت میں ڈوب گئے۔

"اور یہ کہ آج ہی اس کی بیوہ شادی کر رہی ہے" اس شخص نے گویا دھماکہ کیا۔

"شادی؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" مرشد کا اضطراب ملا کی سمجھ میں آ گیا۔

"ممکن کیوں نہیں' بیوہ کی شادی میں کیا قباحت ہے؟"

ملا سنگین اورستانی نے فوراً اپنا آپ ظاہر کر دیا اور انہونی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

چند برس اپنے وطن میں گزار کر ملا سنگین پھر لاہور اپنے مرشد کے قدموں میں آ گئے اور ساری روداد من و عن بیان کرنے کے بعد کہا" حضور! اگر میں ایک روز تاخیر سے پہنچتا تو یقیناً تباہ و برباد ہو جاتا۔"

حضرت شاہ میرؒ انسانوں ہی میں نہیں جنوں میں بھی یکساں مقبولیت کے حامل تھے۔ سلطان علی نامی ایک عقیدت مند کے بیٹے پر ایک جن کی نظر التفات تھی۔ ویسے تو لڑکا لکھنے پڑھنے

Marfat.com

سے معذور تھا مگر جن کی موجودگی میں فہم وفراست کی ایسی ایسی باتیں کرتا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ بسا اوقات مشہور و معروف کتب میں درج شدہ مضامین کی بڑے عالمانہ طریقے پر تشریح کر کے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیتا۔ ایک روز ان پڑھ لڑکے نے مثنوی مولانا روم پڑھنی شروع کی اور اتنی گہری وضاحت کی کہ سامعین عش عش کر اٹھے۔ اگر چہ وہ جن لڑکے کو گزند نہیں پہنچاتا تھا پھر بھی ناری اور خاکی مخلوق کا رشتہ کوئی مناسب بات نہ تھی۔ علاوہ ازیں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی کہ ناری مخلوق کا رویہ ہمیشہ سودمند رہے گا۔ سلطان علی بچے کو ''سیانوں'' کے پاس لے جا لے جا کر عاجز آ گیا آخر تھک ہار کر وہ آستانہ فقیر پر آیا اور بپتا بیان کرنے کے بعد نظر کرم کا طلب گار ہوا۔ حضرت چند پل مراقبے میں گئے اور زیر لب مسکرانے لگے ''عجیب پڑھا لکھا مسخرہ جن ہے' بہر حال ناجائز شے کا مطالبہ نہیں کر رہا۔ آپ لوگ دو چپڑی ہوئی روٹیاں کسی بھوکے شخص کو کھلا دیں۔''

سلطان علی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا ''صرف دو روٹیاں؟ یہ بھی کوئی علاج ہے؟'' اس نے اس علاج کی طرف توجہ ہی نہ دی اور لڑکا بدستور جن کے زیر تسلط رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی صحت گرنے لگی اب تو سلطان علی بڑا فکر مند ہوا۔ وہ پھر میاں جیو سے نظر کرم کا متمنی ہوا۔ آپ نے داستان الم سن کر فرمایا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟ اس نالائق جن کا مطالبہ پورا ہو گیا تھا تو پھر وہ گیا کیوں نہیں؟''

''حضور! یہی تو غلطی سرزد ہوئی ہم نے روٹیوں والا مطالبہ پورا ہی نہیں کیا' اب کئے دیتے ہیں۔''

''جناب! میں چاہتا تو ان بے خبروں کو تباہ و برباد کر دیتا۔'' اچانک لڑکے نے گرجنے لگا ''آپ کے مقام و مرتبے کا پاس کرتے ہوئے میں نے صرف دو روٹیوں کا سوال کیا تھا۔ یہ دو روٹیاں کسی کو کھلا دیتے' میں اسی روز رخصت ہو جاتا۔''

''ٹھیک ہے عزیزم! اب تشریف لے جاؤ' تمہاری فرمائش پوری کر دی جائے گی۔'' حسب ارشاد بھوکے کو کھانا کھلایا اور لڑکے کو نجات مل گئی۔

ایک شخص کے گھر اس کی کنیز امانت میں رکھی ہوئی قیمتی اشیاء چرا کر لے گئی۔ وہ بھاگم بھاگ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ''حضور! میں تباہ و برباد ہو گیا' میں لٹ گیا'' وہ واویلا مچانے لگا۔

Marfat.com

آپ نے اسکی آہ وفغاں کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ یہ خلاف معمول بات تھی۔ تھوڑی دیر تو وہ شخص خاموش رہا پھر از سرِ نو شور مچانے لگا "جناب! میری درخواست پر غور تو فرمائیں" لیکن آپ نے پھر کوئی توجہ نہ دی، حاضرین مجلس نے بھی اس بات کو محسوس کیا۔ تیسری بار وہ شخص لب کشا ہونے لگا تو آپ نے اس کے بولنے سے پہلے ہی فرما دیا "تمہاری کنیز گھر پہنچ چکی ہے جتنی محبت تم لوگ دنیاوی ساز و سامان سے کرتے ہو، کاش اس کا عشرِ عشیر ہی آخرت کے لیے بچا رکھتے۔ زر و مال کی جدائی ایک پل کے لئے برداشت نہیں کر سکتے" گھر پہنچ کر اس شخص نے کنیز سے احوال دریافت کیا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ "میں شیطان کے بہکاوے میں آ کر اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھی، شہر سے کافی دور جا چکی تھی کہ کسی نے مجھے بازو سے جکڑ لیا "لڑکی، آگ سے دامن بچاؤ ورنہ جل کر راکھ ہو جاؤ گی" یہ الفاظ میرے سینے میں تیر کی طرح ترازو ہو گئے۔ اس کے بعد میں اپنے آپ کو اس گھر کے سامنے پایا۔ میں بھاگ کر اندر داخل ہوئی اس پل سے سپرد اضطراب ہوں۔"

مالک کی سمجھ میں ساری بات آ گئی، اس نے کنیز کو تسلی دی اور اس کی غلطی کو نظر انداز کر دیا۔

مردانِ حق کے لئے زمین کی مسافت مختصر ہو جاتی ہے۔ موجودہ دور میں اس کی سائنسی توجیہہ موجود ہے، رفتار اگر نوری بہاؤ کے برابر ہو جائے تو علم حساب کی رو سے فاصلہ "صفر" وقت میں طے ہونا چاہیے۔ یہ نظریہ زمان و مکان یعنی

TIME AND SPACE QUANTAM THEORUM کہلاتا ہے اس کی گہرائی میں اترے بغیر صرف اس قدر عرض ہے کہ بزرگان دین اپنی حسب منشاء فاصلہ طے کر لیا کرتے تھے۔ بغیر سوچے سمجھے اس بات کو رد کر دینا پرلے درجے کی جہالت ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ حاجی علی سوی ایک زاہد شب زندہ دار قسم کا انسان حضرت میاں میرؒ کا شیدائی تھا۔ آپ بھی اس کی دلی کیفیت سے بخوبی واقف تھے۔ پیشے کے اعتبار سے تاجر تھا اور پانچ برس بعد لاہور سے وطن مالوف جاتا مگر دیوانہ وار مکروہات زمانہ سے جان چھڑا کر آستانہ درویش پر حاضر ہو جاتا۔ حاجی علی سوی کا قافلہ ایک بار اصفہان اور یزد کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ لوگ کھانے وغیرہ کا اہتمام کر رہے تھے کہ دور سے ایک گھڑ سوار لباس فاخرہ زیب تن کئے قافلے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ سوار قریب آیا تو حاجی صاحب نے اسے پہچان کر حیران رہ گئے وہ حضرت میاں میرؒ تھے

Marfat.com

''حضرت آپ؟'' حاجی علی بھاگ کر استقبال کو پہنچا۔

''عزیزم! تمہارا قافلہ نشیبی علاقے میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور یہ جگہ عنقریب طوفان کی زد میں آنے والی ہے تم لوگوں کے پاس وقت بہت کم ہے۔ قافلے والوں سے کہو کہ اونچی جگہ منتقل ہو جائیں۔'' حاجی موصوف شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے قافلے کی طرف پھر بالا پیرؒ کی طرف نگاہ کی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شور مچاتا بھاگتا ہوا قافلے کی طرف آیا اور ان کو نقل مکانی پہ اکسانے لگا۔ اکثر لوگ اپنے سامان وغیرہ کے ساتھ بلند مقامات کی طرف بھاگے' چند بدنصیب اسی جگہ ٹھہرے رہے اور تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ حیرت انگیز واقعہ حاجی علی نے میر محمد لاہوری کو خود سنایا۔

غوث الاعظمؒ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک بار سر عام فرمایا تھا ''تقدیر سے دست و گریباں ہونا شیوہ مردانگی ہے۔'' ایک شخص کا لخت جگر عالم نزع میں تھا۔ وہ پریشان حال گریباں چاک درویش کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ رنج والم کی مکمل تصویر تھا۔ آپ اس کی آہ زاری سے متاثر ہو کر مراقبے میں گئے اور فوراً واپس آ گئے۔ چہرے پر تفکیر کے آثار تھے۔ اس شخص نے آپ کا چہرہ پڑھا تو ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا آپ پھر مراقبے میں چلے گئے اور کافی دیر بعد واپس آ گئے۔

''فقیر پر تقصیر سے جو کچھ بن پڑا کر گزرے گا'' پھر مٹی کا پیالہ طلب فرمایا پانی سے بھر کر اس پر دعا پڑھی اور پریشان شخص سے کہا ''یہ جا کر لڑکے کو پلا دو اللہ خیر کرے گا۔''

لڑکے کو رب العزت نے صحت کاملہ عطا کی تو آپ بے اختیار پکار اٹھے ''قادر مطلق نے فقیر کی لاج رکھ لی'' لڑکا سات برس کا ہوا تو وہ شخص اپنے فرزند کو لے کر ایک بار پھر حاضر خدمت ہوا ''پیر و مرشد! یہ قوت گویائی سے محروم ہو چکا ہے۔''

''اسے حافظ قرآن بناؤ' تو بات بنے'' آپ نے تبسم فرمایا۔

''حضور! یہ بول تو سکتا ہی نہیں' حافظ قرآن کیسے بنے گا؟''

''برخوردار' ذرا ادھر تو آؤ'' آپ نے لڑکے کو قریب بٹھا لیا ''اب پڑھو'' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

لڑکے نے آپ کی اتباع میں فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔ اہل محفل حیران رہ گئے۔ (وہ جو مزاج فقیر سے آشنا نہیں تھے ورنہ اہل دل تو آئے دن ایسے واقعات کو دیکھتے ہی رہتے تھے)

اس لڑکے نے قرآن حفظ کیا تو اس کا باپ شاداں و فرحاں آپ کی خدمت میں حاضر

Marfat.com

ہوا۔ لڑکے کا تلفظ بس سننے والا تھا۔ حضرت میاں میرؒ کو دلی مسرت ہوئی اور آپ نے اپنا وہ رومال جس سے وضو کے بعد چہرہ خشک کیا کرتے تھے لڑکے کے سر پر باندھ دیا۔ ''یہ تو دستارِ فضیلت ہوگئی'' لڑکے کا باپ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

''جب بھی طبیعت ناساز ہو یہ رومال اس کے سر پر اسی طرح باندھ دینا'' شاہ میرؒ نے ہدایت فرمائی۔

طاعون کے آثار نمودار ہوں تو لوگ پیشگی فاتحہ خوانی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سید محمد جعفرؒ کی عمر پانچ برس کی تھی جب لاہور اس وبا کی زد میں آیا۔ سید جعفرؒ بھی اس وبا کا شکار ہوئے اور کان کے نیچے گلٹی نمودار ہوئی۔ موصوف والد بزرگوار شاہ میرؒ کے ارادت مندوں میں سے تھے وہ اپنے لختِ جگر کو لے کر درِ فقیر پر حاضر ہوئے۔

''ابراہیم! فکر کی چنداں ضرورت نہیں'' شاہ میرؒ نے تسلی دی ''تمہارا فرزند روشن جبیں ہے' خلقِ خدا نے اس سے فیض یاب ہونا ہے' پھر بسم اللہ پڑھ کر گلٹی پر ہاتھ رکھا' کان کی نچلی جگہ ہموار ہوگئی۔ فصیلِ جاں سے طاعون کے جراثیم نکل گئے۔

کنوئیں کا کھاری پانی میٹھا ہو جانا ناقابلِ فہم سی بات ہے۔ میر حسین خوائیؒ نے اپنی حویلی میں کنواں کھدوایا مگر بدقسمتی سے پانی کھارا نکلا۔ ساری محنت رائیگاں گئی۔ وہ کچھ سوچ کر حضرت میاں میرؒ کے پاس آیا اور اپنی محنت کے برباد ہو جانے کا رونا رونے لگا۔ آپ نے ایک کوزے میں پانی بھرا اور اس میں اپنی انگشتِ شہادت ڈبو دی ''عزیزم! یہ کوزہ اس کنوئیں میں انڈیل دینا۔ ربّ العزت کرم نوازی فرمائے گا وہ کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا۔''

اس کنوئیں کا پانی ایسا ٹھنڈا میٹھا تھا کہ خلقِ خدا' دور دور سے پیاس بجھانے آتی۔

مغل شہنشاہ شاہجہاں جب پہلی بار آستانہ درویش پر حاضری کے لئے محل سے نکلا تو شہزادہ دارا شکوہ سے مخاطب ہوا۔ آج اگر شاہ میرؒ ہمیں انگور کھلائیں تو ان کی بزرگی پر میں ایمان لے آؤں گا۔'' (وہ موسم انگوروں کا نہیں تھا)

''ابا حضور! وہ واقعی خدا کی برگزیدہ ہستی ہیں'' دارا شکوہ نے کہا۔

جب شہنشاہِ وقت حجرے میں داخل ہوا تو سامنے تازہ انگوروں سے بھرا ہوا خوان پڑا تھا۔ ''فقیر کیا اور فقیر کی بساط کیا۔'' شاہ میرؒ نے مسکرا کر کہا ''مہمانوں کی خاطر سنتِ رسول ﷺ ہے اور اگر مہمانوں کی خواہش کا احترام کیا جائے تو بڑی خوش نصیبی والی بات ہے' شوق فرمایئے

Marfat.com

انگور حاضر ہیں۔''

بادشاہ وقت نے چونک کر شہزادے کی طرف دیکھا اور بسم اللہ پڑھ کر انگور کھانے لگا۔
کرامات میرؒ بے شمار ہیں' ہم نے چند ایک کا انتخاب قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا
۔(مشتے از خروارے کے طور پر)

قاضی سائیں دتہ کے گھرانے سے حضرت میاں میرؒ کے نقش قدم پر چل کر مقامات ولائت پر فائز ہونے والی دوسری ہستی ان کی ہمشیرہ بی بی جمال خاتون ہیں۔آپ کے دوسرے بھائی' قاضی بولن' قاضی عثمان' قاضی طاہر اور ہمشیرہ بی بی بادی یہ تمام ہستیاں زہد و تقویٰ میں بے مثال تھیں مگر مقام ولایت چیزے دیگر است۔ابتدا میں ''طریقہ شغل'' کی تعلیم موصوفہ نے اپنی دادی سے حاصل کی مگر اصل بات اس وقت بنی جب حضرت میاں میرؒ متوجہ ہوئے۔دس برس تک موصوفہ کی ازدواجی زندگی کا ثبوت ملتا ہے جس میں آخری چار برس شوق الٰہی غالب رہا۔خاوند کی وفات کے بعد ترک و تجرید کی زندگی اپنائی اور بحر معرفت میں غواصی کی مثال قائم کر دی۔استغراق کا یہ عالم کہ خود حضرت میاں میرؒ فخر و انبساط سے اپنی ہمشیرہ کا ذکر کرتے' کشف و کرامات کا بکثرت اظہار ہوا۔لیکن اس سلسلے میں بھی جمال خاتونؒ نے اپنے بلند مرتبت برادر کی اتباع کی یعنی اظہار کرامات میں ہر ممکن گریز۔آپ کی کرامات زیادہ تر اضطراری نوعیت کی ہیں۔مثلاً ایک بار گھر میں مچھلی لائی گئی آپ پر حالت استغراق طاری تھی ''کیفیت'' سے مکمل طور پر باہر تشریف آوری نہیں ہوئی تھی کہ اتفاقاً مچھلی پر نظر پڑ گئی جو مہر پر تنویر کی طرح چمکنے لگی۔بعد ازاں آپ نے خود فیصلہ دے دیا کہ ''یہ مچھلی متبرک ہوگئی ہے'' ایک طویل عرصے تک وہ مچھلی قاضی گھرانے میں موجود رہی اور خلق خدا اس عجیب و غریب مچھلی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔فیوض و برکات کا نزول بھی خوب ہوا۔حضرت میاں میرؒ نے اپنے وصال سے کچھ عرصہ پیشتر روحانی وسیلے سے اپنی زاہدہ عابدہ ہمشیرہ کو مطلع فرما دیا تھا کہ ''فلاں دن اور فلاں وقت سفر مراجعت اختیار کروں گا مگر تم مجھے اپنے آس پاس موجود جان کر ذکر و فکر میں مشغول رہنا۔''

حاکم ٹھٹھہ کے ہاں پے در پے لڑکیوں کی پیدائش ہوئی تو وہ اولاد نرینہ کو ترسنے لگا۔وہ بی بی جمال خاتون کی خدمت میں حاضر ہوا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔سگ دنیا ہڈی کا طلب گار تھا مگر ''مانگنے'' کے طریقے سلیقے سے واقف تھا۔

''بولتا کیوں نہیں' یہ بت کی طرح کیوں کھڑا ہے؟'' بی بی جمال خاتون نے ڈانٹ کر

Marfat.com

پوچھا۔

"ہر بار گھر میں "شمع" روشن ہو جاتی ہے اب "چراغ" کا طلب گار ہوں" حاکم نے کاسہ گدائی سامنے کر دی "جب تک اولاد نرینہ کی نوید نہیں ملے گی خدمت میں اسی طرح کھڑا رہوں گا۔"

"دھمکیاں دے رہا ہے؟" جمال خاتون نے قہر آلود نظروں سے دیکھ کر فرمایا۔

"استغفر اللہ! ناگوار خاطر الفاظ زبان پر لانے سے پیشتر، زیر زمین سونے کی ترجیح دوں گا۔ میں نے سمندر سے صرف ایک قطرے کی تمنا کی ہے" حاکم وقت بدستور سر جھکائے کھڑا رہا۔ جمال خاتون نے سوئے آسمان دیکھا۔ نگاہوں میں کرم نوازی کے آثار پیدا ہوئے تو حاکم وقت کی جان میں جان آئی۔

"جاؤ جا کر پانچ صد غربا و مساکین کے کھانے کا بندوبست کرو اور دیکھو بخل سے کام نہ لینا" دربار ولایت سے حکم ہوا۔

"حکم ہو تو بندہ پندرہ صد کا اہتمام کر دوں؟" حاکم وقت بات کی تہ تک پہنچ گیا۔

"چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ' اب تم جا سکتے ہو۔"

زمانہ گواہ ہے کہ حاکم ٹھٹھہ کے ہاں اوپر تلے پانچ لڑکے پیدا ہوئے۔ پیاسے کو سمندر سے ایک نہیں پانچ قطرے مل گئے۔ بی بی جیوؒ نے جلال خاموشؒ سے بھی فیض باطن حاصل کیا۔ ۲۷ ربیع الاول بروز منگل ۱۰۵۷ء اس زاہدہ عابدہ نے سفر آخرت اختیار کیا۔

احباب واصحاب ہوں' مریدان باصفا یا خلفا اگر کسی ہستی کو حضرت میاں میرؒ کے قریب ترین قرار دیا جائے تو وہ نتھے شاہؒ دیوان قادری کی ذات بابرکات ہے۔ میاں جیوؒان کو میاں نتھا کہہ کر پکارتے تھے اور قریبی احباب بابا نتھا۔ مرید و مرشد کے روابط سمجھنے کے لیے چشم تصور میں امیر خسروؒ کو لائیے۔ جو رشتہ امیر خسرو کا شیخ نظام الدین اولیاء سے تھا وہی نتھے شاہ کا حضرت میاں میرؒ سے تھا یعنی

سورج تھا وہ تو میں بھی عطارد نصیب تھا
اس کے نظام شمسی میں سب سے قریب تھا

والی بات تھی۔ ایک معمولی سا فرق البتہ ضرور رہا کہ شیخ نظام الدینؒ امیر خسرو سے پہلے رحلت فرما گئے اور مرید و عاشق زار کو سپرد اضطراب کر گئے۔ دل کی ویرانیوں اور فصیل جاں میں اضطراب کی اٹھنے والی لہروں کو امیر خسرو نے صرف ایک شعر میں بند کر دیا جو زبان زد خاص و عام ہوا۔

Marfat.com

گوری سوئے سیج میں مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

اور اسی آتش فراق سے جل کر خسرو راکھ ہو گئے۔ادھر نتھے شاہ نے ملک عدم سدھار نے میں پہل کی اور میاں میرؒ کو بصد حسرت ویاس کہنا پڑا ''ہائے میرا نتھا'' گھر کا فقر بھی ساتھ ہی لے گیا'' اور آنکھوں سے اشک رواں کی نہر جاری تھی۔

میاں موصوف کے اجداد سرہند کے رہنے والے تھے لیکن آپ کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔بچپن میں آستانہ میر پر حاضر ہوئے اور عمر بھر کا رشتہ استوار ہو گیا۔علوم ظاہری کے لئے کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا گویا امی تھے مگر علم لدنی یہاں تک حاصل کیا کہ لوح محفوظ کی تحریر تک پڑھ سکتے تھے۔نباتات و جمادات بھی آپ سے ہم کلام ہوتے۔حضرت میاں میرؒ کے بعد ملا محمد سیال کوٹی کی ہم جلیسی پسند آئی۔

تعلیم و تربیت کے بعد حضرت میاں میرؒ اپنے مریدوں کو خود سے جدا کر دیا کرتے تھے مگر نتھے شاہؒ کو اپنے سے جدا کرنا گوارا نہ تھا۔شب و روز کی ہم جلیسی کا یہ اثر ہوا کہ میاں موصوف استغراق کی بلندیوں کو چھونے لگے۔سکران کی یہ کیفیت کہ بعض اوقات ظاہری واجبات ترک ہو جاتے۔جنگلوں ویرانوں یا کسی قبر کے سرہانے جا بیٹھتے اور محو راز و نیاز ہو جاتے۔ایک بار مسلسل تین روز اسی استغراق میں ایک قبرستان کی شکستہ دیوار پر بیٹھے تھے۔میاں جیوؒ مراقبے میں گئے اور صورت حال سے آگاہی کے بعد ایک درویش سے کہا۔''نتھا'' فلاں قبرستان کی دیوار پر مسلسل تین روز سے بغیر کچھ کھائے پیئے بیٹھا ہے۔وہ اس وقت ''عالم حیرت'' میں ہے جاؤ اسے بلا لاؤ۔''

تاریخ تصوف میں یہ پہلی مثال ہے کہ مرید باصفا کے کارہائے نمایاں مرشد کی زبانی زینت کتب بنے ہوں۔میاں جیوؒ نے اپنے طلب گار کا قصہ یوں بیان کیا ''جونپور سے ایک درویش میاں نتھا سے ملاقات کا اشتیاق لے کر آیا۔''

''تو کون ہے اور حاضری کا سبب؟'' میاں نتھا نے پوچھا۔

''میاں جونپور سے کالے کوسوں کی مسافت طے کر کے' آپ کی زیارت کرنے حاضر ہوا ہوں۔''

''اچھا! اب زیارت کر لی' جاؤ اور میری مسافت کھوٹی نہ کرو۔''

''میں تو جناب کے ''احوال'' دیکھنے کا تمنائی ہوں۔'' جونپوری درویش نے کہا۔

Marfat.com

''احوال یا تماشا دیکھنے آیا ہے۔''

''سن میرے بھائی' تیری چشم تماشا چندھیائی جائے گی اور بصیرت و بصارت ساتھ نہ دے سکیں گی۔ اس لئے کہ رب العزت نے عالم جبروت' لاہوت اور عالم ملکوت کی چابیاں اپنے اس عاجز بندے کو عطا کر رکھی ہیں۔ میں اپنی حسب منشا ہر عالم کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہو سکتا ہوں اگر قوت برداشت رکھتے ہو تو بسم اللہ...... آؤ میرے ساتھ۔''

''حضرت! یہ تاب' یہ مجال' مجھ میں کہا؟'' جونپوری مہمان کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

''اچھا اب زیارت ہو گئی' احوال دیکھ سن لیا' برائے کرم تشریف لے جائیں'' یہ کہا اور میاں نتھا استغراق میں چلے گئے۔

حضرت میاں میرؒ نے اپنے مرید خاص کی تربیت جس انداز سے فرمائی تھی اس پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ ''بلند پروازی'' ناقابل فہم نہیں رہتی۔ سرمحفل ایک بار میاں نتھا نے مرشد سے پوچھا ''ہماری تمام دعائیں مقام قبولیت پر فائز کیوں نہیں ہوتیں؟ جب کہ رب العزت نے خود فرمایا ہے ''ادعونی استجبلکم'' (تم دعا کرو' میں قبول کروں گا)۔

''مانگنے کا طریقہ سلیقہ اور کچھ شرائط ہوتی ہیں'' حضرت میاں میرؒ نے فرمایا ''الفاظ کے وزن اور اثر سے انکار کی گنجائش نہیں۔ کفر تک جیسی بیماری کا علاج کلمہ طیبہ سے ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب بھکاری طلب کرتا ہے تو الفاظ مناسب ہونے چاہئیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ دعا کا ہر لفظ صدق دل سے نکلے۔ دوسری جس زبان سے وہ لفظ ادا ہو' وہ لقمہ حرام سے ناآشنا ہونی چاہیے۔ حضور قلب سے مانگی ہوئی دعا جب لقمہ حرام سے ناآشنا زبان تک آتی ہے تو شرف قبولیت ضرور حاصل کرتی ہے۔ حضور قلب سے مراد یہ ہے کہ دعا مانگتے وقت' بھکاری کے دل میں ماسوا کا تصور نہیں ہونا چاہیے۔

تربیت کے آغاز میں یہ بات حضرت میاں میرؒ نے میاں نتھا کے ذہن میں اچھی طرح نقش کر دی کہ جن ہستیوں کے لئے مقام ملکوت کے دروازے وا ہونا ہوتے ہیں' ان کو رب العزت جبیں شناسی کا ملکہ عطا کرتا ہے۔ یہ گویا حرف آغاز ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ لوگوں کی جبینیں پڑھ سکتے ہیں کہ کون خوش بخت اور کون بد بخت ہے۔ ظاہر ہے کہ خوش بختوں کی مجلس کا انتخاب آسان ہو جاتا ہے۔ اصل کہانی کا آغاز اس کے بعد ہوتا ہے۔ پھر عالم ملکوت کے مسافر سے...... غیر مرئی مخلوق کے علاوہ نباتات و جمادات ہم کلام ہوتے ہیں اور اسے مختلف ''ترغیبات''

Marfat.com

میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ان ترغیبات میں آ جانے والے کی منزل آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے''

اس بات کا عملی ثبوت میاں نتھا کو اپنی زندگی میں ہی مل گیا۔ایک ''جن'' جو غوث الاعظم کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا نتھے شاہ سے ہم کلام ہوا''میرے پاس اتنا بڑا خزانہ ہے جو روئے زمین پر کسی کے پاس نہ ہوگا۔اس میں سے جس قدر درکار ہو لے لو۔''

''یہ خزانہ میرے کس کام کا؟''نتھے شاہ نے منہ توڑ جواب دیا''حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق یہ بس دم آخر تک ساتھ دے گا اور دائمی زندگی کا آغاز تو اس دم آخر کے بعد سے ہوگا۔کوئی ایسی شے ہو جو اس زندگی میں میرے کام آ سکے تو پیش کرو میں بصد شکریہ قبول کروں گا۔''

پھر ایک باغ میں میاں موصوف ریاضت و عبادت کے لئے پہنچے تو ایک درخت سے آواز آئی''ذرا قریب آؤ......ایک سودمند بات سنتے جاؤ۔''

''اس ''جن'' کی بات نظر انداز کر کے تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا' مجھے حاصل کرو' میری ایک شاخ قلعی میں ڈالو گے تو وہ چاندی بن جائے گی' ذرا سوچو کتنی فائدے والی بات ہے؟''

''اور روز محشر اس چاندی کا حساب کون دے گا؟''میاں نتھا نے اس کی پیشکش رد کر دی۔قریب ہی ایک اور شجر سایہ دار کھڑا تھا' اس نے پکارا اور کہا''مجھے پگھلے ہوئے تانبے میں ملاؤ گے تو وہ خالص سونا بن جائے گا۔''

میاں نتھے شاہ کو مرشد کی باتیں یاد آ گئیں اور وہ ان ترغیبات سے دامن بچا کر نکل گئے......ایک روز ایک گنبد بھی آپ سے ہم کلام ہوا''باہر مت جانا طوفان میں گھر جاؤ گے۔''پھر ایک ایسا وقت آیا کہ میاں نتھا سے کرامات کا ظہور ہونے لگا مگر مرشد کے حسب ارشاد ان کے اظہار میں احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے۔

ملا محمد سیالکوٹی میاں نتھے شاہ اور چند دوسرے احباب ''محفل میر'' میں تشریف فرما تھے۔یہ مجلس حجرے سے باہر سایہ دیوار تلے منعقد تھی۔اچانک آسمان پر گھٹائیں چھا گئیں۔طوفان باد باراں کا آغاز ہوا تو دل جمعی میں فرق سا آ گیا۔

''اجازت ہو تو طوفان کو یہاں سے غائب کر دوں' مطلع صاف ہو جائے گا اور ہمیں اندر نہیں جانا پڑے گا''' میاں نتھے شاہ نے مرشد سے کہا۔خیال یہی تھا کہ مرشد اور احباب کو زحمت

Marfat.com

نہ اٹھانی پڑے۔

''اوئے تیلی کی اولاد! نوبت بہ ایں جا رسید کہ اب تو کرامتیں دکھانے لگا ہے۔ خود نمائی کے بعد خود فروشی کا خیال ہے؟'' میاں میرؒ جو اپنے یار غار کے ناز اٹھانے میں مشہور تھے سخت الفاظ میں سرزنش کرنے لگے۔ واضح ہو میاں نتھے شاہ اس دور میں بلند مرتبت درویش تھے اور یہ سرزنش سرعام ہوئی تھی پھر میاں میرؒ کو خود ہی دل شکنی کا احساس ہوا اور الفاظ میں نرمی آ گئی۔

''عزیزم! اگر ہم اٹھ کر حجرے میں چلے جائیں تو ہرج ہی کیا ہے؟ اس کارخانہ قدرت کا چلانے والا' قادر مطلق ہے' محمود کا ہر فعل ''محمود'' ہی ہوتا ہے۔ ہم اسے ناپسند کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ قضائے الٰہی پر راضی برضا رہنا ہی عقل مندی ہے اور اسی میں عافیت ہے ......خبردار! مداخلت بے جا کا ارتکاب مت کرنا۔''

بات حاضرین کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ اظہار کرامات میں احتیاط کی بہترین مثال تھی ۔جہانگیر کا عہد حکومت تھا۔ ۱۰۲۷ھ بمطابق ۱۶۱۸ء ان دنوں لاہور کا صوبیدار نواب قاسم خان تھا ۔میاں نتھا کی طبیعت قدرے علیل تھی۔ حجرے کے اندر حالت استغراق میں تھے اچانک میاں میرؒ نے ایک درویش سے فرمایا ''ذرا اندر جا کر دیکھو میاں نتھا موجود ہے؟''

''حضور! وہ اندر موجود ہیں میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔''

''اس بار ذرا غور سے دیکھو۔''

درویش اندر پہنچا' ٹٹول کر دیکھا تو میاں نتھے شاہ جسد خاکی میں تو موجود تھا مگر اندر کا چہچہانے والا پنچھی پرواز کر چکا تھا اور پنجرہ خالی رہ گیا تھا۔ دوران تدفین میاں جیوؒ آبدیدہ تھے۔ یہی میاں نتھے شاہ ہیں جن کی قربت میں حضرت میاں میرؒ نے اپنی آرام گاہ کی وصیت کی تھی۔

حیات میاں میرؒ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ روشن پہلو جو کھل کر سامنے آتے ہیں' ان کا متن پیش خدمت ہے۔

خشیت الٰہی ہر خیال پر مقدم تھی۔ کم از کم ستر بار دعائے مغفرت کرتے' ذکر و فکر کے لئے جنگلوں' بیابانوں اور باغوں کا انتخاب کرتے۔ عبادت اوڑھنا بچھونا رہی۔

عشق رسول اللہ ﷺ میں ایسے غوطہ زن ہوئے کہ تا عمر ابھرنے کا خیال تک نہ آیا۔ اتباع سنت کی سختی سے پابندی اسی عشق کا نتیجہ تھی۔ نماز باجماعت کی ادائیگی' تہجد کا اہتمام اور روزوں کا بطور خاص اہتمام زندگی کا اصول رہا۔

Marfat.com

غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایسے عاشق زار کہ بغیر وضوان کا نام زبان پر نہیں لاتے تھے۔

نذرانہ قبول کرنے سے اجتناب فرماتے' اس میں مقام ومرتبے کی کوئی قید نہ تھی۔ رزق حلال' کم خوری' کم خوابی' اور کم گوئی کو ہر پل ملحوظ خاطر رکھتے۔ خلق عظیم کے مالک تھے' خرقہ گودڑی پہننے سے گریز کرتے اور ترک وتجرید پسندیدہ تھے۔ قناعت کا یہ عالم کہ سنگ وخشت اور زر وجواہر کی حیثیت نگہ درویش میں ایک جیسی تھی۔

لباس میں سادگی مگر پاکیزگی کا خاص خیال رکھتے۔ تکیہ کلام تھا ''صوفی وہ ہے جو ہو بھی' تو نہ ہو۔''

خلفائے میاں میرؒ کا فرداً فرداً ذکر تو واقعی امر محال ہے (اور ان میں سے چند ایک کا انتخاب دشوارتر) میاں نتھے شاہ کے علاوہ ہم صرف ایک خلیفہ میاں میرؒ کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں تا کہ قارئین کرام اندازہ کرسکیں کہ یہ کنج تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والے بوریا نشین علم وآ گہی کے کس مقام پر فائز تھے

ملا خواجہ بہاری کا شمار میاں میرؒ کے جلیل قدر خلفاء' میں ہوتا ہے۔ حاجی پورہ پٹنہ صوبہ بہار کے باشندے تھے۔ علوم ظاہر کی تکمیل ہوئی تو تشنگی مزید بڑھ گئی۔ پٹنہ ہی کے چھوٹے سے قصبے گودھ پور میں شیخ جلال الدین اولیاء کی درس گاہ' علم آ گہی کا مینار نور تھی۔ خواجہ صاحب نے اسی درس گاہ میں شرکت فرمائی مگر شدت طلب میں کمی واقع نہ ہوئی۔ آفتاب میاں میرؒ طلوع ہو چکا تھا لہٰذا لاہور تشریف لے آئے اور پھر اسی در کے ہو رہے۔ مرشد سے دلی لگاؤ کا یہ عالم کہ جب وہ پانی یا لونگ وغیرہ چبا کر پھینک دیتے تو خواجہ بہاری اسے اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔ وصال مرشد کے بعد اپنے اس عمل کی تشریح کی ''اسی پھوک کی برکت سے میری یاداشت غضب کی ہوگئی۔ مثنوی مولانا روم' لمعات' سوانح' فصوص الحکم' احادیث اور قرآن پاک کی تفہیم آسان ہوئی' میری مہارت تامہ کا یہ عالم ہوگیا کہ بین السطور مفہوم بھی آشکار ہونے لگے''۔

کشف وکرامات کا ظہور خواجہ بہاری سے بکثرت ہونے لگا۔ غازی خاں کے ہاں عرس میں شریک تھے کہ مسئلہ توحید زیر بحث آ گیا۔ آپ خاموشی سے علمی موشگافیاں سنتے رہے۔ سردی جوبن پر تھی' صحن میں آگ کا الاؤ جل رہا تھا'' آپ حضرات توحید کے سلسلے میں قیل وقال سے گریز کریں'' خواجہ بہاری نے سرسری لہجے میں کہا۔

Marfat.com

''خواجہ صاحب! یہ علمی باتیں ہیں' آپ ٹھہرے درویش''۔ کسی نے طنز کا تیر چلایا۔

''محترم! علم ظاہری کی انتہا درویشی کا آغاز ہوتی ہے مگر میں بحث میں الجھنا مناسب خیال کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے'' یہ کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے الاؤ میں جا بیٹھے۔ وہ ''قال'' تھا یہ ''حال'' ہے'' سپرد الاؤ درویش نے مسکرا کر کہا۔ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔

لاہور میں آپ اپنے عقیدت مند ملا فاضل کے ہاں مقیم تھے۔ خاتون خانہ سامان خورد نوش لے کر درویش کے کمرے میں داخل ہوئی تو شور مچاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ''خواجہ صاحب کو کسی نے قتل کر دیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا'' یہی دو فقرے دہرائے جا رہی تھی۔ اتفاق سے خاتون خانہ کے شوہر نامدار تشریف لے آئے۔

''خدا کی بندی' ہوش میں آؤ' کیا کہہ رہی ہو؟'' ملا فاضل نے خاموشی ہو جانے کی تلقین کی۔ اندر خواجہ صاحب کے ٹکڑے پڑے ہیں۔ سر الگ' دھڑ الگ' ایک بازو ادھر ایک بازو ادھر۔'' ملا فاضل واقف ''حال'' تھے۔ وہ اندر داخل ہوئے تو خواجہ بہاری مراقبے میں بیٹھے تھے۔ ''اب جا کر' دیکھ' خواجہ صاحب کس حال میں ہیں؟'' ملا فاضل نے پریشان حال بیوی سے کہا ''ان معاملات'' کو صبر و تحمل سے دیکھنا چاہیے۔''

۱۰۵۱ھ بمطابق ۱۶۴۲ء شہنشاہ ایران' میرزا صفی نے قندھار پر حملہ کر دیا۔ شہزادہ دارا شکوہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ''حضرت میاں میرؒ کے آپ جانشین ہیں لہٰذا آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔ قندھار پر والی' ایران نے حملہ کر دیا ہے۔''

''شہزادے! حد ادب' ان خرافات کے لئے غلامان میرؒ ہی کافی ہیں اور اس میرزا ایرانی کی کیا مجال کہ قندھار کا رخ کرے وہ اپنی خیر منائے''۔

چند روز بعد خبر آئی کہ قندھار پر حملہ کرنے والا زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔

ملا خواجہ بہاری نے جب لاہور میں تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا تو چنیوٹ سے ایک طالب علم نواب سعد اللہ خان بھی اس درسگاہ میں شریک ہوا۔ خواجہ موصوف جانے کس حال میں بیٹھے تھے۔ طالب علم کو دیکھتے ہی فرمایا ''آیئے نواب سعد اللہ خان وزیر اعظم صاحب۔'' گویا درویش نے سعد اللہ کو وزارت عظمیٰ کا قلمدان سونپ دیا۔ (اصل میں شاہ برہان بخاریؒ نے سعد اللہ کو خواجہ صاحب کا دامن تھام لینے کی تلقین کی تھی۔ شاہ برہانؒ کا مزار' لاہور بیرون یکی دروازہ کوچہ پیر برہان' سرکلر روڈ پر واقع ہے)

Marfat.com

نواب سعد اللہ خان بعد میں درویش کی پیش گوئی کے عین مطابق شاہجہاں کے وزیر اعظم بنے۔نواب موصوف کو لاہور سے دلی انس تھا۔ایک روایت کے مطابق ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، نواب سعد اللہ اور امام ربانی مجدد الف ثانیؒ لاہور میں ہم مکتب رہ چکے تھے۔لاہور اندرون موچی گیٹ نواب نے دو حویلیاں بھی تعمیر کروائی تھیں۔حویلی میاں خاں اور پتھرانوالی حویلی۔زمانہ طالب علمی میں نواب موصوف کی رہائش مسجد وزیر خان کے قریب ایک حجرے میں تھی اور وزارت عظمیٰ تک رسائی کی داستان بھی بڑی عجیب وغریب ہے۔تکمیل تعلیم کے بعد سعد اللہ خان دہلی منتقل ہو گئے اور نواب آصف خاں کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے لگے۔دربار شاہجہاں تک رسائی تو نہ تھی مگر درباری معاملات سے باخبر ضرور رہتے۔ایک بار دربار کے سارے دانش ور ایک مسئلے کے حل میں بری طرح ناکام ہو گئے۔مگر خواجہ بہاری کے شاگرد رشید نے وہ مسئلہ بطریق احسن حل کر دیا۔

شاہ ایران نے دربار شاہجہاں میں مکتوب ارسال کیا تم صرف ہندوستان کے شہنشاہ ہو۔اپنے آپ کو شاہجہاں کیوں کہتے ہو کیا ہندوستان، سارے جہان کے برابر ہے؟''

نواب آصف خان بھی اس الجھن میں گرفتار تھا۔مزاج شاہی کا کیا اعتبار کب برہم ہو جائے اور کون اس کی زد میں آجائے۔نواب سعد اللہ خان کو خبر ہوئی تو اس نے ایک مختصر سا خط اس کے جواب میں لکھا اور مہر شاہی ثبت کر کے ایران روانہ کر دیا۔اس کے جواب میں شاہ ایران نے شاہجہاں کے نام ایک طویل مراسلہ تحریر کیا۔جس میں درج تھا ''اپنے خط کا جواب لکھنے والے ہندی دانش ور کو ہم سلطنت ایران کا وزیر اعظم مقرر فرماتے ہیں۔''

شاہ جہاں نے تحقیق کی تو نویسندہ سعد اللہ خان نکلا۔درباری میں فوری طلبی ہوئی۔''سارا ماجرا بلا کم وکاست بیان کیا جائے''فرمان شاہی صادر فرمایا۔

''ظل سبحانی' شاہ ایران نے لکھا تھا کہ شہنشاہ ہند نے شاہجہاں کا لقب کیوں اپنایا؟''سعد اللہ نے مودب لہجے میں کہا ''میں نے جواب دیا کہ لفظ ہند اور جہان کی عددی قیمت مساوی ہوتی ہے (ہ۔ن۔د=۵۹ اور ج'ہ'ا'ن=۵۹) لہٰذا اگر ہم نے شاہ جہاں کا لقب اختیار کر لیا تو ہم حق بجانب ہیں۔''

اس تشریح سے شاہ جہاں گویا پھڑک اٹھا'خلعت فاخرہ سے نوازا' سلطنت ہند کا صدر الصدور متعین کیا پھر قلمدان وزارت عظمیٰ سونپ دیا۔

Marfat.com

گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس دانش بھرے چراغ میں روشنی حضرت میاں میرؒ ہی کی تھی۔ خواجہ بہاری کا وصال ۱۶۳۲ء عہد شاہجہاں میں ہوا۔ مزار میاں میرؒ اور قصبہ میاں میرؒ کے درمیان' ریلوے لائن کے قریب ایک عظیم الشان گنبد والا مزار ہے جو خلفائے میرؒ کی تربتوں میں سب سے خوب صورت ہے یہی خواجہ بہاری کی آخری آرام گاہ ہے۔ آبادی کے سیلاب کے باوجود مزار کا وقار تا دم تحریر قائم دوائم ہے۔

مدینۃ الاولیاء لاہور میں حضرت میاں میرؒ کو انارکلی والے حجرے میں قیام پذیر ہوئے ساٹھ برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اسہال کا عارضہ لاحق ہوئے پانچ روز گزر چکے تھے۔ ربیع الاول کی سات تاریخ تھی۔ ۱۰۴۵ء بمطابق ۱۶۳۵ء شاہ جہاں کو تخت دہلی پر متمکن ہوئے سات برس ہو چکے تھے۔ چیدہ چیدہ خلفاء و مریدان باصفا آفتاب عالم تاب کی ضیاء پاشیوں کو عارضی طور مدھم ہوتے ملاحظہ کر رہے تھے۔ عالم فانی میں غروب ہونے والا سورج عالم جاودانی میں طلوع ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک روز پیشتر یعنی سوموار والے دن حاکم لاہور وزیر خان ایک حاذق طبیب کے ہمراہ ملاقات کو حاضر ہوا تھا۔

''فقیر لمبے سفر کی تیاری میں مصروف ہے۔ ملاقات کی فرصت ہے نہ ضرورت'' درویش نے کچھ اس قسم کا جواب دیا تھا۔

''حضور! وہ صرف زیارت کا خواہش مند ہے'' شیخ محمد لاہوری' حاجی محمد نبیانی' خادم خاص نور محمد سب نے بیک زباں استدعا کی۔

''اچھا آ جائے مگر کم سے کم وقت برباد کرے'' درویش کو آخری لمحات میں بھی دل شکنی مطلوب نہ تھی۔

وزیر خان اور حاذق طبیب حاضر ہوئے ''اجازت ہو تو حکیم کوئی دوا تجویز کرے؟'' وزیر خان نے بصد احترام پوچھا۔

''اب طبیب مطلق ہی کافی ہے' مسافر کوس رحلت کی آواز سن رہا ہے'' حضرت نے سب کو رخصت فرما دیا۔

یوم آخر یعنی منگل والے روز بے تابیٔ دل حد سے تجاوز کر گئی۔ نور محمد نے سبب دریافت کیا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ طائر روح' اڑنے کے لئے پھڑ پھڑا رہا ہے اور یہ بے قراری اس بنا پر ہے۔

Marfat.com

''ایک طویل عرصے بعد دیدارِ یار نصیب ہونے کی گھڑی ہے' دل بے قرار نہ ہو تو اور کیا کرے'' میاں جیوؒ نے سب سوالات کا ایک جامع جواب عطا کیا۔ اس بے قراری میں چار پائی سے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کسی کا استقبال کر رہے ہوں۔ نور محمد نے سہارا دینے کی کوشش کی' آپ نے ہاتھ جھٹک دیا اور فرشِ زمین پر برہنہ پا ننگے سر ایک عاجز و مسکین غلام کی طرح کھڑے ہو گئے'' الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ'' صاف الفاظ میں دو بار کہا جو سامعین نے بخوبی سنا۔ چشم بصارت نے دیکھا' چشم بصیرت نے سمجھا اور فہم ادراک نے پہچانا۔ پھر چار پائی پر دراز ہو گئے۔ میاں شیخ لاہوری نے بغور دیکھا تو دہن مبارک آہستہ آہستہ جنبش میں تھا۔ شیخ موصوف نے آخری الفاظ سمجھنے کی کوشش کی دو مرتبہ ''اللہ اللہ'' سنائی دیا پھر سناٹا چھا گیا۔ سکوت مرگ اسی کا نام ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون سب نے بیک زبان کہا۔ حسب وصیت موجودہ انارکلی بازار کے آغاز سے جنازہ اٹھایا گیا اور میاں نتھے شاہؒ' حاجی سلیمانؒ' شیخ ابوالکلام' حاجی مصطفیٰ کلالؒ وغیرہ کے قریب دفن کر دیا گیا۔ محفل احباب واصحاب کی رونق قائم رہی۔ لاہور میاں میرؒ چھاؤنی ویسے تو مشہور و معروف مقام ہے مگر ایک اجنبی کے لئے عرض ہے کہ مزار مبارک دھرم پورہ چوک (لاہور) کے قریب انفنٹری روڈ پر موجود ہے۔ جس کی تعمیر کا آغاز دارا شکوہ نے کیا اور تکمیل اورنگ زیب عالم گیر نے کروائی۔

یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ وصال میاں میرؒ کے بعد دارا شکوہ جیسا عقیدت مند سکینۃ الاولیاء کا مصنف شہباز تصوف و طریقت ایک طویل عرصے تک زندہ رہا۔ دور شاہجہانی کا عروج تھا اور وہ وارث تاج و تخت کی حیثیت سے لامحدود اختیارات کا مالک بھی تھا۔ پھر اس نے بیش قیمت ساز و سامان مثلاً سرخ سنگ مرمر اور آرائش کا چوبی سامان وغیرہ بھی اکٹھے کئے مگر ایک عظیم الشان خانقاہ کی تعمیر ممکن کیوں نہ ہو سکی۔ جواب سادہ سا ہے' اس میں رضائے درویش کارفرما تھی۔ حضرت میاں میرؒ نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ میری تدفین شور زدہ زمین میں ہونی چاہئے تاکہ ہڈیوں کا نام و نشان تک مٹ جائے پھر قبر پرستی کی مذمت میں فرمایا ''میری قبر کو بطور دکان سجا کر نہ بیٹھ جانا اور ہڈیوں کا کاروبار شروع نہ کر دینا'' تاج محل بنا' لال قلعہ اور تخت طاؤس تیار ہوئے' مقبرہ جہانگیر' شالامار باغ کیا کچھ تعمیر نہ ہوا مگر نمود و نمائش کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے والے کا مزار سادگی کی منہ بولتی تصویر ہی رہا۔ شاید اس میں بھی درویش کی رضا شامل ہے کہ آج تادم تحریر مزار میاںؒ پر ایک ایک سنگی کتبہ ایک سادہ سی تختی تک نصب یا آویزاں

Marfat.com

نہیں، ایک اجنبی کو پوچھنا پڑتا ہے "کیا یہ واقعی مزار میاں میرؒ ہے؟"

موجودہ امام مسجد مولانا ممتاز سے جب راقم نے سنگی کتبے کی عدم موجودگی کے سلسلے میں استفسار کیا تو انہوں نے مزار اقدس کی لائبریری کے ایک گوشے میں پڑے سنگی کتبے کی طرف اشارہ کیا "کتبہ تو تیار ہے مگر نصیب نہیں ہو سکا۔"

"مگر اس پر تو کچھ بھی تحریر نہیں" راقم نے حیران ہو کر ترشے ہوئے پتھر کو دیکھا۔

"اصل میں حضرت میاں میرؒ کی تاریخ پیدائش کا فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ فیصلہ ہو جائے تو بات بنے" امام صاحب نے راقم کو لاجواب کر دیا...... ہے نا عجیب بات۔

شاہجہاں کے بعد اورنگ زیب عالم گیر تخت نشین ہوا تو اس نے عظیم الشان مقبرے کے لئے جمع شدہ ساز و سامان بادشاہی مسجد کی تعمیر میں استعمال کروایا۔ مزار کی چاردیواری پہلے ہی مکمل ہو چکی تھی۔ روضہ مبارک خانقاہ مسجد وغیرہ کا نامکمل کام اس کے حکم سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ وصال میاں میرؒ کے بیس بائیس برس بعد تک اگر دارا شکوہ کو "مجمع البحرین اور سر اکبر" جیسی کتب لکھنے سے فرصت مل جاتی تو شاید عظیم الشان مزار کی تکمیل ہو جاتی مگر اصل بات وہی کہ درویش کی رضا نہ تھی۔ ایک لاہوری محقق کا خیال یہ بھی ہے کہ مزار کی تکمیل عہد شاہجہاں میں دارا شکوہ نے کروا دی تھی اور مزار میاں میرؒ کا ساز و سامان شاہی مسجد لاہوری کی تعمیر میں استعمال ہونے والا قصہ فرضی ہے۔ (مگر راقم کو اس سے اتفاق نہیں)

اورنگزیب عالم گیر کے سفر آخرت اختیار کرتے ہی مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ جس کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد جب لاہور "سکھا شاہی" کی زد میں آیا تو لاہور کی مساجد، مقابر، اور خانقاہوں میں نصب شدہ قیمتی پتھر اکھیڑ لئے گئے۔

دربار صاحب امرتسر، رام باغ امرتسر بارہ دری حضوری باغ کی زیب و زینت مقصود تھی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی نگہ ناز" مزار میاں میرؒ کی جانب اٹھی، موصوف اپنی من پسند گھوڑی "لیلیٰ" پر سوار ہو کر مزار کی حدود میں داخل ہوئے اور تمام سنگ سرخ اور سفید اکھیڑ کر امرتسر پہنچانے کا حکم صادر کیا۔ اس حکم کی تفصیل تک کتب میں محفوظ ہے یعنی فلاں پتھر فلاں جگہ وغیرہ وغیرہ۔ حکم صادر فرمانے کے بعد اپنی چہیتی گھوڑی "لیلیٰ" کی جانب متوجہ ہوئے تو اس نے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا۔ لوگ حیران اور رنجیت سنگھ پریشان ہوا۔ گھوڑی پالتو تھی۔ تعلقات پرانے تھے مگر ترک تعلقات والی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دم دلاسے دئے گئے پچکارا گیا

Marfat.com

آخر رنجیت سنگھ مہاراج گھوڑی پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے ...... اس کے بعد والی داستان ذرا دل خراش نوعیت کی ہے۔

جونہی مہاراجا گھوڑی کی پشت پر بیٹھا وہ سیخ پا ہو کر الف ہوئی' سوار نے سنبھلنے کی بہتری کوشش کی مگر سب کوششیں رائگاں گئیں اور وہ پہلو کے بل زمین پر آ رہے۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی گھوڑی اور سوار ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ تھے اور نہ مہاراجہ اناڑی تھے' مانے ہوئے شہسوار تھے۔ بہر حال یہ سوئے اتفاق تصور کیا گیا تھا اور راجا موصوف نے پھر کوشش کی۔ اس بار گھوڑی نے نہ صرف سوار کو دور پٹخ دیا بلکہ ایک عدد دولتی بھی جھاڑ دی۔ ایک تو سوار سر کے بل گرا' رہی سہی کسر یوں پوری ہوئی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ ''وقفہ تسلیم و رضا'' میں تشریف لے گئے۔

عالم ہوش میں آئے تو بے اختیار پکار اٹھے ''بادشاہوں کے پیر کی توہین مت کرو۔ مزار کے پتھروں کو ہاتھ مت لگانا' ہمیں کافی سزا مل چکی ہے'' چوٹوں کو سہلاتے برہنہ پا مزار پر تشریف لائے ناصیہ فرسائی کے بعد پانچ سو روپے سکہ رائج الوقت جیب خاص سے نذرانہ پیش کیا۔ توبہ کی۔ مزار مقدس کی مرمت اور سفیدی کے احکام جاری کئے۔ خلیفہ نور الدین ...... اپنے درباری کو یہ فرائض سونپے اور لیلیٰ پر سوار ہو کر مزار سے رخصت ہو گئے۔ لیلیٰ اب رام ہو چکی تھی۔ مہاراجا کی تقلید میں امراء وزراء بھی مزار پر حاضری دینے لگے۔ مجاوروں کی گویا چاندی ہو گئی۔

راجا موصوف نے مزار میاں میر کو تو بخش دیا (یا منہ کی کھائی) مگر ملا شاہؒ بدخشانی' حضرت خواجہ بہاریؒ اور شہزادی نادرہ بیگم کے مزاروں سے تمام قیمتی پتھر اتروا کر امرتسر روانہ کر دیئے۔

مقبرے کا چبوترہ (۲۶ قدم مربع) سنگ مرمر سے تعمیر شدہ ہے اور آمد و رفت کے لئے جنوبی دروازے کی چوکھٹ سنگ سرخ سے بنائی گئی تھی۔ مقبرے کے اندر والے فرش میں سنگ موسیٰ اور سیاہ کی گلکاری بڑی دیدہ زیب ہے گنبد کی چھت پر شیشے کا کام سکھا شاہی دور سے بعد کا ہے جو دو فرنگی عقیدت مندوں مسٹر پٹیل اور مسٹر گبن کا خراج تشکر و ارادت ہے۔ انگریز راج کے زمانے میں مسٹر گبن ایک مشہور و معروف متمول تاجر تھا اور پٹیل اس کا کارندہ۔ ایک بار ان کے بحری جہاز جو سامان تجارت سے لدے تھے ڈوب گئے یا لاپتہ ہو گئے۔ تاجروں کے لیئے یہ نقصان ناقابل برداشت تھا۔ مسٹر پٹیل آستانہ درویش پر حاضر ہوا اور نہائت عجز و انکسار سے حرف مدعا زبان پر لایا۔ معجزاتی طور پر جہاز بخیر و عافیت کنارے پر آ لگے اس طرح حضرت شاہ میرؒ کے

Marfat.com

عقیدت مندوں میں فرنگیوں کا اضافہ ہوا اور یہ آرائش معرض وجود میں آئی۔

راقم نے مزار میاں میرؒ پر بلا امتیاز مذہب و ملت' ایسے ایسے عقیدت مندوں کو دیکھا ہے جن کی موجودگی کا کسی دوسرے مزار پر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ساون کے پہلے ہفتے میں ہر سال چار سکھ زائرین باقاعدگی سے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ یہ عقیدت مند چبوترے سے تھوڑے فاصلے پر' پائینی کی جانب جھولی پھیلا کر بے حس و حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ کسی سے ہم کلام ہوتے ہیں' نہ کسی کے سوال کا جواب دیتے ہیں۔ بس لب بستہ دامن دراز کھڑے رہتے ہیں کبھی چند منٹ کبھی چند گھنٹے پھر جھولی سمیٹ کر خوشی خوشی مزار سے رخصت ہو جاتے ہیں جھولی سمیٹنے کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے اس میں کچھ آ گرا ہو۔ جانے کون ہیں اور کیا حاصل کرنے آتے ہیں مگر آتے ضرور ہیں۔

حال ہی میں ایک سرخ و سفید رنگت والا عقیدت مند راقم کو تعویذ کی پائینی جانب بیٹھا نظر آیا۔ یہی کوئی پچاس کے پیٹے میں ہوگا۔ جس والہانہ انداز سے وہ محو راز و نیاز تھا راقم کے لئے اچنبھے سے کم نہ تھا۔

''جناب' کب سے یہاں تشریف فرما ہیں؟'' میں نے مودب لہجے میں پوچھا مگر وہ اپنے وظیفے میں مشغول رہا۔ میرا اصرار جاری رہا' خدا خدا کر کے پتھر میں جونک لگی تو وہ بڑے دھیمے لہجے میں لب کشا ہوا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو' کوئی پچیس چھبیس برس پہلے کی بات ہے 'میں ذات کا بھنگی اور عیسائی مسلک کا بگڑا ہوا نوجوان تھا'' تھوڑی دیر وہ سر جھکا کر بیٹھا رہا پھر زیر لب بڑی نفرت سے بڑبڑانے لگا'' چوہڑا چمار کہیں کا مرنے جوگا'' وہ اپنے آپ کو ہدف ملامت بنا رہا تھا۔ پھر سوئے مزار دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

''محترم پچیس برس پہلے کیا ہوا تھا؟'' میں نے کرید جاری رکھی

''میں نے ماں کے پیٹ سے جنم لیا تھا'' اس نے زیر لب مسکرا کر کہا'' میں بڑا کڑیل جوان تھا مگر رنگت ہنڈیا کے پیندے سے زیادہ سیاہ تھی' میرے نامہ اعمال سے بھی زیادہ سیاہ۔''

''مگر خال روئے یار سے تو زیادہ سیاہ نہ ہوگی'' میں نے بھی اس لہجے میں کہا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا' انداز تھا'' دوست! شاید اپنا قارورہ مل گیا'' پھر وہ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔

''جو کچھ میرے پاس تھا' شراب کباب کی نذر ہو گیا۔ اپنے آبائی پیشے کی طرف لوٹ

Marfat.com

آنا ممکن نہ تھا۔ دارو کا نشہ الگ اور روٹی کا الگ' کوئی ایک مصیبت تھی؟ بھوکا پیاسا نشے کا مارا ادھر آ نکلا یا شاید نکیل کسی کے ہاتھ میں تھی۔ چار دیواری کے قریب پہنچا تو خیال آیا کہ یہ تو مسلمانوں کے پیر ہیں؟ کسی رشتے ناتے' کس نسبت سے اندر جاؤں؟ پھر جیسے کسی نے دھکا دے کر اس دروازے کے اندر پھینک دیا'' اس نے جنوبی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں دیوار کے سائے تلے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ خلق خدا کا ہجوم تھا مگر میرا پرسان حال کوئی نہ تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر سوئے مزار دیکھا ''بابا بھوک لگی ہے روٹی دو'' مجھے تو مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا مگر یہ میرے دل کی آواز تھی' آواز لرز رہی تھی

کچھ مرے الفاظ کے تھے نا مناسب پیرہن
مدعا کچھ گم ہوا لرزا صدا کی اوٹ میں

بچپن میں اسی انداز سے اپنی ماں سے کھانا طلب کیا کرتا تھا۔ میں پھر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک نورانی چہرے والی ہستی میرے قریب آئی۔ قد درمیانہ' روشن چہرہ' کھڑی سی ناک بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ ابرو آپس میں پیوست تھے۔ اعضاء متناسب' موٹے کپڑے کا کرتہ اور تہبند' دستار مبارک بھی سوتی کپڑے کی مگر سارا لباس صاف ستھرا اور معطر سا' اس نے کھانے کا طشت میرے آگے رکھ دیا اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ بس ساری چھاپ تلک چھین لی' اپنے در کا کتا بنا لیا۔''

''جناب! میں مسلمان نہیں ہوں' اتنا ضرور یاد رکھیں۔'' میں نے دوٹوک بات کی تاکہ کوئی غلط فہمی نہ رہے۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ رب العزت تو نجس حیوانوں کو بھی روزی دیتا ہے' تم تو اشرف المخلوقات ہو۔ کائنات کے دولھا ہو' انہوں نے بڑی رسان سے کہا۔

''ہائے وہ طرز تکلم' میں تو بس کھانے پر ٹوٹ پڑا جیسے جنم جنم کا بھوکا کتا بغیر چبائے ہڈی بوٹی نگل جاتا ہے۔''

''عزیزم! جلدی کا ہے کی ہے آرام سے کھاؤ' سب ٹھیک ہو جائے گا'' میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کچھ بھی نہ تھا مگر وہ آواز؟ اس کی گونج ابھی تک میری سماعت میں زندہ سلامت موجود تھی۔ میں نے سوچا شاید میرے کان بج رہے ہیں۔''

مزار پر بیٹھا شخص آپ بیتی سنا رہا تھا مگر راقم کسی اور ہی عالم میں تھا ''محترم! آپ

Marfat.com

جانتے ہیں کس ہستی کا آپ نے حلیہ بیان فرمایا ہے؟'' میں نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا

''اب اتنا بے خبر بھی نہیں ہوں' ربع صدی سے مالک کے در پر بیٹھا دم ہلا رہا ہوں' اتنا شعور تو آ ہی جانا چاہیے۔'' سپید رنگت والے بزرگ نے مسکرا کر راقم کو دیکھا یہی میرے مالک تھے ''اس نے مزار کی طرف دیکھا مگر اس زمانے میں تو میں واقعی خر بے شعور تھا بس ایک جگہ سایہ دیوار تلے بیٹھا رہتا۔ اناج اندر گیا تو اندر کے حیوان نے پر پرزے نکالے۔ نشے کی طلب ہوئی' چاردیواری سے باہر جانا چاہا تو جا نہ سکا بڑی عجیب صورت حال تھی۔''

''باہر جانے سے کون روک رہا تھا آپ کو؟'' میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

''اب آپ بے خبروں والی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ کہنا ''خر بے شعور'' چاہتا تھا مگر مروت میں نازیبا الفاظ کا استعمال نہ کر سکا۔

''میں تھک ہار کر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ میرے سامنے مٹی کا پیالہ پڑا تھا۔ پانی سے لبالب بھرا ہوا میں نے اٹھا کر وہی ہونٹوں سے لگا لیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن نشے کی طلب جاتی رہی پھر ایک شام میں کھانا کھانے لگا تو وہی کانوں میں رس گھولنے والی آواز سنائی دی۔

''عزیزم! بسم اللہ نہیں پڑھو گے؟'' اب میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا' کون قدم قدم پر حیران ہوتا رہے۔

''مگر میں تو مسلمان نہیں ہوں'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا مگر اندر سے میں کانپ کر رہ گیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ناگہاں کچھ نہ کچھ ہونے کو ہے۔

''کفر کا علاج کلمہ طیبہ ہے مگر غفلت کا علاج نہیں۔ تم کافر ہو' غافل تو نہیں'' کانوں میں رس گھولا گیا ''بس جناب' میں نے کلمہ طیبہ پڑھا اور اسی دن سے یہاں بیٹھا ہوں'' یہ کہہ کر وہ سرخ و سپید عقیدت مند درود شریف کا ورد کرنے لگا۔

''بس ایک سوال کا اور جواب دے دیں'' راقم نے بے تکلفی سے پوچھا ''بقول آپ کے آپ کی رنگت خال روئے یار یا ہنڈیا کے پیندے جیسی سیاہ تھی مگر آپ تو ؟'' وہ سیاہی...... ؟ وہ تو اندر کا اندھیرا تھا جس کا اظہار روسیاہی کی شکل میں ہو رہا تھا۔ اب تو اندر روشنی ہی روشنی ہے میرے مالک کی رنگین روشنی۔''

''آپ کا پرانا نام کیا تھا؟'' راقم نے پیش رفت جاری رکھی۔

Marfat.com

''آخری سوال کے بعد بھی کوئی سوال ہوتا ہے۔''عقیدت مند میرؔ نے مجھے لاجواب کر دیا مگر یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ایک دوسرے عقیدت مند نے مجھے سب کچھ بتادیا۔

''وہ تو استاد محرم علی ہیں' پہلے عیسائی تھے پھر......''

''بس محترم اتنا ہی کافی ہے بقیہ ساری داستان سے میں واقف ہوں'' راقم نے دوسرے ارادت مند کا شکریہ ادا کیا۔

راقم مزار سے رخصت ہونے لگا تو استاد محرم علی نے خود اشارے سے اپنے پاس بلایا اور رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا'' باؤ صاحب! آپ تو پڑھے لکھے دکھائی دیتے ہیں' یاد رکھیں'' ساوا گیا تے کالا گیا' دھولا گیا تے رولا گیا'' (لفظی ترجمہ سبز گیا' سیاہ گیا' سفید بال گیا تو سارا شور شرابا ختم ہوا یعنی بچپن سے مسیں بھیگیں پھر بال سفید ہوئے۔سفید بال اپنے ساتھ زندگی کی رونقیں لے کر جاتے ہیں)

''استاد محرم علی! آپ تو بڑے استاد ہیں مگر میرے ذہن میں اب بھی چند ایک سوال ہیں''

''باؤ جی! بندے کو تھوڑا سا پریشان رہنا چاہیے یہی آگے بڑھنے کی چابی ہے'' پھر استاد محرم علی نے استادانہ لہجے کہا۔

عقل والا تری محفل سے پریشان گیا
عشق والا تجھے ہر رنگ میں پہچان گیا

عظمت میاں میر بالا پیرؒ کا منہ بولتا ثبوت' استاد محرم علی زندہ سلامت مزار مقدس پر موجود رہتا ہے۔جو چاہے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ آج کل آنکھوں کی گواہی معتبر گردانی جاتی ہے

صلائے عام ہے' یاران نکتہ داں کے لئے۔

O......☆......O

Marfat.com

اللہ لوگ

حضرت محمد باہو المعروف سلطان العارفین سلطان باہوؒ

Marfat.com

علم و آگھی کے سمندر اور معرفت و ادب کے مھر تابناک 'سلسلہ قادریہ کے آفتاب عالمتاب 'والدہ بی بی راستی اور والد باز یدمحمدؒ دونوں کی طرف سے نجیب الطرفین ولی اور اویسی" محمد باھو "سلطان العارفین سلطان باھوؒ کے نا م سے مشھور ھوئے .علم لدنی کی کمال مظھر 'ایک سو چالیس تصانیف جو اردو 'عربی 'فارسی اور پنجابی میں تحریر کی گئیں .ترک لذات اور فقر میں اصحاب صفہؓ کے نقش قدم پر چلنے والے سلطان باھوؒ راہ سلوک کے منفرد مسافر مانے گئے .جنھوں نے اپنی تعلیمات کو شاعری کے دلنشیں انداز میں ایسے بیان کیا کہ خود شاعری بھی نازاں ھوئی .ان کے اشعار شاعری کی آبرو قرار دیئے جاسکتے ھیں .زندگی میں آپ روحانی کمال پر تھے اور بعد از وصال آپ اپنے فیوض سے خلق خدا کو بھرہ مند فرماتے ھیں .

Marfat.com

سلطان باھوؒ

برق رفتار گھوڑی اتنی خوبصورت تھی کہ لوگ دور دور سے اُسے دیکھنے آتے' اس کی مست خرامی ہوا کو مات کر دینے والی بات تھی۔ زقند لگاتی تو دیوار کو ریت کی سلوٹ سمجھ کر عبور کر جاتی۔ شاید انہی صفات کی بنا پر وادی سون سکیسر اور اس کے گردونواح میں لوگ اسے ''سون پری'' کہتے تھے۔ مروجہ آلات حرب سے مسلح جو شخص اس پر سوار تھا وہ بھی مردانہ وجاہت کا نمونہ نظر آ رہا تھا۔ سرخ و سفید رنگ' کشادہ پیشانی مضبوط قد کاٹھ' عقابی نگاہیں' گھنی داڑھی میں چند سفید بال' شہ سوار کو رزم و بزم دیدہ ثابت کر رہے تھے۔

جونہی سوار فصیل شہر کے قریب پہنچا۔ عظیم الشان دروازے پر کھڑے پہرے داروں نے اسے روک لیا اور ان میں ایک بھاگم بھاگ اپنے افسر اعلیٰ کے پاس پہنچا۔

''جناب! جس شخص کی ہمیں تلاش تھی وہ شہر پناہ کے دروازے پر کھڑا ہے'' سپاہی کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔ محافظوں کا مسئول بسرعت تمام سپاہی کے ساتھ ہو لیا۔ دروازے پر حلیہ نویسوں کی تحریر کے عین مطابق شخصیت اس کے سامنے تھی۔ سوار کے چہرے سے اعتماد جھلک رہا تھا مگر غرور یا گھمنڈ نہ تھا۔

''آپ کا اسمِ گرامی بازید محمدؒ ہے؟ افسر نے مودب لہجے میں پوچھا۔

Marfat.com

''جی! بازید بندۂ عاصی ہی کا نام ہے'' سوار نے مہذّب لہجے میں جواب دیا۔

''تو پھر تشریف لائیے' ناظم ملتان آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے''

''گویا قصہ رسوائی مجھ سے پہلے اس شہر کے گلی کوچوں میں پہنچ چکا ہے۔''

''جناب! اسے شہرت کا نام بھی تو دیا جا سکتا ہے۔''

''مگر میں نے تو ایسا کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا جو وجہ شہرت قرار دیا جا سکے۔ مکروہات زمانہ سے فرار کی کوشش البتہ ضرور کی ہے'' پھر سوار نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا جیسے وہ اپنے آپ سے محوِ کلام ہو' بہاؤالدین زکریاؒ اور شاہ رکن عالمؒ کے دامن میں کنج عافیت تلاش کرنے کی یہ کوشش بھی رائگاں جاتی دکھائی دیتی ہے۔''

ناظم ملتان کے محل کی طرف چلے تو مستعد سپاہیوں کی ٹولی ہمراہ تھی کچھ سپاہی پیچھے کچھ دائیں بائیں۔ ان کا سالار البتہ بازید محمدؒ کے ہم رکاب تھا۔

''گویا ہم زیر حراست ہیں؟'' شہسوار نے اچٹتی سی نگاہ اپنے گردوپیش ڈالتے ہوئے کہا۔

''اسے عزت افزائی بھی تو کہا جا سکتا ہے' اس کے علاوہ ہمیں یہی حکم ہے'' سالار نے معذرت پیش کی۔

یہ قافلہ اسی ہیت کذائی میں منزل مقصود پر پہنچا۔ حاکم شہر نے آنے والے کو بغور دیکھا تو پہلی نظر ہی میں اس کی صلاحیتوں کا قائل ہو گیا۔ سپاہیوں کو رخصت کر دیا گیا اور بازید محمد کو لے کر ناظم ملتان اپنے ''حجرہ خاص'' میں آ گیا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ شہنشاہ ہند کے دربار سے اسے ''مفرور'' کے حلیئے وغیرہ سے مطلع کر دیا گیا تھا اور اس کا فرض تھا کہ وہ اپنی ''دریافت'' کی اطلاع فوراً دہلی دربار کو فراہم کرے مگر جو شخصیت اس کے سامنے تھی وہ ٹوٹ تو سکتی تھی جھک نہیں سکتی تھی۔ موسم بہار کو تہ کمند یا خوشبو کو اسیر دام کرنا حماقت کے زمرے میں آتا ہے۔ روشنی کو شیشے کی دیواروں میں مقید کرنے والی بات تھی۔ وہ بازید محمدؒ کو کوئی گزند پہنچائے بغیر اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا لہٰذا بڑے محتاط انداز میں محو کلام ہوا۔ یہ ایک سیاسی ملاقات تھی۔ آنے والے نے بھی اپنے تعارف میں اختصار سے کام لیا اور تفصیل سے عمداً گریز کیا۔

بازید محمدؒ کا تعلق قبیلہ اعوان سے تھا۔ وہ پشتنی رئیس تھے۔ مزید پیش رفت سے پیشتر مناسب ہے کہ ''قبیلہ اعوان'' کا تعارف پیش کر دیا جائے تا کہ قارئین کرام' سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ کے پس منظر سے کماحقہ آگاہ ہو سکیں۔

Marfat.com

امیر المومنین علیؓ ابن ابی طالب کے اٹھارہ بیٹے تھے۔جن میں امیر زبیر کا نام بھی کتب تاریخ میں مرقوم ہے۔رئیسان کالاباغ کے ملک خاندان کے کتب خانے میں ''کتاب النساب'' آج بھی موجود ہے جس میں آپ کے صاحبزادگان کے بارے میں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

محولہ بالا کتاب میں فتاویٰ غیاثی کے مطابق مرقوم ہے کہ امیر زبیر کی والدہ ماجدہ کا نام ''میمنہ'' خاتون یا ''میمونہ'' تھا جو رستم پہلوان کی اولاد سے تھیں اور اعوان' امیر زبیر کی پشت سے ہیں۔

سب سے پہلے امیر شاہ ولد قطب شاہ ''اعوان'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔اس کی تشریح کچھ اس طرح سے کہ اعوان کا مفہوم' معاون مددگار ہے۔جب خراسان کے سادات گردشِ ایام کا شکار ہو کر مصائب میں مبتلا ہوئے اور گوشہ نشینی اختیار کر گئے تو امیر شاہ والئی ہرات نے سادات بنی فاطمہ کی ہر حیلے بہانے دل کھول کر معاونت کی۔لہٰذا کتب تاریخ میں قطب شاہ کی اولاد کو اعوان'' کہا گیا ہے۔حضرت بازیدؒ کا تعلق اس نسل سے تھا۔فتاویٰ غیاثی میں سلسلہء نسب اس طرح درج ہے۔

سلطان العارفین سلطان باہوؒ بن سلطان بازید محمدؒ بن شیخ سلطان فتح محمد بن شیخ اللہ دتہ بن شیخ محمد تمیمؒ بن شیخ منانؒ بن شیخ موغلا بن شیخ محمد پیدا' بن شیخ محمد سگھرا' بن شیخ محمد انونؒ بن شیخ محمد سلاؒ بن شیخ محمد بہاریؒ بن شیخ محمد جیسمونؒ بن شیخ محمد ہرگن بن شیخ محمد انور شاہ بن شیخ امیر شاہ بن شیخ محمد قطب شاہ بن حضرت امان شاہ بن حضرت سلطان حسین شاہ بن شیخ فیروز شاہ بن محمود شاہ بن شیخ فرطک شاہ بن نواب شاہ بن دراب شاہ بن اوہم شاہ بن شیخ عتیق شاہ بن سکندر شاہ بن احمد شاہ بن امیر زبیر بن اسد اللہ الغالب علی المرتضیٰؓ بن ابی طالب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن ....الخ آدم علیہ السلام۔

ناگفتہ بہ حالت کے سبب جب سادات وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو انہوں نے ایران و ترکستان کے مختلف حصوں میں بود و باش اختیار کی۔اس دورِ غریب الوطنی میں اعوان ہی ان کے کام آئے۔اپنی معاونت میں وہ اس حد تک گئے کہ سادات نے بغرض ہجرت جس مقام کا قصد کیا' اعوان ان کے نقش قدم پر چلتے رہے۔سادات بنیادی طور پر علم و آگہی اور زہد و تقویٰ کے وارث رہے مگر اعوان قوت بازو پر انحصار کرنے والے ''جنگ جُو'' اور اسی قسم کی صفات کے حامل ہوتے گئے یہاں تک کہ قطب شاہ نے ہرات پر مکمل فتح حاصل کر لی۔

Marfat.com

خراسان سے سادات بنی فاطمہ نے ہند کی جانب ہجرت کی تو ان کے عشاق اعوان بھی ان کی ہمراہی پہ مجبور ہوئے۔اس طرح کالا باغ کے پہاڑی علاقے اور دریائے اٹک کے کنارے سرزمین پنجاب نے ان کا استقبال کیا۔بنی سادات تو حسب معمول مختلف مقامات پر کنج عافیت تلاش کر کے یادالٰہی میں مصروف ہو گئے مثلاً اوچ شریف میں بخاری بس گئے۔بھوٹ مبارک میں گیلانیوں نے بسیرا کیا۔چوہاسیدن شاہ میں شیرازی' دنداشاہ بلال میں ہمدانی سادات رشد وہدایت میں مصروف ہو گئے مگر قبیلہ اعوان نے اپنی جبلت سے مجبور ہو کر کالا باغ پر قبضہ کر لیا۔دریائے اٹک کا مشرقی کنارہ بھی ان کی تگ وتاز کا مرکز ومحور قرار پایا۔

اس دور میں کوہستان کے مشرقی حصے پر ہندو راجگان خٹک' جنجوہا وغیرہ نے بڑے مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعے بنا رکھے تھے اور یہ سارا علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ مغرب میں دریائے جہلم تک' شمال میں دھنی وپوٹھوہار تک' جنوب میں چولستان اور مشرق میں کوہ سیون' کوہ پکھیڑ وکوہ سکیسر (یہ سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر سرسبز وشاداب علاقہ تھا) کوہ تپاؤ' تاؤ ہا اور کوہ کھون وغیرہ کے سلسلے تھے۔اعوان قبیلے کے شہ سوار اور مردان شمشیر زن اس علاقے کے ہندو راجگان سے نبرد آزما ہوئے اور آخر کار اس سارے علاقے پر قابض ہو گئے۔ایک طرح سے یہ نبرد آزمائی' سادات بنی فاطمہ کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے بھی تھی۔دوسرے ان کی جنگ جویانہ فطرت کی تسکین بھی اسی میں تھی۔آج بھی اس علاقے میں اس دور کے بت خانے' دیوان خانے وغیرہ اپنی اصلی حالت میں جوں کے توں موجود ہیں۔کوہ سکیسر پر کھڑے ہو کر مغرب کی جانب دیکھیں تو انب شریف پر پتھر کا مضبوط قلعہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس بلند مقام پر تعمیر شدہ قلعے کی ایک ایک سیل' پانچ پانچ مربع گز سے کسی صورت کم نہیں' عقل حیران ہے کہ سر بہ فلک چوٹیوں پر اتنی وزنی سلیں پہنچانے کے کون سے ذرائع اس دور میں موجود تھے۔یہ انسانی ارادے اور استقلال کی منہ بولتی تصویر ہے۔بہرحال یہ سارا علاقہ اعوانوں کے زیر تسلط آ گیا۔موجودہ ضلع سرگودھا کے علاقے' وادی سون سکیسر میں سلطان العارفین کے آبا واجداد کا مسکن تھا۔

حضرت بازید محمد' رئیس ابن رئیس قسم کی شخصیت تھے اور سلطنت دہلی کے شاہی منصب دار بھی تھے مگر شاہی ملازمت ان کی ذاتی صفات میں حارج نہ تھی۔وہ حافظ قرآن' پابند صوم وصلوٰۃ اور دینی علم کے ماہر تو تھے لیکن یہ زہد وتقویٰ قیل وقال تک محدود تھا ''حال'' سے یکسر بیگانہ

Marfat.com

تھے۔اس دور کے متعلق یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ موصوف ایک صالح نوجوان تو تھے مگر گرفتار دنیا بھی تھے۔

حضرت بایزیدؒ نے سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے ازدواجی زندگی بسر کی مگر اولاد نرینہ سے محروم رہے اور ادھیڑ عمر میں 'اولاد کی خاطر ایک صورت وسیرت میں لاجواب خاتون سے نکاح کیا۔یہ خاتون ان کے اپنے قبیلے سے تھیں مگر سیرت میں رابعہ ثانی ثابت ہوئی۔اس عظیم خاتون کا نام ''بی بی راستی'' تھا۔لفظ بی بی آج تو نچلے طبقے سے مختص ہوگیا ہے مگر ماضی بعید میں یہ بیگم یا...... بلند مرتبت خاتون کے لیے مستعمل ہوا کرتا تھا۔خیر! بی بی راستی اور حضرت بایزیدؒ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے تو ایک عجیب بات ہوئی۔رفتہ رفتہ خاتون خانہ کا رنگ' شوہر نامدار پر چڑھنے لگا۔ بی بی راستی کا زہد وتقوی کس مقام ومرتبے پر تھا اس کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ سلطان باہوؒ نے خود فرمایا۔

رحمت حق بر روان راستی

راستی از راستی آراستی

(جان راستی پر رحمت حق کا نزول ہو'راستی'' کو راستی (سچائی) سے آراستہ کیا گیا۔)

اس کے علاوہ اپنی بے مثال تصنیف ''عین الفقر'' میں سلطان العارفین نے جس انداز سے اپنی والدہ ماجدہ کا ذکر کیا ہے وہ ان کے مقام کا بین ثبوت ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا حضرت بایزید کا باطن روشن ہوتا چلا گیا۔اس کا آغاز بے شک جبین نیاز پر عرق انفعال سے ہوا۔بی بی راستی سے چند ایک کرامات کا ظہور بھی ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت بایزیدؒ کو اپنی عمر رفتہ رائگاں محسوس ہونے لگی۔چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے یہی خیال کچوکے لگاتا رہتا ''افسوس! میں نے عمر عزیز مکروہات زمانہ کی نذر کردی۔مجھ سے تو ہزار درجہ بہتر میری زاہدہ عابدہ بیوی ہے'' یہ حسد کی بنا پر نہ تھا۔بلکہ اپنی ذات پر اظہار تاسف تھا۔

بے تابی دل حد سے بڑھ گئی تو حضرت بایزید محمدؒ نے زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا اور ایک روز تلافی مافات کی خاطر ترک دنیا کا ارادہ کرلیا مگر یہاں بھی ''پس منظر'' گل کھلا گیا۔سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگل کی راہ لینے کی بجائے آپ مروجہ ہتھیار سجا کر اپنی برق رفتار گھوڑی ''سون پری'' پر سوار ہوئے اور ریاست ومنصب داری کو لات مار کر سوئے ملتان روانہ ہوگئے۔اس سفر کو دہلی دربار نے ''فرار'' کا نام دیا اور حسب قانون آپ کا حلیہ اور مکمل تعارف' ناظم ملتان کو روانہ کر

Marfat.com

دیا۔

☆......☆......☆

ناظم ملتان نے حضرت بازید محمدؒ سے گفتگو کی تو ساری بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ ایک جہاں دیدہ انسان تھا۔ راہ حق کی جانب اٹھنے والے قدموں کے راستے میں رکاوٹ کا قائل نہ تھا ۔لہٰذا اس نے نہایت مناسب الفاظ میں ملازمت کی پیشکش کی۔

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ عہد شاہجہاں کا آغاز ہے'' ناظم ملتان نے ایک ایک لفظ تول تول کر گفتگو کا آغاز کیا۔ ''ریاست سے فرار کو کوئی اور نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ آپ ترک دنیا کا ارادہ فرما چکے ہیں' خدا آپ کو استقامت بخشے مگر مغل فوج سے بگاڑ اچھی بات نہیں۔ بہتر ہے آپ میری ملازمت میں آ جائیں۔ میں آپ کی سلامتی کی ضمانت دیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ ہر بات آپ کے حسب منشا ہوگی۔ آپ بے شک یاد الٰہی میں مصروف رہیں۔ آپ کے ''وظیفے'' میں کوئی فرد مخل نہ ہوگا۔''

ناظم ملتان نے نشیب و فراز سے آگاہ کیا تو حضرت بازید محمد نے چند شرائط پیش کیں گویا یہ ملازمت مشروط تھی۔

''مجھے دربار کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور میرا افسر بالا و اعلیٰ صرف خدا ہو گا۔''

''میری رہائش کسی الگ مقام پر پاک صاف جگہ پر ہو۔''

''میں کسی کو جھک کر یا فوجی انداز میں سلام نہیں کروں گا۔ کیوں کہ اب یہ سر صرف قادر مطلق کی بارگاہ میں جھکے گا۔''

ناظم ملتان نے یہ تینوں شرائط خندہ پیشانی سے قبول کر لیں اور اس عجیب و غریب ''فوجی افسر'' کی تنخواہ دو روپے سکہ رائج الوقت یومیہ مقرر کی گئی' حضرت بازیدؒ نے اپنے حسب منشائے زندگی کا آغاز کیا۔ کنج تنہائی تھا اور آپ کے پرخلوص سجدے۔ ایسے سجدے جن میں دل کی رغبت اور روح کا میلان دونوں شامل تھے۔ نئی نویلی دلہن بی بی راستی بھی فراموش ہو گئی۔

غوث الثقلین' شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں قرب الٰہی بندے سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر ہوتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ قدم دنیا سے اٹھا کر' میدان حب اللہ میں رکھ دیا جائے۔''

Marfat.com

حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ جو بندے کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے' اسے تلاش کرنے کے لئے' جنگلوں پہاڑوں کی خاک چھاننا ضروری نہیں۔ راہ سلوک میں مجاہدات کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر ''حقیقت عشق'' سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ عشق حقیقی میں ڈوبا ہوا ایک پل برسوں کی ریاضت پر بھاری ہوتا ہے اور اس کا ایک قدم لامتناہی فاصلے طے کر لیتا ہے۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
ورنہ زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

بازید محمدؒ دنوں میں اس مقام تک جا پہنچے جس کی حسرت لیے اکثر حضرات زیر زمین جا سوتے ہیں۔ بصیرت و بصارت کے سامنے حائل تمام پردے اٹھتے چلے گئے۔ (سلطان العارفین بھی اپنی تصنیفات میں اس بات زور دیتے ہیں کہ بندہ ایک قدم اٹھا کر واصل حق ہو سکتا ہے) ہمارے نزدیک بازیدؒ کا اس مقام پر فائز ہونا اصل میں اس مقدس ہستی کا استقبال کرنا تھا جو شکم مادر میں پروان چڑھ رہی تھی یعنی ''سلطان العارفین''

ایک عام آدمی گھر سے غائب ہو جائے تو اہل خانہ کی جان پر بن آتی ہے اور یہاں خاندان کا سربراہ' شاہی منصب دار اچانک غائب ہو گیا تھا۔ حضرت بازید محمدؒ کے لواحقین آپ کی تلاش میں چاروں طرف پھیل گئے۔ ادھر ملتان میں ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دریائے ستلج کے مشرقی کنارے اور بیکانیر کے ریگستانی علاقے کی حد بندی کے سلسلے میں ناظم ملتان اور راجا مروٹ کے مابین اختلاف' تنازعے کی شکل اختیار کر گیا اور بات کشت و خون تک جا پہنچی۔ اس رات حضرت بازیدؒ مراقبے سے باہر تشریف لائے تو چشم بصیرت نے سارا منظر دکھا دیا ''آخر ہم تنخواہ دار ہیں اور رزق حلال کا تقاضا ہے کہ ناظم ملتان کی معاونت کی جائے ''حضرت نے یہ سوچ کر علی الصباح اپنے ہتھیار جسم پر سجائے'' سون پری پر سوار ہوئے اور دربار میں تشریف لائے۔

''ہم راجا مروٹ کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں'' حضرت بازیدؒ نے سنجیدگی سے کہا۔

''شرائط کے مطابق آپ کو کس جتھے سے منسلک کیا جائے؟''

ناظم نے مسکرا کر الجھن بیان کی۔ ''فوج کی کمان تو میرے ہاتھ میں ہوگی اور آپ کو کسی آفیسر کے زیر کمان کام کرنا پسند نہیں۔ آخر آپ کس طرح اس جنگ میں حصہ لے سکتے ہیں؟''

Marfat.com

''اس کا بہترین حل میرے پاس موجود ہے'' حضرت نے اسی لہجے میں جواب دیا ''ناحق خلق خدا کا خون بہانے سے فائدہ؟ آپ اس بندہ ناچیز کو تن تنہا راجا مروٹ سے جنگ کی اجازت دیں' قادر مطلق بہتر صورت حال پیدا کر دے گا۔''

اہل دربار جو جنگی منصوبہ بندی میں مصروف تھے' حیرت زدہ نگاہوں سے اس شخص کو دیکھنے لگا جو خود ہی لشکر اور خود ہی سالار لشکر تھا۔ ایسا تو کبھی کسی نے دیکھا نہ سنا...... ایک تنہا شخص پوری فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟' مگر شاید اہل دربار مرد مومن کی فراست سے آگاہ نہیں تھے۔ بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ حضرت موصوف کو آزمانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ناظم ملتان البتہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کوئی انہونی ہونے کو ہے۔

''اگر آپ واقعی تنہا راجا مروٹ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔'' ناظم ملتان نے ہتھیار ڈال دیے۔

ایک سپاہی جو راستے سے بخوبی واقف تھا آپ کے ہمراہ کر دیا گیا اور راجا مروٹ کی تصویر بھی حملہ آور کے سپرد کر دی گئی۔ اجازت ملتے ہی حضرت نے سون پری کو ایڑی لگائی اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ درباری سپاہی کو ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا۔

منزل مقصود نظر آئی تو حضرت بازیدؒ نے سون پری کو رکنے کا اشارہ کیا اور اپنے ہم سفر سے مخاطب ہوئے ''عزیزم! اس سے آگے میں تنہا جاؤں گا' تمہارا کام ختم ہوا۔ لہٰذا تم واپس لوٹ جاؤ۔''

''جناب! ایک سے دو بھلے' ویسے آپ کا ارادہ کیا ہے؟'' سپاہی نے ازراہ ہمدردی پوچھا۔

''جنگ کا خواہش مند صرف راجا ہے' میں اسی سے بات کروں گا''

''حضور!...... لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے' مذاکرات کا وقت اب گزر چکا ہے''

''بھوتوں کا انتظام بھی میرے پاس ہے' آپ ''پینڈا کھوٹا'' نہ کریں اور سوئے ملتان لوٹ جائیں'' یہ کہہ کر آپ نے سون پری کو چلنے کا اشارہ کیا اور سپاہی حیران و ششدہ واپس لوٹ گیا۔

شہر پناہ کے دروازے پر محافظوں نے حضرت بازیدؒ کو ایلچی تصور کیا' کیوں کہ تنہا شخص

Marfat.com

کا شہر یا فوج پر حملہ' قصے کہانیوں میں تو ممکن ہے' عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

''میں ملتان دربار سے آیا ہوں اور راجا سے ملاقات کا خواہش مند ہوں'' آپ نے محافظوں سے کہا تو انہوں نے راجا کے دربار تک جانے کی اجازت دے دی بلکہ دربار تک رسائی کا راستہ بھی اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا۔

من کتم سرہ بلغ مرادہ (جس نے اپنے راز کی حفاظت کی وہ بامراد ہوا) کے مصداق آپ نے اپنے ارادے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ جنگ کا آغاز ہونا ہو تو پیغام رسانوں کی آمد و رفت کوئی اچنبھے والی بات نہیں۔ اہل دربار بھی آپ کو ایلچی ہی سمجھے۔ راجا مروٹ بڑے کروفر سے راج سنگھاسن پر تشریف فرما تھا۔ امرا حسب مراتب براجمان تھے جب آپ نے سون پری کو مناسب فاصلے پر روکا اور اسے بے حس و حرکت کھڑے رہنے کی تلقین کی۔ سون پری آپ کی مزاج شناس تھی۔ لہٰذا حکم عدولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح آپ بڑے وقار سے چلتے ہوئے راجا مروٹ کے قریب جا پہنچے۔

''تو آپ خلق خدا کا خون بہانے سے باز نہیں آئیں گے؟''

حضرت بازیدؒ نے افہام و تفہیم والے لہجے میں کہا۔

''ایلچی! آنے کا مقصد بیان کرو' فضول باتوں کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں'' راجا نے بڑی نخوت سے حکم دیا۔

سب کی نظریں دھوکا کھا گئیں۔ کب شمشیر بے نیام چمکی اور کب راجا کی گردن زد پر آئی کوئی سمجھ ہی نہ سکا بس کوندا سا لپک کر رہ گیا۔ آپ نے ایک ہی وار سے راجا کا سر قلم کر دیا۔ درباریوں کو ہوش اس وقت آیا جب راجا کی سر بریدہ لاش راج سنگھاسن سے ڈھلک کر ایک طرف جا گری اور کٹا ہوا سر حضرت بازیدؒ نے لپک کر پکڑا۔ اہل دربار چند پل تو سکتے میں رہے پھر ایسا شور و غل ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ''لینا' پکڑنا' اپرادھی جانے نہ پائے'' چند ضرورت سے زیادہ وفادار درباری آپ کے اور سون پری کے درمیان حائل ہو گئے۔ حضرت بازیدؒ فن سپاہ گری کے جوہر دکھاتے ہوئے برق رفتار گھوڑی کے پاس آئے' کٹا ہوا سر خرجی میں رکھا اور اچھل کر سون پری پر سوار ہو گئے۔ دونوں کا ذہنی رابطہ قائم ہوا تو گھوڑی کو گویا پر لگ گئے۔ وہ واقعی پری بن گئی۔

یہ بات مستند ہے کہ جب آپ دربار سے باہر آئے تو فصیل شہر کے دروازے بند کر

Marfat.com

دیے گئے۔ یہ دشمن کی ایسی حکمت عملی جوان کے خیال میں ناکام ہوسکتی ہی نہ تھی۔ راجا بے شک قتل ہو چکا تھا مگر قاتل تو موجود تھا۔ لہٰذا خلق خدا اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ سون پری فصیل شہر کے دروازے کی بجائے کسی دوسری جانب بھاگنے لگی تو تعاقب کرنے والے کو اطمینان ہو گیا لیکن شاید وہ سون پری اور شہ سوار کی صلاحیتوں سے ناواقف تھے۔ فصیل شہر قریب آئی تو سوار نے گھوڑی کو اشارہ کیا۔ سون پری نے اس اشارے کا مفہوم سمجھ کر اپنی رفتار میں کئی گنا اضافہ کیا اور پھر ایک محیر العقول واقعہ ظہور پذیر ہوا...... سب کی نظروں کے سامنے گھوڑی نے چھلانگ لگائی یہ جست جنون خیز تھی۔ سون پری، پری کے مانند اڑتی ہوئی فصیل شہر کو عبور کر گئی خلق خدا دنگ رہ گئی۔

جب تک لوگ دروازہ کھول کر اس کا تعاقب کرتے وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ گرد و غبار میں لپٹا ہوا ایک نقطہ سا نظر آ رہا تھا اور نقطے کا وجود ہی کہاں ہوتا ہے؟ صرف لوگوں کے ذہنوں میں...... آوارہ ہوا کا تعاقب حماقت کے زمرے میں آتا ہے لہٰذا راجا مروٹ کے حواری کف افسوس ملتے رہ گئے۔

''جس حکمران کی فوج میں ایسے شیر دل سپاہی موجود ہوں ان سے کون نبرد آزما ہونے کی جرات کرے'' یہی سوچ کر فوج نے ہمت ہار دی۔ جب انسان ہمت ہار دے تو پھر ہارنے کے لیے اس کے پلے کچھ نہیں رہتا۔

جب بازید محمدؒ راجا کا کٹا ہوا سر لیکر ملتان پہنچے تو ملتانی لشکر کوچ کی تیاری میں مصروف تھا۔ لوگوں نے ناظم شہر کو قائل کر لیا تھا کہ یہ خطرناک مہم سر کرنا، تنہا شخص کے بس کی بات نہیں۔

''لیجیے جناب! میں نے فساد کی جڑ ہی کاٹ دی'' آپ نے راجا کا سر ناظم ملتان کو پیش کیا تو سب لوگ ورطہ حیرت میں ڈوب گئے۔ ''آپ حضرت ہتھیار کھول دیں۔ دشمن کی فوج اپنی شکست تسلیم کر چکی ہے۔'' آپ کی یہ بات سب کی سمجھ میں آ گئی۔

یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ اس کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیلی۔ شہنشاہ ہند کو پوری تفصیل ارسال کر دی گئی۔ کہتے ہیں مصوروں نے سون پری کی تصویر بھی دربار میں بھیج دی اس محیر العقول کارنامے کی تفصیل وادی سون سکیسر میں بھی پہنچی، شہ سوار اور گھوڑی کا حلیہ نیز طریقہ کار، ہر شے حضرت بازید کی شخصیت کا اعلان کر رہی تھی۔ اس طرح آپ کے دو برادران نسبتی بی بی راستی کے سگے بھائی ملتان پہنچے اور بازید محمدؒ سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آپ کو

Marfat.com

مراجعت پر زور دینے لگے ''آپ کو اس طرح گھر بار چھوڑ کر روپوش نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' ان کی گفتگو کا یہی لب لباب تھا۔

''نہ میں نے راہ فرار اختیار کی ہے نہ روپوش ہوا ہوں۔'' آپ نے جواب دیا ''میں مکروہات زمانہ کی دلدل سے نکل کر راہ راست پر آیا ہوں۔''

ایک لمبی بحث کا آغاز ہوا۔ برداران نسبتی خالی ہاتھ لوٹنے کے حق میں نہ تھے۔ آپ نے بحث کو ختم کرتے ہو کہا ''آپ واپس جائیں اور اپنی ہمشیرہ سے مشورہ طلب کریں۔ اس کا فیصلہ مجھے بھی قبول ہوگا۔''

بی بی راستی کے برادران خندہ پیشانی سے رضامند ہو گئے۔ یہ گویا حضرت بازیدؒ کی طرف سے رضامندی کے مترادف تھا۔ وہ خوش خوشی واپس لوٹے اور بی بی راستی کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ بی بی راستی چند لمحے آنکھیں بند کر کے سوچتی رہی اور پھر خلاف توقع فیصلہ صادر فرمایا۔ ''یہ سرالٰہی ہے جس کا انکشاف میں کرنے لگی ہوں'' بی بی راستی نے اپنے بھائیوں کو سمجھایا۔ ''میرے وجود میں ایک بلند مرتبت ولی پرورش پا رہا ہے۔ ایسا ولی جو ''اویسی'' ہوگا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے درجات بلند سے بلند تر ہوتے جائیں گے۔ مجھے اس کی جائے پیدائش اور نام سے بھی باخبر کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا بہتر ہے مجھے میرے شوہر کے پاس پہنچا دو۔''

بی بی راستی نوشتہ تقدیر پڑھ کر سنا رہی تھیں اور ان کے بھائی دم بخود سن رہے تھے۔ وہ اپنی زاہدہ عابدہ ہمشیرہ کے مقام سے واقف تھے۔

''مناسب ہے کہ آپ ہمیں اس ہستی سے پیشگی متعارف کرا دیں'' بھائیوں نے دلی خواہش کا اظہار کیا۔

''اس ولی اللہ کا ظہور دریائے چناب کے علاقے میں ہوگا اور وہ میری گود میں کھیلے گا جو میرے لیے باعث صد افتخار بات ہوگی'' ہمشیرہ نے آنے والی ہستی کا تعارف پیش کیا۔ ''اس کا نام ''باہو'' ہوگا جو ایک نقطے کے اضافے سے ''یاہو'' بن جاتا ہے۔ یہ حرف ندا اور ''ضمیر اکبر'' کا حسین امتزاج ہے۔ کلمہ ''ہو'' کے فیض سے یہ کارخانہ قدرت رواں دواں ہے۔ بس اس سے زیادہ تشریح کی اجازت نہیں۔'' اس کلام کے بعد لب کشائی کی گنجائش نہ رہی اور اس طرح بی بی راستی اپنے شوہر کے پاس ملتان تشریف لے گئیں۔

دہلی دربار میں جب ناظم ملتان کی رپورٹ پہنچی تو شہنشاہ ہند بھی حیران و ششدرہ رہ

Marfat.com

گیا۔ وہ خود رزم بزم دیدہ انسان تھا۔ جن مشکلات پر قابو پا کر شہاب الدین شاہ جہاں نے تخت دہلی تک رسائی حاصل کی تھی اس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں۔ بہر حال وہ رسوم جدال و قتال سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے ناظم ملتان کو احکام جاری کیے ''اس نادرالوجود شخصیت کو ہر حال میں عہدہ منصب داری پر بحال کی جائے اور اسے اپنی ریاست کی نگرانی پر مجبور کیا جائے۔''

حکم حاکم مرگ مفاجات کے برعکس حضرت بازید محمد نے ان احکامات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جواز یہی پیش کیا...... ''میں ترک دنیا کی راہ پر گامزن ہو چکا ہوں۔''

حاکم وقت نے آپ کے حسب منشا شورکوٹ کے علاقے میں جاگیر خاص سے نوازا اور آپ بی بی راستی کے ہمراہ شورکوٹ میں رہائش پذیر ہوئے (ریلوے جنکشن، شورکوٹ روڈ کے علاقے میں واقع ہے اور شورکوٹ شہر یہاں سے تقریباً دس میل شمال کی جانب ہے)

ماہ رمضان کی آمد آمد تھی جب ۱۰۳۹ھ کے متبرک و مقدس سال میں سلسلہء قادریہ کا آفتاب عالم تاب دریائے چناب (یعنی چن آب، چن بہ معنی مہتاب) کے علاقے شورکوٹ میں طلوع ہوا۔ بی بی راستی اور والد بزرگوار بازید محمدؒ دونوں بچے کے مقام و مرتبے سے آگاہ تھے۔ اس ''آگاہی'' میں مزید اضافہ ماہ رمضان میں ہوا، بچے کا نام حسب القا ''محمد باہو'' رکھا گیا جو بعد میں ''سلطان العارفین سلطان باہو'' مشہور ہوا۔

یکم رمضان المبارک کا دن تھا جب سحری کے بعد بی بی راستی نے نومولود شیر خوار کو دودھ پلانے کی کوشش کی۔ بچے نے اپنے پھول پنکھڑیوں جیسے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے اور دودھ پینے سے صاف انکار کر دیا۔ والدین حیرت میں ڈوب گئے مگر بی بی راستی اپنی فراست سے بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔

''بچہ پیدائشی ولی ہے، فکر و اندیشے کی کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ افطاری کے بعد دودھ پی لے گا'' والدہ محترمہ نے سب کو تسلی دی اور واقعی افطاری کے بعد بچہ دلی رغبت سے دودھ پینے لگا۔ اس کرامت کا چرچا شہر کے گلی کوچوں میں ہوا اور اہل دل حضرات بچے کی زیارت کو آنے لگے۔

مشائخ امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ خرق عادت واقعات (قوانین قدرت کے خلاف رونما ہونے والے واقعات) وجہ ایمان یا جزو ایمان نہیں ہونے چاہئیں لیکن ان کا تذکرہ، ایمان کی تازگی کا سبب ضرور بنتا ہے۔ اس بنا پر بزرگان دین کی جانب سے ''ظہور کرامت'' کا ہر واقعہ بالتفصیل پیش کیا جاتا ہے۔ خوارق عادات کا یکسر انکار پرلے درجے کی جہالت ہے مگر ان کی روشنی

Marfat.com

میں عملی زندگی سے یا عمل صالحہ سے گریز جہالت کی انتہا ہے۔

سلطان العارفین آغوش مادر میں تھے جب یہ انوکھا واقعہ رونما ہوا۔ پڑوس میں بھگوان داس نامی برہمن رہائش پزیر تھا۔ جو دن رات اٹھتا بیٹھتا دیوی دیوتاؤں کے کارنامے دہراتا رہتا۔ جو بھگوان پریمی کے نام سے مشہور تھا۔ ایک روز الصباح آپ کی دایہ آپ کو لے کر ہواخوری کے لیے نکلی تو بھگوان داس سے ٹکراؤ ہو گیا۔

''شریمتی! یہ کس کا بچہ ہے؟ ذرا درشن تو کراؤ'' بھگوان داس نے بچے کو ایک نظر دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ موسم گل' نغمہ اور بچے کی مسکراہٹ کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا۔ برہمن تو بس ایک نظر بچے کو دیکھنا چاہتا تھا یا شاید کوئی غیر مرئی طاقت اسے نظارگی پر اکسا رہی تھی۔ جونہی برہمن نے بچے کے رخ روشن پر نگاہ ڈالی تو اس کے سینے میں طوفان برپا ہو گیا۔ ہوش و حواس تو قابو میں تھے البتہ زبان پر اختیار نہ رہا۔ وہ ''انہوں نے شبد'' الاپنے لگا۔ اہل ہنود کلمہ طیبہ کو انہوں نے شبد کہا کرتے تھے۔ وہ پشتنی برہمن زادہ' کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ زبان بے قابو ہوئی تو اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ سورج کی روشنی کو ہتھیلی کی اوٹ سے روکنے والی بات تھی' آخر تا بہ کے؟ رفتہ رفتہ دل نے زبان کا ساتھ دینا شروع کیا تو اس نے نعرہ مستانہ بلند کیا۔ ''مجھے بھگوان داس نہیں غلام اللہ کہو غلام محمد کہو لوگو' میں نے ہفت اقلیم کی دولت سے بڑھ کر پا لیا (بھگوان داس کا مفہوم غلام اللہ سے ادا ہوتا ہے) سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ ہندوؤں نے کہا'' برہمن پوتر تھا' ادھرمی ہو گیا' اس کا دماغ چل گیا''۔

برہمن نے کہا'' میرا داؤ چل گیا' میں نرھک (دوزخ) سے سورگ (جنت) میں آ گیا

'بس ایک بار اس پوتر ہستی کا دیدار کرا دو''

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شہر بھر کے غیر مسلم سیانوں کے لئے لمحہ فکریہ تھا۔ '' یہ بچے کا چمتکار ہے' بھگوان اس کے درشن سے سب کو محفوظ رکھے۔'' سب کا یہی متفقہ فیصلہ تھا۔ دو ایک روز بعد یہ واقعہ بصورت دیگر دہرایا گیا۔

سلطان العارفین کی دایہ آپ کو گود میں لیے سودا سلف خریدنے بازار جا رہی تھی۔ جس ہندو کی نظر پڑی اس نے وہی شبد یعنی کلمہ طیبہ کے الفاظ دہرانے شروع کر دیئے۔ شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ غیر مسلم سرکردہ شخصیات کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ جب بار بار ایسے واقعات رونما ہونے لگے تو وہ وفد کی صورت میں حضرت بازید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عجیب و غریب درخواست پیش کی۔ '' جناب آپ اپنی خادمہ کو حکم دیں کہ وہ بچے کو لے کر باہر نہ

Marfat.com

نکلا کرے''۔

ان کی درخواست اگرچہ واہیات قسم کی تھی مگر سلطان العارفینؒ کے والدین اپنی نیک فطرت سے مجبور تھے اور خلق خدا کی دل شکنی کے سخت خلاف تھے۔ لہذا انہوں نے یہ لایعنی قسم کی درخواست بھی قبول کر لی۔ حضرت باہوؒ جب قدم قدم چلنے کے قابل ہوئے تو وہ خود باہر نکل جاتے اور پھر وہی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا جس بت پرست کی نگاہ ان کے رخ روشن پر پڑتی۔ اس کی تاریک دنیا روشن ہو جاتی مگر اس کے لواحقین چلا اٹھتے۔ آخر انہوں نے ایک پائیدار حل تلاش کیا۔ یعنی جب بھی آپ تنہا یا کسی کی ہمراہی میں گھر سے باہر جانے کا قصد کرتے تو شورکوٹ کے گلی کوچوں میں اعلان کرنا پڑتا ''لوگو! باہوؒ گھر سے باہر تشریف لانے والے ہیں' اپنی اپنی حفاظت کا اہتمام کر لو۔''

اس منادی کا اشارہ ہنود کی جانب ہوتا۔ لہذا وہ لوگ دکانوں' مکانوں تاریک گوشوں میں چھپ جاتے جیسے طلوع آفتاب کے وقت خفاشیں (چمگادڑ) تاریکی میں پناہ تلاش کرتی ہیں۔ ایک بار تو بس حد ہوگئی۔ سلطان العارفین کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ شورکوٹ میں ایک حاذق طبیب رہتا تھا جو اتفاق سے برہمن تھا۔ اس سے رابطہ قائم کیا گیا۔ پہلے تو وہ مریض کے علاج پر خندہ پیشانی سے رضامند ہوا مگر جب مریض کا نام بتایا یا تو وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا ''جناب! اپنا دین دھرم کسے عزیز نہیں؟ میں مروت یا چند ٹکوں کی خاطر اپنے دھرم سے ہاتھ دھونے کو تیار نہیں۔ آپ کسی اور سے علاج کروالیں۔''

''مہاراج! علاج تو آپ ہی کو کرنا پڑے گا۔'' باہوؒ کے غلاموں میں سے ایک کو طیش آ گیا۔ ''ہم آپ کی 'واہیات باتیں' تک برداشت کر لیتے ہیں جو ناجائز ہوتی ہیں۔ آپ ہماری جائز بات سے انکار کر رہے ہیں۔''

''مہاراج! یہ تو آپ زبردستی سے کام لے رہے ہیں۔'' طبیب صاحب نے عذر پیش کیا۔

''زبردستی سے تو اب کام لیا جائے گا۔ ہم بغیر اعلان کے' ان کو گھر سے باہر لائیں گے 'اعلان والی شرط منسوخ کی جاتی ہے' ایک غلام باہوؒ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو طبیب منت سماجت پر اتر آیا۔

آخر اس نے خود اس مسئلے کا حل بھی پیش کر دیا ''آپ مجھے مریض کا قارورہ دکھا دیں' میں اسے دیکھ کر تسلی بخش علاج کروں گا۔''

Marfat.com

یہ تجویز معقول تھی۔ لہذا طبیب کے سامنے مریض کا قارورہ پیش کر دیا گیا اور ''انہونی'' ہو کر رہی۔ شورکوٹ کا حاذق طبیب قارورہ دیکھ کر ''انہونے شبد'' دہرانے لگا۔ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد وہ اسی آستانے کا ہو گیا۔ یہ محیر العقول واقعہ ''مناقب سلطانی از شیخ سلطان حامد بن غلام باہو بن سلطان العارفین میں موجود ہے۔

سلطان باہوؒ نے شعور کی آنکھ کھولی تو فصیل جاں پر واردات الٰہی کا آغاز ہوا۔ ایک سرور کی سی کیفیت جسم و جاں پر طاری رہتی جس کے نتیجے میں علوم ظاہری کی طرف توجہ دینا ممکن نہ رہا اور یہی حیران کن بات ہے۔ کیوں کہ آپ کی تصنیفات کی تعداد جن کا سراغ ملتا ہے ایک سو چالیس ہے جو اردو' فارسی' عربی اور پنجابی زبان میں تحریر کی گئیں۔ یہ اکتسابی علم کا کارنامہ ہرگز ہرگز نہیں' علم لدنی ہی کا کمال ہے۔ اپنی معرکہ آرا تصنیف ''عین الفقر'' میں خود فرماتے ہیں ''میں علوم ظاہری کے لیے محمد عربی ﷺ کی طرح کسی کے آگے زانوئے تلمیذ تہہ نہیں کیا۔''

اس زمانے میں بھی یعنی جب تجلیات الٰہی کے نزول کا تھا' آپ نے فرائض تو کیا کبھی کوئی مستحب بھی ترک نہیں کیا۔ سن بلوغت کو پہنچے تو وہ واقعہ پیش آیا جس کی بناء پر آپ کو' اویسی' قرار دیا جاتا ہے۔

غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے سلطان العارفین شورکوٹ کے نواح میں ذکر و فکر میں مشغول تھے کہ اچانک ایک نورانی چہرے والا شہ سوار نمودار ہوا۔ باہوؒ نے صرف ایک نظر آنے والے کے روخ روشن کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ دست وفا پر دل سجا کر پیش کرنے کو تیار ہو گئے۔ آنے والے کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ پلکیں جھپکائے بغیر محو نظارہ رہے تاکہ جلوگی کا تسلسل مجروح نہ ہو جائے۔

''فرزند! میرے قریب آؤ'' سوار نے الفاظ کا رس کانوں میں ٹپکایا تو باہوؒ اس کی شخصیت کے طلسم سے ابھرے اور بھاگ کر رکاب سے لپٹ گئے۔

''آپ ...... آپ کون ہیں؟'' لرزتے لبوں نے حرف مدعا بیان کیا' اندر سے سارا وجود یوں لرز رہا تھا جیسے خزاں رسیدہ پتہ طوفان کی زد پر آ جائے۔

''فرزند لفظ سن کر بھی مزید تعارف کی تمنا ہے؟ میں تمہارا جد اعلیٰ علیؓ ابن ابی طالب ہوں؟۔''

یہ سنتے ہی سلطان باہوؒ کی ازلی بے قراریوں کو قرار آ گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے تشنہ لب

Marfat.com

مسافر کے ہونٹوں سے جام کوثر لگا دیا جائے۔ حیدر کرارؓ نے اپنے فرزند کو پیچھے سوار کرایا اور دونوں منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے۔ سلطان العارفین کا جی چاہتا تھا نطق حیدر سے بار بار استفادہ ہو۔ لہٰذا بارگاہ حیدری میں عرض کی ''حضور! ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

یہ سوال ڈر خوف کا نتیجہ نہ تھا جیسا کہ بعض کتب میں اشارتاً مرقوم ہے۔ یہ سوال نطق حیدر سے لطف اندوز ہونے کی بنا پر کیا گیا تھا۔ کسی بھی خادم کو اپنے آقا سے شرف گفتگو نصیب ہو تو کچھ ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ ہر حیلے وسیلے سے گفتگو کو طول دینا چاہتا ہے یہی لمحات تو حاصل زندگی ہوتے ہیں جب محبوب خود مائل بہ کرم ہو۔

''ہم کائنات کی سب سے بڑی بارگاہ یعنی دربار رسالت ﷺ میں جا رہے ہیں'' حیدر کرار نے جواب دیا۔

سلطان العارفین کی کیفیت کو احاطہ تحریر میں لانا ممکن ہی نہیں۔ نوک خامہ کو ''نطق'' میسر آ جائے تو پھر بھی ناممکن ہے کہ وہ اس کیفیت کا اظہار کر سکے۔

وہ کون سی محفل تھی اور کون کون وہاں تشریف فرما تھا؟ امیر خسرو نے بھی ایک بار اس جلوگی کو قلم بند کرنے کی کوشش کی تھی ''نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم'' کہہ کر خاموش ہو جانا پڑا۔ حواس کی کی مجال کہ اس نظارگی کا حق ادا کر سکیں۔ وہاں تو ہوش و خرد سے پہلے قلب و نظر شکا رہو جاتے ہیں۔ اہل بیت تشریف فرما تھے پھر صدیق اکبرؓ تھے جو ساری امت میں ''ارحم'' کے مقام پر فائز ہیں۔ عمر فاروقؓ تھے جن سے ابلیس لعین خود پناہ مانگتا تھا۔ عثمان غنیؓ تھے جن کے حیا کی گواہی خود رسالت مآب ﷺ نے دی۔ سب نے فرداً فرداً توجہ سے سرفراز فرمایا۔ پھر اہل بیت کی باری آئی۔ بقول سلطان باہوؒ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ سرور کائنات مجھے حیدار کرارؓ کے سپرد فرمائیں گے اور نگاہ حیدرؓ بھی میرے خیال کو تقویت بخش رہی تھی۔ دوسرے علی المرتضیٰؓ ہی میرا وسیلہ بنے تھے مگر میری خوش قسمت کو تو انتہا تک پہنچنا تھا۔ وہ مقام جس کی تمنا ہی کی جا سکتی ہے' سرور کائناتؐ نے بنفس نفیس نگاہ التفات سے سرفراز فرمایا اور اپنے دست مبارک پر بیعت سے نوازا۔ وہ ایک پل جب میرا ہاتھ مولائے کائنات کے دست مبارک میں تھا' مجھے فرش سے اٹھا کر مقام عرش تک لے گیا۔ اس لیے کہ اس کے بعد کوئی بلندی ہی نہیں کوئی مقام و مرتبہ ہی نہیں۔ میرا اول و آخر یکساں ہوا سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ نے فرمایا ''تو میرا فرزند ہے'' پھر میں نے امامین کے قدم چومے' امام حسنؓ اور امام حسینؓ کا طوق غلامی پہنا۔ اس کے بعد سرور کائنات نے مجھے غوث الثقلین کے سپرد

Marfat.com

فرمایا اور اس طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے مجھے رشد و ہدایت کی تلقین سے سرفراز فرمایا۔"

اپنی ایک تصنیف میں سلطان باہوؒ رقم طراز ہیں "میں نے جو کچھ دیکھا' اپنی ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا اور میں اپنے اس ظاہری وجود کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ (یعنی یہ عالم رویا اور نہ چشم تصور کا کرشمہ ہے)

اس فیضیابی کے بعد سلطان العارفین' ہر پل ہر گھڑی' وحدانیت میں مستغرق رہتے۔ یہ ذات مطلق کے جلال و جمال کی مستی تھی جس کی بنا پر باہوؒ عارفین کے سلطان بنے۔ راہ سلوک میں آپ نے مستی کو بلند مقام دیا ہے' فرماتے ہیں۔

تا مست نگروی نکشی بار غم عشق

آرے، آرے شتر مست کشد بار گراں را

(جب تک تو مست نہ ہوگا' غم عشق کا بوجھ اٹھا نہیں سکے گا ہاں! ہاں مست اونٹ ہی بھاری بوجھ اٹھاتا ہے)

سلطان العارفین نے مست اونٹ کی مثال صرف اس لیے دی ہے کہ اونٹ کانٹے دار جھاڑیاں وغیرہ کھا کر بوجھ اٹھانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اسی طرح راہ سلوک کے مسافر روکھی سوکھی کھا کر عشق کا بوجھ اٹھانے میں اپنا جواب آپ ہوتے ہیں۔

سلطان باہوؒ کا زندگی میں دو مرتبہ کھیتی باڑی کے سلسلے میں ہل جوتنا' کتب مناقب سے ثابت ہے اور دونوں بار جتے جتائے ہل چھوڑ کر عشق الٰہی میں مست جنگلوں کی سیر کو نکل گئے اور دنیاوی اثاثہ جس کے ہاتھ لگا' وہ لے اڑا۔ مال و زر کی وقعت آپ کی نظروں میں کیا تھا اس کے لیے ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔ مشائخ کے ہاں تو ویسے بھی زر و جواہر اور پتھر کی حقیقت یکساں ہوتی ہے۔

سلطان باہوؒ بھکر کے علاقے میں مظاہرات قدرت کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ سلطان حمید (یکے از خلفائے باہوؒ) آپ کے ہمراہ تھے۔ نماز ظہر کے بعد سلطان باہوؒ ایک ٹیلے کی اوٹ میں فرش ریگ پر آرام کرنے کی خاطر لیٹ گئے۔ سر مبارک سلطان حمید کے زانو پر تھا۔ تھوڑی دیر بعد سلطان حمید نے دیکھا کہ مرشد کا بدن خاک آلود ہو گیا ہے۔ فرش زمین کا اور چھت آسمان کی تھی۔ ایسا تو ہوتا ہی تھا۔ مگر سلطان حمید مرشد کے بدن کو خاک آلود ہوتا دیکھ کر آب دیدہ ہو گئے کاش میرے پاس دنیاوی وسائل ہوتے تو میں اپنے مرشد کے لیے آرام دہ بستر فراہم کرتا۔ اطلس

Marfat.com

کی چادریں، مخمل کے تکیے ہوتے درو دیوار کو حریری پردوں سے سجا دیتا۔ میرے راہبر کا جسم صرف اس بنا پر خاک آلود ہے کہ میں مفلس وقلاش ہوں۔"

سلطان حمید کے ذہن میں یہ خیالات گردش کر رہے تھے کہ سلطان باھوؒ نے چشم بصیرت سے یہ بساط خیال پڑھ لی۔ آپ نے مرید باوفا کے زانو سے سر اٹھایا اور لب کشا ہوئے "حمید! کیا سوچ رہے ہو؟"

"حضور! اپنی مفلسی کا احساس آج پہلی بار ہوا" سلطان حمید نے فرمایا۔

"اچھا تھوڑی دیر کیلئے آنکھیں بند کر کے نظارہ کرو" باھو نے فرمایا۔

سلطان حمید نے آنکھیں بند کیں تو بس انہیں کھولنا ہی بھول گئے جیسے آنکھ دریچے کھل گئے تو خوشگوار خواب اور دل کش مناظر اڑ جائیں گے۔ ایک سرسبز چمن زار تھا جس میں انواع و اقسام کے پھل دار اشجار تھے جن کی ڈالیاں پھلوں سے لدی، سوئے زمین جھکی ہوئی تھی۔ باغ کے عین وسط میں ایک سفید براق محل تھا۔ سلطان حمید بے دھڑک اس میں داخل ہو گئے۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ نے ان کا استقبال کیا۔ ایک تو اس کا حسن جہاں سوز قیامت کا تھا دوسرے قیمتی زیورات سے سج رہی تھی۔ لباس فاخرہ جو اس نے زیب تن کر رکھا تھا وہ الگ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ سلطان حمید تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

"مجھے آپ ہی کا انتظار تھا" دوشیزہ بڑی رغبت سے سلطان حمید کی طرف بڑھی "یہ مال و دولت یہ چمن زار سب آپ کی نذر کرتی ہوں بشرطیکہ آپ مجھے قبول فرمالیں اور مجھ سے عہد وفا استوار کر لیں۔"

سلطان حمید کوئی عالم خواب میں تو تھے نہیں، شاید ان کے قدم ڈگمگا جاتے کہ اچانک انہیں خیال آیا "میں تو مرشد کی محفل میں ہوں اور ان کا سر میرے زانو پر ہے" وہ فوراً سنبھل گئے "نامراد خاتون دور ہٹ، میں مقام ادب پر ہوں اور اپنے مرشد کی قربت میں اس فعل بد کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ایک نامحرم دوشیزہ کے ساتھ رنگ رلیاں مناؤں" سلطان حمید نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ وہی ٹیلا تھا، وہی فرش ریگ زار، مرشد بدستور محو استراحت تھے۔

"عزیزم! کیا دیکھا؟" باھوؒ نے زیر لب مسکرا کر پوچھا۔

"حضور! جو کچھ ہوا آپ ہی کے طفیل سے ہوا۔ اب آپ ہی دریافت فرما رہے ہیں کیا دیکھا؟"

Marfat.com

''تو قلت مال و متاع پر افسوس کر رہا تھا اور یہی تو دنیا تھی پھر اسے قبول کیوں نہ کیا؟ اگر تو اس سے عہد وفا استوار کر لیتا تو عمر بھر دولت تیرے گھر کی کنیز ہوتی''

''حضور! بات میری سمجھ میں آ گئی تھی مگر میرے لیے آپ کا دامن ہی کافی ہے ''سلطان حمید نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''تو پھر یاد رکھ! فقر محمدی ﷺ کا اثر تیرے خاندان سے کبھی نہیں جائے گا۔''

سلطان العارفین' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح دیدار الٰہی کی تڑپ میں بے قرار رہتے اور'' رب ارنی '' کے کلمات بھی آپ کی زبان سے ادا ہوتے۔ طلب دیدار میں مست لوگ علم دعوت کے حصول کے لئے جس کے وسیلے سے دیدار الٰہی نصیب ہوتا ہے' اولیا کی قبور پر سواری کیا کرتے ہیں (یہ راہ سلوک کے بلند مرتبت مسافروں کا طریقہ کار رہا کرتا ہے اور علم دعوت کی خبر صرف اولیاء اللہ ہی کو ہوتی ہے) سلطان العارفین جب اس بلند مقام پر فائز ہوئے تو کامل اولیاء اللہ کی قبور پر سوار ہوا کرتے تھے۔ ایک بار آپ پیر طریقت عبدالرحمٰن قریشی کی قبر پر سوار ہوئے۔ پیر موصوف' صاحب جلال جمال مشہور ہیں۔ اس سواری کے نتیجے میں باہوؒ کے دونوں پاؤں پر آبلے پڑ گئے۔ گویا زیر زمین سونے والے نے علم دعوت کی شراکت سے انکار کر دیا۔ سلطان العارفین بھی جلال میں آ گئے۔ ''گھر بلا کر یہ بے مروتی ؟'' انہوں نے صاحب مزار سے کلام کیا ''تم نامراد اور لاولد فقیر ہو' ہماری نسل سے کوئی فرد تمہاری قبر پر نہیں آئے گا۔''

تادم تحریر سلطان العارفین کی ۹ ویں پشت زندہ سلامت موجود ہے لیکن کوئی' پیر عبدالرحمن کی قبر پر حاضری نہیں دیتا۔ اگر کوئی حکم عدولی کا ارتکاب کر بیٹھے تو جانی و مالی نقصان اٹھاتا ہے۔

علم دعوت کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے مزار پر پیش آیا۔

سلطان باہوؒ نے چار شادیاں کیں۔ دو ازدواج کا تعلق قبیلہ اعوان سے تھا' تیسری مخدوم برہانؒ کے خاندان سے تھیں اور چوتھی ملتان کے ہندو ساہوکار کی بیٹی تھی جو مشرف بہ اسلام ہوئی۔

بہاؤالدین ابوبکر محمد زکریاؒ ملتانی کے مقام و مرتبے سے کون واقف نہیں۔ سلطان باہوؒ شوق نظارگی میں ان کے مزار پر سوار ہوئے تو قبر میں جنبش ہوئی۔ موصوف بھی زیر زمین محو خواب کے مقام سے بخوبی آشنا تھے مگر مقام نیاز کے بھرم بھرد سے سوار ہو گئے تھے'' مناقب سلطانی '' میں مرقوم ہے کہ جونہی مزار زکریاؒ میں جنبش ہوئی غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی آواز آئی

Marfat.com

''غوث بہاؤ الدین زکریاؒ! یہ فرزند فاطمۃ الزہراؓ' ہمارا محبوب ہے۔ اس سے مہر و محبت کا برتاؤ کرنا اور ہر خواہش کا احترام کرنا'' یہ سننا تھا کہ مزار مقدس پر سکون ہو گیا! اور غوث الملک تربت سے باہر تشریف لائے اور کہا ''فرمایئے جناب! کیا حکم ہے؟''

اس وقت سلطان باہوؒ حالت سکر میں تھے مگر غوث الملک کو دیکھ کر ''صحو'' میں آ گئے اور کہا ''بس آپ نے پوچھ لیا' یہ نوازش ہی کافی ہے۔''

جناب من! یہ غوث الثقلین کی آرزو ہے کہ آپ کی خدمت کی جائے اور ہمارے لیے یہ آرزو حکم کا درجہ رکھتی ہے لہٰذا اپنی خواہش بیان کیجئے''۔ بہاؤ الدین زکریاؒ نے اصرار کیا۔

''اپنے شہر سے ایک پاکیزہ ''بازو'' عطا فرما دیں'' سلطان باہو نے کہا اور جذب و مستی کی کیفیت میں مزار سے باہر نکل گئے۔

شمال کی جانب دریا کنارے پہنچے اور نماز ظہر کے لیے آب رواں سے وضو کرنے لگے تو اچانک ایک دوشیزہ' پریشان حال' آبلہ پا' آپ کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی حالت زار اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ سفر کی عادی نہیں۔ چوں کہ وہ برہنہ پا تھی لہٰذا مسافرت سے پاؤں زخمی ہو چکے تھے۔

''خاتون! تو کون ہے اور مجھ سے کیا کام ہے؟'' سلطان باہوؒ نے استفسار کیا۔

''میں اس شہر کے رئیس کی بیٹی ہوں جو ہندو ہے' دوشیزہ نے صورت حال کی وضاحت کی ''جب آپ غوث الملک کے مزار سے باہر آئے تو میری زبان پر کلمہ توحید آ گیا۔ گویا میرے عزیز و اقرباء سے تمام تعلقات منقطع ہو گئے اور میں بہاؤ الدین زکریاؒ کے حسب ارشاد آپ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ میں وہی پاکیزہ بازو ہوں جس کی آپ نے خواہش کی تھی''

سلطان باہوؒ رضائے الٰہی کے لیے مراقبے میں گئے تو صورت حال کی وضاحت ہو گئی۔ آپ نے قریبی گاؤں کے مسلمانوں کی موجودگی میں شریعت محمدی ﷺ کے عین مطابق اس نومسلم دوشیزہ سے نکاح کیا اور اسے لے کر سوئے شورکوٹ روانہ ہوئے۔

بی بی راستی صاحب بصیرت خاتون تھیں۔ انہوں نے پہلے ہی ازواج باہو کو مطلع کر دیا کہ گھر میں ایک نئے فرد کا اضافہ ہونے والا ہے۔ سلطان باہو گھر میں داخل ہوئے' حسب عادت والدہ محترمہ کی قدم بوسی فرمائی تو بی بی راستی نے ممتا بھرے لہجے میں فرمایا ''بیٹا! تمہاری تخلیق معرفت الٰہی کے لئے کی گئی ہے' اپنے پاؤں میں زنجیروں کا اضافہ مت کرو'' اشارہ بیویوں کی

Marfat.com

طرف تھا۔

''حضور! معرفت الٰہی تو مجھے حاصل ہے۔''

''جس کی تکمیل ابھی باقی ہے'' بی بی راستی نے بڑی گہری بات کی۔ اشارہ ظاہری مرشد کی طرف تھا۔ ''بیٹا جی! راہ سلوک میں ظاہری مرشد کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے بھی قربت الٰہی کے متلاشیوں کو ظاہری مرشد کی پناہ میں ضرور آنا چاہیے۔ تم کو بخوبی علم ہے کہ سیدنا موسیٰؑ ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔ قادر مطلق سے ہم کلامی کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود خضرؑ کی ہمراہی میں ''مجمع البحرین،، گئے (سورۃ کہف میں اس کی تفصیل موجود ہے)

مادر محترم کی گفتگو سن کر سلطان باہوؒ سوچوں میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے نئی دلیل پیش کی۔ ''میرے لئے آپ ہی مرشد ہیں۔''

اگر عورتوں کی ''بیعت و تلقین'' ...... کا حکم ہوتا تو اس سے مناسب ترین ذات ''فاطمۃ الزہرہ بنت رسول ﷺ کی تھی۔ اس کے بعد رابعہ بصریؒ بیعت و تلقین کے مقام پر فائز ہوتیں۔''

یہ لاجواب قسم کی دلیل تھی۔ سلطان باہو نے عرض کی ''مرشد کو کہاں تلاش کروں؟''

''روئے زمین پر'' مادر مہربان نے مشرق کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ آپ نے نئی نویلی دلہن کو اسی حال میں چھوڑا اور والدہ کے حسب ارشاد سوئے مشرق روانہ ہوئے۔

دریائے چناب کی زمین پیچھے رہ گئی اور سرزمین راوی کا آغاز ہوا جہاں شاہ حبیب اللہ قادری کا شہرہ تھا اور موصوف کا بسیرا ''بغداد'' نامی گاؤں میں تھا۔ سلطان باہوؒ بارگاہ حبیب اللہ میں حاضر ہوئے۔

شاہ حبیب اللہ کا طریقہ کار منفرد قسم کا تھا۔ پانی کی ایک دیگ تلے آگ دہکائے رکھتے' جو طالب حق حاضر ہوتا' اسے کھولتے پانی میں ہاتھ ڈالنے کا حکم صادر فرماتے۔ وہ ہاتھ ڈالتے ہی صاحب کشف ہو جاتا۔ سلطان العارفین نے یہ کرشمہ ملاحظہ فرمایا تو پانی میں ہاتھ ڈالنے سے گریز کیا اور لب بستہ ایک گوشے میں بیٹھے رہے۔ تنہائی میسر آئی تو آپ نے مدعا بیان کیا۔

''درویش! تم نے دیگ میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالا؟'' شاہ حبیب اللہ نے دریافت فرمایا ''دیگ میں ہاتھ ڈال دیتے تو منزل مراد تک پہنچ جاتے۔''

''حضور! میں ان مقامات سے عرصہ ہوا گزر چکا ہوں، میری منزل بہت آگے ہے'' باہوؒ نے مودب لہجے میں کہا۔

Marfat.com

شاہ حبیب اللہ نے چونک کر نو گرفتار کو دیکھا اور سوچ میں ڈوب گئے "درویش تم کو چند روز مجاہدہ کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی۔" شاہ موصوف نے فرمایا "تا حکم ثانی مسجد میں پانی بھرنا ہو گا"

باہوؒ تعمیل ارشاد میں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور لنگر کے خدام سے ایک مشک طلب فرمائی۔ سقاوے میں ایک ہی مشک ڈالی تو ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ خدام حیرت میں ڈوب گئے۔ فوراً صورت حال شاہ حبیب کے گوش گزار کی گئی۔ انہوں نے سلطان باہوؒ کو طلب کیا۔

"درویش! یہ مشک والا کیا معاملہ ہے؟"

"حضور! مجھے پانی بھرنے کو کہا گیا تھا، مشکوں کی تعداد معین نہ تھی" سلطان باہوؒ نے جواب دیا۔

"تمہاری ملکیت میں متاع دنیا تو ہو گی؟" دوسرا سوال کیا گیا

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"ایک میان میں دو تلواریں کیسے سما سکتی ہیں؟" شاہ حبیب اللہ نے کہا "مناسب یہی ہے، پہلے گھر جاؤ اور متاع دنیا سے نجات حاصل کرو۔"

سلطان باہوؒ تعمیل ارشاد کے لیے گھر واپس آئے۔ ادھر بی بی راستی نے اپنی بہورانیوں سے فرمایا "میرا بیٹا متاع دنیا سے نجات حاصل کرنے گھر لوٹ رہا ہے، اپنے زیورات ادھر ادھر چھپا دو کہ زیب و زینت مستورات کا حق ہے۔" انہوں نے ایسا ہی کیا۔

سلطان العارفین گھر میں داخل ہوئے تو بی بی راستی نے جلد لوٹ آنے کی وجہ دریافت کی۔

"شیخ نے دنیاوی مال و متاع سے نجات حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔"

"ٹھیک ہے! جو کچھ نظر آئے اسے راہ خدا میں خیرات کر دو" بی بی راستی نے اجازت دے دی۔

اس وقت سلطان باہوؒ کے فرزند اکبر نور محمد، عالم شیر خوارگی میں تھے اور گہوارے میں کھیل رہے تھے۔ بچے کی انگلی میں نظر بد سے بچاؤ کی خاطر دھات کی انگوٹھی تھی جو اتار کر پھینک دی گئی پھر حضرت باہوؒ نے ادھر ادھر دیکھا اور ہوا میں سونگھ کر کہا "مجھے طلائی زیورات کی بد بو آ رہی ہے۔ اجازت ہو تو ان سے بھی نجات حاصل کر لی جائے؟"

Marfat.com

''بیٹا! میری طرف سے اجازت ہے''

مادر مہربان نے اجازت دی تو آپ نے سارے زیورات تلاش کر کے خیرات کر دیئے اور شاہ حبیب اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

''مال سے فارغ ہو لیے' اپنی ازدواج کا کیا کرو گے؟ یکسوئی سے حقوق اللہ کی ادائیگی مطلوب ہے تو جا کر ان کو بھی آزاد کر دو۔''

حکم کی نوعیت زیر بحث نہیں کہ وہ جائز تھا یا ناجائز۔ بس مرشد کا حکم تھا لہذا آپ پھر گھر واپس آئے اور ایک بار پھر بی بی راستی نے ازدواج باہو کو اکٹھا کیا اور فرمایا ''تمہارا شوہر اپنے مرشد کا حکم بجالانے گھر آ رہا ہے اور اس بار تم سب سے قطع تعلق کے ارادے سے آ رہا ہے۔ تم فوراً میری اوٹ میں چھپ جاؤ' ایسا نہ کہ دیدار الٰہی کی تڑپ میں وہ شرعی کلمات ادا کر بیٹھے اور تم سب پر طلاق واجب ہو جائے۔''

چاروں خواتین نے ایسا ہی کیا۔ نئی دلہن تو ساس کی پشت سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ سلطان باہو گھر میں داخل ہوئے تو بی بی راستی نے فوراً پوچھا ''بیٹا! کس ارادے سے آئے ہو؟''

''حقوق الزوجین سے نجات حاصل کرنے'' آپ نے مختصر جواب دیا۔

''کوئی قدم اٹھانے سے پیشتر میری بات غور سے سنو'' بی بی راستی نے سنجیدگی سے کہا ''تمہاری ازدواج کے وہ حقوق جن کا تعلق نان ونفقے سے ہے' ان سے تم کو آزاد کیا جاتا ہے۔ باقی حقوق بدستور قائم رہیں گے۔ تم دلی رغبت سے' ہر قسم کے فکر اندیشے کو بھول کر' اپنی منزل کی جانب پیش قدمی جاری رکھو۔ کامیاب لوٹو گے تو یہ تعلقات بھی بدستور قائم رہیں گے' ناکامی کی صورت میں خود فیصلہ کر لینا اور ایک خوش خبری مزید سن لو کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب و کامران لوٹو گے۔''

مادر مہربان کا مشورہ ہر لحاظ سے مناسب اور حکمت و دانائی سے پُر تھا ویسے بھی آپ والدہ کی حکم عدولی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

''ایک بات میری بھی اپنے مرشد کے گوش گزار کر دینا'' بی بی راستی نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ''شاہ حبیب اللہ نے جو دیگ سجا رکھی ہے وہ سوزن عیسیٰؑ سے بہت زیادہ وزنی ہے اور اس متاع دنیا کا کوئی جواز بھی نہیں اب تم جا سکتے ہو' فی امان اللہ۔''

بی بی راستی کا اشارہ اس مکالمت کی طرف تھا جس کی وجہ سے ان کا فرزند بلا جواز اپنی

Marfat.com

ازدواج کو آزاد کرنے پر تل گیا تھا۔ یہ تمام واقعات بی بی صاحبہ کے بلند مقام کا منہ بولتا ثبوت بھی ہیں۔

لاہور پہنچے تو آپ نے ساری روداد من وعن مرشد کے گوش گزار کی۔ شاہ حبیب اللہ نے بھی اسے قبول کیا اور سلطان العارفین کی تربیت کا آغاز ہوا۔ نظر کاملہ سے توجہ فرمائی گئی۔ واردات کا القا وغیرہ ہوا۔ ان مناسک سے فارغ ہوئے تو مرشد نے احوال دریافت کیا ''عزیزم! انکشافات کیسے لگے؟''

حضور! جن مقامات کا طرف آپ اشارہ کرر ہے فرمار ہے ہیں ان سے تو میں عالم شیر خوارگی میں گزرا تھا' گہوارے میں ان ہی سے دل بہلایا کرتا تھا۔''

یہ اتنی بڑی حقیقت تھی جسے شاہ حبیب اللہ ہضم کر ہی نہیں سکتے تھے ''عزیزم! تم بہت بڑا دعویٰ کرر ہے ہو اس کی آزمائش بھی کی جا سکتی ہے۔''

''حضور کو اختیار ہے' آزما دیکھیں'' سلطان باہوؒ نے مودب لہجے میں جواب دیا۔

مناقب سلطانی' تذکرہ اولیائے پنجاب وغیرہ میں مرقوم ہے کہ شاہ حبیب اللہ بیٹھے بیٹھے غائب ہو گئے تو سلطان باہو بھی ان کے تعاقب میں پرواز کر گئے۔ ایک اجنبی دیس کے جنگل کنارے آپ نے شاہ صاحب کو ایک عمر رسیدہ شخص کے روپ میں جالیا جو بیلوں کی جوڑی لیے ہل جوتنے جارہے تھا۔ آپ خرقہ پوش فقیر کے بھیس میں اچانک شاہ صاحب کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

''بابا! آپ اس عمر میں کڑی مشقت سے گریز فرمائیں' لایئے میں آپ کی جگہ ہل چلاتا ہوں'

شاہ صاحب اپنے اصلی روپ میں آ گئے اور خجل خجل سے باہوؒ کے ساتھ چلنے لگے۔

اس آنکھ مچولی کا از سر نو آغاز ہوا۔ اس بار شاہ صاحب غائب ہو کر ہندوؤں کے ایک متبرک شہر جا پہنچے۔ اب وہ ایک برہمن کے بھیس میں تھے۔ سیندور سے بھرا ہوا برتن ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ ایک مندر کے سامنے کھڑے دیوی درشن کے شائقین کی خدمت فرمارہے تھے۔ ہر پجاری کے ماتھے پر تلک لگاتے اور آشیرواد بھی دیتے۔ سلطان العارفین بھی ایک نوعمر ہندو کی ہیئت کذائی میں ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

''بابا! اس پیشانی کو بھی چھاپ تلک سے مزین فرمادیں'' یہ سنتے ہی شاہ صاحب

Marfat.com

مسکرانے لگے۔اصولاً بات یہیں ختم ہو جانی چاہئے تھی مگر شاید حبیب اللہ آخری حد تک جانا چاہتے تھے۔لہٰذا وہ تیسری بار پھر غائب ہو گئے اور کسی دور دراز شہر کی غیر معروف سی مسجد میں بچوں کو قرآن پڑھانے میں مصروف دکھائی دیئے سلطان باھوؒ ایک ننھے بچے کی شکل میں قاعدہ ہاتھ میں لیے ان کے سامنے دوزانو جا بیٹھے ''بابا! مجھے بھی سبق پڑھادیں''

شاہ صاحب مسکرانے لگے اور سلطان العارفین سے مخاطب ہوئے ''درویش! جس منزل کے تم مسافر ہو اس کی راہنمائی ہمارے بس کی بات نہیں ۔البتہ ہم اس منزل کی نشان دہی ضرور کر سکتے ہیں ۔تم ہمارے پیر طریقت سید عبدالرحمٰن دہلوی کی خدمت میں پہنچ جاؤ اور اپنا ''نصیب'' وصول کرلو۔''

اویسی مشائخ کو ہر زمانے میں یہ مسئلہ درپیش ہوتا رہا ہے کہ مرشد کامل کی تلاش ایک کڑی آزمائش سے کم نہیں ہوتی ۔ان کا تو آغاز ہی اس مقام سے ہوتا آیا ہے جو اکثر مشائخ کا مقام انتہا تھا مگر ظاہری مرشد سے تعلق استوار ہونا بھی ضروری تھا۔لہٰذا وہ اپنے سے کم تر مقام و مرتبے والے شیخ کے آگے زانوے تلمذ تہ کرنے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔دوسرے یہ ضروری نہیں کہ ہر مرید ہمیشہ اپنے مرشد سے کم تر رہے۔کتنے لوگ ہیں جو غوث الثقلینؒ کے مرشد ابوسعید مخرومی سے آگاہ ہیں یا شاہ حسینؒ کے مرشد ابوبکر بھگویؒ اور بہلول دریائیؒ سے۔حضرت میاں میرؒ بالا پیرؒ کے مرشد حضرت خضر سیستانیؒ کے سلسلے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے'اس کے برعکس کون ہے جو غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ شاہ حسینؒ یا حضرت میاں میرؒ کے مقام و مرتبے سے ناآشنا ہے۔اول الذکر بزرگان دین اوج ثریا پر فائز تھے۔اس لب کشائی کی گنجائش نہیں مگر اس عالم امکان میں شہرت کے اعتبار سے وہ اپنے مریدان باوفا سے بہر حال کم تر ہیں۔غوث الاعظم نے تو اعلان کر دیا تھا ''میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے''اس زمانے میں آسمان سلوک کے کیسے کیسے آفتاب و مہتاب موجود تھے۔یہی مسئلہ سلطان العارفین کو درپیش تھا۔بہر حال انہوں نے لاہور سے دہلی کا سفر اختیار کیا۔

آزمائشوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جس سے موصوف کو گزرنا پڑا۔اوتاد و ابدال اور مجذوبوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ان میں جلالی و جمالی ہر نوع کے مشائخ تھے۔بہر حال سلطان باھوؒ کسی سے الجھنا نہیں چاہتے تھے۔منزل و دعوت نظارہ دے رہی تھی اور آپ کشاں کشاں بحر اشتیاق میں ڈوبے محو مسافرت تھے۔اس عالم شوق میں سلطان العارفین اپنے عشاق سے البتہ غافل نہ

Marfat.com

تھے۔ دہلی ابھی دور تھی کہ ایک روز عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

بھکر میں سلطان حمید آپ کے خادم خاص ذکر و فکر میں مشغول تھا کہ ایک مست الست مجذوب کہیں سے آنکلا ''واہ مولوی صاحب! کیا دکان سجا رکھی ہے۔'' مجذوب نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ سلطان حمید کی کمر پر اس نے پوری قوت سے لاٹھی دے ماری۔ سلطان موصوف بے ہوش کر گر پڑے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

''رقص بسمل، رقص بسمل'' مجذوب قہقہے لگاتا اسی کی گردان کرنے لگا پھر اچانک اس نے زمین بوس سلطان حمید کی پشت پر دوسرا وار کرنے کے لیے لاٹھی بلند کی مگر اس کی کلائی مضبوط ہاتھ میں آ گئی اور ساتھ ہی ایک سرزنش بھری آواز سنائی دی ''درویش رک جاؤ' یہ وار تمہیں مہنگا پڑے گا۔''

درویش کی مستی ہرن ہوگئی۔ سلطان العارفین اس کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بغور اسے دیکھنے لگے۔

''ہم لوگ بھی اہل ''صحو'' ہیں اور فضول بدمزگی کے قائل نہیں'' سلطان باہوؒ نے کہا ''مناسب یہی ہے کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ ہم آپ کی پہلی خطا معاف کیے دیتے ہیں۔''

مجذوب کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی پھر رفتہ رفتہ وہ حالت اعتدال پر آ گیا۔ اور سر جھکا کر منظر سے غائب ہو گیا۔ سلطان باہوؒ اپنے خادم کی طرف متوجہ ہوئے تو فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور حیران و ششدر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''اگر وہ مجذوب دوسرا وار کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ اپنے گرد و پیش سے باخبر رہا کرو'' سلطان باہوؒ نے تلقین کی۔

دہلی کی فصیل شہر سامنے تھی۔ باہوؒ کے قدم برق رفتاری سے اٹھنے لگے۔ ادھر سید عبدالرحمٰن دہلوی کو خبر ہو گئی۔ انہوں نے اپنے ایک درویش کو طلب کیا ''بڑی لمبی مسافت طے کر کے ایک مہمان آ رہا ہے'' پھر سید موصوف نے سلطان العارفین کا حلیہ بیان کیا۔ ''اسے عزت و احترام سے ہمارے پاس لے آؤ''

سلطان العارفین اس بدرقہ (زبان و تصوف میں وسیلہ' محافظ وغیرہ) کی ہمراہی میں پیر طریقت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ادھر بھی آتش شوق برابر دہک رہی تھی۔ ملاقات ہوئی تو سید 'مہمان کو لے کر خلوت نشین ہو گئے۔ طالب و مطلوب ایک ہوئے۔ صدیوں کی مسافتیں پلوں

Marfat.com

میں طے ہونے لگیں۔ قیل وقال کی منزل بہت پیچھے رہ گئی۔ ہر لحہ ہر گھڑی حال ہی حال تھا۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(اے کہ تجھ سے ملاقات' ہر سوال کا جواب ہے۔ یہاں ہر مشکل قیل وقال' بحث وتمحیص کے بغیر حل ہو جاتی ہے)

یہ ملاقات مختصر سی تھی مگر سلطان باہوؒ نے اپنے حصے کا سب کچھ وصول کر لیا۔ یہ جمعہ کا مبارک دن تھا اور سلطان العارفینؒ دہلی کے گلی کوچوں میں خرام ناز بکھیر رہے تھے۔ ہر خاص و عام ''توجہ'' کا مستحق قرار پایا۔ نعمت خاص تھی جو طلب کیے بغیر عوام میں تقسیم ہو رہی تھی۔ چشم فلک کے لیے یہ نظارہ حیران کن تھا۔ عطا تو ہمیشہ طلب سے مشروط ہوا کرتی ہے اور یہاں سے ہر شخص مستفید و مستفیض ہو رہا تھا۔ خلق خدا کا ہجوم بے کراں تھا کہ شہر کے راستے بند ہو گئے اور دھوم مچ گئی۔

سید صاحب کا بے خبر رہنا ناممکن تھا۔ درویشوں نے من و عن ساری روداد سید موصوف کے گوش گزار کی۔

''فوراً اسے پکڑ کر ہمارے پاس لاؤ ورنہ انہونی ہو جائے گی۔ عوام الناس کا ظرف اتنا وسیع نہیں ہوتا کہ اس کیفیت کی جذب و مستی کو برداشت کر سکے'' سید موصوف نے حکم دیا۔ ہرکارے دوڑائے گئے اور سلطان باہوؒ آستانہ عالیہ پر حاضر ہوئے۔

''درویش! یہ کیا غضب ڈھا رہے ہو؟ ہر کس و ناکس نصیحت خاص کا مستحق کیسے ہو گیا؟ ہم نے یہ نصیحت خاص تمہیں عطا کی اور تم نے اسے عام کر دیا'' سید صاحب کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''حضور! ایک بڑھیا روٹی پکانے کا توا خریدتی ہے تو اسے ٹھوک بجا کے دیکھتی ہے۔ سلطان باہوؒ نے جواب دیا'' ایک نادان لڑکا کھیل کود کیلئے کمان خریدتا ہے تو اسے کھینچ کر تان کر اس کی لچک کا اندازہ لگاتا ہے' میں بھی آپ کی نصیحت عظمیٰ کو پرکھ رہا تھا۔ آپ فکر نہ کریں انشاء اللہ آپ کی عطا کردہ نعمت رو بہ زوال نہیں ہو گی' تاقیامت ترقی پذیر رہے گی۔''

سید عبدالرحمٰن قادریؒ کی تسلی ہو گئی اور انہوں نے خندہ پیشانی سے رخصت عطا کی

........آپ پھر بازار میں گئے........

جیسا کہ عرض کی جا چکا ہے کہ وہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ سلطان باہوؒ نماز جمعہ کی

Marfat.com

ادائیگی کے لیے جامع مسجد دہلی میں داخل ہوئے۔ جہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ شہنشاہ دہلی محی الدین اورنگ زیب عالم گیر ارکان سلطنت کے ہمراہ مسجد میں موجود تھا۔ ہجوم بے کراں کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ آپ خاموشی سے دروازے کے پاس جوتیاں رکھنے کی جگہ پر کھڑے ہو گئے ۔نمازیوں کو ''ہدف توجہ'' بنایا تو گویا کہرام مچ گیا۔ ہر شخص وجد میں آ کر جھومنے لگا۔ صرف تین حضرات نگا تاثیر سے محروم رہے۔ کوتوال شہر۔ قاضی اور خود شہنشاہ اورنگزیب۔

اورنگزیب کے متعلق یہ تاثر عام ہے کہ وہ احکام شریعت کی سختی سے پابندی کیا کرتا تھا۔ یہ بات حرف بہ حرف سچ ہے۔ دوسرا تاثر یہ ہے کہ وہ صوفیائے کرام کے سخت خلاف تھا۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ وہ صرف مبتلائے مکروفریب صوفیا کا جانی دشمن تھا۔ البتہ احیائے اسلام کا صدق دل سے حامی و مددگار تھا جسے ہندو برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ بنا بریں اسے متعصب و تنگ نظر مشہور کر دیا گیا۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں اس کا سب سے بڑا جرم' داراشکوہ کا قتل تھا جسے ہندو وسیع ظرف والا' کشادہ دل انسان کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ قتل اس کی بدنام زمانہ تصانیف مجمع البحرین اور سراکبر کی پاداش میں وقوع پزیر ہوا۔ اس کی تفصیل حضرت میاں میر بالا پیرؒ کے ذیل میں بیان کی گئی ہے۔ اس لیے یہاں اس کے ذکر سے گریز کیا جاتا ہے۔

جب تین حضرات نگاہ باہوؒ سے محروم رہے تو اورنگ زیب کو اس کا بڑا دکھ ہوا۔ اس نے دست بستہ عرض کی ''مرد خدا! یہ ''امتیازی'' سلوک کس لیے؟ کس تقصیر کی بنا پر ہمیں محروم رکھا گیا؟۔''

''ہم نے ہر خاص و عام پر بلا امتیاز توجہ کی مگر تم لوگ ضرورت سے زیادہ سخت دل ہو' گدازی کی کمی کے باعث تم پر اثر نہ ہو سکا'' باہوؒ نے جواب دیا۔

''اگر یہی وجہ ہے تو پھر ہم گویا خصوصی توجہ کے مستحق ہیں تا کہ گداز کی کمی، کرم کی فراوانی سے دور کی جاسکے'' اورنگ زیب نے اصرار جاری رکھا۔

''ہم ایک شرط پر خصوصی توجہ کے لیے تیار ہیں'' سلطان العارفینؒ نے فرمایا۔

''مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے'' اورنگ زیب ہر حیلے وسیلے سے نگاہ التفات کا حصول چاہتا تھا۔

''تم اور تمہاری اولاد' ہماری نسل کو دنیاوی مال و دولت سے محروم رکھے اور ہم سے حتی الوسع دور رہے'' سلطان باہوؒ کی یہ عجیب وغریب شرط سن کر لوگ حیران و ششدر رہ گئے مگر اورنگ

Marfat.com

زیب کی نگاہوں میں درویش کی قدر و منزلت کی حد نہ رہی۔اس نے صدق دل سے تعمیل ارشاد کا یقین دلایا تو نگاہ لطف و کرم سے سرفراز ہوا۔

درویش رخصت ہونے لگا تو شہنشاہ وقت نے بڑے ہی عاجزانہ انداز میں درخواست پیش کی۔''اس نگاہ کرم کو یادگار بنانے کی خاطر بندہ ناچیز کی تمنا ہے کہ آپ کچھ ارشاد فرمائیں۔''

چنانچہ سلطان العارفینؒ نے وہیں کھڑے حکمت و دانائی کے موتی لٹانے شروع کیے۔زبان درویش سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ' شاہی محرروں نے قلم بند کر لیا۔ان فرمودات باہو کا نام''کتاب اورنگ شاہی'' ہے۔اورنگ زیب نے اس''ارشاد نامے'' کو عمر بھر اپنے سے جدا نہ کیا۔اس کے بعد درویش بے ریا نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

وقت کے ساتھ اورنگ زیب کی قدر و منزلت سلطان العارفینؒ کے دل میں بڑھنے لگی۔اس کی زندگی کا دینی پہلو آپ کو پسند تھا چنانچہ فرماتے ہیں۔

''سلطان بادشاہ خلائق پناہ محی الدین اورنگ زیب عالم گیر' بادشاہ غازی' عادل' بادل زاہد' عابد' واقف اسرار ربانی' آگاہ علم سبحانی۔''

اپنی تصنیف''کلید التوحید'' اور''امیر الکونین'' کی ابتدائی سطور میں بھی سلطان باہوؒ نے اورنگزیب کے لیے تعریفی کلمات رقم کیے ہیں۔

دہلی سے واپسی کے سفر کا آغاز ہوا۔راستے میں ایک جگہ آپ ایک شجر سایہ دار تلے بیٹھے آرام فرما رہے تھے کہ ہندو سنیاسیوں کی ایک ٹولی ادھر سے گزری۔ان کے گرو نے قریب آ کر بڑی نخوت سے آپ کو پاؤں کی ٹھوکر رسید کی اور کہا''او! خواب غفلت میں سونے والے انسان اٹھ اور ہمیں راستہ بتا'' وہ سنیاسی کسی مندر کا راستہ پوچھ رہے تھے۔

''مجھے تو ایک ہی راستے کی خبر ہے'' سلطان باہوؒ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا''کہو تو اس سے مطلع کر دوں؟''

سنیاسیوں کا رہنما حیرت زدہ سا ان مسحور کر دینے والی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔اتنے میں آپ اپنا وار کر گئے اور بڑے دھیمے انداز میں کلمہ توحید پڑھنے لگے۔نفی سے اثبات تک آئے پھر مقام رسالت ﷺ کا آغاز ہوا۔ادھر سنیاسی راہ نما آپ کے''نقش پا'' پر چلنے لگا اور عجیب بات یہ ہوئی کہ سارا گروہ بیک زبان کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ان میں سے اکثر مقام ولایت پر فائز ہوئے۔

Marfat.com

مشائخ سلسلہ قادریہ میں سلطان العارفین تصنیف وتالیف کے اعتبار سے سرفہرست قرار دیے جاسکتے ہیں۔آپ کے خلیفہ سید ابو صالح موسیٰ المعروف مومن شاہ گیلانیؒ نے آپ کی ایک سو چالیس کتب کو جمع کیا۔یہ وہ تصانیف ہیں جن کا سراغ مل سکا اور جو کتب زمانے کی دست و برد سے محفوظ نہ رہ سکیں ان کے متعلق خدا بہتر جانتا ہے چیدہ چیدہ کتب درج ذیل ہیں۔

عین الفقر کبیر' صغیر و متوسط' عقل بیدار (کبیر وصغیر) تلمیذ الرحمٰن مجالستہ النبی' بحث الاسرار' اسرار قادری' توفیق الہدایت' تیغ برہنہ' مجموعتہ الفصل' محک الفقرا (کبیر وصغیر) فض اللقا' شمس المعارفین' دیوان باہو کبیر و دیوان باہو صغیر' رسالہ روحی' اورنگ شاہی' امیر الکونین' جامع الاسرار' مفتاح العاشقین' قرب دیدار' نور الہدیٰ' عین النجا' قطب الاقطاب' محکم الفقرا' کشف الاسرار' اور شمس العاشقین۔

درج بالا کتب قصے کہانیوں پر مشتمل نہیں بلکہ ان میں احوال فقر' شریعت' طریقت' حقیقت' معرفت الٰہی' ذکر وفکر کے اشغال' مراقبہ اور علم دعوت جیسے موضوعات پر مدلل بحث کی گئی ہے۔اردو' پنجابی فارسی شاعری کے دیوان الگ ہیں بعض کتب میں دقیق علمی بحث کی گئی ہے۔ایسی نکتہ آفرینیوں سے پالا پڑتا ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے مثلاً محبت اور دوستی کو زیر بحث لاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''وصال محبوب سے آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔دل اور آنکھ کا مزاج بنیادی طور پر ''گرم'' ہوتا ہے اور ان میں کمال درجے کی حرارت پائی جاتی ہے یہی وجہ کہ قدرت نے آنکھوں کو پانی سے بھرے ہوئے چشم خانے میں رکھا ہے۔آنکھوں کو سرد ہوا کا احساس زیادہ ہوتا ہے کیوں کہ گرمی' سردی دونوں مخالف قوتیں ہیں جن میں انتہا درجے کی کشش ہوتی ہے۔''

''دل کو پھیھڑوے کا پنکھا عطا کیا گیا ہے۔جو ہر پل ہر گھڑی اسے تازہ ہوا بہم پہنچاتا ہے' جس کے مختلف دریچوں سے اندر باہر کا رستہ استوار ہوتا ہے۔دل کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے شریانوں کے بلند پایہ نظام کے ذریعے سرد اور تازہ ہوا (آکسیجن وغیرہ) پہنچائی جاتی ہے اور دل بھی آنکھ کی طرح ہر وقت رطوبت میں غوطہ زن رہتا ہے' گرمی دل سے سینہ گرم رہتا ہے اور سینے کی برودت مساموں کے راستے دل تک پہنچتی رہتی ہے۔سینہ دل کا مجاور اور اس کا زندہ غلاف ہے۔''

ایک بار محفل رشد وہدایت میں سلطان حمید نے مرشد سے سوال کیا ''نماز میں صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی تکرار کیا نقص ایمان کا اعلان ہے؟۔''

Marfat.com

آپ نے ایسا مدلل جواب دیا جو تا قیامت مشعل راہ ثابت ہوگا۔آپ نے فرمایا "اھدنا الصراط لمستقیم (دکھا ہم کو سیدھا راستہ) کی تکرار نقص ایمان کی نہیں محب کی بے تابی دل کی علامت ہے۔محب اور محبوب کے درمیان مختصر ترین راستہ وہی ہے جو سیدھا ہوا اور وصال محبوب میں ایک پل کی دیر بھی محب پر گراں گزرتی ہے۔دوسرے چشم تماشا خوب سے خوب تر کی متلاشی ہوتی ہے یعنی مختصر ترین راستے کی تلاش اور اس تلاش میں جدوجہد اور تڑپ محب کے جذبہ صادق کی دلیل ہے۔

''جب سالک کے مقامات میں ترقی ہوتی ہے تو بسا اوقات وہ تجدید ایمان تک کا اعلان کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ پہلے حالت کفر میں تھا۔حضرت بایزید بسطامیؒ کو ستر مرتبہ دیدار الٰہی نصیب ہوا۔رویت حق کے مراقبے سے سر اٹھاتے تو مسجد میں جا کر از سر نو تجدید دین فرماتے فلما افاق سبحانک تبت الیک و انا اول المومنین (پس جب افاقہ ہوا تو کہا تو پاک ہے میں تیری طرف تائب ہوتا ہوں اور میں پہلا مومن ہوں) والی بات صادق آئی''

''بایزید بسطامیؒ اپنے پہلے مقام کو بعد والے مقام کے مقابلے میں غفلت وحجاب تصور کرتے تھے اور اہل دل کے ہاں ''غفلت'' مقام کفر سے زیادہ دور نہیں ہوتی۔یہی وجہ کہ رویت حق کے فوراً بعد آپ از سر نو تجدید دین فرماتے اور ایسا ستر مرتبہ ہوا۔''

دیدار الٰہی سے آنکھیں چندھیا جانا اور ہوش وحواس سے بے گانہ ہو جانا سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں جبکہ جزو کے اندر کل سمانے والی بات ہے جو محال ہے کیوں کہ طالب ومطلوب کے ''مقام'' میں کوئی نسبت ہی نہیں یہاں تو ''حیرت'' سے سینہ پھٹ جانا چاہیے۔

تو وچشمے کہ زدلہا گزرہ مژگانش

من و دز دیدہ نگاہے کہ بمژگاں نہ رسند

(ایک تو اور تیری آنکھیں ہیں جن کی پلکیں دلوں کے آر پار ہو جاتی ہیں ایک میں ہوں اور میری دزدیدہ نگاہیں جو پلکوں تک بھی نہیں پہنچ پاتیں)

ایسی صورت حال میں محب ومحبوب کا موازنہ کس طرح ممکن ہے بلکہ ایسا کرنا ہی نادانی ہے۔

یہ بات مستند ہے کہ دنیاوی کاروبار کے سلسلے میں آپ کو کھیتی باڑی پسند تھی۔یہ الگ بات کہ اس سے ڈھیروں فائدے حاصل کرنا مقصود نہ تھا۔جس زمانے میں آپ اس شغل کی جانب راغب تھے ایک ایسی کرامت کا ظہور ہوا جو آج بھی اس علاقے کے بچے بچے کی زبان پر

Marfat.com

ہے۔

ایک خاندانی شخص مفلسی کا ایسا شکار ہوا کہ سفید پوشی کا بھرم رکھنا دشوار ہو گیا۔فقر و فاقہ میں بسر ہونے لگی' دروازے پر قرض خواہوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔وہ ایک بزرگ کے آستانے پر حاضر ہوا اور مصیبت احوال بیان کر کے معاونت کا طلب گار ہوا۔

''اس مشکل وقت میں بس ایک شخص تمہارے کام آ سکتا ہے'' بزرگ نے داستان الم سننے کے بعد کہا ''سلطان باہوؒ کے در اقدس پر حاضر ہو جاؤ ہر نوع کی دلدل سے نجات حاصل کر لو گے۔''

سفید پوش آستانہ باہو پر حاضر ہوا تو خبر ملی کہ موصوف کھیتوں میں ملیں گے۔سفید پوش کھیتوں میں پہنچا تو اس کی توقعات کا شیش محل زمین بوس ہو گیا۔سامنے ایک مفلوک الحال سا شخص کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔دھول میں اٹا چہرہ' معمولی لباس جس میں پیوند' سفید پوش کا تو دل ہی ٹوٹ گیا ''یہ شخص تو خود اس قابل ہے کہ اس کی مدد کی جائے'' یہی سوچ کر وہ حرف مدعا زبان پر لائے بغیر واپس لوٹنے لگا۔

چند قدم چلا تو سلطان العارفینؒ نے آواز دی ''سید برکت علی! اتنی دور سے سفر کی کلفتیں برداشت کر کے آئے ہو اور ملاقات کے بغیر ہی واپس جا رہے ہو''

اپنا نام سن کر سید موصوف کا چہرہ کھل اٹھا ''بات بنے نہ بنے مرد کامل سے ملاقات تو ہو گئی جو شخص کشف کا مالک ہے کرامت کا ظہور اس سے بعید نہیں'' یہ سوچ کر وہ بڑے اشتیاق سے آگے بڑھا اور اپنی داستان الم بیان کرنے لگا۔

''تو آپ کو سونا چاندی درکار ہیں؟'' سلطان باہوؒ نے دکھ بھری داستان سننے کے بعد اطمینان سے کہا۔

''جناب! بس اس قدر میسر آ جائے کہ قرض خواہوں سے نجات مل جائے اور بچیاں' عزت آبرو کے ساتھ اپنے گھروں کو سدھاریں'' سفید پوش ملتمس ہوا۔

''آپ تھوڑی دیر میرا یہ ہل چلائیں' میں ذرا پیشاب سے فارغ ہو لوں۔''

سلطان باہوؒ نے ہل اس کے حوالے کیا اور خود کھیت کنارے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔واپس آئے تو ہاتھ میں مٹی کا وہ ڈھیلا پکڑ رکھا تھا جس سے بول کی طہارت سے فارغ ہوئے تھے۔وہی ڈھیلا آپ نے کھیت میں پھینک دیا۔جس جگہ ڈھیلا گرا اس کے گرد و پیش مٹی کے

Marfat.com

سارے ڈھیلے چمکنے لگے۔ سید برکت علی حیران و ششدرره چمکیلے سونے کو دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

''حسب ضرورت اٹھالیں اور فرائض سے سبک دوش ہو جائیں'' سلطان باہوؒ نے سر سری لہجے میں اور پھر اپنے شغل میں مصروف ہو گئے۔

سفید پوش کی حالت زار کو احاطہ تحریر میں لانا ناممکن نہیں۔

اسی زمانے میں یہ شعر زبان زد خاص و عام ہوا۔

نظر جناں دی کیمیااو سونا کردے وٹ
قوم اتے موقوف نہیں ہے کیا سید کیا جٹ

(جن کی نظر کیمیا ہو وہ پتھر کو سونے میں بدل دیتے ہیں۔ یہ کسی خاص قوم کی بات نہیں وہ سید بھی ہو سکتے ہیں، جاٹ بھی)

بقول سلطان باہوؒ درویش کے لیے خالق کائنات سے پر خلوص راز و نیاز بے حد ضروری ہے۔ اسے چاہیے کہ رات کی تنہائی کا کچھ حصہ' عزیز و اقربا سے الگ ہو کر قادر مطلق سے رشتہ استوار کرے۔ ہر رات کو لیلتہ القبر (قبر کی رات) تصور کرے۔ کیوں کہ قبر میں وہی مونس و غم خوار ہو گا اور ہر طلوع ہونے والے سورج کو روز محشر خیال کرے گویا خلق خدا قبور سے جاگ کر باہر آئی ہے اور احتساب کی گھڑی بس آنے ہی والی ہے۔

سلطان العارفینؒ کے چند ایسے اشعار پیش خدمت ہیں جن میں فارسی عربی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ندرت خیال کے علاوہ زبان کی چاشنی اور کمال فن کے اعتبار سے یہ اشعار شاعری کی آبرو تصور کیے جاتے ہیں۔ راہ سلوک کے مسافر تو ان کا ورد لازم قرار دیتے ہیں۔

یقیں دانم دریں عالم کہ لا معبود الّا ہو
ولا موجود فی الکونین لا مقصود اِلّا ہو

(مجھے یقیں کامل ہے کہ اس عالم امکان میں وہی معبود ہے۔ ہر کونے ہر گوشے میں وہی جلوہ گر ہے اور کونین کا مقصود بھی وہی ہے۔)

چو تیغ لا بدست آری بیا تنہا چہ غم داری
مجو از غیر حق یاری کہ لا فتاح الا ہو

(لا کی تیغ میسر ہو تو غم تنہائی بے معنی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بے خوف و خطر تنہا چلا آ۔ غیر کی جانب توجہ نہ

Marfat.com

کر(گرہیں) کھولنے والا تو وہی ہے)

الا اے یار شو فانی مگو ثالث مگو ثانی

ہو الواحد ہو المقصود لا موجود الا ہو

(اے یار! اپنی ہستی کو لٹا کر فانی ہو جا۔ دوئی اور تثلیث سے گریز کر۔ وہ مقصود کائنات تو صرف ایک ہے جو (مکان ولامکان میں) موجود ہے)

زبان کے چٹخاروں اور جسمانی لذتوں سے لطف اندوز ہونا انسانی فطرت ہے اور انہی لذتوں کے تعاقب میں بے خبر انسان ساری زندگی بھاگتا رہتا ہے۔ خود بھی دکھ اٹھاتا ہے اور دوستوں کا جینا بھی حرام کر دیتا ہے۔ ہمارے بزرگان دین بالخصوص صوفیائے کرام اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ان لذائذ کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کا حصول ان کے لیے دشوار نہ تھا۔ وہ چاہتے تو اپنے گرد و پیش سونے چاندی کے ڈھیر اکٹھے کر لیتے۔ ساری 'لذات' ان کے زیر تصرف ہوتیں لیکن وہ ان کی ماہیت سے آشنا تھے اور دیدار الٰہی کی حقیقی لذت ہی سے لطف واندوز ہونے کا شوق پالیتے تھے۔ چنانچہ سلطان العارفینؒ نے اصحاب صفہؓ کے طریقہ کار کو اپنایا۔ دو ایک بار کھیتی باڑی کی طرف راغب ہوئے بھی تو فصل پکنے سے پہلے ہی اسے مال مویشی کے ''سپرد'' کر دیا۔ المختصر ترک لذات اور فقر میں سلطان باہوؒ اصحاب صفہؓ کے نقش قدم پر چلتے' باقی رہا لذات کا قبضہ قدرت میں ہونا تو اس کی مثال پیش خدمت ہے۔

دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر آباد قصبہ سردار پور میں شیخ جنیدؒ قریشی کا قیام تھا (یہ آپ کے ہم عصر بزرگ ہیں) ''کند ہم جنس باہم جنس پرواز'' کے مصداق سلطان العارفینؒ شیخ موصوف کے ہاں پہنچے تو انہوں نے آپ کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ ضیافت کے لیے جو چیز پکائی گئی اسے مفلس و قلاش لوگ بھی پسند نہیں کرتے یعنی جنڈ کے درخت کا پھل جسے ''سنگری'' کہتے ہیں۔ یہ پھل سویوں کی طرح لمبا اور باریک ہوتا ہے وہی سویاں جسے میٹھی عید پر اہل اسلام نوش جاں فرماتے ہیں۔ سلطان باہوؒ کے ہمراہ چوں کہ خدام کا ہجوم تھا۔ لہٰذا دیگ بھر سنگری پکائی گئی۔ چند خدام اس انوکھی دعوت پر حیران و پریشان ہوئے لیکن سنگری کو دیگ سے نکالا گیا تو وہ سارا پھل حقیقی سویوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ شیخ جنیدؒ قریشی کا تصرف تھا۔ سلطان باہوؒ اسے دیکھ کر زیر لب مسکرانے لگے۔ خدام کے چہرے بھی کھل اٹھے۔

''گھی شکر کا انتظام بھی ہو جائے تو بس روز عید کا سا لطف آ جائے'' ایک خادم نے

Marfat.com

دوسرے سے سرگوشی کی۔

''عزیزان گرامی! ذرا ہمارے پاس تشریف لائیں'' سلطان العارفینؒ نے ان دونوں خدام کو اپنے قریب بلایا ''باہر جاؤ اور ''چوہے کیر سمیٹ لاؤ۔''

(چوہے کی بل سے نکلنے والی بھربھری سی مٹی جو شکر سے مشابہت رکھتی ہے ''چوہے کیر'' کہلاتی ہے)

''اور آپ کسی گڑھے سے بارش کا پانی لے آئیں'' دوسرے خادم کو حکم ملا۔

دعوت کا آغاز ہوا، سنگری پر چوہے کیر ڈال دی گئی اور ان کے اوپر بارش کا پانی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ دیگ سے باہر آتے ہی سنگری، سویوں میں بدل جاتی اور سویوں بھری سینک پر چوہے کیر ڈالتے تو وہ شکر بن چکی ہوتی۔ اس طرح بارش کا پانی مہکتا ہوا گھی بن جاتا۔ ساری محفل نے جی بھر کے کھایا اور سب نے بیک زبان کیا ''ایسا لذیذ کھانا ہم نے زندگی بھر نہیں کھایا تھا۔''

اس ''تصرف'' کا ذکر آج بھی شیخ جنیدؒ کے خاندان میں اکثر ہوتا ہے۔ شیخ موصوف کا فرزند ''کالو شاہ'' سلطان باہوؒ کا مرید ہوا۔

کالو شاہ شوق دید کی تسکین کے لئے شور کوٹ آئے تو عجیب صورت حال کا سامنا ہوا۔ مرشد کے حجرے سے ''ذکر ہو'' کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ شیخ کالو زیارت کے لیے اندر داخل ہوئے تو حجرہ خالی تھا۔ شیخ صاحب سکتے میں آ گئے۔ اتنے میں ''ندائے ہو'' باہر سے آنے لگی۔ باہر نکلے تو خاموشی نے استقبال کیا۔ ادھر ادھر دیکھا، نہ آواز تھی نہ باہو۔ اندر شوق نظارہ نے ہل چل مچا رکھی تھی، باہر مطلوب و مقصود پردہ نشینی اختیار کیے بیٹھا تھا۔ ٹھنڈی آہ بھر کر سر جھکایا اور وہیں بیٹھ گئے۔ مرشد ہی کا مشہور زمانہ شعر، حرف مدعا بن کر زبان سے جاری ہوا۔

اندر ہو وت باہر ہوتے باہو کت لبھیندا
ہووا داغ محبت والا دم دم نا سڑیندا

(اندر بھی ہو اور باہر بھی ہو مگر ہو ملتا کہاں سے ہے؟ ادھر یہ حال کہ ہو کا داغ محبت ہر سانس کے ساتھ مزید دہک رہا ہے اور مجھے جلائے دے رہا ہے)

داغ مفارقت اور کلمات ناامیدی نے کام کر دکھایا۔ سینہ باہو میں جذبہ ترحم بے دار ہوا تو آپ نے جواب دیا۔

جتھے ہو کرے رُشنائی چھوڑ اندھیرا ویندا
دو ہیں جہان غلام ہیں جیہڑا ہونوں صحیح کریندا

Marfat.com

(جہاں ہو کی روشنی ہو جائے وہاں سے اندھیرا بھاگ جاتا ہے اور جو "ہو" کو صحیح کر لے دونوں جہاں اس کے زیر تسلط آ جاتے ہیں۔)

اس کے بعد سلطان العارفینؒ نے اپنے طالب کو دیدار سے نوازا۔ کیوں کہ اب درمیان سے حجاب اٹھ چکا تھا۔ شیخ جنیدؒ قریشی اور ان کے فرزند شیخ کالوشاہ دونوں قصبہ سردار پور میں زیر زمین سو رہے ہیں۔ مگر روپوش ہونے والوں کی داستانیں ان کے تذکرے اہل دل کے ہاں آج بھی اسی جوش و خروش اور عقیدت بھرے انداز میں ہوتے ہیں۔ جیسے وہ ادھر ہی کہیں آس پاس موجود ہوں۔

باہوؒ رقم طراز ہیں کہ "قادری" دو اقسام کے ہوتے۔ ایک "زاہدی" دوسرے "سروری"۔ "زاہدی" وہ شیخ ہوتا ہے جسے اس کا مرشد ریاضت اور مجاہدے کی چکی میں پیس ڈالے۔ ہر مقام کی بلندی کے لیے چلہ کشی کرائے۔ دس سے چالیس برس کی چلہ کشی کے بعد اسے غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حضور پیش کرے اور پھر غوث الاعظم اسے دربار رسالت ﷺ کی مجلس سے سرفراز فرمائیں۔ آخری سند بہر حال دربار رسالت ﷺ ہی سے نصیب ہوتی ہے۔

اس کے برعکس "سروری" وہ شیخ ہوتا ہے جو فیض ازلی کی بنا پر ظاہری وسیلے کے بغیر نور محمدی ﷺ کی پرورش سے یہ سب کچھ حاصل کر لے۔ ظاہر ہے ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ سروری قادری کو سریدی بھی کہتے ہیں۔ اسی کا نام "اویسی" شیخ ہوتا ہے سلسلہ قادریہ میں نفی اثبات کا "ذکر جہر" (بہ آواز بلند) رائج ہے اور ہر طالب کے لیے مسائل شریعت سے کماحقہ واقفیت لازمی ہے اور پابندی شرع بھی لازمی امر ہے۔ ظاہر ہے شرعی احکام کے تارک کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ مکر و فریب اور مبتلائے ریا حضرات تو اس سلسلے کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔

آباد اجداد کے زمانے سے سلطان باہوؒ کے زیر تصرف وسیع و عریض جاگیر تھی۔ شورکوٹ کے علاقے میں بھی آپ کے والد بزرگوار کو قلعے سمیت اراضی مہیا کی گئی تھی۔ (قلعے کی جگہ آج بلند و بالا ٹیلا ہے) مگر زمانہ گواہ ہے کہ آپ نے دنیاوی مال و متاع سے عمر بھر گریز کیا۔ روکھی سوکھی روٹی کھانا معمول تھا۔ خوراک اتنی قلیل ہوتی کہ بس تار نفس کا سلسلہ قائم رہے۔ فاقے کی رات کو معراج کہا کرتے اور مرغن غذاؤں کو فساد کی جڑ' اپنا حال چھپانے کے

Marfat.com

لیے سیر وسیاحت کو نکل جاتے اور فقیروں کا بھیس بدل کر ''خودشکنی'' کی خاطر گدائی بھی فرماتے ہے

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

دنیاوی مال ومتاع' دنیادار اور دنیا کے متعلق سلطان باہو کے خیالات' ان کی اپنی زبانی ملاحظہ ہوں۔ فنی اعتبار سے بھی یہ شاعری قابل تقلید ہے۔

ایہہ دنیا زن حیض پلیدی ہرگز پاک نہ تھیوے ہو
جیں فقر گھر دنیا ہووے لعنت اس دے جیوے ہو
حب دنیاوی رب تھیں موڑے ویلے کچھ وے ہو
سہ طلاق دنیا نوں دیے جے باہو سچ پچھیوے ہو

(یہ دنیا عورت کے حیض جیسی پلید شے ہے جو دھونے سے پاک ہوتی ہے نہ غسل' وضو اور تیمم سے۔ جس درویش کے گھر دنیا نے بسیرا کر رکھا ہو اس کی زندگی پر لعنت ہو۔ حب دنیا انسان کو غافل کر کے گمراہیوں کے حوالے کر دیتی ہے اور وہ فکر خدا سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اے باہو اگر سچ پوچھو تو اس دنیا کو تین طلاقیں ہی دے دینی چاہییں یعنی ایسی طلاق جس کے بعد مراجعت ممکن نہ ہو۔)

کم وبیش ایسے ہی خیالات کا اظہار ایک اور جگہ فرمایا' خیال کی گہرائی' الفاظ کا انتخاب اور سادگی ساری صفات ورطہ حیرت میں ڈبو دیتی ہیں۔ ہر مصرع دل پر دستک دینے والا ہے

ایہہ دنیا زن حیض پلیدی کتنی مل مل دھوندے ہو
دنیا کارن عالم فاضل گوشے بہہ بہہ روندے ہو
دن کارن لوگ وچارے ہک پل سکھ نہ سوندے ہو
جہاں چھڈی دنیا باہو اور کندی چڑھ کھلوندے ہو

(یہ دنیا عورت کے حیض جیسی ناپاک چیز ہے جو اس میں مبتلا ہو گئے وہ اسے مل مل کر دھوتے ہیں 'جدوجہد کرتے ہیں مگر اس سے نجات نہیں پا سکتے۔ اس دنیا کی خاطر عوام تو کیا ''عالم فاضل'' لوگ بھی گوشوں میں بیٹھ کر روتے ہیں (بے حد محنت کرتے ہیں اور اس کے فراق میں مرے جارہے ہیں) حتیٰ کہ ایک پل آرام سے سو بھی نہیں سکتے لیکن وہ لوگ جو اسے ترک کر دیتے ہیں وہ دیوار پر چڑھ جاتے ہیں یعنی بلند مقام حاصل کر لیتے ہیں جسے ''نجات'' کہتے ہیں)

Marfat.com

ان خیالات کے اظہار کے بعد سلطان العارفینؒ ایک نتیجہ اخذ کرتے ہیں جو حقیقت دنیا کو آشکار کر دیتا ہے۔

ادھی لعنت دنیا تائیں ساری دنیا داراں ہو
جیں راہ صاحب خرچ نہ کیتی لین غضب دیا مارا ہو
پیواں کولوں پتر کو ہاوے بٹھ دنیا مکاراں ہو
جنہاں دنیا تجی باہو لین باغ بہاراں ہو

(اگر دنیا پر آدھی لعنت بھیجیں تو اصولاً دنیا داروں پر پوری لعنت ہونی چاہیے۔(جو اس کے تاریک پہلو دیکھنے کے بعد بھی اسے اپنا لیتے ہیں) جو لوگ زر و مال کو راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے ان پر قہر الٰہی کا نزول لازمی ہے (اس دنیا میں ہو یا اس دنیا میں) اس مکان دنیا پر صد حیف کہ یہ باپ سے بیٹے تک کو قتل کروا دیتی ہے لیکن جن لوگوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا ان کے لیے دائمی عیش و آرام لکھ دیے گئے۔)

اپنی ہستی کو مٹا دینا جسے سلطان العارفینؒ "خودکشی" کہتے ہیں اس کا انداز ملاحظہ ہو۔اس بیت کے چار کے بجائے پانچ مصرعے ہیں۔انہوں نے شاعری میں ہمیشہ ابلاغ کو اہمیت دی۔لہٰذا بعض اوقات مفہوم پانچ مصرعوں میں ادا کیا۔

جیوندیاں مر رہنا ہوتاں ویس فقیروں بہیے ہو
جے کوئی سٹے گودڑ کوڑا وانگ اروڑی سہیے ہو
جے کوئی کڈھے گا ہلاں مہنے اس نوں جی جی کہیے ہو
گلہ الا ہماں بھنڈی خواری یار دے پاروں سہیے ہو
قادر دے ہتھ ڈور ہے باہو جیوں رکھے تیوں رہیے ہو

گودڑ کوڑا بہ معنی کوڑا کرکٹ کچرا اروڑی بہ معنی کچرے کا ڈھیر بھنڈی بہ معنی جھگڑا فساد۔

"موتو قبل ان تموتو" (موت سے پہلے مر جاؤ) کے مصداق جیتے جی مرنا قبول ہو تو فقیرانہ روش اختیار کرنی چاہیے۔اگر کوئی فصیل جاں پر کوڑا کرکٹ بھی پھینک دے تو کچرے کے ڈھیر کی طرح خاموشی سے برداشت کرنا چاہیے یعنی لوگوں کی زیادتیوں سے آتش زیر پا نہیں ہو جانا چاہیے۔اگر کوئی طعن و تشنیع سے کام لے یا گالی بھی دے تو اس کے جواب میں نرم روی اختیار کرنی چاہیے۔شکوہ گلہ الا ہمے جھگڑے فساد رضائے الٰہی کی خاطر سہہ جانے چاہئیں۔اے باہو ہمارا

Marfat.com

اختیار تو قادر مطلق کے ہاتھ ہے لہٰذا جس حال میں وہ رکھے راضی بہ رضا رہنا ہی مناسب ہے۔
حالت سکر میں احکام شریعت کی قضا ایک بار اس انداز میں ادا کی کہ آج تک وہ طریقہ کار اہل سلوک کے ہاں مشعل راہ کا درجہ رکھتا ہے۔

کلر کہار ضلع جہلم کے پہاڑی مقام پر سلطان باہوؒ "مقام حیرت" میں گم تھے (اس جگہ بھی مور بکثرت پائے جاتے ہیں) ایسے محو نظارہ ہوئے کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ ایک پہاڑی غار میں کئی دن حالت استغراق میں رہے۔ رمضان کا مہینہ تھا' روزے تک قضا ہو گئے۔ حالت اعتدال میں آئے تو نماز روزے کی قضا کے ساتھ نماز تراویح کی قضا بھی ادا کی۔ حالانکہ قضا صرف نماز فرض کی ادا کی جاتی ہے لیکن جہاں خلوص کی حد عشق تک جا پہنچے' احتیاط کا یہی تقاضا ہونا چاہیے۔

اب ہم حیات باہوؒ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں جو خواص کے علاوہ عوام الناس میں بھی بے حد مقبول ہوا یعنی آپ کی پنجابی زبان میں شاعری۔ اگرچہ گویوں اور قوالوں نے اس کے حسن کو مجروح کرنے کی سر توڑ کوشش کی مگر اس کی آب و تاب جوں کی توں رہی۔ یہ شاعری پنجابی ادب پر ایک احسان عظیم کا درجہ رکھتی ہے۔ اگرچہ ابیات سہ حرفی کی صورت میں ہیں مگر ہر حرف کے تحت بندوں کی تعداد یکساں نہیں۔ ہر بند کا ذکر تو ناممکنات میں سے ہے مگر ہم دو سو ایک مشہور "بندوں" میں سے چند ایک کا ذکر کریں گے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہر بند کے عموماً چار مصرعے ہیں مگر بعض اوقات مصرعوں کی تعداد پانچ بھی ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ سلطان العارفینؒ کی یہ شاعری کسی طے شدہ منصوبہ کے تحت معرض وجود میں نہیں آئی بلکہ مختلف اوقات میں آپ پر طاری شدہ کیفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ ساری شاعری "آمد" کی ہے نہ کہ "آورد" کی اور سب سے اہم بات جس پر قارئین کرام کو بڑی بمشکل یقین آئے وہ یہ ہے کہ ہر مصرعے کے آخر میں لفظ "ہو" کا اضافہ بعد کی پیداوار ہے لیکن اب یہ اس قدر مشہور ہو چکا ہے کہ ان کی شاعری کا حصہ بن گیا ہے اور اس کے بغیر چارہ کار ہی نہیں۔ لہٰذا ہم بھی خلق خدا کی اتباع میں لفظ "ہو" کو قائم رکھیں گے۔

سلطان باہوؒ نے جس زبان کو وسیلہ اظہار بنایا' وہ موجودہ ضلع جھنگ میں بولی جاتی ہے مگر اس میں عربی فارسی کے الفاظ پچاس فیصد سے بھی زیادہ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ہو

Marfat.com

نفی اثبات دا پانی ملیس ہر رگے ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جان پھلن پر آئی ہو
جیوے مرشد کامل باھو جیں ایہہ بوٹی لائی ہو

یہ بند ابتدائی زمانہ وصول کے بعد کا ہے۔ان ابیات کے متعلق مزید عرض یہ ہے کہ ''انوار سلطانی'' از نور محمد کلاچوی نے ایک سو چودہ بند دیئے ہے مگر ایک اور عاشق باھو مقبول الٰہی نے ۱۸۶ بند درج کیے ہیں۔اب اس بند کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

''میرے مرشد نے میرے قلب مین چنبیلی کا مہکتا ہوا پودا لگا دیا۔جسے نفی اثبات (لا الا اور الا اللہ) کے پانی سے سیراب کیا گیا۔اس پودے کی نمو اس انداز میں ہوئی کہ پھول کھل اٹھے اور میرا سینہ مہک اٹھا۔اس مہک کی فراوانی سے گویا جاں تک پھول گئی (جیسے خوشی سے پھولے نہ سمانا) خدا میرے مرشد کامل کی عمر دراز کرے جس نے یہ پودا لگایا۔

ایہہ تن میر اچشماں ہووے مرشد ویکھ نہ رجاں ہو
لوں لوں دے مڈھ لکھ لکھ اکھیاں اک کھولاں اک کجاں ہو
اتنا ڈھٹیاں صبر نہ آوے ہور کتے ول بھجاں ہو
مرشد دا دیدار باھو مینوں لکھ کروڑاں حجاں ہو

میری فصیل جاں از سرتا پا آنکھیں بن جائے جس سے میں مرشد کا نظارہ کرسکوں (چوں کہ آپ بنیادی طور اویسی ہیں لہٰذا یہاں مرشد سے مراد ذات رسالت مآب ﷺ ہے) میرے ہر رونگٹے کی جڑ میں ایک ایک لاکھ آنکھیں ہوں تا کہ ایک جھپکوں تو دوسری کھلی رہے (اس طرح نظارگی کا تسلسل مجروح نہ ہونے پائے) اس انداز نظارگی کے بعد اگر تشنگی کی تسکین نہ ہو سکے تو پھر میں کہاں جاؤں اور کون سا ذریعہ ووسیلہ تلاش کروں؟

(کیوں کہ مجھے مرشد کا دیدار لاکھوں کروڑوں حجوں کے برابر ہے)

بے ادباں نہ سار ادب دی گئے ادباں تھیں وانجے ہو
جیہڑے تھاں مٹی دے بھانڈے کدے نہ ہوندے کانجے ہو
جیہڑے مڈھ قدیم دے کھیڑے کدے نہ ہوندے رانجھے ہو
جیں دل منگ حضور نہ باھو او دوئیں جہانیں وانجے ہو

جن لوگوں کو ادب آداب کا خیال نہیں وہ ادب سے کورے رہ کر گستاخ بنے رہتے ہیں

Marfat.com

۔ بے ادبوں کی مثال مٹی کے برتنوں جیسی ہے جو مانجھنے سے دھات کے برتنوں جیسے چمک دار نہیں ہو سکتے۔ جو ازل سے کھیڑے ہوں وہ رانجھے نہیں بن سکتے۔ (رانجھا ہیر کا عاشق تھا سو خوش قسمت تھا 'کھیڑے ہیر کو زبردستی بیاہ کر لے گئے مگر پھر بھی ہیر کو حاصل نہ کر سکے لہٰذا بد قسمت ہوئے) جس دل میں حضوری' قربت الٰہی کی تمنا بے دار نہیں ہوتی وہ دونوں جہان نامراد و برباد ہوا۔

پڑھ پڑھ حافظ کرن تکبر ملاں کرن وڈیائی ہو
گلیاں دے وچ پھرن نمانے بغل کتاباں چائی ہو
جتھے ویکھن چنگا چوکھا پڑھن کلام سوائی ہو
دوئیں جہانیں مٹھے باہو جہاں کھادی ویچ کمائی ہو

علم قرآن حاصل کرنے کے بعد بھی لوگ مبتلائے غرور ہو جاتے ہیں اور گلیوں بازاروں میں کتابیں اٹھائے پھرتے ہیں (دنیا دار علما کی عادت ہے کہ) جہاں انواع و اقسام کے لذیذ کھانے موجود ہوں وہاں کلام اللہ کی طویل آیات پڑھتے ہیں تا کہ اہل خانہ دکھانا کو مرعوب کر سکیں (جہاں سے نفع کی امید ہو وہاں اپنی علمی فضیلت کا اظہار زیادہ کرتے ہیں) اے باہوؒ جنہوں نے اپنے علم و فضل کو بیچ ڈالا وہ دونوں جہان میں پیچھے رہ گئے (ناکام ہو گئے)

تن من یار میں شہر بنایا دل وچ خاص محلہ ہو
آن الف وچ وسوں کیتی ہوئی خوب تسلہ ہو
سب کچھ پیا سنیوے جو جو بولے ماسویٰ اللہ ہو
درد منداں ایہہ رمز پچھاتی بے درداں سر کھلہ ہو

میں نے فصیل جاں کے شہر میں دل کو ایک خاص جائے قرار کا مقام دیا جس میں میرے یار "الف" "نور وحدت" نے آن بسیرا کیا۔ مجھے وہ سارے بول خوب سنائی دے رہے ہیں جو "ماسویٰ" کے ہونٹوں سے بھی ادا ہو رہے ہیں (دنیا بھر کی اشیا جو ذکر و تسبیح میں مشغول ہیں میں ان کی صدائیں بھی سن رہا ہوں) اہل درد دل اس راز سے واقف ہیں باقی رہے پتھر دل بے درد لوگ تو ان کے سر پر جوتا (وہ سب محروم رہے' ان کی ہمیں کیا پروا)

پاٹا دامن ہو یا پرانا کچرک سیوے درزی ہو
حال دا محرم کوئی نہ ملیا جو ملیا سو غرضی ہو
باجھ مربی کسے نہ لدھی گجھی رمز اندر دی ہو

Marfat.com

اوسے راہ ول جایئے باہو جس تھیں خلقت ڈر دی ہو

(کچرک بہ معنی کب تک لدھی=ڈھونڈلی' پالی)

(میرا دامن بوسیدہ ہو کر تار تار ہو گیا کب تک درزی اسے سیئے گا یا رفو گر رفو کرے گا' مجھے جو بھی ملا غرض کا بندہ ملا۔ محرم حال دل کوئی نہ مل سکا۔ اندر کا راز وہی پا سکتا ہے جو مونس و غم خوار ہو' اے باہو اس مشکل راستے کو اپنانا چاہیے جس پر چلنے سے خلق خدا خوف زدہ ہو یہی شیوہ مردانگی ہے کیوں کہ پرخطر راستہ ہی منزل پر جلد پہنچاتا ہے)

ثابت صدق تے قدم اگیرے تائیں رب لبھیوے ہو
لوں لوں دے وچ ذکر اللہ دا ہر دم پیار پڑھیوے ہو
ظاہر باطن عین عیانی ہو ہو پیا سینوے ہو
نام فقیر تنہادا باہو قبر جنہاں دی جیوے ہو

وصال باری تعالیٰ کی دو شرائط ہیں صدق دل اور ثابت قدمی سے پیش رفت' حالت یہ ہو کہ جسم کا ہر رونگٹا ذکر الٰہی کا ورد کرے۔ ظاہر باطن میں ہو ہو کی صدا سنائی دے۔ اے باہو فقیر وہی کہلانے کا حق دار ہے جس کی قبر زندہ ہے۔ یعنی فصیل جاں ذکر سے زندہ ہو دوسرا مطلب ہے 'موت کے بعد قبر میں سوتے ہوئے بھی فیض رسانی جاری ہو وہی سچا درویش ہے۔

جو دل منگے ہووے نائیں ہوون گیا پریرے ہو
یار نہ دیوے دل دا دارو عشق نہ واگاں پھیرے ہو
اس میدان محبت والے ملن تاء ترکھیڑے ہو
میں قربان تنہاں تھیں باہو جنہاں رکھیا قدم اگیرے ہو

ترکھیڑے بہ معنی تیز قدم' باقی سارا بند عام فہم اور سادہ زبان میں ہے۔

دل جس بات کا طالب ہے وہ ہو نہیں چکتی بلکہ دم بہ دم دور ہوتی جا رہی ہے۔ دوست درد دل کی دوا نہیں دیتا اور نہ کامل عشق کا حصول ہوتا ہے (کہ جل کر راکھ ہو جائیں) میدان الفت میں جوانان تیز گام ہی کامیاب ہوتے ہیں' میں ان پر قربان جاؤں اے باہو جو اس میدان میں آگے نکل گئے۔

جیں دل عشق خرید نہ کیتا سو دل بخت نہ بختی ہو
استاد ازل دے سبق پڑھایا ہتھ وتس دل تختی ہو

Marfat.com

بر سر آیاں دم نہ ماریں جاں سر آوے سختی ھو
پڑھ توحید تاں تھیویں واصل سبق پڑھیوے وقتی ھو

جو عشق کا خریدار نہیں وہ بد بخت ٹھہرا۔ خدا نے ہمیں سبق پڑھایا ہاتھ تختی دل تھما دی۔ اس معاملے اگر مشکل درپیش ہو تو دم نہیں مارنا چاہیے (اسے خاموشی سے برداشت کرنا چاہیے ہر وقت اسی یکتا کا نام ورد زباں ہو تو وصال ممکن ہوتا ہے۔)

چڑھ چناں توں کر رشنائی ذکر کریندے تارے ھو
گلیاں دے وچ پھرن نمانے لعلاں دے ونجارے ھو
شالا مسافر کوئی نہ تھیوے ککھ جنہاں توں بھارے ھو
تاڑی مار اڈاؤ ناہیں اسیں آپے اڈن ہارے ھو

اے مہتاب تو جلوہ فگن ہو کہ تارے ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ جواہرات کے تاجر گلیوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں (اے نور ازل ان کے قلب و نظر کو منور کر دے یہی نور اصل میں جواہرات ہیں جن کے بیوپاری گلی گلی گھوم رہے ہیں) خدا کرے کوئی پردیس نصیب نہ ہو کہ پردیس کے تنکے بھی ان سے وزنی ہوتے ہیں (اے باہو) دنیا میں ہم پردیسی ہیں اور خود ہی پرواز کر جانے والے ہیں لہٰذا دنیا دارو! ہمیں ڈرا دھمکا کر مائل پرواز کرنے کی کوشش مت کرو۔

دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیا جانے ھو
وچے بیڑے وچے جھیڑے وچے ونج موہانے ھو
چوداں طبق دلے دے اندر تنبو وانگوں تانے ھو
جو اس دل دا محرم باھو سو یو رب پچھانے ھو

انسانی دل دریاؤں سمندروں سے گہرے ہوتے ہیں جیسے دریاؤں سمندروں میں جہاز طوفان (جھیڑے بہ معنی جھگڑے فساد یعنی ہلچل طوفان) لہریں اور جہاز ران وغیرہ ہا بھی سما سکتے ہیں اسی طرح انسانی قلوب میں بھی اس قبیل کی ساری اشیاء موجود ہوتی ہیں۔

سات زمینیں سات آسمان یعنی چودہ طبق بھی اسی دل میں خیموں کی مانند تنے ہوئے ہیں جو انسان ایسے وسیع و عریض دل کی کیفیتوں سے آشنا ہو جائے اسے ہی معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

اب ایک ایسا بند پیش خدمت ہے جس میں تشبیہ و استعارے کا استعمال منفرد ہی نہیں لاجواب قسم کا ہے۔ معاملات دین و دنیا پر شاعر کی اتنی گہری نظر دیکھ کر اہل دل حیرت زدہ رہ جاتے

Marfat.com

ہیں۔

دودھ دہی تے ہر کوئی رڑکے عاشق بھاہ رڑکیندے ہو
تن چٹورا من مدھانی آہیں نال ہلیندے ہو
دکھاں نیتر کڈھے لشکارے غماں دا پانی پیندے ہو
نام فقیر تنہا دا جیہڑے ہڈاں تھیں مکھن کڈھیندے ہو

(بھاہ بہ معنی قسمت نیتر اب بہ معنی نتھرا ہوا۔ چٹورا بہ معنی دہی بلونے والی چاٹی' رڑکنا بہ معنی بلونا)

دودھ دہی تو ہر کوئی بلوتا ہے عاشق لوگ قسمت بلوتے ہیں وہ فصیل جاں کی چاٹی میں من کی "مدھانی" ڈال کر آہوں سے ہلاتے ہیں جب سارے دکھ نتھر کر چمکنے لگتے ہیں تو ان دکھوں غموں کا پانی نوش فرماتے ہیں (اے باھوؒ) وہی لوگ درویش کہلانے کے حق دار ہیں جو اپنی ہڈیوں سے مکھن نکالنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

دل دریاؤں سمندروں ڈوہنگا غوطہ خور مار غواصی ہو
جیس دریا وچ نوش نہ کیتا رہی جان پیاسی ہو
ہر دم نال اللہ دے رکھن ذکر فکر دے آسی ہو
اس مرشد تھیں زن بہتر جو فند فریب لباسی ہو

انسانی دل دریا سمندر سے گہرا ہے اس میں غوطہ خور کے مانند غوطہ لگانا چاہیے۔ اگر سارا دریا نوش نہ کیا تو تشنگی ہرگز نہ بجھے گی۔ ہر پل ذکر فکر میں مشغول رہا کرو۔ ریا کار فریبی مرشد سے فاحشہ عورت بہتر (کہ گناہ بے لذت تو نہیں ہوتا)

"موتوا" والی موت ملے نہ جیں وچ عشق حیاتی ہو
موت وصال تھیسی ہک جدوں اسم پڑھیسی ذاتی ہو
عین دے وچوں عین جو تھیوے دور ہووے قرباتی ہو
ہو دا ذکر ہمیش سڑیند اونہاں سکھ نہ راتی ہو

"موتوا" سے مراد ہے موتو قبل ان تموتوا (یعنی طبعی موت سے پیشتر فنا فی اللہ والی موت حاصل کرو)

حیات عشق میں "موتوا" والی موت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسم ذات کا صحیح

Marfat.com

وردنہ کیا اور جب ایسا ہو گیا تو وصال حق کا حصول ہو گیا (موت ہوئی فنا فی اللہ اور بقا باللہ وصال سے ہوا) عین سے عین' نور وحدت میں نقطہ نور اس طرح ملا کہ قرب الٰہی والے فرشتے بھی دور پیچھے رہ گئے۔ اے باہوؒ ذکر ہو' کے سوز کا انداز یہ ہے کہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔

درج بالا بند سے صاف ظاہر ہے کہ سلطان العارفینؒ فقط ذات مطلق کے پرستار ہیں جہاں اضافات ختم ہو جاتے ہیں۔ موت و حیات' زمان و مکاں' اقرار و انکار تک کا اور تعلق دنیا کا تاثر درج ذیل بند میں قابل توجہ ہے۔

عشق چلایا طرف آسماناں فرشوں عرش وکھایا ہو
رہ نی دنیا ٹھگ نہ ساہنوں ساڈا اگے جی گھبرایا ہو
اسیں پردیسی وطن دوراڑا توں کوڑا لالچ لایا ہو
مر گئے جو مرنے تھیں پہلے تہاں رب نوں پایا ہو

وسیلہ عشق نے ہمیں فرض سے اٹھا کر عرش کی سیرا کرادی۔ اے دنیا ہمیں دام تزویر میں پھنسا کر ٹھگنے کی کوشش مت کر ہم تو پہلے ہی اپنے وطن جنت سے نکالے ہوئے پردیسی ہیں تو جھوٹے لالچ دے رہی ہے۔ جنہوں نے موت سے پہلے اپنی ذات کو مٹا دیا۔ وہ قرب الٰہی سے نوازے گئے۔

فقر باہو کی انفرادیت یہ ہے کہ آپ بے علم درویش کو ضرر رساں سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں جاہل انسان کی صد سالہ عبادت رائیگاں جاتی ہے کیوں کہ اس سے ''غفلت'' دور نہیں ہوتی۔ اس بیگانگی سے مبتلائے کفر ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ علم و آگہی کا نتیجہ عشق نہ ہو تو وہ علم بھی جھوٹا ہے۔ عشق ہی فقر کو تقویت عطا کرتا ہے۔ لیکن ذکر و فکر عشق الٰہی کے بال و پر ضرور ہوتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ذکر کنوں کر فکر ہمیشہ ایہہ لفظ تکھا تلواروں ہو
کڈھن آہیں تے جان جلاون فکر کرن اسراروں ہو
فکردا بھٹیا کوئی نہ جیوے جان پٹے مڈھ پاروں ہو
حق دا کلمہ آکھیں باہو رب رکھے فقر دی ماروں ہو

ذکر کرتے وقت فکر یعنی تصور یار قائم رہنا چاہیے کیوں کہ اس کی کاٹ تلوار سے تیز ہوتی ہے اس تیزی کے سبب عشاق آہیں بھرتے اور جان جلاتے ہیں اور پس پردہ ذات اسرار میں گم

Marfat.com

رہتے ہیں۔ تصور ذات کا زخم فنا اللہ ضرور کرتا ہے یہ جان کو جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے۔ اے باہو حق بات کہنے کو شعار بناؤ اور وہ یہ ہے کہ خدا فقر کی نامرادی سے محفوظ رکھے۔

جس طرح آدمؑ نے مقرب فرشتوں کو علمی شکست سے ہمکنار کیا' سلطان باہو بھی ان کو پیچھے چھوڑا جانا چاہتے ہیں لیکن ذات مطلق میں شامل ہو کر یہ بہ لحاظ قربت شکست ہوگی۔ ملاحظہ فرمائیں انداز بیاں۔

ہودا جامہ پہن گھر آیا اسم کماون ذاتی ہو
نہ اوتھے کفر اسلام دی منزل نہ اوتھے موت حیاتی ہو
شہ رگ تھیں نزدیک لدھیسی پا اندرو نے جھاتی ہو
اوہ اساں وچ اسیں اوہناں وچ دور ہوئے قرباتی ہو

ذات حق کا اقرار کر کے انسان اس دنیا میں آیا تا کہ اسم ذات کما سکے۔ اس کام کی تکمیل ہوگئی تو کفر و اسلام یا موت و حیات تمام منازل کے آثار مٹ گئے۔ اے انسان تو اپنے اندر جھانک کر دیکھ وہ تیری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے میں اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ مقرب فرشتے بھی اس قربت کا تصور نہیں کر سکتے۔

عشق جنہاں دے ہڈی رچیا او پھر دے چپ چپاتے ہو
لوں لوں دے وچ لکھ زباناں' او کردے گنگی باتے ہو
اسم اعظم دا وضو کرن وچ دریا وحدت نہاتے ہو
تدوں قبول نمازاں باہو جد یاراں یار پچھاتے ہو

پہلے مصرعے کا مفہوم اس شعر سے بخوبی ادا ہوتا ہے

جنہوں کا عشق صادق ہے وہ کب فریاد کرتے ہیں
لبوں پہ مہر خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں

جن لوگوں کے رگ و ریشے میں عشق سما جائے وہ خاموش پھرتے ہیں۔ ان کا رواں رواں ذاکر ہوتا ہے لیکن وہ پھر بھی لب بستہ رہتے ہیں (عشق کا اظہار نہیں کرتے) دریائے وحدت میں غوطہ زن ہو کر اسم اعظم کا وضو کرتے ہیں (جب ساری کثافتیں دور ہو جاتی ہیں تو عرفان حاصل ہو جاتا ہے) یار گویا یار کو پہچان لیتا ہے تب جا کر نمازیں قبول ہوتی ہیں۔

عرفان ذات اور وصال یار کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے ملاحظہ فرمائیں

Marfat.com

جو دم غافل سو دم کافر اسان مرشد ایخو پڑھایا ہو
سنیا سخن گیاں کھل اکھیں اسا چت مولا دل لایا ہو
کیتی جان حوالے رب دے اساں ایسا عشق کمایا ہو
مرن تھیں اگے مر گئے باہو تاں مطلب نوں پایا ہو

ہمیں یہ تعلیم کیا گیا ہے کہ غفلت کا ہر پل کفر میں گزرتا ہے یہ سن کر ہماری آنکھیں کھل گئیں لہٰذا اسی سے دل لگا لیا۔(یعنی غفلت کا پردہ ہٹا دیا) جان کے سارے اختیار اسے سونپ دیے اور عشق کے اس مقام پر فائز ہو گئے کہ موت سے پہلے اپنی ہستی کو مٹا دیا تب جا کر کہیں بامراد ہوئے۔

راتیں نین رت ہنجوروون ڈیہاں غمزہ غم دا ہو
پڑھ توحید وڑیا تن اندر سکھ آرام نہ سم دا ہو
سر سولی تے جا ٹنگیو نے ایہا رازپرم دا ہو
سدھا ہو کو ہیوے باہو قطرہ رہے نہ غم دا ہو

(طالب دیدار) رات کو خون کے آنسو بہاتا ہے تو دن کو بحر غم میں ڈوبا رہتا ہے۔وہ توحید کا ورد کرتا ہوا اپنے اندر جا اترتا ہے پھر اسے سکھ کی نیند نصیب نہیں ہوتی۔راز الفت یہ ہے جیسے سولی پر لٹکا دیا گیا ہو۔باہو شان محبت یہ ہے کہ ذبح ہو جانے کے بعد رتی برابر اضطراب یا غم نہ رہے اور اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔

دریا عشق محبت دے وچ تھی مردانے تریئے ہو
جتھے قہر غضب دیاں ٹھاٹھاں قدم اتھائیں دھریئے ہو
اوجھڑ جھنگ بلائیں بیلے ویکھو ویکھ نہ ڈریئے ہو
نام فقیر تد تھیندا باہو وچ مطلب جاں مریئے ہو

بحر عشق میں مردانہ وار تیرنا چاہیے۔قدم اسی جگہ دھرنا چاہیے۔ جہاں طوفان بلا خیز کی لہریں اٹھ رہی ہوں۔عشق کے جنگل میں جہاں راستہ دشوار از بلاؤں کا بسیرا ہو بلا خوف وخطر داخل ہونا چاہیے۔اے باہو انسان اس وقت درویش کہلاتا ہے۔جب مقصد حیات (وصال یار) میں جان قربان کر دے۔

عشق دی چاہ ہڈاں دا بالن عاشق بہہ سکیندے ہو

Marfat.com

گھت کے جان جگر وچ آرا دیکھ کباب تلیندے ہو
سرگرداں پھرن ہر ویلے خون جگر دا پیندے ہو
ہوئے ہزاراں عاشق باہو پر عشق نصیب کہیندے ہو

شوق عشق ہڈیوں تک کو جلا ڈالتا ہے اور عاشق یہ آگ بڑی رغبت سے تاپتے ہیں اور جگر کو چیر کر اس کے کباب بناتے ہیں یعنی رضائے محبوب حاصل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں خون جگر پی پی کر مارے مارے پھرتے ہیں۔ دنیا میں ویسے تو عشق کا دعوٰی کرنے والے ہزاروں (اہل ہوس) پھرتے ہیں مگر عشق حقیقی کسی کسی کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے یعنی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

بقول سلطان باہوؒ عشق کسی خاص طبقے قبیلے کی میراث نہیں ہر شخص اس کا شکار ہو سکتا ہے بلا امتیاز شاہ و گدا۔ ملاحظہ فرمایئے دل موہ لینے والا انداز

عشق دی بازی ہر جا کھیڈی شاہ گدا سلطانان باہوؒ
عالم فاضل عاقل دانا کردا چا حیراناں ہو
تنبو کھوڑ بیٹھا وچ دل دے چالوڑیں خلوت خاناں ہو
عشق امیر فقیر منیندے کیا جانے لوگ بیگانے ہو

بازی عشق ہر مقام و مرتبے کے لوگ، ہر زمانے میں کھیلتے رہے ہیں۔ اس میں شاہ و گدا کسی کی قید نہیں۔ اس کی تاثیر تو عاقلوں اور علماء کو حیران کر دیتی ہے۔ عشق ان کے دلوں کے خلوت خانوں میں جا بسیرا کرتا ہے۔ صرف غفلت شعار ہی اس سے بے خبر اور محروم رہتے ہیں۔

کلمہ طیبہ چند الفاظ پر مشتمل ہے مگر یہ چند الفاظ انسان کی کایا پلٹ دیتے ہیں مگر سلطان باہوؒ کلمے کے نئے پہلوؤں سے روشناس کراتے ہیں ملاحظہ فرمائیں

کلمے نال میں نہاتی دھوتی کلمے نال ویاہی ہو
کلمے میرا پڑھیا جنازہ کلمے گور سہائی ہو
کلمے نال بہشتیں جاناں کلمے کرے صفائی ہو
مڑن محال تنہاں نوں باہو جن صاحب آپ بلائی ہو

کلمے کے ذکر نے مجھے روحانی کثافتوں سے پاک کر دیا (میں نے غسل کیا) اسی کلمے

Marfat.com

نے مجھے سہاگن بنایا (مجھے مرشد کامل ملا) اسی سے میرا خاتمہ بالخیر ہوا اور اسی سے میری قبر روشن ہو گی۔ اسی نے میرے من کی صفائی کی اور مجھے پار اتارا (جنت میں) اے باہو جسے خود یار بلائے ان کا واپس مڑنا دشوار ہوتا ہے۔

فریاد اور آہ و زاری کا انداز ملاحظہ ہو۔

کوک دلا متاں رب سنے چا درد منداں دیاں آہیں ہو
سینہ میرا دردیں بھریا اندر بھڑکن بھائیں ہو
تیلاں باجھ نہ بلن مشالاں درداں باجھ نہ آہیں ہو
آتش نال یارانہ باہو پھر اوہ سڑن کہ نائیں ہو

اے دل فریاد کہ شاید درد بھری آہ کو شرف قبولیت ہو۔ میرا سینہ درد سے بھرپور ہے۔ اس میں الاؤ دہک رہے ہیں۔ جس طرح تیل کے بغیر مشعلیں نہیں جلا کرتی ہیں اسی طرح بغیر اندرونی سوز کے ''آہ'' نہیں نکلا کرتی۔ جل کر راکھ ہو جانا آگ سے دوستی کرنے والوں کا مقدر ہے۔

مختلف صوفیائے کرام نے درج ذیل مضمون کو اپنے اپنے انداز میں بیاں کیا ہے

سلطان العارفینؒ کا انداز بیاں ملاحظہ ہو۔

میں کوجھی میرا دلبر سوہنا میں کیکر اس نوں بھاواں ہو
وہڑے ساڈے وڑدا نائیں پئی لکھ وسیلے پانواں ہو
نہ سوہنی نہ دولت پلے میں کیکر یار منانواں ہو
ایہو دکھ ہمیشہ رہ سی کدے روندڑی نہ مر جانواں ہو

میرا معشوق خوبصورت ہے مگر میں ٹھہری بدصورت، بھلا میں اسے کیسے پسند آ سکتی ہوں لاکھ جتن کیے مگر وہ میرے آنگن میں قدم نہیں رکھتا۔ بدصورتی کے ساتھ بھلا میں اسے کیسے پسند آ سکتی ہوں، بدصورتی کے ساتھ میں مفلس وقلاش بھی ہوں (اعمال کے لحاظ سے) اب یار کو اپنی طرف مائل کیسے کروں؟ یہی خوف کھائے جا رہا ہے کہیں روتے روتے جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں (یعنی اسے اپنی طرف راغب کیے بغیر ہی نہ مر جاؤں)

سلطان باہوؒ کے بعض اشعار تو ضرب المثل بن چکے ہیں یہ بند اس کی بہترین مثال ہے

نال کوسنگی سنگ نہ کریے کل نوں لاج نہ لائیے ہو
تمے بن تربوز نہ جاندے توڑے توڑ مکے لے جائیے ہو

Marfat.com

کانواں دے پت ہنس نہ تھیندے توڑے موتی چوگ چگایئے ہو
کوڑے کھوہ نہ مٹھے تھیندے توڑے سے مناں کھنڈ پایئے ہو

برے ساتھی کے ساتھ مل جل کر رہنا عمر بھر کی شرافت کو داغ دار بنانے والی بات ہے۔

اندرائن کا پھل مکے شریف لے جانے سے تربوز نہیں بن جاتا۔ جیسے کوؤں کے بچے مروارید کھلانے سے راج ہنس نہیں بن جاتے اسی طرح کھارے پانی والے کنوئیں کبھی میٹھے نہیں ہو جاتے بے شک ان میں سیکڑوں من چینی ڈالی دی جائے۔ یعنی کسی چیز کی سرشت نہیں بدل سکتی اس لیے بدطینت لوگوں سے گریز کرنا لازم ہے۔

بقول سلطان العارفینؒ دنیا' مال ومتاع زر و جواہر کا نام نہیں ان کی چاہت میں مبتلا ہو کر مقصد حیات کو بھلا دینے میں کا نام دنیا ہے اور اسے وہ ''غفلت'' کا نام دیتے ہیں جو ایک لا علاج مرض ہے۔ حیات باہو کا یہ پہلو واقعی قابل تقلید ہے کہ خلق خدا کے حقوق ادا کرنے کے باوجود مبتلائے غفلت نہ ہوئے۔ چار بیویوں کے بطن سے آٹھ بیٹے تولد ہوئے۔

(۱) سلطان نور محمد (فرزند اکبر) (۲) سلطان ولی محمد (۳) سلطان لطیف محمد (۴) سلطان صالح محمد (۵) سلطان اسحاق محمد (۶) سلطان فتح محمد (۷) سلطان شریف محمد (۸) سلطان حیات محمد (ان کا انتقال عہد طفلی ہی میں ہوا) تمام فرزندان کو آپ نے علوم ظاہری تعلیم کیے اور مستند اساتذہ کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کرایا۔

ایک فرزند اکبر سلطان باہو کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے کہ اچانک سلطان باہوؒ نے اپنے فرزند کو آگے چلنے کا حکم دیا۔

''حضور! یہ کیسے ممکن ہے؟'' پاس ادب سے سلطان نور محمد نے عذر پیش کیا ''آپ کے نقش قدم پر چلنا ہی میرے لیے باعث سعادت وصد افتخار ہے۔''

''فرزند! ذرا اوپر دیکھو'' سلطان باہوؒ نے فرمایا۔

نور محمد نے اوپر نگاہ کی تو گویا آنکھیں چندھیا گئیں' درخشاں نور کی ایک لاٹ تھی جو تاحد نظر سے آگے تھی۔ اس کے آغاز کا نظارہ تو کیا جا سکتا تھا مگر انتہا حد نظر سے آگے تھی۔

''آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی اس روشنی کو دیکھو اور پہچانو۔ یہ تمہارا نور باطن ہے جسے ہم نے آشکار کر دیا'' یہ کہا اور دست حق پرست سے پکڑ کر اپنے آگے کر دیا۔

سلطان ولی محمد جو باہوؒ کے پردہ پوش ہو جانے کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ مقام ولایت

Marfat.com

پر فائز ہوئے۔علوم ظاہری و باطنی میں ید طولیٰ کا نتیجہ تھا کہ ''فصیل جاں پر کیفیت'' سکر طاری رہتی ۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ موصوف کے درجات دیدار باہوؒ کی کثرت سے بلند ہوئے۔آپ کی عادت تھی کہ سلطان باہوؒ کے روبرو دوزانو بیٹھے رہتے اور پلک جھپکے بغیر محو نظارہ رہتے۔

''حضور! اپنے جسم کو لبادے میں چھپا کر رکھا کریں' ولی محمد مسلسل محو نظارہ رہتا ہے' بد نظری کا احتمال ہے'' ایک روز فرزند اکبر نے شکایت کی

''بیٹا! ولی محمد اور میرا معاملہ سر الٰہی ہے۔اس بحث سے گریز ہی مناسب ہے۔وہ اپنے درجات کی بلندی کا خواہش مند ہے اور مختصر ترین راستے پر گامزن ہے'' سلطان باہوؒ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

یہاں ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''عمل'' کے بغیر کیا فقط نظارہ کرنے سے مقام بلند ہوسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یقیناً اثبات میں ہے۔دیدار رسالت مآب ﷺ سے مقام صحابیت کا حصول ہوتا ہے (حالت ایمان شرط ہے) غلاف کعبہ کی جانب دیکھتے رہنا' عبادت کے زمرے میں آتا ہے۔اسی طرح دیدار مرشد' مراتب کو بلند کرتا ہے اس لیے سلطان باہوؒ نے فرمایا تھا کہ مرشد کا دیدار میرے لیے حج کے برابر ہے۔

رنگ پور کھیڑے کے گردونواح میں سلطان ولی محمدؒ ایک روز محو خرام تھے کہ چند لوگ کنواں کھودتے ہوئے نظر آئے۔آپ نے دوربیں نگاہوں سے دیکھا اور مداخلت پر مجبور ہوگئے ۔''اپنی محنت کو ضائع مت کرو'' ولی محمدؒ نے کہا۔''اس جگہ زیر زمین میٹھا پانی مفقود ہے اور بے فائدہ عمل سے گریز ہی دانش مندی ہے۔''

وہ لوگ آپ کے مقام سے آگاہ تھے۔کنواں نصف سے زیادہ کھودا جا چکا تھا۔کچھ لوگوں نے فوراً ہاتھ روک لیے مگر چند لوگ مصروف کار رہے...... کچھ دیر بعد زمین اتنی سخت ہوگئی کہ مزید کھدائی ممکن نہ رہی۔لوگ حیران تھے کہ نرم زمین سنگلاخ کیسے ہوگئی؟ سب لوگ کنوئیں سے باہر نکل آئے اور آپ سے ملتمس ہوئے کہ آپ مناسب جگہ کی نشان دہی فرمائیں۔سلطان موصوف ایک ٹیلے پر قدم جما کر کھڑے ہوگئے۔

''میرے قدموں تلے ٹھنڈے میٹھے پانی کا ذخیرہ ہے۔اس جگہ کھدائی کا آغاز کردو۔'' ولی وقت نے خلق خدا کو فیض سے نوازا۔اس جگہ کنواں کھودا گیا تو ایسا آب خنک اور شیریں دستیاب ہوا کہ گردونواح میں اس کنوئیں کی دھوم مچ گئی۔اسے کمال نظر کہتے ہیں کہ زیر زمین مدفون

Marfat.com

خزانے صاف نظر آ جائیں۔

ملتان کے گردونواح میں ''کھائی کھپیاں'' کا ایک رئیس عالم باعمل انسان تھا۔اس کی بیٹی زہد وتقویٰ میں بے مثال تھی۔لنگر میں حاجت مندوں کے لیے کھانا پکانے کا اسے بڑا شوق تھا۔ ایک روز وہ توے پر روٹی ڈالے تسبیح میں مشغول تھی کہ ایک کمبل پوش آناً فاناً حرم میں داخل ہوا اور توے پر سے روٹی اچک کر لے گیا۔دوشیزہ اس جرات رندانہ پر حیران رہ گئی۔ایک نامحرم کا اس طرح اچانک اندر گھس آنا قابل تشویش بھی تھا مگر وہ درویش تو بس آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح غائب ہو گیا لہٰذا زاہدہ عابدہ لڑکی مجبوراً خاموش رہی۔

دوسرے روز پھر یہی کچھ ہوا تو اس نے ساری روداد اپنے باپ کے گوش گزار کی۔باپ بھی صاحب بصیرت تھا مگر یہ بڑی ناپسندیدہ صورت حال تھی۔''کل میں خود اس درویش سے نمٹ لوں گا'' لڑکی کے باپ نے کہا۔

نیا سورج طلوع ہوا' دوشیزہ کھانا پکانے میں مصروف ہوئی تو رئیس موصوف پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔جونہی درویش نے اندر داخل ہو کر روٹی اچکنے کی کوشش کی' اس کی کلائی مضبوط ہاتھ میں جکڑی گئی۔

''درویش!اس غیر اخلاقی حرکت کے کیا معنی؟ رئیس نے چیں بہ چیں ہو کر پوچھا۔''تم نے دو غلط کام کئے' اہل خانہ کی اجازت کے بغیر مکان میں داخل ہوئے' دوسرے نامحرم خاتون کی پردہ داری کو مجروح کیا۔یہ اللہ والوں کا طریقہ کار نہیں۔''

''یہ سراسر الزام ہے'' یقین نہ ہو تو مراقبے میں جا کر دریافت فرمالیں۔''

رئیس نے تعجب سے فقیر کو دیکھا اور فوراً مراقبے میں گیا اور مشاہدے سے حیران رہ گیا۔ عالم اقدس سے انکشاف ہوا کہ زاہدہ عابدہ لڑکی درویش موصوف کی بیوی ہے آواز آئی ''اے رئیس بے ریا! تیری نیک سرشت صاحب زادی روز اول سے ولی وقت ولی محمد ابن سلطان باہوؒ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکی ہے اور یہ مرد صالح' حکم الٰہی کی تعمیل میں تمہارے گھر آتا ہے' اس کا آنا مبارک ہے۔''

رئیس مراقبے سے باہر آیا تو فرط مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔فوراً شادی خانہ آبادی کا اہتمام ہوا اور ولی محمدؒ سے اس نے اپنی صاحبزادی کا نکاح کر دیا۔چنانچہ مزار باہو کے موجودہ سجادہ نشین' سلطان محمد کی اولاد' اسی زاہدہ عابدہ خاتون کے بطن سے ہے۔سلطان نور محمدؒ اپنی زندگی ہی میں

Marfat.com

سجادہ نشینی سے دست بردار ہو گئے تھے۔

۱۱۰۲ھ جمادی الثانی کی یکم تاریخ تھی' جمعتہ المبارک کو رات کے تیسرے پہر سلطان العارفین سلطان باہوؒ کو رحلت کی صدا سنائی دی تھی۔ وہ تو پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ عمر بھر فرائض کے علاوہ اتباع سنت ﷺ کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ یہ آخری سنت تھی جو آپ نے ادا کی یعنی تریسٹھ برس کی عمر میں راہی ملک عدم ہوئے۔

شورکوٹ موضع قہرگاں کے قلعے میں تدفین ہوئی۔ یہ گاؤں اور اس کا گردونواح کا علاقہ شہنشاہ ہند شاہجہاں نے آپ کے والد بزرگوار سلطان بازید محمد کو بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ یہ ساری زمین محصول خراج سے مستثنیٰ تھی۔ اسی قلعے میں پہلا مزار تعمیر ہوا۔ ستتر برس (۷۷) سلطان العارفین اسی مزار میں آسودہ حال رہے۔

۱۱۸۰ھ میں یہ علاقہ جھنڈا سنگھ وگنڈا سنگھ لاہوری کے زیر تسلط آیا۔ یہ دونوں ملتان کے منتظمین تھے۔ اسی دور میں شیخ سلطان محمد حسین سجادہ نشین تھے۔ وہ ہجرت پر مجبور ہوئے اور خیر پور ٹانویں والا کی جانب کوچ کر گئے۔

دور سکھا شاہی کے جور و ستم ہمارا موضوع نہیں صرف اس قدر عرض ہے کہ سلطان العارفین کی تقریباً ساری اولاد شورکوٹ سے نکل کر پنجاب کے مختلف مقامات کی طرف کوچ کر گئی گویا تسبیح کے سارے دانے بکھر گئے چند فقیر اور خلفا مزار اقدس میں مقیم رہے۔ ان کی وفا نے آستانہ محبوب چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ ادھر دریائے چناب جو ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد'' کے مصداق عشاق سے ہر زمانے میں چھیڑ چھاڑ کرتا رہا ہے۔ قلعہ مذکورہ تک آ پہنچا شاید وہ قدم بوسی کو بے قرار تھا' بہرحال' قلعے کی فصیل گری تو خلفا تشویش میں مبتلا ہوئے۔ مزار اقدس کی حدود میں آفتاب و مہتاب سلوک مدفون تھے۔ تربتوں کو کھولا گیا اور سارے صندوق محفوظ کر لئے گئے تاکہ وہ دریا برد نہ ہو جائیں۔ کسی مناسب مقام پر از سر نو تدفین کی منصوبہ بندی کی گئی مگر سلطان العارفین کا مزار محفوظ تھا۔ لہٰذا اسے قائم رہنے دیا گیا۔

دریا نے مزید پیش رفت کی تو مزار کے درویش فکر میں مبتلا ہوئے۔ اب تربت کھولنے کے سوا چارہ کار نہ تھا مگر جب مزار شق کیا گیا تو تابوت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ حیران کن صورت حال بڑی خطرناک تھی۔ بپھرا ہوا دریا در پر دستک دے رہا تھا اور مدفون ''خزانہ'' گم ہو چکا تھا۔ سب لوگ مایوس ہو کر اشک بہانے لگے۔ یہ بے بسی کے آنسو تھے جنہیں پونچھنے والا بھی کوئی

Marfat.com

نہ تھا۔ یہی غم کھائے جارہا تھا کہ مزار مقدس کا نام ونشان نہ رہا تو درویش کس در پہ جائیں گے۔

وہ شب تاریک ضرورت سے زیادہ سیاہ تھی کہ درویشوں کے دل رو رہے تھے۔ اس کیفیت رنج والم میں سب اونگھنے لگے اور ایک گونج دار صدا کانوں میں رس گھولنے لگی۔ ''فکرو اندیشے کی چنداں ضرورت نہیں ہم یہیں کہیں آس پاس ہی موجود ہیں' دریا کو روک دیا گیا ہے' کل طلوع آفتاب کے وقت ایک مرد خدا آئے گا جو ہمارے جسم کو چھونے کے قابل ہوگا' تابوت اسے ہی ملے گا۔''

اس واضح پیغام سے سب کو اطمینان نصیب ہوا اور سب عشاق طلوع آفتاب کا انتظار کرنے لگے۔ انتظار کی رات تو ویسے بھی ''طول شب فراق'' کے مانند ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی طویل تر۔ خدا خدا کرکے افق پر صبح کے آثار دکھائی دیے۔ نوید مسرت کے عین مطابق ایک سبز پوش گھڑ سوار آیا۔ اس کا چہرہ زیر نقاب تھا۔ وہ آتے ہی مٹی کے اس ڈھیر کی جانب بڑھا جو درویشوں نے کھود رکھی تھی۔ چوبی صندوق سوئی تھا نہ گمشدہ ریت کا ذرہ' بہر حال سب کچھ سب کے سامنے ہوا۔ نقاب پوش نے اس مٹی کے ڈھیر میں سے صندوق ڈھونڈ نکالا۔ یہ ایک ناقابل فہم سی بات تھی مگر ہوا ایسے ہی۔

خلق خدا زیات باہو کو امڈ پڑی۔ صندوق کھولا گیا' فضا ان جانی خوشبو سے مہک اٹھی۔ چہرہ تاباں سے پردہ ہٹایا گیا تو ریش مبارک سے آب غسل کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ گویا ستتر برس پیشتر نہیں' ابھی ابھی غسل دیا گیا...... ایک دو نہیں ہزار ہا آنکھوں نے نظارہ کیا۔ یہ اس قرآنی آیت کی عملی تشریح تھی جس میں ارشاد ہے۔

''خبردار! اولیاء اللہ غم واندوہ سے محفوظ ہیں اور نہ خوف ان کے قریب پھٹک سکتا ہے''

موجودہ جائے مدفن پیپل والی حویلی کے نام سے مشہور تھی (یا پیپل والے کنوئیں کی حویلی) مشہور ہے جو شخص اس حویلی میں قدم رکھتا وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو جاتا۔ انتہا یہ کہ کوئی درندہ یا حیوان تک اس میں داخل ہونے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ بنابریں وہ کنواں اور حویلی دونوں ایک عرصے سے ویران وسنسان پڑے تھے مکان تو گر گیا تھا مگر مکیں ندارد۔ اس حویلی میں مزار اقدس بنانے کا اشارہ بھی نقاب پوش نے دیا اور اپنا کام سرانجام دے کر وہ روپوش ہو گیا۔

مذکورہ کنوئیں کے مغرب میں حویلی کے عین درمیان مزار کی جگہ کا تعین کیا گیا اور صندوق مبارک کو لاکر سطح زمین پر رکھ دیا گیا۔ اس روز حویلی میں جو بھی داخل ہوا اس کے ہوش وحواس قائم

Marfat.com

رہے گویا حویلی کے گرد ایک غیر مرئی حصار قائم تھا جو اس جگہ کو انسانی قدموں سے محفوظ رکھے ہوئے تھا اور اب وہ حصار ٹوٹ چکا تھا' کیوں کہ خالی مکاں کا مکین اسے آباد کرنے آ گیا تھا۔

موجود مزار کے لئے زمین کھود کر تربت تیار نہیں کی گئی تھی بلکہ صندوق زمین پر رکھ کر' اس کے گرد تعمیر مزار کی گئی اور مزار کی موجودہ تزئین و آرائش ۱۹۱۲ء میں ہوئی یعنی مزار باہوؒ تین بار تعمیر کے مراحل سے گزرا۔

شورکوٹ شہر میں بی بی راستی اور سلطان بازید محمدؒ ایک دوسرے کے قریب محو استراحت ہیں۔مزار باہوؒ کے زائرین پہلے یہاں حاضری دیتے ہیں اس کے بعد سوئے مزار باہوؒ روانہ ہوتے ہیں۔ایک مختصر سا راستہ دریائے چناب' پتن سے عبور کر کے مزار کو جاتا ہے جو مختصر سا ہے۔دوسرا تریمو ہیڈ ورکس سے ہوتا ہوا اٹھارہ ہزاری اور یہاں سے گڑھ مہاراجہ کو جاتا ہے۔گڑھ مہاراجہ سے مزار اقدس زیادہ دور نہیں۔مزار واقعی قابل دید ہے مگر اہل دل کے لئے۔

سلطان العارفین نے فرمایا تھا کہ درویش وہ جس کی قبر زندہ رہے اس کی ایک تشریح یہ بھی ہے کہ درویش بعد از مرگ' مصروف ''تصرف'' رہے اس کی چند ایک مثالیں پیش خدمت ہیں۔ان کو کرامات باہوؒ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔اپنا اپنا خیال ہے جس پر کوئی قدغن نہیں، سلطان العارفین نے نہ صرف اپنے مریدان باصفا خلفا کو فیض پہنچایا بلکہ تصرف کا یہ عمل سلسلہ در سلسلہ جاری رہا۔

سلطان العارفین کے ایک خلیفہ نورنگ کھتران محتاج تعارف نہیں۔مرشد کی پردہ پوشی کے بعد کافی عرصہ تک بقید حیات رہے۔مراقبے میں جاتے تو ان کے مریدان باصفا ان کے گردا گرد حلقے میں بیٹھ جائے۔مراقبے سے باہر آ کر جس فرد کو ہدف نگاہ بناتے وہ صاحب احوال کشف ہو جاتا۔ایک روز عجیب صورت حال در پیش ہوئی۔نورنگؒ مراقبے سے باہر آئے تو گردو پیش کوئی متنفس نہ تھا (یہ محض اتفاق تھا) ادھر جذبات سکر کا غلبہ ادھر ہدف مفقود۔ایک سگ آوارہ قریب بیٹھا تھا آپ نے اسی پر توجہ مبذول کر دی۔اس کتے کی کیفیت ہی بدل گئی۔وہ جس طرح نکل جاتا گلی کوچوں کے آوارہ کتے اس کے پیچھے ہو لیتے اور اپنے حصے کی روٹی بوٹی وغیرہ بڑے احترام سے اس کے آگے لا رکھتے اور باقاعدہ حلقہ باندھ کر اس کے گرد جا بیٹھتے۔سلطان العارفین کو نور باطن کے وسیلے سے خبر ہوئی کہ آپؒ باز پرس کی خاطر وہاں پہنچے تو نورنگؒ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔آپ نے بھاگ کر دامن رسالت مآبؐ میں پناہ لی۔

Marfat.com

حضور ﷺ نے فرمایا ''اے باہو! درگزر کر اگر نورنگ سگ آوارہ کی جانب توجہ مبذول نہ کرتا تو اس کا سینہ پھٹ جاتا''

نورنگ کھتران ؒ کے نزدیک خلیفہ سلطان احمد حصول فیض کی خاطر سید عثمان مروندی المعروف لعل شہباز قلندر کے روضہ اقدس پر حاضر ہوئے۔ پشت پناہی کو سلطان العارفین موجود تھے۔ اسی ناز میں بطریق ''دعوت'' تربت قلندر پر سوار ہو گئے۔ لعل شہباز تو بس جلال میں آ گئے۔ راہ سلوک میں بھی اندازے کی غلطی عین ممکن ہے لعل شہبازؒ نے سب کچھ چھین کر ذہن کو کورے کاغذ میں بدل ڈالا' حواس تک چھین لئے۔ کافی عرصہ بعد حواس بجا ہوئے تو خلیفہ صاحب فرط غم سے نڈھال ہو گئے۔ روتے پیٹتے خدمت باہو میں روحانی حاضری دی۔ یہ بڑی الجھی ہوئی صورت حال تھی۔ بہر حال مرشد کامل خدمت قلندر میں پہنچے اور مشہور ہے کہ سلب شدہ نعمت سے ساٹھ گنا زیادہ مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور سلطان احمد کو پہلے سے بلند مقام نصیب ہوا۔ ایک درویش نے دوسرے کا بھرم رکھ لیا۔

نور محمد موچی مرید نورنگ کا ایک واقعہ بڑا مشہور ہے (موصوف کا مزار ڈیرہ اسماعیل خان میں گورستان سلطان سٹھو میں موجود ہے) نور محمد کی مرشد سے والہانہ عقیدت کا یہ حال تھا کہ مرشد دکھائی نہ دیتا تو اشک گریاں سے خون جاری ہو جاتا۔ وصال میں ہوتے تو بھی مسلسل اشک بار رہتے۔

جنہاں دے دل عشق سمایا روون کم انہاہاں
وچھڑے روندے ملدے روندے 'روندے ٹردے راہاں

جن کے دلوں میں عشق بسیرا کر لے اشک باری ان کا وظیفہ بن جاتا ہے۔ ہجر و وصال دونوں حالتوں میں آنسو بہاتے ہیں (وصال میں ہجر کا متوقع غم مضطرب کرتا ہے) وہ چلتے پھرتے روتے رہتے ہیں۔

اس زمانے میں ڈیرا اسماعیل خان و ڈیرا غازی خاں کا علاقہ قوم بلوچ کے زیر تسلط تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خان کا حاکم ''ہوت بلوچ'' تھا۔ انسان کا ایک مقام یہ ہے کہ فرشتے تک سجدہ کرتے ہیں لیکن حضرت انسان پستی میں گرنے پہ آئے تو گراوٹ کی انتہا کر دیتا ہے۔ ہوت بلوچ کے قبضہ قدرت میں طاقت تھی' اقتدار تھا اور وہ پٹری سے اتر چکا تھا۔ بدمستی و خرمستی میں ایک لڑکے پر عاشق ہو گیا۔ ہر وقت اسے اپنی بغل میں رکھتا اور اپنی ذہنی پستی کا سر عام فخریہ اعلان کرتا۔ ابلیس

Marfat.com

نے کرسی دل پر قابض ہوکر اپنی ربوبیت کا اعلان کیا تو ہوت بلوچ نے گردونواح کے علما کو دربار میں طلب کیا اور حکم دیا۔ ''اس لڑکے سے میرے نکاح کا مذہبی جواز تلاش کرو اور ہمیں رشتہ مناکحت میں منسلک کردو۔''

علماء دنگ رہ گئے مگر پابند سلاسل ہونے سے بچنے کی تدابیر سوچنے لگے۔ باہمی مشورے سے طے پایا کہ نور محمد' غلام باہو کو اس میں ملوث کرلیا جائے۔ موصوف علوم ظاہری میں بھی بلند مرتبت انسان تھے۔ ان کو ''شریک مصیبت'' کرنے سے سلامتی کی راہ ہموار ہوسکتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے متفقہ طور پر ہوت بلوچ سے درخواست کی' ہم سب نور محمد موچی کے شاگردان رشید ہیں علم و فضل میں ان کا جواب نہیں'' اس نازک مسئلے کا حل وہی تلاش کرسکتے ہیں۔''

نور محمد موصوف کو دربار میں حاضری کا حکم ہوا اور فتوی صادر کرنے کو کہا گیا۔

''اے حاکم وقت! یہ تمام علماء اس مسئلے کا حل پیش کرنے سے عاجز ہیں لہٰذا ان کو دربار سے رخصت کردو'' نور محمد نے علماء کا پروانہ رہائی حاصل کیا۔ ادھر ہوت بلوچ نے بھی اندازہ لگایا کہ مطلب براری کے لئے مناسب ترین ''ملا'' ہاتھ آ گیا ہے جو سب کا استاد ہے لہٰذا اس نے تمام علما کو رہا کردیا اور فتوے کا از سر نو حکم دیا۔

''اے انسانیت کے ذلیل ترین نمونے' روز ازل سے جو بات ناجائز چلی آ رہی ہے تو کرسی اقتدار کی بدولت اسے اپنے لئے کس طرح جائز قرار دینے کی ضد کررہا ہے'' درویش نے جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کا اعلان کیا۔ ''یہ شرع محمدی ﷺ ہے' کم ظرف انسانوں کا بنایا ہوا قانون نہیں جسے جب چاہا توڑ ڈالا یا اپنی حیوانی خواہشات کے مطابق اس کی تفسیر کرلی۔''

ہوت بلوچ بحر ندامت میں غرق ہونے کے بجائے آتش زیر پا ہوگیا اور بوزنے کی طرح اچھل کود مچانے لگا۔ یہی انسان کی ذہنی پستی ہے وہ نفس پرستی سے نجات حاصل کرنا ہی نہیں چاہتا۔

''اس متقی پرہیز گار کو زندان میں ڈال دو'' ہوت بلوچ نے حکم دیا کیوں کہ اس کے بس میں قفس ہی تھا' صداقت کی مہک نہ تھی'' جب تک یہ ''مولوی'' میرے حسب منشا فتوی نہ دے اسے مبتلائے عذاب رکھو اگر پھر بھی راہ راست پر نہ آئے تو سولی پر لٹکا دو۔''

اس طرح غلام باہو کو کال کوٹھری میں بند کردیا گیا۔ گویا آفتاب عالم تاب کو شیشے کی دیواروں میں مقید کردیا گیا۔

شب تنہائی میں قیدی قبلہ رو ہوکر سربسجود ہوگیا۔ دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور پائے

Marfat.com

استقامت میں لغزش نہ آنے کی خدا سے التجا کی اور سلطان العارفین کی جناب مدح استغاثہ و استمداد رقم کی۔ یہ ایک طویل منقبت تھی جس میں غلام نے گویا کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔(یہ منقبت آج بھی بطور مثال پیش کی جاتی ہے اور عشاق باہوؒ بڑی عقیدت سے اسے پڑھتے ہیں)

''نور محمد! نوید مسرت ہو کہ ہوت بلوچ کا بندوبست ہو گیا ہے۔ آفتاب ظلم غروب ہوا'' سلطان العارفین نے قید خانے میں اپنے عاشق کو خوش خبری سنائی۔

یہ علاقہ حاکم کابل کی عملداری میں تھا' کیسے ہوا اور کیوں کر ہوا؟ یہ غیر متعلقہ بات ہے ہمیں تو صرف ''کیا ہوا؟'' سے غرض ہے ڈیرا اسماعیل خان میں یہ ہوا کہ بادشاہ وقت کا ہرکارہ آیا اور ہوت بلوچ کو گرفتار کر کے کابل لے گیا۔ جہاں کا زندان اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کتب تاریخ میں ہوت کا انجام محفوظ ہے۔ وہ قید و بند کی صعوبت برداشت نہ کر سکا اور سفر آخرت کر گیا۔

شاہی ہرکارے نے نور محمد کو خود قید سے نجات دلائی اور بصد احترام رخصت کیا۔ جن کے ''کلے'' مضبوط ہوں' حوادث بھی ان سے گریز کرتے ہیں۔

مزار باہوؒ کے زائرین میں ''حضوری بیر'' والا خرق عادت واقعہ بڑا مشہور ہے۔ اس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔ اس کی سند وہ ہزار ہا لوگ ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اس شجر ''سدرہ'' (بیری کا درخت) کو دیکھا تھا۔

بیری کا ایک درخت باب حضوری کی دہلیز کے عین وسط میں تھا جو زائرین کے لئے باعث زحمت بنا کھڑا تھا۔ ایک روز نماز عصر کے وقت ایک نابینا عاشق مزار پر فاتحہ خوانی سے تسکین قلب حاصل کرنے کے لئے آیا تو بصارت سے محرومی کے سبب اس کی پیشانی شجر مذکورہ کے تنے سے ٹکرا گئی۔ خون رواں ہوا تو مجاوروں نے اس درخت کو باعث آزار قرار دے کر کاٹنے کا ارادہ کیا۔ اس سے پیشتر بھی کئی بار درخت کو کاٹنے کا ارادہ کیا جا چکا تھا مگر پاس ادب کی بنا پر عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا مگر اس بار سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ درخت کو کاٹ دیا جائے تا کہ زیارت کرنے والوں کو زحمت سے نجات مل جائے۔ اسی رات سلطان باہوؒ نے خلیفہ محمد صدیق کو عالم رویا میں زیارت سے سرفراز فرمایا اور کہا ''عزیزم! درخت کاٹنے کی ضرورت نہیں وہ حکم الٰہی سے خود اپنی جگہ تبدیل کر لے گا۔''

سرسری نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک ناقابل فہم سی بات ہے مگر دوسرے روز الصباح' لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ بیری کا درخت دہلیز کے وسط سے شمال کی جانب پندرہ ہاتھ دور

Marfat.com

ایستادہ تھا۔ درویش نے خلق خدا کی سہولت کو مدنظر رکھا۔

روایت ہے کہ خلیفہ محمد صدیق نے طلوع صبح سے پہلے ہی لوگوں کو مطلع کر دیا تھا کہ درخت کاٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ بہرحال اس روز سے درخت کا نام 'حضوری بیر' پڑ گیا۔ لوگ اسے سدرہ یا بیر نہیں کہتے۔ اس کا پھل ملک کے کونے کونے میں دور دراز تک لوگ تبرکاً لے جاتے ہیں۔ اندرون سندھ کے لوگ مثلاً کچھی شکار پور وغیرہ میں خلیفہ محمد صدیق کو خلق خدا ''مخدوم بیر والا'' کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

جذبہ طلب میں سچائی ہو تو عالم امکان میں ہر شے ممکن ہے۔ سلطان العارفین کی تیسری پشت میں میاں قائم نامی سفید ریش بڑھئی مزار باہو پر معتکف ہوا۔ اسے قرآن خوانی کا شوق تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ عمر رسیدہ شخص قوت بصارت سے یکسر محروم تھا۔ اب ایسے شخص کو قرآن کون پڑھائے۔ بچپن میں جدوجہد کرتا تو حافظ قرآن ہو جاتا۔ اس نے جس سے بھی اپنی تمنا کا اظہار کیا اس نے بوڑھا طوطا کہہ کر ٹال دیا۔ دلی خواہش حسرت میں بدل گئی تو وہ مزار باہو پر دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔

ایک روز اولاد باہوؒ نے دیکھا کہ وہ نابینا شخص قرآن کھولے بیٹھا ہے اور طالب علموں ہی کے انداز میں سطروں کو حرف بہ حرف دیکھ رہا ہے۔ پھر تو اس کا یہی معمول بن گیا صبح کو قرآن کھولتا ظہر تک اپنے وظیفے میں مشغول رہتا پھر نماز عصر کے بعد مصروف کار ہو جاتا۔ لوگوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ یہ کام وہ خاموشی سے سرانجام دیتا رہا۔

''ایک بار اولاد باہوؒ میں سے کسی نے پوچھا۔ ''میاں قائم' تم تو اندھے ہو' یہ خاموش بیٹھے کیا کرتے رہتے ہو؟''

''حضور! میں اندھا تھا مگر وہ تو بڑی پرانی بات ہے'' بابا قائم نے بصد احترام جواب دیا ''اب تو میں ہر چیز دیکھ بلکہ پڑھ بھی سکتا ہوں۔''

''مگر تمہیں پڑھاتا کون ہے؟''

''اس کا جواب میں آپ کے کان میں دے سکتا ہوں'' بابا قائم نے سرگوشی کی۔ ''اخفائے راز سے ممکن ہے میں نعمت عظمیٰ سے محروم ہو جاؤں۔''

سلطان حامد بن غلام باہو رقم طراز ہیں کہ اس بڑھئی نے میرے کان میں کہا ''آپ کے جد بزرگوار سلطان العارفین میرے استاد ہیں۔ میری بینائی بھی ان کے طفیل لوٹ چکی ہے اور اب میں قرآن کی تلاوت کر سکتا ہوں۔''

Marfat.com

رفتہ رفتہ مزار کی حدود میں سب کو خبر ہوگئی بابا قائم عجیب وغریب دعویٰ کرتا ہے۔ایک روز لوگوں نے اصرار کر کے بابا کو قرآن سنانے پہ مجبور کر دیا''اچھا تو پھر سننے کے لئے تیار ہو جاؤ مگر میں تنبیہ کرتا ہوں کہ صرف اہل ظرف وشرف ہی سماعت فرمائیں ورنہ ان کے پیمانے چھلک بھی سکتے ہیں۔''

بابا قائم نے تلاوت کا آغاز کیا تو شجر و حجر جھومنے لگے۔یہ سوز کسی اور ہی عالم کا تھا۔کئی لوگ واقعی ہوش وحواس سے بیگانے ہو گئے۔

آخر جذبہ صادق کی گہرائی کس پیمانے سے ناپی جاسکتی ہے۔وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا بیان ہی پیمانہ ہے۔لوگ زیارت کعبہ کو جاتے ہیں مگر یوں بھی ہوا کہ بیت اللہ خود چل کر کسی عاشق الٰہی کی زیارت کو گیا۔یہ مجذوب کے جذبہ صادق کا کرشمہ تھا صدیوں سے خلق خدا کو سعادت حج نصیب ہو رہی ہے مگر ایک حج حضرت ابراہیم ادھمؒ نے ادا کیا تھا اور رابعہ بصریؒ نے ان کو بھی مات دے دی۔

ابراہیم ادھمؒ نے حج کی نیت کی' احرام باندھا' ہر ایک قدم پر سجدہ توفیق ادا کیا اور ہر دو قدم بعد دوگانہ ادا فرماتے۔احرام کی نیت از سر نو کرتے۔اسی انداز میں سجدہ ریز ہوتے ہوتے بیت اللہ شریف تک جا پہنچے۔یہ سجدے کعبے کی چار دیواری کو نہ تھے بلکہ صاحب بیت عظمت کو تھے۔اگر چار دیواری کو ہوتے تو بے فائدہ قرار دیے جاتے۔بہر حال منزل مقصود پر پہنچے تو منزل کو غائب پایا یعنی بیت اللہ وہاں موجود ہی نہ تھا۔

''رب کائنات' کیا میرا جذبہ خام تھا؟ میری نیت میں فتور تھا؟''ابراہیم ادھم نے فریاد کی۔

''میرے بندے آہ زاری کی ضرورت نہیں' نہ تمہارا جذبہ خام تھا' نہ نیت میں فتور تھا''غیب سے آواز آئی''اصل میں ہماری ایک چاہنے والی عجیب انداز میں ملاقات کو آرہی ہے' کعبہ اس کے استقبال کو گیا ہے۔''

جنابہ رابعہ بصریؒ نے احرام باندھا تو پہلو پر لوٹتی ہوئی کروٹ بدل بدل کر سات برس میں سفر حج طے کیا۔قارئین کرام جذبوں کی صداقت وگہرائی کا اندازہ خود لگائیں۔رابعہ بصریؒ حرم میں داخل ہوئیں تو ابراہیم ادھم نے پوچھا''ارے رابعہ! فرش سے عرش تک یہ کیا ہنگامہ بپا ہے؟ ہر طرف یہی شور وغل ہے کہ کعبہ استقبال رابعہ کو بھیجا گیا۔''

''اے ابراہیم! بندہ خدا شور وغل کی دوسری نوعیت ملاحظہ نہیں فرمائی؟ ابراہیم نے قدم

Marfat.com

قدم پر دوگانہ ادا کیا اور مناسک حج ادا کئے رابعہ بصری نے قدم قدم پر دوگانہ ادا کیا اور مناسک حج ادا کئے رابعہ بصری نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

رابعہ در راہ کعبہ ہفت سال
گشت بر پہلو زہے تاج الرجال

راہ کعبہ میں، رابعہ سات برس تک، پہلو کے بل سفر کرتی ہوئی آئیں۔ زہے نصیب مردوں کا تاج اسے ہی کہتے ہیں۔

قائم بابا ایک اندھے بڑھئی نے جذبہ صادق کے طفیل سلطان العارفینؒ سے قرآن پڑھ لیا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ جذبے ایسے کرشمے دکھایا ہی کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

سلطان العارفینؒ کے خلفا کی تعداد ویسے تو بے شمار ہے اور وہ مشائخ جنہوں نے مزار اقدس سے منسلک ہو کر روحانی فیض حاصل کیا ان کا فرداً فرداً ذکر بھی ممکن نہیں۔ ہم صرف ایک ہستی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں یعنی گل محمد سندھیؒ جو علوم ظاہری میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کا شمار خلفا طبقہ اولا میں ہوتا ہے یعنی وفات باہوؒ کے ابتدائی دور میں۔ مولانا موصوف فیض باطنی کی غرض سے آستانہ عالیہ پر حاضر ہوئے پھر اسی در کے ہو رہے۔ سیر و سیاحت گھٹی میں پڑی تھی مگر معمول یہ تھا کہ خانقاہ کے سوا کسی جگہ آٹھ پہر سے زیادہ قیام خارج از مکان تھا۔ مزار پر حاضر ہوتے تو جیسے مچھلی پانی کے حوالے ہو جائے۔ بے قرار دل کو قرار آ جاتا اور سارا اضطراب ہوا ہو جاتا۔ طبعاً چونکہ سیلانی تھے لہٰذا زیادہ تر جنگلوں بیابانوں میں محو خرام رہتے یا دریا کنارے نکل جاتے۔ سلطان العارفین کے فیوض و برکات کی اس زمانے میں دھوم مچی تھی۔ ادھر مولانا موصوف کو علوم ظاہری سے تسکین نہیں ہو رہی تھی اسی کشمکش میں ایک روز جنگل میں گھوم رہے تھے کہ اچانک ایک عجیب و غریب منظر دکھائی دیا۔

ایک نوجوان شجر تلے سو رہا تھا اور اس کا اسپ تازی قریب ہی گھاس چر رہا تھا کہ اچانک ایک سیاہ ناگ پھن پھیلائے کر گھوڑے پر حملہ آور ہوا۔ ناگ کی دہشت سے گھوڑے پر لرزہ طاری ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ گھوڑا ایستادہ ہو کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور باقاعدہ اسی موذی ناگ کا مقابلہ کرنے لگا۔ ناگ حملہ آور ہوتا تو گھوڑا اچھل کر اس کا وار بچا جاتا پھر اسے اپنے سموں تلے روندنے کی کوشش کرتا۔ مولانا گل محمد سندھی ورطہ حیرت میں ڈوبے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ ان

Marfat.com

کا علم اس محیر العقول واقعے کی تردید کر رہا تھا مگر سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا...... گھوڑے کے ہنہنانے سے خوابیدہ نوجوان کی آنکھ کھل گئی اور وہ بھی اس عجیب وغریب منظر سے لطف اندوز ہونے لگے

''بندہ خدا اپنے گھوڑے کو اس آفت سے بچاؤ'' مولانا موصوف نے نوجوان سے کہا۔

''گھوڑے کو کچھ نہیں ہوگا بلکہ خطرے میں تو ناگ ہے۔'' نوجوان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''جس آستانے سے گھوڑے کا تعلق ہے وہاں کی تو فاختاؤں سے شہباز خوف کھاتے ہیں۔''

دیکھتے دیکھتے واقعی گھوڑے نے موذی ناگ کو اپنے طاقتور سموں تلے کچل ڈالا اور قدم قدم چلتا ہوا اپنے مالک کے پاس آ گیا۔

''گھوڑے کا تعلق کس ''تھان'' سے ہے اور آپ کون ہیں؟'' مولانا گل محمد سندھی نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''میں سلطان العارفین کے مزار کا خادم ہوں اور گھوڑے کا تعلق بھی ان ہی کے طویلے سے ہے۔''

مولانا کو اپنی منزل کی نشان دہی ہو چکی تھی۔ مزار پر حاضر ہوئے تو جذبہ صادق رنگ لایا اور دنوں میں ابدالوں اوتادوں کے زمرے میں شمار ہونے لگے۔

فیض رسانی میں موصوف کا طریقہ کار منفرد قسم کا تھا جس طالب کو بامراد کرنا مقصود ہوتا اس پر روبرو توجہ نہ فرماتے بلکہ یوں گویا ہوتے ''عزیزم! فلاں جنگل میں فلاں جگہ ایک مرد خدا کی روح موجود ہے بھاگ کر جاؤ اور فیض روحانی حاصل کر لو'' اور طالب کے جاتے ہی اس کی عدم موجودگی میں توجہ مبذول کر کے' طالب کو صاحب حال بنا دیتے...... جن ہستیوں کو سندھیؒ نے کمال اوج تک پہنچایا ان میں دایا سلطان' میاں دلبر مرال' قاسم فقیر' وغیرہ اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موصوف کے حالات زندگی' سلطان دایا کی زبانی کتب مناقبت میں محفوظ ہوئے

سلطان دایا کی اپنے مرشد سے والہانہ عقیدت اور مزار باہو سے پر خلوص وابستگی عوام الناس کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ بنیادی طور موصوف طاقت ور مضبوط قد کاٹھ کے مالک تھے' عمر بھر مرغن غذاؤں سے پرہیز کیا سبزیاں بصد شوق تناول فرماتے۔ دن کو روزہ رکھتے رات سجدوں کی لذت میں گزرتی۔ اولاد باہوؒ کے بے دام غلام تھے دن بھر مصروف خدمت رہتے اور خدمت کا

Marfat.com

آغاز نماز تہجد سے ہوتا۔

نماز سے فارغ ہوتے ہی صاحب زادگان کے مویشی چرانے لے جاتے۔نماز چاشت کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتے پھر زمینوں میں ہل چلاتے۔ظہر کی نماز اپنی کٹیا میں آ کر ادا کرتے پھر غروب آفتاب تک مزار سے متعلقہ سخت ترین کاموں میں مصروف ہو جاتے اور دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد روزہ افطار کرتے۔

گل محمد سندھیؒ کے سچے عاشق زار تھے۔موصوف نے لڑکپن ہی میں اپنے سارے اختیار مرشد کو سونپ دیے تھے۔ایک روز مولانا سندھی سلطان العارفین کے مزار پر درود و وظائف میں مصروف تھے۔سلطان دایا کے لڑکپن کا زمانہ تھا مگر وہ مرشد کے قریب رہتے' جانے کب طلبی ہو؟ یہی سوچ کر ہر پل مستعد رہتے۔

''عزیزم! حافظ گوجر صاحب کی خدمت میں جاؤ۔ ہمارا سلام کہنا اور ان کی اجازت سے جلد لوٹ آنا''اس کے بعد مولانا موصوف نے کوئی پیغام دیا جو حافظ صاحب کو پہنچانا تھا۔مرشد کے احکام پر حرف بہ حرف عمل پیرا ہونے کی یہ بہترین مثال ہے جو قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

سلطان دایا نے مرشد کی صرف ایک بات پلے باندھ لی''پیغام پہنچا کر اجازت سے جلد واپس آنا ہے۔''

حافظ گوجر صاحب کا قیام چولستان کے علاقے محمود کوٹ میں تھا۔دایا جب رنگ پور کھیڑا پہنچے تو دل میں سوچنے لگے''مرشد نے جلد آنے کا حکم دیا ہے' مناسب یہی ہے کہ چولستان کا پانی نہ پیا جائے۔''

یہ فصیل جاں پر خود ساختہ شدید ترین پابندی تھی مگر معاملات عشق کی رونق اسی جنوں کی بدولت قائم و دوائم ہے۔دنیا دار تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔(رنگ پور کے بعد چولستان کا علاقہ تھا)

سلطان دایا حافظ گوجر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے' پیغام رسانی کے بعد لب بستہ کھڑے ہو گئے۔مولانا گل محمد سندھیؒ کا پیغام رساں تھا کمسن لڑکا ہوا تو کیا۔حافظ صاحب کمال مہربانی سے پیش آئے اور ازراہ لطف و کرم چند روز قیام کا حکم دیا۔لب کشائی کا مقام نہ تھا اور خود ساختہ عائد کردہ شرط یا پابندی سے گریز شیوہ مردانگی نہ تھا۔سلطان دایا قیام پذیر ہونے پر مجبور ہو گئے۔اتفاق کی بات کہ حافظ گوجر صاحب ان دنوں ڈیرے کے قریب تالاب کھدوا رہے

Marfat.com

تھے۔ سیکڑوں مریدان باصفا اور محبان بے ریا اس کام میں مشغول تھے۔ سلطان موصوف بھی ان میں شامل ہو گئے دن بھر کی مشقت کے بعد شام کو لنگر تقسیم ہوا موصوف نے بھی اپنا حصہ وصول کیا' پیاس سے ہونٹ' خشک ہو رہے تھے اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے مگر سلطان دایا اپنے عہد پر قائم رہے۔

ایک شخص نے چھاچھ پیش کیا تو آپ نے بے دھیانی میں لبالب بھرا کٹورا ہونٹوں سے لگا لیا۔ خشکی ہر گھونٹ سے دور ہونے لگی۔ اچانک خیال آیا ''چھاچھ میں بھی تو پانی موجود ہے اور یہ پانی یقیناً چولستان کا ہے۔ یہ تو بڑی خرابی ہو گئی۔'' کٹورا فوراً ہونٹوں سے الگ کر دیا۔ بھول چوک تو روزے میں بھی معاف ہے۔

پہلا ہفتہ قیامت کا تھا' سارا بدن گویا سپرد آتش محسوس ہوتا تھا پھر رفتہ رفتہ معجزانہ طور احساس تشنگی مٹ گیا۔ واضح ہو یہ جیٹھ کا گرم ترین مہینہ تھا (یعنی جون کا) پورے دو ماہ گزر گئے۔ حافظ گوجر صاحب کو کیا خبر سلطان دایا نے کیا ''عہد و پیان'' کر رکھے ہیں۔ وہ تو یہی دیکھ رہے تھے کہ لڑکا خوش ہے اجازت مرحمت فرمانے کا ان کو خیال ہی نہ آیا۔ ساون کا آغاز ہوا تو ہر سمت جل تھل ہو گیا۔ تالاب کو برساتی نالے سے پر کیا گیا۔ تالاب مذکورہ کے قریب ایک چبوترہ بھی تعمیر کیا گیا تھا اس پر چھڑکاؤ ہوا۔ حافظ گوجر صاحب کی طبع جولانی پر تھی۔

''چلو بھائی کشتیاں ہو جائیں'' حافظ صاحب نے مسرت بھرے لہجے میں مریدان کو حکم دیا۔

ایک دوسرے کی جوڑ کے دو دو حضرات ایک دوسرے کے مقابل میدان میں آئے اور اپنی اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے۔ حاضرین گرنے گرانے والوں کو داد بے داد سے نوازتے۔ سلطان دایا کے مقابلے میں بھی ایک لڑکے کو میدان میں آنے کا حکم ہوا۔ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو سلطان موصوف موصوف نے پلک جھپکتے ہی حریف کو گویا اڑا کے رکھ دیا۔ حافظ گوجر صاحب بہت خوش ہوئے اور ایک مضبوط قد کاٹھ کے لڑکے کو مقابلے کا اشارہ کیا۔ آنے والا سلطان دایا سے بڑا تھا مگر موصوف نے اس کا بھی وہی حشر کیا۔ اس طرح پہلوان آتے رہے اور سلطان موصوف ان کو شکست سے دوچار کرتے رہے تماشائیوں کے ساتھ حافظ گوجر بھی ورطہ حیرت میں ڈوب گئے۔

''لڑکے تم کیا بلا ہو؟'' انہوں نے تعجب سے کہا ''اچھا خیر! دیکھتے ہیں'' اور ایک پورے جوان تنومند مرید کو اکھاڑے میں اترنے کا اشارہ کیا۔

یہ کوئی جوڑ نہ تھا۔ حریف تنومند پہلوان تھا اور سلطان دایا اس کی ٹانگ برابر لگ رہے

Marfat.com

تھے لیکن حیران کن بات یہ ہوئی کہ اس بار بھی سلطان موصوف نے حریف کا گویا چھلکا اڑا کے رکھ دیا۔ ایسا الٹا مارا کہ حریف چاروں شانے چت ہو گیا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ حافظ گوجرؒ فوراً مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سلطان دایا کو پکڑ کر خلوت خانے میں لے گئے۔

''عزیزم! اب بتاؤ یہ کیا راز ہے۔ تم ایک نحیف ونزار دبلے پتلے سے لڑکے ہو اور تنومند جوانوں کو پلک جھپکنے میں پچھاڑ دیا؟'' حافظ گوجرؒ سے پوچھا ''یہ تمہاری ظاہری طاقت کا کمال نہیں ہو سکتا' سچ بتاؤ کون سے باطنی شغل میں مشغول رہے؟''

''حضور! میں کیا اور میری بساط کیا' جب سے یہاں آیا ہوں میں نے باطنی شغل کی طرف دھیان ہی نہیں دیا'' سلطان دایا نے دست بستہ عرض کی۔

''پھر بھی سوچ کر بتاؤ کوئی ایسا کام' کوئی ایسا وظیفہ جو تمہارے مرشد نے تمہیں عطا کر رکھا ہو؟'' حافظ صاحب نے اصرار کیا تو سلطان دایا نے دست بستہ عرض کی۔

''حضور! مرشد کا حکم تھا کہ اجازت ملتے ہی فوراً واپس لوٹ آنا' میں نے عہد کیا کہ چولستان کا پانی نہیں پیوں گا۔ اجازت پر میرا اختیار نہ تھا مگر اپنے عہد پر قائم رہنا میرے اختیار میں تھا۔ سو میں اس پر قائم رہا۔''

''کیا مطلب؟ تم جب سے ہمارے ہاں آئے ہو بغیر پانی پیئے زندہ ہو؟'' حافظ صاحب مزید حیران ہوئے۔

''حضور! پہلے دن بدعہدی ہوئی تھی' میں نے چھاچھ پی لی تھی مگر بے خیالی میں'' سلطان دایا نے عذر پیش کیا۔ حافظ گوجرؒ خود صاحب بصیرت وبصارت بزرگ تھے بات کی تہ تک پہنچ گئے۔

''برخوردار تم فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ' تم تو ہم سب کو مصیبت میں مبتلا کر سکتے ہو'' حافظ صاحب پریشان ہو گئے۔ ''جانتے ہو تم نے ''مجاہدے'' کا نیا قابل تقلید باب رقم کیا ہے۔ ایسا کڑا مجاہدہ جو ابدالوں کے بس کی بات نہیں مگر یہ سب کچھ یقیناً سلطان العارفین کی قربت کے طفیل ممکن ہوا۔

سلطان دایا فوراً شورکوٹ کی طرف چل دیے۔ اور دریائے چناب کے کنارے پہنچ کر مہینوں کی تشنگی دور کی۔ یہ واقعی انسانی بس کی بات نہ تھی صرف توفیق الٰہی سے ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔

مولانا گل محمد سندھی نے ایک بار اپنے تمام مریدان باوفا کو اکٹھا کیا اور دریائے چناب عبور کر کے مزار باہوؒ پر حاضر ہوئے اور فرمایا ''عزیزان من! ہمارا آخری وقت سر پر آ پہنچا اور ہم

Marfat.com

اپنے تمام عقیدت مندوں اور محبان کو اس آستانے کے سپرد کرتے ہیں' ہماری تلقین کو پلے باندھ لو' ہمارے بعد اس در کو ہرگز نہ چھوڑنا ورنہ فیوض و برکات سے محروم ہو جاؤ گے۔''

اس کے بعد مولانا سندھیؒ واپس آئے اور دریا عبور کر کے دریائے راوی کی جانب چل پڑے۔ ہجوم عاشقاں بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ ایک وسیع وعریض میدانی علاقے میں آپ نے تمام عشاق کو رک جانے کا حکم دیا۔ ''دوستو! یہ ہماری آخری ملاقات ہے ہم پر حکم شہادت جاری ہو چکا ہے لہٰذا آپ حضرات واپس چلے جائیں اور ہماری تعلیمات کو ذہنوں سے محو نہ ہونے دیں۔''

''آپ کو کون شہید کرنے کی جرات کر سکتا ہے'' ہجوم بیک زبان پکار اٹھا ''ہم آپ سے پہلے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے۔''

''آزمائش کی گھڑی سے پناہ مانگو' مولانا نے سنجیدگی سے فرمایا۔ ''اس میں بڑے بڑے سورماؤں کے پائے استقامت لڑکھڑا جاتے ہیں۔''

پھر آپ نے تاریخ سے چند ایسے حقائق بیان فرمائے جن سے انکار کی گنجائش نہ تھی آپ نے فرمایا ''جان پر کھیل جانے والے عشاق خال خال ہوتے ہیں۔ جذبہ بقا پاؤں میں زنجیریں ڈال کر' مقتل میں جانے سے روک دیتا ہے۔ دیدار الٰہی کے عوض ہمیں اپنے جسم کے ٹکڑے پیش کرنے کا حکم ملا ہے اور مشیت ایزدی کے آگے ہم سر تسلیم خم کر چکے ہیں۔ کیوں اور کیسے کا مقام نہیں'' آپ نے سب کو لاجواب کر دیا اور از سر نو خطاب کیا۔

''انجیل مقدس کے ۲۶ ویں باب میں مرقوم ہے کہ عید فتح کے روز عیسیٰؑ یروشلم میں ایک شخص کے ہاں آخری طعام تناول فرما رہے تھے۔ اور سنت ابراہیمی کی اتباع میں اپنے بارہ حواریوں سے محو کلام بھی تھے'' دوستو! کل طلوع آفتاب سے ایک پہر بعد مجھے سولی پر لٹکا دیا جائے گا اور تم سے ایک شخص مجھے بیت المقدس کے کاہنوں...... کے سپرد کر دے گا جو میری جان سے کم پر راضی نہیں ہیں۔ پھر ہم کبھی مل کر نہیں بیٹھیں گے۔''

''اے روح اللہ وہ کون شخص ہے جو آپ کو سپرد یہود کرے گا؟'' حواریوں نے بیک زبان پوچھا'

''وہی جس کا ہاتھ میرے طباق میں ہے'' عیسیٰؑ نے فرمایا اور وہ شخص یہودا تھا'' یہ سن کر سب زار و قطار اشک بہانے لگے۔

''اے روح اللہ اس وقت ہم سب کہاں ہوں گے؟'' یہ سوال یعقوب نے کیا جو پہلا

Marfat.com

صحابی تھا (یونانی زبان میں اس کا نام پطرس تھا)

''تم سب مجھے چھوڑ کر فرار ہو جاؤ گے اور میں تنہا رہ جاؤں گا'' عیسیٰ نے فرمایا۔

''یہ ہرگز نہ ہوگا' میں ضرور آپ کی خدمت میں رہوں گا'' پطرس نے کہا۔

''اے یعقوب! شب جمعہ کے آخری حصے میں مجھے گرفتار کر کے بیت المقدس میں قید کر دیا جائے گا اور تو اذان مرغ سے پہلے تین بار مجھ سے اظہار لاتعلقی کرے گا۔ وہ میرے قتل کے درپے ہوں گے اور تو مجھ سے بے زار ہو کر میرا ناآشنا بن جائے گا۔''

''عزیزان گرامی! پھر سارا واقعہ من وعن اسی طرح پیش آیا جس طرح پیغمبر خدا عیسیٰ نے فرمایا تھا۔''

مولانا سندھیؒ نے انجیل مقدس کا حوالہ دیا ''جب بیت المقدس میں عیسی علیہ السلام کو مقید کیا گیا تو یعقوب ان کے ساتھ تھا۔ شمع کی روشنی میں ایک کنیز نے پطرس کو پہچان لیا اور سردار یہود سے کہا ''جب عیسیٰ ہیکل میں وعظ ونصیحت کے لئے آتے تھے تو یہ شخص ان کے ہمراہ ہوا کرتا تھا۔''

''کیا تو عیسیٰ الیسوع ناصری کا ساتھی ہے؟'' یہودیوں نے تین بار تصدیق چاہی اور پطرس نے تینوں بار اظہار لاتعلقی کیا۔ تیسری بار انکار کیا تو رات کا ایک پہر باقی تھا اور مرغ سحر کی اذان سے پہلے' تین بار روح اللہ کا انکار کر دیا۔''

پھر آپ نے جنگ احد سے مثال پیش کی۔ مولانا موصوف نے فرمایا ''سید المرسلین' صاحب شان لولاک ﷺ' جنگ احد میں کامیاب وکامران رہے۔ یہ آزمائش معمولی نوعیت کی نہ تھی۔ سید الشہدا حضرت حمزہؓ کے جسم اطہر پر انتیس زخم آئے اور عتبہ بن وقاص سمیت پچیس مشرکوں نے کائنات کے دولہا کا چہرہ مبارک زخمی کیا اور عتبہ بن وقاص ہی کے پتھر سے دانت مبارک شہید ہوا۔ ابن قمیہ کی تلوار سے رسالت مآب ﷺ کی زرہ مبارک کٹ کر گڑھے میں گر گئی اور آپ ﷺ شہدا کی لاشوں تلے دب گئے۔ کل کائنات کی تخلیق جن کی تخلیق سے مشروط کی گئی ''لولاک لما خلقت الافلاک (آپ کو پیدا نہ کرتا تو افلاک کی تخلیق بھی نہ ہوتی) اس کے علاوہ 'لولاک لما اظہر الربوبیہ'' (اگر تو نہ ہوتا تو اپنی ربوبیت کا اظہار نہ کرتا) ان کو آزمائش سے گزارا گیا پھر صحابہ کرامؓ وقتی طور پر سہی منتشر ہوئے۔ اس وقت شہنشاہ کونین تنہا رہ گئے اور حیدر کرار بے قراری سے آپ ﷺ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے پھر ستر وفاداروں نے نقد جاں کا نذرانہ پیش کیا۔

Marfat.com

''عزیزان من! آزمائش سے پناہ مانگو اور واپس لوٹ جاؤ''

مولانا گل محمد سندھی نے آخری بار تنبیہ کی۔ عشاق دم بخود ارشادات عالیہ سماعت فرما رہے تھے مگر اپنی جگہوں پر کھڑے تھے۔ سب پر ہیبت طاری تھی۔ تب مولانا نے فرش زمیں پر ایک لکیر کھینچ کر کہا ''جس شخص کو اپنا قتل منظور ہو وہ اس لکیر کو عبور کر کے میرے پیچھے چلا آئے۔''

سب کھڑے کے کھڑے رہ گئے' صرف سلطان دایا لکیر عبور کر کے مرشد کی اتباع میں چلنے لگے۔

''جب وقت آئے گا تو تم بھی لب بستہ رہ جاؤ گے' یہی لوح محفوظ پر مرقوم ہے'' مولانا نے اپنے واحد پرستار سے کہا۔

دونوں طالب و مطلوب دریائے راوی کے قریب چوترہ سرگانہ پہنچے جو رئیس' مہر سلطان کی عملداری میں تھا۔ مہر موصوف کی اہلیہ مولانا کی عقیدت مند تھی۔ وہ اپنے خدمت گار کے ہمراہ ایک...... چارپائی لے کر حاضر ہوئی اور آپ ننگی چارپائی پر قبلہ رو ہو کر لیٹ گئے۔ وہ عورت آپ کے روبرو خاموشی سے بیٹھ گئی۔ سلطان دریا کو جانے کس طرح زبردست اونگھ آ گئی' شاید تقدیر الٰہی اسے ہی کہتے ہیں۔ اچانک مہر سلطان کا لڑکا ''نامدار'' اپنے دو نوکروں سمیت آندھی طوفان کی طرح آیا اور آتے ہی اس نے مولانا گل محمد سندھیؒ کا سر قلم کر دیا اور پھر تینوں تلواریں سونت کر آپ کے سربریدہ لاش پر پل پڑے اور لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ جانے وہ کیا راز تھا جو مولانا نے اپنے عاشق زار سلطان دایا سے بھی مخفی رکھا۔

سلطان دایا ہوش میں آئے یا اونگھ سے نجات ملی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ قاتل آپ کا ٹکڑے ٹکڑے جسم بھی اٹھا کر لے جا چکے تھے۔ رئیس مہر سلطان کا سارا خاندان کس طرح تباہ و برباد ہوا' یہ ایک طویل داستان ہے جس کا بیان یہاں مناسب نہیں۔ مولانا گل محمد سندھیؒ کس پائے کے بزرگ تھے اس کی تشریح کے لئے ایک مختصر سا واقعہ پیش خدمت ہے جو میاں دلیر مرالی کی وساطت سے کتب مناقبت میں محفوظ ہوا۔

ایک روز مولانا سندھیؒ اپنے احباب کے ہمراہ دریائے راوی کے کنارے ایک گاؤں کے قریب سے گزرے۔ اچانک گاؤں سے چیخ و پکار' آہ و فغاں کی آوازیں بلند ہوئیں تو مولانا رک گئے۔

''یہ شور و غل کیسا ہے؟'' ایک درویش سے آپ نے پوچھا۔

Marfat.com

''حضور آپ کا کمسن عقیدت مند فوت ہو گیا ہے۔'' درویشوں نے جواب دیا۔

مولانا تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے بے حس و حرکت کھڑے رہے پھر تیز تیز قدم اٹھاتے اس گاؤں میں داخل ہوئے' بیت الحزن کے دروازے پر پہنچے تو متوفی کی والدہ روتی پیٹتی باہر نکلی اور سندھیؒ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ''حضور! وہ تو آپ کا غلام تھا' ابھی تو اس کے کھیلنے کے دن تھے۔ آپ خدا سے دعا کریں میرے لخت جگر کی جگہ میری جان لے لے''

''خاتون! صبر سے کام لو'' مولانا نے زخموں پر مرہم تسلی رکھنا چاہا۔

''حضور! یہ کوئی دوپٹہ تو نہیں جو سر پہ اوڑھ لوں، کہاں سے دستیاب ہو گا وہ صبر جس سے میری بے قراری کو قرار آ جائے گا۔''

خاتون کی حالت زار سے مولانا سندھیؒ بڑے متاثر ہوئے اور غور و فکر میں ڈوب گئے پھر جیسے کوئی فیصلہ کر کے ارشاد فرمایا ''اچھا! چلو مجھے وہ لڑکا دکھاؤ پھر زیر لب کہا ''مولا! فقیر کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے''

وہ خاتون آپ کو لڑکے کی میت تک لے آئی۔

آپ نے بسم اللہ پڑھ کر دائیں ہاتھ سے لڑکے کی انگشت شہادت پکڑ لی اور اس انداز سے پکارا جیسے سوئے ہوئے بچے کو جگایا جاتا ہے۔ لڑکے کے جسم میں جنبش نہ ہوئی تو آپ نے بڑے رسان سے کہا ''عزیزم! ایسی بھی کیا بے مروتی' ہم اتنی دور سے آئے ہیں نہ سلام نہ دعا ۔اب ضد چھوڑو اور مان جاؤ'' مولانا نے یہی تاثر دیا تھا کہ لڑکا سو رہا ہے۔ اب درویش کا تاثر غلط ثابت ہوتا تو وہ کیا توجیہہ پیش کرتا۔ جب گفتگو بے اثر ثابت ہوئی تو درویش سندھی زبان میں ترنم سے صدائیں دینے لگے۔ جانے وہ کوئی گیت تھا کہ لوری یا الوہی نغمہ بہر حال سب کی آنکھوں کے سامنے اظہار کرامت ہوا اور لڑکے نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ حیران و ششدر اپنے گرد ہجوم کو دیکھنے لگا۔ لڑکے کی والدہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی پھر اس نے درویش کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

''تقدیر الٰہی بدل بھی سکتی ہے' صرف سن رکھا تھا آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔'' ہر شخص کی زبان پر یہی تھا۔

''خاتون! آپ کا لخت جگر فوت نہیں ہوا تھا بلکہ اندرونی تمازت سے سکتے میں آ گیا تھا'' درویش نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ ''جنڈی کے پتے مکھن میں ملا کر اسے کھلاؤ اندرونی

Marfat.com

حرارت بجھ جائے گی۔ یہ کہا اور درویشوں سمیت' تیز تیز قدم اٹھاتے گاؤں سے نکل گئے۔ لوگ جانتے تھے کہ درویش نے اخفائے راز سے کام لیا ہے۔

حافظ شیخ سلطان محمد قدس سرہ مزار باہوؒ کے تیسرے سجادہ نشین ۱۲۰۰ھ میں گدی نشین ہوئے۔ بچپن میں حافظ اس قدر کمزور تھا کہ برسوں محنت کرتے رہے مگر قرآن پاک کے چند رکوع تک حفظ نہ کر سکے۔ ادھر بھائی' برادران یوسف ثابت ہوئے تو والد محترم نے بچے کو ڈیرا غازیخان اپنے ایک عقیدت مند کے ہاں تعلیم و تربیت کے لئے بھیج دیا۔ وہاں بھی اساتذہ نے بہتیرا سر مارا مگر موصوف کے ذہن نے حرفوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ عرصے بعد آپ کے والد بزرگوار شفقت پدری سے مجبور ہو کر ڈیرا غازی خان پہنچے۔ ایک روز پیشتر محمد قدس سرہ کے استاد نے کہا ''برخودار! کل تمہارے والد تشریف لا رہے ہیں۔ لاؤ تمہارا سبق رواں کر دوں''

استاد نے سبق سنا تو ایک لفظ بھی درست نہ تھا۔ استاد نے تو سر پیٹ لیا۔ بچے کی بھی خوب پٹائی کی اور جھنجھلا کر کہا ''لڑکے! تو نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا اب ہم تمہارے والد کو کیا جواب دیں گے؟ ہماری نظروں سے دور ہو جا' یہ کوزہ لے اور دریا سے بھر لا۔''

ادھر استاد آتش زیر پا تھا ادھر معصوم بچہ مارے حیا کے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ واضح ہو موصوف کی والدہ ماجدہ کا اس زمانے میں انتقال ہو چکا تھا۔ شفقت والد کی گھنی چھاؤں سے محروم اور مانوس گلی کوچوں سے دور بچہ' بھرے جہان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ عالم بے بسی میں آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ کوزہ پکڑ کر دریا کنارے آیا تو بلک بلک کر رونے لگا۔

نظروں کے سامنے دریا رواں تھا مگر پانی حاصل کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ استاد کا خوف دامن گیر تھا۔ خالی کوزہ تو استاد کے غصے کو مزید ہوا دیتا۔ یہی سوچ کر بچہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔ اچانک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے سامنے دیکھنے لگا۔ آنسو خود بخود رک گئے۔ رنج و الم پر تجسس غالب آ گیا۔ تھوڑے فاصلے ایک نورانی صورت بزرگ دریا کی رواں لہروں پر مصلیٰ بچھائے رکوع و سجود میں مصروف تھا۔ بچے کا ذہن اس خرق عادت عمل کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جس ماحول میں بچے کی پرورش ہوئی تھی چوں کہ اس میں ایسی باتوں کا ذکر اکثر و بیشتر ہوا کرتا تھا لہٰذا معصوم ذہن کو رفتہ رفتہ آنکھوں پر اعتبار آ گیا۔

وہ شخص رکوع و سجود سے فارغ ہوا اور لہروں پر چلتا ہوا بچے کے قریب آ گیا۔ فضا عطر بیز ہو گئی اور ہوائیں رقص کرنے لگیں۔ بچہ مبہوت کھڑا آفتاب عالم تاب کو تکے جا رہا تھا۔

Marfat.com

''بیٹا کیوں رہے تھے؟''

لہجے کی چاشنی کانوں میں رس گھول گئی۔ الفاظ دل میں اتر گئے۔ مونس وغم خوار میسر آیا تو آنکھیں پھر چھلکنے لگیں اور آنسوؤں کی دھند میں نورانی سراپا کی جلوگی مدھم سی پڑنے لگی۔ بچے نے آنسو پونچھ ڈالے اور لرزیدہ لہجے میں داستان الم بیان کرنے لگا۔

''جناب! مجھے سبق یاد نہیں ہوتا' کوشش کرتا ہوں پھر بھی یاد نہیں ہوتا' جناب جی! یہ بالکل سچ ہے اور استاد صاحب مجھے بہت مارتے ہیں'' بچہ بلک بلک کر رونے لگا۔ سراپا نور ہستی نے بچے کے سر پر دست شفقت رکھ دیا۔

''اچھا ذرا ہمارے سامنے اپنا سبق پڑھو' دیکھیں تو کیوں یاد نہیں ہوتا۔''

لہجے کی شیرینی نے بچے کی ڈھارس بندھائی اور اس نے سبق سنانا شروع کیا۔ ایک جگہ زبان ذرا سی لڑکھڑائی پھر اس میں مست خرام ندی کی سی روانی آ گئی۔ حرف حرف کی نوک پلک درست ہوتی چلی گئی۔ ایک جگہ اٹکا تو اس سراپا مشفق ہستی نے لقمہ دیا پھر تو زبان گویا گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑنے لگی۔ موصوف کا سبق پہلے سیپارے پر تھا مگر بچہ پانچویں سیپارے تک بلا رکے پڑھتا چلا گیا۔

''عزیزم! تمہارا سینہ کشادہ ہو گیا ہے اب تمہیں پڑھائی میں کبھی بھی دقت پیش نہیں آئے گی۔ اپنا کوزہ پانی سے بھر لو اور رخصت ہو جاؤ۔''

بچے کا لوٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ عشق ومحبت کی باتوں سے یکسر نابلد تھا مگر اس کے سینے میں دھڑکنے والا دل گھائل ہو چکا تھا۔ تعمیل ارشاد میں اس نے پانی سے کوزہ بھرا اور بلا خوف خدمت استاد میں پہنچ گیا۔ بچے کا اپنی ذات پر اعتماد بحال ہو چکا تھا مگر استاد اس کی کیفیت سے قطعاً بے خبر تھا۔ وہ ابھی تک غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ آتش غیظ تو ویسے بھی قوت فیصلہ کو کمزور کر دیتی ہے اور انسان کے اندازے غلط ہو جاتے ہیں۔ استاد کو بچے کی ''چال'' میں بھی خرابی نظر آنے لگی۔ بچے نے پانی سے بھرا کوزہ زمین پر رکھا تو وہ زمین سے ذرا سا ٹکرا گیا۔ استاد تو بس آگ بگولا ہو گیا۔

''تم نہ سبق یاد کرتے ہو نہ کوئی دوسرا کام کر سکتے ہو۔ آخر کس قسم کے انسان ہو؟''

''جی سبق تو مجھے یاد ہے'' بچے نے مودب لہجے میں کہا۔

''یعنی اب جھوٹ بھی بولنے لگے؟ تم تو زندگی بھر سبق یاد نہیں کر سکتے۔''

''سن لیجیے بے شک'' بچے کے پراعتماد لہجے میں جلتی پر تیل کا کام کیا اور استاد نے

Marfat.com

اسے سبق سنانے کا حکم دیا۔

''جی! پہلا سیپارہ سناؤں یا دوسرا؟''

استاد نے حیران ہو کر اپنے کند ذہن شاگرد کو دیکھا اور پہلی بار سوچنے پر مجبور ہوا۔

''کوئی ایسی بات ضرور ہو چکی ہے جس نے بچے کی کایا پلٹ دی ہے۔'' استاد کے دل نے گواہی دی۔

ادھر بچے نے تلاوت کا آغاز کیا تو استاد نے چونک کر اسے دیکھا'' یہ لہجہ' یہ تلفظ' یہ انداز میں نے تو تعلیم نہیں کیے۔ استاد ورطہ حیرت میں ڈوبتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ حیرت' فخر و انبساط میں بدلنے لگی پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ بچے نے پہلا رکوع ختم کیا تو استاد پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہونے لگی اور تھوڑی دیر بعد وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو کر زمین پر گر گیا۔ اس کا تنگ ظرف اس فراوانی لذت کو برداشت نہ کر سکا۔

اس محیر العقول واقعے کی شہرت خوشبو کی طرح پھیل گئی۔ بطور آزمائش لوگ تلاوت کی سماعت کو آتے اور اسی طرح '' تجربے'' سے گزرتے۔ ادھر بچہ ہر روز اسی جگہ دریا کنارے پہنچ جاتا۔ اسی امید پر کہ شاید وہ سراپا رحمت ہستی ایک بار پھر مہربان ہو کر دیدار سے سرفراز فرمائے۔

تیسرے روز بچہ اسی جگہ دریا کنارے اداس بیٹھا تھا کہ ایک سبز پوش گھڑ سوار اس کے قریب آ کر رک گیا۔ بچے نے اٹھ کر بڑے ادب سے سلام کیا۔

''بیٹا! میں تمہارا جد اعلیٰ سلطان باہو ہوں'' گھڑ سوار نے اپنا تعارف پیش کیا'' اور خوش خبری سنانے آیا ہوں کہ تم اویسی بن چکے ہو۔ جس ہستی نے تمہیں اپنی جلوگی سے سرفراز ان کے دیدار کو لوگ عمر بھر ترستے رہتے ہیں۔ شاید میرے آقا کو میری اولاد میں سے کسی کی کند ذہنی پسند نہ تھی۔ سرور کائنات ﷺ نے بذات خود تمہاری راہنمائی فرمائی اور اب علوم ظاہر و باطنی کے حصول میں تمہیں کبھی دقت پیش نہیں آئے گی۔'' یہ کہہ کر گھڑ سوار رخصت ہو گیا۔

سلطان باہوؒ مہر محبت کا مجسمہ تھے مگر یہ حقیقت ہے کہ اپنے عقیدت مندوں پر زیادتی کرنے والے کی سرزنش بھی آپ کا شعار رہا ہے۔ مومن شاہ گیلانی کے قابل صد افتخار فرزند پیر صالح شاہ سلطان العارفینؒ کے مرید تھے اور اندرون سندھ رشد و ہدایت میں مصروف تھے۔ ایک بار وہاں کے سادات خاندان سے ان کی ان بن ہو گئی۔ بات بڑھتے بڑھتے شیعہ سنی فساد تک جا پہنچی۔ وہاں کے سادات اثر و رسوخ کے مالک تھے۔

Marfat.com

صالح شاہ صاحب درویش صفت انسان تھے۔ سادات نے انہیں فساد کی ''جڑ'' ثابت کر کے مقدمے میں ملوث کرا دیا۔ مقدمہ بازی نے طول کھینچا تو پیر صالح شاہ گھبرا گئے۔ ان کے تبلیغی کام ٹھپ ہو کر رہ گئے تھے۔ مزید زیادتی یہ ہوئی کہ مقدمہ جب حیدر آباد سندھ کے حاکم کی عدالت میں پیش ہوا تو میاں غلام شاہ والی سندھ نے سادات کی حمایت کرتے ہوئے قانون کے تقاضوں کو پس پشت ڈالا اور صالح شاہ صاحب کو گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا۔

صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ جب قانون کا رکھوالا ہی قانون کی دھجیاں بکھیرنے پر اتر آئے تو عوام کس در پہ جا کر دستک دیں۔ صالح شاہ صاحب نے اپنے مرشد سلطان العارفین سے روحانی رابطہ قائم کیا اور ساری صورت حال ان کے گوش گزار کی۔ سلطان العارفینؒ نے تسلی و تشفی سے نوازا اور دوسرے دن بھری عدالت میں ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔

میاں غلام شاہ والی سندھ بڑے کروفر سے اپنے تخت پر براجمان تھا کہ لڑھک کر ایک طرف جا گرا ''شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار لوگ'' گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ لڑھک کر ایک طرف گر جانے کی حد تک تو بات خیر ہضم ہو جاتی مگر اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس نے سب کو چکرا کے رکھ دیا۔ والی سندھ کے منہ پر ایسا زناٹے دار تھپڑ پڑا کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور ساتھ ہی اس کی بینائی بھی رخصت ہو گئی۔

''خدا کے لئے یہ تو بتاؤ تم کون ہو اور سر عام مجھے ذلیل و خوار کیوں کر رہے ہو؟'' والی سندھ نے پکار کر کہا۔

''میں صالح شاہ کا مرشد سلطان باہوؒ ہوں اور تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرو۔''

یہ آواز تو سب نے سنی مگر کسی چشم تماشا نے تھپڑ مارنے والے کا دیدار نہ کیا۔ ساری بات حاکم کی سمجھ میں آ گئی۔ میاں غلام شاہ صاحب والی سندھ نے اسی وقت کانوں کو ہاتھ لگائے، سرکاری ہرکارے دوڑائے گئے اور زندان سے پیر صالح شاہ کو عزت و احترام سے دربار میں لایا گیا۔

''جناب! گناہ گار کی تقصیر معاف فرمائیں۔ میں حکمرانی کا پہلا سبق یعنی بلا امتیاز صغیر و کبیر ''انصاف'' بھول گیا تھا۔ سلطان العارفین نے کرم نوازی کی، اب میں یہ سبق تا عمر یاد رکھوں گا۔''

قیدی کو نہ صرف باعزت رہا کیا گیا بلکہ وہ شاہی مراعات کا حق دار بھی ٹھہرایا گیا۔ شاید

Marfat.com

اس لئے سلطان العارفین سلطان باہوؒ نے فرمایا تھا۔"

"نام فقیر تینڈا باہو قبر جہناں دی جیوے ہو"

(فقیر کہلانے کا وہ شخص حق دار ہے جس کی قبر زندہ ہو ورنہ ریا کار درویش سے تو فریبی عورت بہتر ہے) "قبر زندہ" والی بات سلطان العارفین نے بار بار دہرائی۔ ابیات اٹھا کر جو چاہے دیکھ لے۔

O-O-O

Marfat.com

اللہ لوگ

حضرت سید عبداللہ شاہ المعروف بابا بلھے شاہؒ

Marfat.com

راہ حق کے منفرد مسافر......درویش بے ریا ......تصوف،طریقت اور شاعری کے بیش قیمت سرمایہ ء دل پذیر "سید عبداللہ گیلانی" "جنھیں زمانہ بلھے شاہ کے نام سے جانتا ھے .اھل نظر نے آپ کو ......مرد حقانی ......درویش ھر دو عالم ......اور محرم راز جیسے خطابات سے نوازا "مخدوم حافظ غلام مرتضی "سے علوم ظاھری اور روحانی فیوض کے لئے "شاہ عنائیت قادری شطاری سے بیعت ھوئے .انھی کی بدولت آپ طریقت و تصوف کے اس مقام اعلیٰ تک جاپھنچے جھاں آپ عشق کو سر بازار لے آئے او رراہ سلوک میں فنا و بقا کا اک نیاباب رقم کیا .یہ حقیقت ھے کہ کلام بلھے شاہ کو سمجھنے کے لئے علمیت و رموز عشق حقیقی سے آگھی لازم ھے کیونکہ تصوف و سلوک میں کلام بلھے شاہ کو عظیم صوفی شعراء مولانا روم و شمس تبریزی کے افکار عالیہ کے ھم پلہ او ران کے کلام کے رموز و نکات قرار دئیے گئے ھیں .کلام بلھے شاہ میں استعارات و تشبیھات انتھائی بے تکلفانہ ھیں جس میں سادگی سے مسائل دین و دنیا کو پیش کیا گیا.

Marfat.com

بلھے شاہ

چھت پر بیٹھا سیدزادہ یادالٰہی میں مصروف تھا مگراس کے سینے میں جلا کر راکھ کر دینے والا الاؤ دہک رہا تھا۔ الاؤ نہیں اسے کھولتا ہوا لاوا کہنا چاہئے جو اضطراب کے سمندر عطا کرتا ہے، حُب اختیاری وغیر اختیاری میں مبتلا ہو جانے والوں کے سینوں میں خلائیں بھر دیتا ہے۔ منزل عشق کی جانب پہلا قدم اٹھانے والوں کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔ نہ دن کو چین، نہ رات کو آرام۔

''میرے اس اضطراب کا آخر کیا علاج ہے؟'' سیدزادے نے زیرلب کہا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تو تھی مگر دانوں میں جنبش نہیں ہو رہی تھی۔

''کیا میرا جذبہ عشق سچا نہیں، کیا میرے خلوص میں کمی ہے؟ نہیں نہیں! ایسا ہرگز نہیں'' اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔

''مگر یہ تو دستورِ عشق کے سراسر خلاف ہے۔ میں جتنا اسے یاد کرتا ہوں اتنا ہی میرے اضطراب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔'' سیدزادے نے ازسرنو وردووظائف میں مشغول ہونے کی کوشش کی مگر اچانک اس کی نگاہ، خرام ناز بکھیرتی ہوئی ایک گوالن پر پڑی۔ گوالن کے سر پر دودھ بھری گاگر تھی اور وہ اسی مکان کی طرف آ رہی تھی جس کی چھت پر سیدزادہ یادالٰہی میں مصروف تھا۔ پنجاب کی آب وہوا اور حیات آور خوراک کا اظہار آنے والی کے انگ انگ سے ہو رہا تھا۔ وہ سندور ملے میدے سے بنی ہوئی حسین مورتی دکھائی دے رہی تھی مگر سیدزادہ تو کسی اور ہی منزل کا مسافر تھا، گوالن کے حسن غارت گر سے کوئی سروکار نہ تھا۔

Marfat.com

گوالن نے متجس ہرنی کی طرح ادھر اُدھر دیکھا پھر سید زادے کے مکان کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی جو محبوب کو دیکھ کر ہونٹوں پر رقص کرنے لگتی ہے اور انسانی وجود کو سرور کی لہروں کے سپرد کر دیتی ہے۔ عشاق کا علاج صرف اور صرف ''وصل'' ہوتا ہے۔ اس مرض کا اور کوئی علاج ہی نہیں۔ ہر دانشور نے غور و خوض کے بعد یہی نتیجہ نکالا ہے۔ مثنوی سفر عشق میں میاں محمد بخش فرماتے ہیں۔

عاشق دا جو دارو دسے باجھ ملاپ سجن دے
اوہ سیانا جانو ایانا روگ نہ جانے من دے

(وہ دانا جو مریض عشق کا علاج ''ملاپ'' کے علاوہ کچھ اور تجویز کرتا ہے اسے نادان تصور کرو کہ وہ دل کے روگ سے قطعاً نا آشنا ہوتا ہے)

گوالن قدم قدم چلتی مکان کے قریب آئی۔ دیوار کی اوٹ میں اس کا محبوب بیٹھا ہوا تھا۔ سید زادے کی آنکھوں سے دونوں اوجھل تھے۔ مگر ان کی گفتگو بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

''تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں اس جگہ تیرا انتظار کر رہا ہوں''؟ گوالے نے اپنی گوالن سے سوال کیا۔

''محبوب کی موجودگی، دل سے محسوس کی جاتی ہے'' گوالن نے جواب دیا ''آنکھیں تو صرف دیدار کا وسیلہ ہوتی ہیں۔''

دونوں مصروف راز و نیاز تھے مگر سید زادہ کسی اور ہی جہان میں پہنچ چکا تھا۔ وہ گوالن کے جواب پر غور کر رہا تھا۔

''اچھا! پیاس لگ رہی ہے، مجھے دودھ پلاؤ'' گوالے نے سرسری لہجے میں کہا۔

''کتنا دودھ پیو گے؟'' گوالن نے مسکرا کر اسی انداز میں پوچھا۔ گوالے کے لہجے میں اچانک تلخی آ گئی۔

''نالے یاریاں نالے من من کے'' (دوستی کا دعویٰ بھی اور ناپ تول کا خیال بھی)

اس فقرے کا اثر گوالن پر کیا ہوا! یہ ایک غیر متعلقہ بات ہے مگر سید زادے کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ پہلے تو وہ حیرت کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کیفیت سے باہر آیا تو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''واہ جی واہ! نالے یاریاں، نالے من من کے'' اس نے اپنی تسبیح کو ایک طرف اُچھال

Marfat.com

دیا اور آگہی کے سرور میں جھومنے لگا۔

وہ گلیوں بازاروں میں رقص کرتا پھر رہا تھا اور ہونٹوں پر اسی ذومعنی فقرے کی تکرار تھی ...... خلق خدا جذبہء ترحم سے تماشا کر رہی تھی۔ فہم وفراست کے پتلے تاسف بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے مگر سیدزادہ تماشائیوں سے یکسر بے نیاز اپنے وظیفے میں مشغول تھا۔ یہ نوجوان سید سخی شاہ درویش محمد کا لخت جگر سید عبداللہ گیلانی تھا جو برصغیر میں بلھے شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔

سندھ کے علاقے "اُچ شریف" کئی لحاظ سے ایک مشہور و معروف بستی تھی۔ مردان سادات کے ورود سے پیشتر اس کا نام دیوگڑھ تھا۔ عصر حاضر میں یہ بستی بہاول پور میں شامل ہے اور پانچ دریاؤں کے سنگم پنجند کے قریب موجود ہے۔ سترہویں صدی کے آخری ربع میں یہ بستی شہرت کے بام عروج پر تھی۔ سہروردی سلسلے کے بزرگان ایک محلے میں آباد تھے جو محلہ بخاریاں کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ دوسرے محلے میں قادری سلسلے کی شخصیات نے طریقت کا چراغ روشن کر رکھا تھا۔ اسے محلہ گیلانیاں کہا جاتا تھا۔ تخت ہند پر مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر متمکن تھا۔ ۱۶۸۰ء اس کے جلال کے دور عروج میں اُچ گیلانیاں میں شاہ محمد درویش کے ہاں ایک ایسے بچے نے جنم لیا جو تصوف اور فن شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ثابت ہوا۔ شاہ صاحب نے اپنی افتاد طبع کے عین مطابق بیٹے کا نام عبداللہ (اللہ کا بندہ) تجویز کیا۔ جسے زمانے نے "بلھا" (ہوا کا جھونکا) کہا مگر اس نے اپنے آپ کو "بھلا" (بھٹکا ہوا) قرار دیا۔ میدانِ طریقت اور فن شاعری میں وہ واقعی تازہ ہوا کا جھونکا تھا۔ عقیدت مند اسے بلھے شاہ کہنا پسند کرتے ہیں اور عقیدت کی کوئی وجہ ہوتی ہے نہ اس پر کوئی قدغن لگائی جا سکتی۔

اُچ گیلانیاں کی ہواؤں میں پاکیزگی کا بسیرا تھا۔ مٹی کا خمیر کچھ اس نوعیت کا تھا کہ راہ راست سے بھٹکنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہی وہ بستی تھی جسے سہروردی سلسلے کے سردار بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے خلیفہ سید جلال الدین نیر شاہ بخاریؒ نے بودوباش کے لیے پسند کیا۔ یہ ۱۲۴۴ء کا واقعہ ہے۔ موصوف کا وطن مالوف بخارا تھا۔

میاں والی کے قصبے بھکر میں بخاری صاحب تشریف لائے مگر بھکر کی فضا راس نہ آئی۔ موصوف نے رخت سفر باندھا اور اُچ میں قدم رنجہ فرما کر محلہ بخاریاں آباد کیا۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا تعلق بھی اسی قصبے سے تھا۔ جنہوں نے ۳۶ مرتبہ فریضہ حج ادا کیا۔ سرزمین حجاز کے علاوہ مصر، شام، عراق اور بلخ بخارا کی سیاحت فرمائی اور جہاں گشت کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُچ کی اس

Marfat.com

صاحب وقار ہستی کے دست حق پر اہل ہنود کے آٹھ قبائل مشرف بہ اسلام ہوئے راجپوتوں کا قبیلہ ''کھرل'' ان میں سرفہرست تھا۔ سید صدرالدین راجو قتال بھی اسی بستی کے رہنے والے تھے۔

۱۵ ویں صدی عیسوی کے آخر میں شیخ محمد غوث بندگی اُچ گیلانیاں میں آباد ہوئے جو حلب سے تشریف لائے تھے۔ موصوف برصغیر میں قادری سلسلے کے بزرگ اوّل ہیں۔

بلھے شاہ کا بچپن ایسی تقدس بھری سرزمین پر گزرا۔ یہ کوئی حتمی اصول نہیں مگر ماحول کا اثر بندے کی نشو ونما پر ہوتا ضرور ہے۔

بچے نے اشیا کی ماہیت پر غور وفکر کرنا اسی جگہ سے سیکھا۔ گویا عمارت کی پہلی اینٹ سیدھی رکھی گئی اور اس کے فلک بوس ہو جانے کی بنیاد پڑ گئی۔

بلھے شاہ کی افتادِ طبع اور رجحان کا اندازہ دیکھنے والوں نے آغاز ہی میں لگا لیا۔ بچے کے معصوم ہونٹوں پر ایسی بات آ جاتی جو اس کی عمر سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ اپنے بیگانے حیرت زدہ ہو جاتے۔ بچہ روزمرہ کی بول چال میں بھی نکتے کی بات کہہ جاتا۔

ایک بار کوئی خوانچہ فروش گلی میں نارنگیاں بیچ رہا تھا' اس نے آواز دی ''سوہنے سنگترے 'میٹھے سنگترے''

پانچ چھ برس کا بچہ جواباً مسکرانے لگا'' کوجھے سنگ ڈبّے تے بھیڑے سنگ مرے'' یہ سوہنے اور میٹھے کا جواب تھا یعنی بدصورت کا ساتھ دینے والے ڈوب گئے اور برائی کا ساتھ دینے والے تباہ برباد ہوئے ﴿سنگ بہ معنی ساتھ غور طلب ہے﴾۔ خوانچہ فروش بھی کوئی صاحب دل تھا۔ وہ بچے کے جواب پر پھڑک اٹھا اور اپنا سارا سرمایہ اس نے بچوں میں بانٹ دیا ''اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے'' بچے نے اسی بات کی وضاحت کی تھی۔

تلاش معاش میں چرند پرند تک مصروف رہتے ہیں۔ حضرت انسان تو روٹی بوٹی کے نشے میں گرفتار ہے۔ شاہ محمد درویش' اہل خانہ کی بھلائی کی خاطر اُچ گیلانیاں سے نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ بلھے شاہ کی عمر اس وقت چھ برس کے قریب تھی۔ یہ خاندان ساہیوال کے علاقے 'گاؤں ملک وال میں آ بسا مگر یہ سکونت عارضی ثابت ہوئی۔

راجپوت بھٹی خاندان کے دو بھائیوں ''پانڈو اور سدھار'' نے دو گاؤں آباد کیئے۔ ﴿پانڈو کے اور سدھار یہ دونوں گاؤں آج بھی اسی نام سے موجود ہیں﴾ زمین نے انسانی محنت کا سخاوت سے جواب دیا۔ ہر طرف کھیت لہلہانے لگے۔ چوہدری پانڈو بھٹی نے تسکین قلب کی

Marfat.com

خاطر ایک عالی شان مسجد بنوائی ۔ پرانے وقتوں میں گاؤں کی مسجد علاقے کی بہترین عمارت ہوا کرتی تھی ۔ چوہدری نے مسجد تو تعمیر کرا ڈالی مگر اس کی امامت کے لیے کسی مناسب شخص کی تلاش مسئلہ بن گئی ۔ اس خاندان کے چند افراد تلونڈی میں قیام پذیر تھے ۔ جو ملک وال کے قریب ایک مشہور بستی تھی...... چوہدری پانڈو نے اپنی تلاش میں خاندان کے دیگر افراد کو شریک کرنے کا فیصلہ کیا ۔ تلونڈی نے موصوف کو مایوس نہیں کیا ۔ گاؤں کے دستور کے مطابق چوہدری کی آؤ بھگت ہوئی ۔

چراغ جلے گاؤں کے سر کردہ حضرات ایک جگہ مل بیٹھے اور نئی بستی ''پانڈو کے'' زیر بحث آئی ''دھرتی تو ثمر بار سہاگن سے بڑھ کر ثابت ہوئی ہے'' چوہدری پانڈو نے حاضرین کے استفسار کا جواب دیا ''مایوس مجھے انسانوں نے کیا ہے'' ۔

''بھلاوہ کیسے؟'' میزبان نے سوالیہ نگاہوں سے پوچھا ۔

''آپ جانتے ہیں سجدہ اپنے سے بہتر انسان کی اقتدا میں کیا جاتا ہے ۔ مجھے اپنی مسجد کے لیے کسی نجیب الطرفین سید کی تلاش ہے'' چوہدری حرف مدعا زبان پر لے آیا ۔

اس عہد ملوکیت میں یہی رواج تھا کہ مسجد کا امام معاشرے کا بہترین انسان ہونا چاہیے ۔ اورنگ زیب عالمگیر نے تو بطور خاص سرزمین حجاز سے اپنے لیے امام درآمد کیا تھا...... معاشرے کے گئے گزرے بندے کو امام مقرر کر دینا فرنگی دور حکومت کی اختراع ہے ۔ مغربی جمہوریت کا تقاضا تھا کہ قیام کے وقت، سجدے میں جھک جانے والا امام ہونا چاہیے خیر! یہ ہمارا موضوع نہیں ۔

''چوہدری! سمجھو تمہاری تمنا پوری ہوگئی'' میزبان نے خوش خبری سنائی ''قریبی گاؤں ملک وال میں نجیب الطرفین سید تشریف لائے ہیں ۔ ان کے قیام کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا ۔ خلوص دل سے کوشش کی جائے تو مراد ضرور بر آئے گی ۔ سُنا ہے وہ خود بھی ضرورت مند ہیں ۔''

چوہدری پانڈو نے سکھ کا سانس لیا اور دوسرے روز تلونڈی کے سرکردہ افراد کے ہمراہ 'وفد کی صورت سوئے ملک وال روانہ ہوا ۔ شاہ محمد درویش آنے والوں کے خلوص سے بے حد متاثر ہوئے اور حیل وحجت کے بغیر پانڈو کے میں سکونت اختیار کرنے پر راضی ہوئے ۔

اس طرح چھ برس کا بُلھے شاہ ملک وال سے ''پانڈو کے'' میں قیام پذیر ہوا ۔ معصوم ذہن کے لیے یہ نت نئی نقل مکانی استاد کا فریضہ سرانجام دے رہی تھی ۔

بچہ اپنے گردوپیش کا بغور مطالعہ کرتا' ہر پیش آنے والا واقعہ قلب وذہن پر نقش ہونے لگا ۔

Marfat.com

اس کا ذہن چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج اخذ کر رہا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب اس کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔

شاہ محمد درویش نے مسجد کی امامت کے ساتھ ساتھ گاؤں کے نوخیز بچوں کی تعلیم کا بیڑہ بھی اٹھالیا۔ اس طرح بلھے شاہ کے پہلے استاد خود ان کے والد ماجد قرار پائے۔ ایک سچا استاد اور مشفق والد صرف دو ہستیاں ایک بلند مقصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اپنے شاگرد اور بیٹے کو صرف یہ دو ہستیاں اپنے سے بلند مقام پر دیکھنے کی تمنائی ہوتی ہیں...... یہاں بچے کی طلب کو پورا کرنا درویش کے بس کی بات نہ تھی۔

ایک روز بلھے شاہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول تھا۔ اس علاقے میں چینا اور سوانک دو فصلیں وافر مقدار میں پیدا ہوا کرتی تھیں۔ ان کو دھان کی طرح ''چھڑ'' کر حاصل کیا جاتا تھا۔ بچوں کے کھیل پر بھی اسی طریقہ کار کی چھاپ ہوا کرتی تھی۔ شاہ درویش بیٹے کی تلاش میں ادھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ ہاتھ میں حسب عادت تسبیح تھی۔ باپ بیٹے کی نگاہیں چار ہوئیں تو بلھے شاہ کے ہونٹوں پر عجیب وغریب مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے تسبیح کو دیکھ کر فی البدیہہ شعر کہا مگر کھیل کا تسلسل بھی مجروح نہ ہونے دیا۔

لوکا دیاں جپ مالیاں تے بابے واجپ مال
ساری عمراں مالا پھیری اک نہ کٹھا وال
چینا اینج چھڑ یندا لال

(لوگوں کی مالائیں جپنا اور سائیں کا مال ہڑپ کر جانا۔ ساری عمر کی ہیرا پھیری ﴿مالا پھیرنے﴾ سے ایک بال تک نوچنے کی توفیق نہ ہو سکی...... چینا اس انداز میں ''چھڑا'' جاتا ہے) آخری بول ضرورت قافیہ کے تحت ادا کیے جاتے ہیں'' پنجابی اصاف سخن میں یہ ایک عام سا دستور ہے۔ باپ اپنے بیٹے کے ذومعنی الفاظ سُن کر سکتے میں آ گیا۔ اس کیفیت سے نجات حاصل ہوئی تو فصل جان پر وجد طاری ہو گیا۔

''بیٹا عبداللہ! یہ باتیں تمہیں کون سکھاتا ہے؟'' باپ نے بیٹے کی روشن پیشانی پر مہر شفقت ثبت کرتے ہوئے پوچھا۔

''کون سی باتیں بابا!'' معصوم بچے نے مسکرا کر پوچھا۔ شاید لطف وکرم کی گھڑی گزر چکی تھی اور بچہ حد اعتدال میں آ چکا تھا یہی مہربان وقت کا المیہ ہے کہ وہ مختصر ثابت ہوتا ہے اور اگر

Marfat.com

نامہربان ہو جائے تو گزرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ باپ حقیقت آشنا تھا لہذا خاموش ہو گیا۔ بعض روایات میں یہ واقعہ اُچ گیلانیاں میں قیام کے دوران پیش آیا۔ بہرحال یہ بچے کی افتادِ طبع کی نشان دہی کرتا ہے۔

سیدزادے کے لڑکپن کا زمانہ تھا بستی کے رسم و رواج کے مطابق اسے مویشی چرانے کا فریضہ بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ چراگاہوں کی کمی نہ تھی۔ پانڈو کے کا علاقہ سرسبز و شاداب تھا۔ قدرت انسانوں سے زیادہ حیوانوں پر مہربان تھی۔ انسان آپس میں دست و گریباں تھے' حیوان خاطر و مدارات سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ سیدزادہ مویشیوں کو ہانک کر آبادی سے دور لے جاتا اور صبح کا گیا چراغ جلے لوٹتا۔ ان کی دیکھ بھال میں بلھے شاہ کی دلچسپی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ عطا کا سرچشمہ بننے سے پیشتر یہ گویا تربیت ہو رہی تھی۔ مویشی گفتگو کے فن سے بے شک محروم تھے مگر زبانِ وفا سے نا آشنا نہیں تھے۔ جذبہ صادق رنگ لا کر رہتا ہے اور محبت کی نگاہ رائیگاں نہیں جاتی کے مصداق مویشی سیدزادے کے اشاروں پر چلنا سیکھ چکے تھے۔

ایک روز سیدزادہ مویشیوں کو چراگاہ میں چھوڑ کر ایک پیڑ کے سائے تلے جا بیٹھا۔ غور و فکر کی عادت تھی۔ پاؤں پھیلا کر فرصت کے لمحات سے استفادہ کرنے لگا اور وادیٔ فکر سے گہری نیند میں جا پہنچا۔ حیوانوں میں بھی انسانوں کی طرح ہر ''ونگی'' کے نمونے ہوتے ہیں۔ کوئی محبت کا جواب محبت سے دینے والا وفا کا پتلا' کوئی عہد و پیماں کو نظرانداز کرنے والا بے وفا۔ چند مویشی لہلہاتے کھیتوں میں جا گھسے اور ساری فصل کو برباد کر ڈالا۔ لقمہء تر کی ترغیب تو انسانوں تک کو آزمائش میں ڈال دیتی ہے' حیوان تو ویسے بھی نیک و بد کی تمیز سے آزاد تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ کھیت جیون خان نامی بستی کے ایک وسنیک کا تھا۔ کھیت کا مالک دور کھڑا اپنے سرمائے کو لٹتا دیکھ رہا تھا۔ دہقان اور فصل کی محبت سے کون واقف نہیں' یہ محبت تو شاعروں تک کا موضوع رہی ہے۔

جیون خان اپنی روزی کے وسیلے کو تباہ ہوتے دیکھ کر آتش زیر پا ہو گیا۔ اس نے عقیدت کی ردا کو لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور واہی تباہی بکتا سیدزادے کے مویشیوں پر ٹوٹ پڑا...... ''لوٹ مار'' کرنے والوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد جیون خان سیدزادے کی تلاش میں نکلا تاکہ اپنے نقصان کی تلافی کا تقاضا کر سکے۔ سیدزادے کو شجر تلے گہری نیند سوتے دیکھ کر اس کے غم و غصے کی انتہا نہ رہی مگر اچانک اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور خوف و دہشت سے اس کا رنگ پیلا پڑنے لگا۔

Marfat.com

سیدزادہ محوخواب تھااور ایک سیاہ ناگ پھن پھیلائے عین اس کے سر پر جھوم رہا تھا۔ جیون خان نے آنکھوں کی معتبر گواہی سے یہی نتیجہ نکالا کہ ناگ سیدزادے کا کام تمام کر چکا ہے۔ اس آفت ناگہانی کے سامنے کھیت کی تباہی کی کیا اوقات تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر دبے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ ناگ کو اشتعال دلا کر موت کو آواز دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ ناگ برق رفتاری سے پیچھا کرتا ہے اور جتنی دیر میں سرپٹ دوڑنے والا اسپ تازی ایک قدم کا فاصلہ طے کرتا ہے ناگ تین بار ڈس سکتا ہے۔ جیون خان اور ناگ کا درمیانی فاصلہ کوئی بیس ایک گز کا ہوا تو دہشت زدہ انسان سر پر پاؤں رکھ کر گاؤں کی طرف بھاگا۔ ساتھ ساتھ وہ شور بھی مچاتا جا رہا تھا ''بلھے شاہ کو ناگ نے مار ڈالا۔ اس کی لاش پیڑ تلے پڑی ہے' لوگوں بھاگو دوڑو جلدی کرو۔'' گاؤں کے لوگوں نے یہ دلدوز خبر شاہ صاحب تک پہنچائی اور ایک ہجوم سیدزادے کی مرگ ناگہانی پر کف افسوس ملتا جائے وقوعہ پر پہنچا۔ ناگ ابھی تک سیدازدے کے قریب کھڑا جھوم رہا تھا شاید رخ روشن کا طواف کر رہا تھا۔ شاہ صاحب نے لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور صورت حال کا بغور جائزہ لیا۔ بیٹے کے لیٹنے کا انداز موت کی نفی کر رہا تھا۔ شاہ صاحب بے خوف وخطر چند قدم آگے بڑھے۔ خلق خدا تماشائی تھی۔ امام مسجد کے زہد وتقویٰ کی شہرت تو تھی مگر ناگ کا سامنا کرنا تو بات ہی کچھ اور تھی۔ گاؤں کے لوگ اس بات کو نظر انداز کر رہے تھے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کی بقا کے خیال سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں انسان کو اپنی جان کی پروا نہیں ہوا کرتی۔ یہی شفقت پدری اور ماں کی ممتا کا تقاضا ہے۔

''درویش اب آپ تشریف لے جائیں'' شاہ صاحب نے ناگ کو مخاطب کیا ''ہم نے آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی اور نہ کوئی ایسا ارادہ ہے'' شاہ درویش یوں محو کلام تھے جیسے زہریلا ناگ ان کی گفتگو کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

''آپ تشریف لے جاتے'' ہیں یا ہم کوئی اور اہتمام کریں'' اب شاہ صاحب نے زرد بنگ لہجے میں کہا۔ خلق خدا نے اپنی آنکھوں سے تماشا کیا کہ ناگ پھن سمیٹ کر ایک طرف چل دیا اور سیدزادے کی آنکھ بھی کھل گئی ۔ ہجوم کو دیکھ کر بلھے شاہ نے قدرے حیرت کا اظہار کیا ''بابا جانی! یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' سیدزادے نے سوال کیا

''برخوردار! جیون خان نے شکایت کی ہے کہ تمہاری بے پروائی سے اس کا کھیت اُجڑ گیا ہے اور یہ تمہارے ان لاڈلوں کا کیا دھرا ہے'' شاہ صاحب نے مویشیوں کی طرف اشارہ کیا

Marfat.com

''یہ معصوم تو کسی کو نقصان پہنچانے کے اہل ہی نہیں ہیں'' سید زادے نے بصد احترام جواب دیا'' مجھے دکھائیں کون سا کھیت اُجڑا ہے۔

''جیون خان کی راہنمائی میں لوگ اُجڑے ہوئے کھیت پر پہنچے تو حیرت نے ان کا استقبال کیا۔کھیت کا ایک ایک پودا سلامت تھا بلکہ وہ قریبی کھیتوں سے بڑھ کر گھنی فصل کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ہوا کے جھونکے لہریئے بنتے ہوئے پودوں کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

''مگر میں......میں نے اپنی ان گنہگار آنکھوں سے اُجڑی ہوئی فصل کو دیکھا تھا'' جیون خان نے شرمسار لہجے میں سب کو یقین دلایا مگر خلق خدا بھی تو بصارتوں کی مالک تھی' کھیت ان کے سامنے لہلہا رہا تھا۔''جیون خان! معلوم ہوتا ہے تم نے کوئی خواب دیکھا تھا'' سید زادے نے مسکرا کر حیران شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا'' کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی عادت ٹھیک نہیں ہوتی اور یہ اندر سے انسان کو لوٹ لیتی ہے اور سینہ خالی ہو جاتا ہے۔تم دیکھ رہے ہو کہ کھیت دوسرے کھیتوں سے زیادہ گھنا اور سرسبز ہے اور کیا چاہتے ہو؟'' سید زادے کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے محسوس کر کے سب لوگ خاموش ہو گئے۔جیون خان پہلا شخص تھا جس نے بلھے شاہ کی عقیدت کو سرمایہ افتخار بنایا۔اس کا اظہار اس نے اپنے انداز میں کیا۔وہ کھیت عقیدت کے مارے نے سید زادے کے نام کر دیا۔حیران کن بات یہ ہے کہ اس کھیت کی فصل دوسرے کھیتوں سے سوائی ہونے لگی اور یہ سلسلہ آج تین صدیاں گزر جانے کے بعد بھی جاری ہے۔آج وہ کھیت مزار بلھے شاہ کے گدی نشینوں کی تحویل میں ہے۔فصل کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

''پانڈوکے'' والی مسجد بلھے شاہ کی پہلی درس گاہ تھی۔اسی جگہ اپنے والد کی زیرنگرانی سید زادے نے ابتدائی تعلیمی مراحل طے کیے۔سن بلوغت کی آمد ہوئی تو شاہ محمد درویش کو اپنے لخت جگر کی اعلیٰ تعلیم کا خیال آیا۔قصور میں حافظ غلام مرتضیٰ کا مدرسہ ﴿جامع مسجد کوٹ﴾ اس زمانے میں مناسب ترین تھا۔لہذا بلھے شاہ کو اس میں داخل کرا دیا گیا۔یہ قصور سے زندگی بھر کے تعلق کی ابتدا تھی۔اسی مدرسے میں علوم فقہ' حدیث' تفسیر' منطق معانی کی تکمیل ہوئی۔یہ بات مستند ہے کہ بلھے شاہ نے اسی درس گاہ میں کچھ عرصہ تدریسی فرائض بھی سرانجام دیئے۔حافظ غلام مرتضیٰ کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

مغل شہنشاہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں قاری عبدالمالک صدیقی نے سندھ کی بود و باش اختیار کی۔قصور کے پٹھان اُن کی علمی فضیلت سے متاثر ہو کر ان کو اپنے علاقے میں

Marfat.com

لائے' اسی جگہ قاری صاحب رشتہء ازدواج میں منسلک ہوئے اور ان کے ہاں مخدوم غلام مرتضٰی پیدا ہوئے۔ یہی وہ ہستی ہے جسے ترجمان حقیقت وارث شاہ اور مرد حقانی بلھے شاہ جیسی شخصیات کا استاد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ موصوف سلسلہ نقش بندیہ سے بیعت تھے۔ پنجاب میں سکھ گردی سے تنگ آ کر ایک بار پشاور کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس دور ابتلا میں احمد شاہ ابدالی کی نگہ انتخاب اُن پر پڑی تو پنجاب واپس آئے چنانچہ ابدالی کی قائم کردہ مجلس مشاورت میں مخدوم ایک سرکردہ رکن تھے۔ استاد اور شاگرد دونوں نے اپنے آپ کو قصوری کہلوایا۔ بلھے شاہ نے بانگ دہل اپنے رشتے کا ان الفاظ میں ذکر کیا۔

''اسیں قصوری' ساڈی ذات قصوری اسیں وچ قصور دے وسنے ہاں۔

''اس کے علاوہ ایک مقام پر اہل اُچ سے مخاطب ہوئے۔

''تسیں وچ اُچ دے اُچے ہو اسیں وچ قصور قصوری ہاں

'' دونوں شعروں میں بلھے شاہ نے لفظ قصور کے مروجہ معانی سے استفادہ بھی کیا۔ یعنی ہم قصور کے باشندے ہیں۔ داستان بلھے شاہ میں مزید پیش رفت سے پہلے قارئین کی خدمت میں قصور کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ لاہور سے چونتیس میل جنوب مشرق کی جانب پٹھانوں کی بسائی ہوئی یہ بستی لاہور کی تحصیل ہوا کرتی تھی۔ پرانا قصور ۲۶ بستیوں پر مشتمل تھا اور ہر بستی کوٹ کہلواتی تھی۔ روایت کے مطابق ہندوؤں کے اوتار سری رام چندر کے بیٹے لو نے لاہور اور کسا kusa نے قصور کی بنیاد رکھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں مشہور زمانہ چینی سیاح ہیون سانگ جب ہندوستان میں وارد ہوا تو وہ پُرانے قصور ہی میں قیام پذیر ہوا تھا۔ موجودہ شہر مغلوں کے عہد میں معرض وجود میں آیا۔ مغلیہ دور کے اختتام کے بعد قصور سے ستلج پار کا علاقہ جلال آباد تک نواب جلال ممدوٹ کے قبضے میں آ گیا جس کا دار الحکومت علم و آ گاہی کا مرکز قصور پایا۔ اس شہر کی لائبریری پورے پنجاب میں لاجواب تھی جسے رنجیت سنگھ نے فتح قصور کے بعد تباہ برباد کر ڈالا۔ بھارت کی سرحدی چوکی کھیم کرن اور حسینی والا کے قریب یہ تجارتی منڈی کی حیثیت سے آج بھی ایک اہم مقام ہے۔ ۱۹۷۶ء میں اسے ضلع کا درجہ دیا گیا۔

قصور بزرگانِ دین کا مرکز رہا ہے۔ بلھے شاہ کے عہد میں سارا پنجاب چونکہ یورشوں کی زد میں تھا اور قصور بطور خاص مبتلائے عذاب رہا۔ اس شہر کو بلھے شاہ نے اپنی شاعری میں بارہا موضوع سخن بنایا مثلاً

Marfat.com

بلھا قصر نام قصور ہے اوتھے مکھ نہ سکن بول
اوتھے سچے گردن مارئیے اوتھے جھوٹھے کرن کلول

قصور ایسی بستی ہے جہاں لب کشائی ممکن نہیں کہ سچ کی گردن اُڑائی جاتی ہے اور جھوٹ کا بول بالا ہوتا ہے۔

بلھیا قصور بے دستور اوتھے جانا بنیاں ضرور
پُن کوئی نہ دان ہے نہ کوئی لاگ دستور''

قصور اک بے دستور مقام ہے لیکن وہاں جانا ضروری ہو گیا۔ یہ دان پُن یا لاگ دستور کی بات نہیں۔

یہ اشعار بلھے شاہ کی قلم سے کب اور کیوں ادا ہوئے۔ مناسب مقام پر اس کی تشریح کر دی جائے گی۔

جس طرح مولانا جلال الدین رومی کو مولائے روم شاہ شمش تبریزی نے بنایا اسی طرح بلھے شاہ بنانے والی ذات شاہ عنایت قادری شطاری کی مانی اور گردانی جاتی ہے۔ مولانا رومی نے اعتراف کیا تھا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریزی نہ شد

﴿مولوی اس وقت تک مولائے روم نہیں بن سکتا جب تک شمس تبریزی کی غلامی اختیار نہ کر لے۔﴾ یہ تو ایک اعتراف تھا لیکن بلھے شاہ کی شاعری کا بیشتر حصہ شاہ عنایت کی عطا پر مشتمل ہے۔ کلام بلھے شاہ کے کماحقہ ادراک کے لیے دو باتوں کا سمجھ لینا بے حد ضروری ہے۔ پہلی بات شاہ عنایت کی ذات گرامی سے مکمل تعارف' دوسری اہم ترین بات پنجاب کا وہ دور ابتلا ہے جس میں یہ علاقہ گرفتار تھا۔ اس تناظر کے بغیر بلھے شاہ کی شاعری کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ ۱۷۱۰ء تک کا زمانہ اس سرزمین کے لیے ایک قیامت سے کم نہیں تھا۔ یہ سیاسی و سماجی ابتری کا دور تھا۔ اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بندہ بیراگی جیسے ستم شعار' مرہٹے' افغانی سکھ کس کس نے علم جور و جفا بلند نہیں کیا۔ اس دور میں صرف ایک آواز مینار نور کا درجہ رکھتی ہے جو دلوں کو تسلی دینے کے ساتھ ظلم و استبداد کے خلاف نبرد آزمائی کے لیے گونجتی ہے۔ وہ آواز بلھے شاہ کی ہے یہ للکار اپنوں بیگانوں میں تمیز کی روادار بھی نہ تھی۔ دشمنوں کے علاوہ اس نے روایتی ملاؤں کے خلاف بھی محاذ کھول دیا۔

Marfat.com

سرمدمستانہ قتل گاہ میں قدم رکھ چکا تھا۔ داراشکوہ کا انجام بھی دنیا کو یاد تھا۔اس تناظر میں دیکھا جائے تو بلھے شاہ کی شاعری واقعی عظیم الشان کارنامہ دکھائی دیتی ہے۔اسے صرف تصوف کی شاعری قرار دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔

بلھے شاہ روایتی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔مخدوم غلام مرتضیٰ نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی مگر سیدزادے کے اضطراب کا علاج ان کے بس کی بات نہ تھی۔گوالے گوالن کی مکالمت کے بعد سیدزادے نے تسبیح ایک طرف اچھال دی اور جذب و مستی کے عالم میں ان دیکھی منازل کی طرف چل نکلا۔درعنایت تک رسائی کے متعلق پہلی روایت ہے کہ گورداسپور کے علاقے بٹالہ میں بلھے شاہ نے منصور حلاج کی اتباع میں نعرہ بلند کیا۔''میں اللہ ہوں'' لیکن خوش قسمتی سے وہاں کوئی جنید بغدادی موجود نہ تھا اور حکام اعلیٰ وبالا بھی مزاج دگر کے حامل تھے لہذا خیریت گذری۔ دار پر لٹکانے کے بجائے لوگ موصوف کو پکڑ کر دربار فاضلیہ لے گئے۔پیر طریقت شیخ فاضل الدین نے سیدزادے کو بغور دیکھا اور مسکرا کر کہا ''جوان ٹھیک کہتا ہے' یہ ابھی اِلّھا ﴿بہ معنی کچا پنجابی میں پلا﴾ ہے اسے شاہ عنایت کے سپرد کرو تاکہ اچھی طرح ''پک پکا'' جائے۔' دوسری روایت کچھ اس طرح ہے کہ بلھے شاہ حالت اضطراب میں ایک روز کسی شجر سایہ دار تلے بیٹھا تھا کہ اونگھنے لگا۔عالم خواب میں سید عبدالحکیم ﴿سیدزادے کے دادا کے دادا﴾ نے اپنا تعارف کرانے کے بعد دودھ کا گلاس طلب کیا۔چند گھونٹ لینے کے بعد وہی گلاس بلھے کو پیش کردیا

''برخوردار تمہاری بے چینی کا علاج شروع ہوگیا ہے۔اسے پی لو''

آنکھ کھلی تو بے قراری میں اضافہ ہو چکا تھا۔بلھے شاہ اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا شاہ درویش کے گوش گزار کیا۔انہوں نے شاہ عنایت لاہوری کے آستانے پر حاضری کا مشورہ دیا۔سیدزادہ اسی پل پا پیادہ' سوئے لاہور روانہ ہوگیا۔شاہ عنایت قادری کا آرائیں قبیلے سے تعلق تھا۔اندرون بھاٹی گیٹ ''اُچی مسجد'' میں امامت کے فرائض ادا کیا کرتے تھے۔سیدزادے کا تھکن سے بُرا حال ہو رہا تھا' منزل مقصود پر پہنچ کر ستانے کی خاطر ایک آم کے پیڑ تلے جا بیٹھا اور طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا پھر اچانک کچھ سوچ کر شاخ ثمر کی طرف دیکھا۔چند آم ٹپک کر مسافر کی جھولی میں آن گرے۔مسافر بے تکلف انہیں چوسنے لگا۔

Marfat.com

''برخوردار! یہ کیا حرکت تھی؟'' شاہ عنایت نے ایک طرف سے آتے ہوئے پوچھا۔
''جناب! میں نے یہ آم چوری تو نہیں کیئے'' بلھے شاہ نے جواب دیا ''بس رازق کا نام لیا تھا یہ خود بخود میری جھولی میں ٹپک پڑے اس میں میرا کیا قصور؟''
''قصور والوں کا قصور نہیں تو اور کس کا ہے؟'' شاہ عنایت نے ذو معنی بات کی ''چوری اور سینہ زوری شاید اسے ہی کہتے ہیں''
''جناب میں نے عرض کیا کہ میں نے صرف ''اللہ غنی'' کہا تھا اور رازق کا نام لینا کوئی عیب والی بات نہیں۔''
''اچھا تو تمہیں رازق کا نام لینے کی تمیز ہے؟'' شاہ عنایت نے سرسری لہجے میں کہا ۔پھر ایک عجیب بات ہوئی'شاہ عنایتا نے زیر لب ''اللہ غنی'' کہا تو ٹپکے ہوئے آم غائب ہو گئے ۔ بلھے شاہ نے شاخ ثمر بار کی طرف دیکھا تو وہ آم اپنی پہلی جگہ پر جھول رہے تھے ۔
سیدزادے نے جو دیکھنا تھا' دیکھ لیا اور دست بستہ شاہ عنایت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
''شاہ صاحب! اب کیا چاہتے ہیں آپ اس آرائیں سے؟'' شاہ عنایت نے کہا ۔''حضور! اپنے غلاموں میں شامل کر لیجئے۔ میں آپ کے دست حق پرست پر بیعت' ہونا چاہتا ہوں'' برخوردار تم ٹھہرے سید'' شاہ عنایت نے مسکرا کر کہا۔ایک آرائیں کی بیعت تمہیں زیبا نہیں ۔''
''حضور! مجھے مایوس نہ کریں جس در تک مجھے پہنچنا تھا بس پہنچ گیا'' بلھے شاہ نے ملتجی لہجے میں کہا۔
''میں مفت میں کسی کو بیعت سے نہیں نوازا کرتا'' شاہ عنایت نے سنجیدہ لہجے میں کہا'' پانچ سو روپے نقد'ایک بہترین نسل کا گھوڑا' ایک جوڑی سونے کے کنگن اور ایک جوڑا کپڑوں کا لے آؤ تو میں سوچوں گا۔''
''مگر حضور! میں تو بے سروساماں مسافر ہوں۔''
''میں اگر مگر نہیں جانتا'' شاہ عنایت نے مسافر کا فقرہ بھی پورا نہ ہونے دیا'' یہ تمام اشیا نماز مغرب تک مہیا کر دو اور شام کی نماز اسی مسجد میں ادا کرنا ہوگی۔اب جاؤ اور'' سروسامان'' کا بندوبست کرو۔''
بلھے شاہ کے لیے یہ آزمائش نہ صرف غیر متوقع بلکہ ناممکن قسم کی تھی ۔وہ پرندوں کی

Marfat.com

طرح رزاق کے بھروسے بس رخت سفر کے بغیر منزل کی جانب چل نکلا تھا۔ مطلوبہ اشیا کے لیے زر کثیر درکار تھا۔ عالم پریشانی میں مسافر دریائے راوی کی جانب چل دیا۔ سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ شام سے پہلے پہلے یہ مہم سر کرنا تھی۔ شہر نا آشنا میں کوئی پُرسان حال بھی نہ تھا۔

بلھے شاہ کی پریشانی رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ میں بدلنے لگی۔ اپنی کم مائیگی کا احساس کچوکے لگانے لگا ''اس سے تو بہتر ہے کہ میں دریا برد ہو جاؤں'' بلھے شاہ نے گویا ڈوب مرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ راوی کی لہروں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ گذری ہوئی زندگی کی فلم چشم تصور میں چلنے لگی۔ اس زمانے میں دریائے راوی کی گذرگاہ بادشاہی مسجد کے قریب ہی تھی۔ آج اس کی نشانی بڈھے دریا کی صورت میں موجود ہے۔ اپنے آپ کو لہروں کے سپرد کرنا تو خیر خارج از امکان تھا مگر سید زادے کی پریشانی واقعی عروج پر تھی۔ اچانک اپنے عقب میں اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ ایک نقاب پوش کوتل گھوڑے کی لگام تھامے اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ قریب ہی زمین پر ایک گٹھڑی رکھی تھی۔

''جناب! ذرا میرے گھوڑے کی لگام پکڑیں اور میرے سامان کی حفاظت بھی کریں'' نقاب پوش نے کہا ''میں ذرا دریا میں غسل کر لوں۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر میں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دوں گا۔''

''اس میں زحمت کی کون سی بات ہے'' بلھے شاہ نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''نہائیے مگر بپھری ہوئی موجوں کا خیال ضرور رکھیے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں یہ میرا روز کا معمول ہے'' نقاب پوش نے تسلی دی۔ ''ویسے اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو میرا یہ مال آپ پر حلال ہوگا'' بلھے شاہ کا جواب سنے بغیر اس نقاب پوش نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور ایسا غوطہ لگایا کہ پھر اُبھر ہی نہ سکا۔ بلھے شاہ حیران و ششدر دیکھتا رہ گیا۔

وقت گذرتا گیا۔ نقاب پوش کو سطح آب پر آنا تھا نہ آیا۔ نماز عصر تک سید زادہ گھوڑے کی لگام پکڑے ساحل پر منتظر کھڑا رہا۔ ڈوبنے والے کے ساماں کی تلاشی لینے پر معلوم ہوا کہ یہ تو کوئی اور ہی کھیل تھے۔ نقاب پوش کے سامان میں ہر وہ شے موجود تھی جس کا شاہ عنایت نے مطالبہ کیا تھا۔ بلھے شاہ گھوڑے پر سوار ہو کر اُچی مسجد پہنچے۔ غروب آفتاب میں ابھی کافی دیر تھی۔ بے سرو سامان مسافر نے بیعت کی مطلوبہ شرط پوری کر دی تھی۔

Marfat.com

''حضور! میں نے اوپر والے کے خاص کرم سے آپ کی مطلوبہ اشیا فراہم کردی ہیں۔ لہذا مجھے بیعت سے نواز دیں'' بلھے شاہ نے عرض کی۔

''مگر اپنے آپ کو دریا برد کرنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟'' شاہ عنائت نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

بلھے شاہ نے چونک کر انہیں دیکھا' صورت حال کی وضاحت ہو چکی تھی۔ نقاب پوش کی اصلیت سے آگاہی ہوئی تو سید زادہ مرشد کے قدموں میں جھک گیا۔ شاہ عنایت نے مرد حقانی کو سینے سے لگالیا۔

شاہ عنایت قادری کا تعلق شطاری شاخ سے تھا۔ شطار کا مفہوم ''چست'' یا اپنے معاملات میں حد سے زیادہ ''سرگرم'' بیان کیا جاتا ہے۔ اس شاخ سے تعلق رکھنے والے بزرگانِ دین سخت مجاہدے اور ریاضت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس شاخ کی بنیاد بایزید بسطامیؒ کی تعلیمات پر استوار ہوئی ہے۔ ہند میں اس کا آغاز شیخ شہاب الدینؒ سہروردی نے کیا۔ شیخ عبداللہ شطاری' شیخ محمد غوث گوالیاری' وجیہہ الدین احمد آبادی' سید صبغت اللہ بھڑ وچی اور شاہ عنایت شطاریوں کے سر کردہ بزرگان میں شمار ہوتے ہیں۔

شاہ عنایت کا پورا نام محمد عنایت اللہ تھا۔ ان کے والد مولوی شیر محمد مزنگ لاہور کے رہنے والے تھے۔ لاہور کا یہ موجودہ محلہ اس دور میں نواحی گاؤں کا درجہ رکھتا تھا اور شیر محمد کا آبائی پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ ان کی سسرال کا تعلق قصور سے تھا۔ اس ریشمی رشتے کی کشش تھی یا کوئی اور وجہ بہر حال موصوف لاہور سے قصور نقل مکانی کر گئے۔ شیر محمد زاہد شب زندہ دار قسم کے انسان تھے۔ ایک روز وہ نماز تہجد کی تیاری کر رہے تھے کہ مسجد کے دروازے پر ایک مست الست قسم کے ملنگ نے ان کا راستہ روک کر عجیب لہجے میں کہا ''شیر محمد تیاری کر لو استقبال کی' گھر میں نور کا سیلاب آنے والا ہے۔ اوپر سے ''عنایت'' ہونے والی ہے''۔ چند روز بعد اس گھرانے میں شہباز طریقت تولد ہوا جس کا نام محمد عنایت رکھا گیا۔

ڈاکٹر لاجونتی رام کرشنا کی تحقیق کے مطابق آرائیں مسلمانوں کا تعلق چندر بنسی اور سورج بنسی اہلِ ہنود سے تھا مگر ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ اصل میں محمد بن قاسم نے جب سندھ میں تہذیب حجاز کا تعارف پیش کیا تو اس کی فوج میں عراقی اور شامی دو جنگجو گروہ بھی شامل تھے۔ شامی سپاہی بنو امیہ کی خلافت کا دم بھرتے تھے اور ان کا تعلق سرزمین شام کے ملاقے ''اریحا'' سے

Marfat.com

تھا۔ انہی حضرات نے سندھ میں بود و باش اختیار کی۔ ۱۱۰ ہجری میں شہر منصورہ مسلمانوں کی مساعیِ جمیلہ سے معرضِ وجود میں آیا تو ''اریحا'' سے تعلق رکھنے والے افراد نے یہاں بسیرا کر لیا۔ انہوں نے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کیا۔ عباسی عہد خلافت میں اس شہر کی رونق زوال پذیر ہوئی۔ کچھ لوگ کوہ سلیمان کی طرف ہجرت کر گئے کچھ ملتان میں آباد ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی نے ملتان فتح کیا تو یہ لوگ پنجاب میں آ بسے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ''اریحا'' کے باشندے یا وہ افراد جن کے آباؤ اجداد کا تعلق اریحا سے تھا آرائیں کہلانے لگے۔ برصغیر میں جس پیشے کو ان لوگوں نے اپنایا تھا وہی ان کی پہچان بن گیا۔ دھرتی کے سینے سے حیات بخش خوراک حاصل کرنے والے یہ کاشتکار ہندوؤں سے مسلمان نہیں ہوئے بلکہ خالص عربی النسل ہیں۔

شاہ عنایت کا شجرہ نسب ۲۳ واسطوں سے ''کلاب'' سے جا ملتا ہے۔ کلاب کے دو بیٹے کعب اور قصی تھے۔ قصی بن کلاب وہ ہستی ہیں جو عبدالمناف کے والد ماجد تھے جن کی پشت سے کائنات کے سب سے بڑے انسان اور محسنِ انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ شاہ عنائت کا شجرہ نسب کلاب کے دوسرے بیٹے کعب سے شروع ہوتا ہے۔

بہر حال پنجاب میں شاہ موصوف کا آبائی پیشہ کھیتی باڑی تھا اور ایک سید النسل کا آرائیں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا یا اس کی بیعت کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بلھے شاہ نے البتہ اپنی شاعری میں اپنے رشتے پر فخر و انبساط کا کھل کر اظہار کیا۔ اس میدان میں سیدزادے نے تو مولانا روم علیہ رحمہ کو بھی مات کر دیا۔ اپنے راہنما کو شاعری کا موضوع بنایا۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ بلھے شاہ کی مشہور زمانہ کافی ملاحظہ ہو۔

بلھے شاہ نوں سمجھاون آئیاں بھیناں تے بھر جائیاں
من لے بلھیا ساہڈا کہنا چھڈ دے پلا رائیاں
آل نبیؐ اولاد علیؓ نوں توں کیوں لیکاں لائیاں
جیہڑا ساہنوں سید سدے دوزخ ملن سزائیاں
جو کوئی ساہنوں رائیں آکھے بہشتی پینگاں پائیاں
رائیں سائیں سبھنی تھائیں رب دیاں بے پروائیاں
سوہنیاں پرے ہٹائیاں تے کوہجیاں لے گل لائیاں
جے تو لوڑیں باغ بہاراں چاکر ہو جا رائیاں

Marfat.com

بلھے شاہ دی ذات کیہ پچھنیں شاکر ہو رضائیاں

ہے کوئی اس اظہار تعلق کی مثال؟ ہمارے خیال میں تو اسکی کوئی مثال نہیں۔ بلھے شاہ کی طرح شاہ عنائت کو بھی راہنما کی تلاش میں قصور سے لاہور آنا پڑا اور محمد رضا قادری شطاری کی انہوں نے بیعت کی۔ باطنی تعلیم سے آراستہ کرنے کے بعد مرشد نے ان کو واپس قصور لوٹ جانے کو کہا۔ یہ علاقہ اس دور میں نواب حسین خان افغان کی عملداری میں تھا۔

نواب حسین خان ایک عیاش اور بدکردار حکمران تھا۔ ترنوالے اور حسین چہروں کا دلدادہ حاکم، شاہ عنائت کی ہردل عزیزی سے گھبرا اٹھا۔ اقتدار کی بنیاد اگر ظلم وستم پر استوار ہو تو راج سنگھاسن ہوا کے فرحت بخش جھونکے سے بھی ڈگمگانے لگتا ہے۔ آستانہ عنائت پر عوام الناس کا ہجوم دیکھ کر حاکم وقت کا گھبرا جانا قابل فہم بات ہے۔ نواب ''حسب دستور'' فقیر سے الجھنے لگا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں فقیر کو نقل مکانی کا حکم دیا مگر درویش بے ریا نے مسکرا کر ٹال دیا۔ اسی دوران قصور میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے نواب حسین کی دلی مراد پوری ہو سکتی تھی۔

ایک فن کار قسم کی مغنیہ کا اس دور میں بڑا چرچا تھا۔ چونکہ اس کا تعلق نوابی دربار سے تھا لہذا نواب موصوف اپنے آپ کو اس کا بلا شرکت غیرے مالک سمجھتا تھا۔ جانے کیسے اور کس طرح ہوا کہ وہ مطربہ آستانہ عنائت کی طرف مائل ہوگئی۔ گلاب کے پودے تلے کی مٹی بھی مہک اٹھتی ہے کے مصداق مغنیہ کے دل کی دنیا زیروزبر ہوگئی۔ جھوٹ کی دنیا سے سچ کے ایوان میں آئی تو اسے محسوس ہوا جیسے اس نے ساری زندگی رائیگاں گزار دی ہو۔ مغنیہ کا شباب زوال پذیر تھا مگر اس کی بیٹی طلوع آفتاب کا منظر پیش کر رہی تھی۔

''حضور! میری عاقبت تو برباد ہو ہی گئی۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنی بچی کو آتش دوزخ سے محفوظ کرلوں'' مطربہ نے دل کی بات شاہ عنائت کے گوش گزار کی۔

''در توبہ دم آخر تک کھلا رہتا ہے ایسی بات نہ کیا کرو'' شاہ صاحب نے اسے تسلی دی'' بچی کو دینی تعلیم سے آراستہ کر کے اپنی عاقبت بھی سنوار لو۔''

فقیر کے الفاظ مغنیہ کے دل پر نقش ہو گئے۔ اس نے اپنی بیٹی کو قرآن حفظ کرایا اور زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ دوشیزہ تو نوری مخلوق کا نقشہ پیش کرنے لگی۔ حاکم وقت دوشیزہ کو بھی اپنی جاگیر تصور کر رہا تھا مگر فقیر کے ہوتے ہوئے اپنی ہوس کا پورا کرنا ایک مسئلہ بنتا جارہا تھا۔ مطربہ ویسے بھی گناہوں سے تائب ہو چکی تھی۔ سرکار دربار سے قطع تعلق کر کے وہ آستانہ عنایت سے

Marfat.com

رشتہ جوڑ چکی تھی۔ اس نے تلخ ترین الفاظ میں نواب کا دست ہوس جھٹک دیا۔ یہ اقتدار کے منہ پر طمانچے والی بات تھی۔ حسین خان خلف زئی خویشگی تو اس زمانے میں شتر بے مہار بنا پھرتا تھا۔ لاہور کے صوبے دار کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس کی اپنی فوج بہادر سپاہ پر مشتمل تھی۔ ایک فقیر بے نوا کی شہ پر ایک مغنیہ اسے للکار رہی تھی۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی' مطربہ نے اپنی بیٹی کے لئے اس دور کے صالح ترین انسان شاہ عنایت کا انتخاب کر لیا۔

''حضور! میں آپ سے جائز رشتہ استوار کرنا چاہتی ہوں'' مغنیہ نے شاہ عنایت سے التجا کی۔

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' شاہ صاحب نے پوچھا۔

''آخرت میں آپ کی ہمسائیگی کیلئے''۔

''وہاں صرف نیک اعمال ساتھ دیں گے کوئی رشتہ کوئی تعلق کام نہیں آئے گا۔''

'' یہ میرے سوچنے کی بات ہے۔'' مطربہ نے کہا ''تعلق سے انکار نہ اس دنیا میں نہ اس جہان میں کیا جا سکتا ہے۔ وہاں تو وضع قطع' لباس ظاہری شکل وصورت بھی کام بگاڑ یا سنوار سکتی ہے۔ رشتہ دار تو دور کی بات ہے۔''

''مدعا کھل کر بیان کرو'' درویش نے کہا۔

'' میں چاہتی ہوں کہ سنت رسولؐ کے مطابق آپ میری نیک دل بیٹی سے عقد کر لیں۔'' مطربہ نے گویا بم کا دھماکہ کیا ''اس طرح میں دنیا وآخرت میں حصارِ عافیت کی حق دار ہو جاؤں گی۔ دنیا سے مراد حاکمِ وقت کا ''شر'' ہے۔''

درویش نے سر جھکا کر تھوڑی دیر توقف کیا۔ مقابلہ ایک طاقتور حکمران سے تھا۔ انکار کا مفہوم کچھ اور اخذ کیا جا سکتا تھا۔ نکاح کوئی غیر شرعی فعل ہرگز نہیں تھا۔ شاہ عنایت نے مغنیہ کی درخواست قبول کر لی اور رشتہء ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

نوابی ایوانِ اقتدار میں گویا زلزلہ آ گیا۔ سرکار دربار میں طلبی ہوئی' حسین خان نے بدتمیزی سے کہا '' وہ دوشیزہ جس سے آپ نے عقد کیا آپ کی بیٹی کے برابر تھی' یہ کیا حرکت کی جناب نے؟''

''بیٹی کے برابر تھی' بیٹی تو نہیں تھی اور حرکت سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' درویش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''تم نے جو اپنے گرد خواتین کا ریوڑ پال رکھا ہے اس کا کیا جواز ہے؟''

Marfat.com

''مجھ میں ایسا کرنے کی طاقت ہے۔ میں حسن کی ناز برداریاں کرسکتا ہوں'' احمق حاکم نے گھسا پٹا جواب دیا۔

''وہ عمل جس میں ایک گدھا انسان سے کئی ہاتھ آگے ہو باعثِ فخر نہیں ہوسکتا'' درویش نے نکتے کی بات کی۔ ''ہوس سے باز آ جاؤ اور حدِ اعتدال میں رہو ورنہ انجام بہت بُرا ہوگا۔''

درویش کے لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ حاکمِ وقت کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت ثبت ہوگئی۔

''ہم دونوں کا مفاد اسی میں ہے کہ آپ قصور سے نقل مکانی کر جائیں۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔'' نواب صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔ ''اپنے برے انجام کو بھی دیکھ لوں گا۔''

''میرا کام صرف تنبیہ کرنا تھا۔ جو لکھا جا چکا ہے اس پر خط تنسیخ کھینچنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔''

درویش نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ وہ جزا و سزا کا مالک نہیں تھا۔ چند روز بعد شاہ عنایت مع اہل و عیال قصور سے لاہور منتقل ہوگئے۔ نقل مکانی سے پہلے درویش نے صرف اس قدر کہا تھا ''ہم لاہور کا سفر کرتے ہیں نواب کو سفرِ آخرت کرنا ہوگا۔''

حاکم قصور اس دور میں اقتدار کے بام عروج پر تھا۔ مغل حکمرانوں کی گرفت ہند پر ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ جہاندار شاہ چند ماہ تخت دہلی پر متمکن رہنے کے بعد قتل کیا جا چکا تھا۔ فرخ سیر کا عہد حکومت تھا۔ جگہ جگہ خود مختار قسم کے نواب اور حکمران کشور کشائی فرما رہے تھے۔ امرتسر کے حاکم گلاب سنگھ نے قصور پر چڑھائی کر دی۔ قصور امرتسر کی فوجیں بارہا آپس میں ٹکرا چکی تھیں۔ سکھ افواج کے مقابلے میں نوابی سپاہ سینہ سپر ہوئیں۔ گھمسان کا رن پڑا مگر گلاب سنگھ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ میدان جنگ سے تو فرار ہوگیا مگر جاتے جاتے حسین خان کے قتل کا اہتمام کر گیا۔ اس نے دو مچھیروں کی خدمات حاصل کیں۔ نواب کے سر کی قیمت دو ہزار روپے سکہ رائج الوقت قرار پائی۔ مچھیرے نواب کی تلاش میں رہے۔ مگر نواب موصوف کا ستارہ ابھی گردش میں نہ آیا تھا۔ فرخ سیر کے بعد ایک سال میں تیسرا حکمران محمد شاہ تخت دہلی پر براجمان ہوا۔ پنجاب کی حکومت عبدالصمد خان کے حصے میں آئی۔ یہ ۱۷۱۹ء کا واقعہ ہے۔ نواب حسین خان پنجاب کے حکمران سے ٹکرا گیا۔ قصور سے اٹھارہ کوس پر واقع قصبہ چونیاں کے قریب مغل اور افغان فوجوں میں ٹکراؤ ہوا۔ پہلے نواب حسین خان کی افغان فوج کا پلہ بھاری رہا مگر پھر اچانک نواب کا فیل بان مارا گیا۔ ہاتھی

Marfat.com

بے قابو ہوا تو دشمن کی زد پر آ گیا۔ ایک جوشیلے حریف نے ہاتھی کی سونڈ پر وار کیا۔ ہاتھی اپنے سوار کو گراتا ہوا میدان جنگ سے دُم دبا کر بھاگا...... حسین خان کی فوج منتشر ہو چکی تھی۔ یہ ۱۵ اپریل ۱۷۲۰ء بمطابق ٦ جمادی الآخر ۱۱۳۲ھ کا واقعہ ہے۔

نواب حسین جان بچا کر ایک مچھیروں کی بستی میں جا پہنچا۔ تقدیر کا طاقتور ہاتھ زبردست کو زیردست بنانے پر تُلا بیٹھا تھا۔ کرائے کے قاتل مچھیروں نے نواب ذی وقار کو دیکھا تو ان کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ انہوں نے مہمان کی خوب آؤ بھگت کی۔ رکاب کو بوسہ دیا اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ نواب اس عزت افزائی کا عادی تھا۔ قاتل نگاہوں کو پہچان ہی نہ سکا۔ اقتدار کی دُھند میں کم ظرف انسان بصیرت و بصارت سے محروم ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات محروم سے مرحوم ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

''جناب والا آپ کی دعوت اس نایاب مچھلی سے کی جائے گی'' ایک مچھیرے نے اعلیٰ نسل کی مچھلی نواب کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ نواب اس وقت گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے جھک کر مچھلی کا معائنہ فرمایا دوسرے مچھیرے نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طمنچے سے گردن پر فائر داغ دیا۔ نواب کا معائنہ ادھورا ہی رہ گیا۔ شاہ عنائت قادری کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی تھی۔

نواب حسین خان خویشگی کی موت کے بعد قصور کی عملداری بدستور اس کے خاندان میں رہی۔ عہد فرنگی میں نواب شہباز خان اس خاندان کا چشم و چراغ اور انگریز راج کا وفادار تھا۔ جنگ عظیم اول میں اس نے پندرہ ہزار روپے کی خطیر رقم ''وار فنڈ'' میں دی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر جلیانوالہ باغ کے خونچکاں حادثے کے بعد برصغیر میں غم و غصے کی ایک لہر اٹھی۔ انگریزوں نے اس شورش کو دست ستم سے دبا دیا۔ اہل قصور نے اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ شہباز خان کو آقاؤں کا حکم وصول ہوا ''اس آتش فساد کو ٹھنڈا کر دو''۔

نواب موصوف نے قصور ریلوے اسٹیشن کے عین سامنے ''کڑکیاں'' لگوائیں۔ ٹیچرز ٹریننگ سکول کے افراد اور ہائی سکول کے بچوں کو الم ناک سزا کے سپرد کر دیا۔ آہنی شکنجوں میں جکڑ کر انہیں کوڑے لگائے گئے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ کوڑے معمولی نوعیت کے نہیں ہوا کرتے تھے۔ انگریز راج میں ایسے چھ سے بارہ کوڑوں کی جزاء چھ ماہ قید با مشقت کے برابر ہوا کرتی تھی۔ اس سے کوڑوں کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہر کوڑا جسم کی کھال ادھیڑ کر ہڈیوں تک کی خبر

Marfat.com

لایا کرتا تھا۔ پنجابی میں اسے بنت (بید) کہا کرتے تھے۔ اور بید کھانے والے کو ''کمیاں''۔ بہر حال شہباز خان نے قوم کے بچوں کو وحشت ناک سزا کے سپرد کر کے اپنی وفاداری کا ثبوت انگریز سرکار کو پیش کر دیا۔

اس کتاب الم کا دوسرا باب بھی کچھ کم نہ تھا۔ مشہور زمانہ لاہور سازش کیس کے وقت شہباز خان کا بیٹا نواب محمد احمد خاں قصوری آنریری مجسٹریٹ کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھا۔ بھگت سنگھ راج گورو اور سکھ دیو آزادی کے تین متوالوں نے لاہور ڈی اے وی کالج کے عین سامنے نیم کے شجر تلے کھڑے ہو کر مسٹر سانڈرس کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ نیم کا یہ پیڑ کالج گیٹ کے قریب موجودہ ایس ایس پی آفس لاہور کے سامنے تھا۔ اس مقدمے کی بازگشت برصغیر کے کونے کونے میں گونجی ''مینوں رنگ دے بسنتی چولا'' یہ گیت بڑا مشہور ہوا۔ مجرمانِ وفا کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ برصغیر کا کوئی مجسٹریٹ دارورسن کی اس کاروائی کا مشاہدہ کرنے کو تیار نہ ہوا جو ایک قانونی تقاضہ تھا۔ فرنگی آقا کی نگہہ انتخاب نواب احمد خان قصوری آنریری مجسٹریٹ پر ٹک گئی اور موصوف نے بھی اپنے آقاؤں کو مایوس نہیں کیا۔ یہ باب وفا میں ایک اضافہ تھا۔

موجودہ شادمان چوک میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ نواب صاحب نے ساری کاروائی کو ''حسب قانون'' قرار دے کر راتوں رات بھگت سنگھ کی لاش کو ''حسینی والا'' کے قریب...... پہنچا کر سپرد آتش کیا اور راکھ دریائے ستلج میں بہا دی۔ نواب قصوری نے بزمِ خویش ''جرم'' کا نام نشان مٹا دینے کی کوشش کی مگر ہوا کیا۔ فیروز پور حسینی والا میں عین اس جگہ جہاں بھگت سنگھ کی لاش کو نذر آتش کیا گیا تھا' بھگت سنگھ میلے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس روداد کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں میاں قصوری صاحب کو بالکل اسی جگہ جہاں بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تھی' گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اس کیس کی ابتدائی رپورٹ تھانہ اچھرہ میں لکھوائی گئی اور اس مقدمے میں بھٹو صاحب کی سزا ہوئی' یہ ایک الگ داستان ہے۔

وقت اسی انداز میں انصاف کیا کرتا ہے۔ شاہ عنایت اور بلھے شاہ کی تربتوں پر آج بھی ''چراغاں'' ہوتا ہے۔ خدا لگتی کہیے' کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ نواب حسین خان خویشگی حاکم قصور زمین کے کس حصے پر مدفون ہے......؟ یا وہاں کس قدر اندھیرا ہے۔ قانون قدرت یہی ہے جسے بلھے شاہ نے طریقے سلیقے سے پیش کیا کہ خلقِ خدا کو اندھیرے بانٹنے والے روشنی سے ہمیشہ کے لیئے محروم ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

مغل شہنشاہ محمد شاہ تختِ ہند پر متمکن ہوا۔ وہ نسبتاً ایک آزاد خیال حکمران تھا۔ شاہ عنایت کی فیض رسانی بچے بچے کی زبان پر تھی۔ شوقِ ملاقات اسے درویش کے در تک لے آیا۔

یقین پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے مغفوری

اقبالؒ

موصوف نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ مزاج شاہ اس رویّے کا عادی نہیں تھا۔ مگر اس نے سن رکھا تھا کہ درویش دولت قناعت سے مالا مال ہے اور قناعت کا پہلا اصول بے نیازی پیدا کرنا ہوا کرتا ہے۔

''فقیر آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہے؟'' شاہ عنایت نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

سردی جوبن پر تھی، بادشاہ نے درویش کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور اصول دنیا کے مطابق آزمائش بھی گھسے پٹے انداز کی تھی ''آم کھانے کو جی چاہتا ہے اگر ممکن ہو تو......''

''یعنی آپ کو بے موسم پھل کی خواہش ہے!'' درویش نے حاکمِ وقت کا مدعا پا لیا۔

''موسموں کی قید تو ہم ایسے دنیا داروں کے لیے ہوتی ہے'' شہنشاہ نے سنجیدگی سے کہا ''آپ حضرات ان قوانین کے محتاج نہیں۔''

''قوانین خالق کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا احترام مخلوق پر واجب ہے'' درویش نے بھی سنجیدگی سے کہا ''لیکن آپ ہمارے مہمان ہیں لہٰذا آم تو ضرور کھلائے جائیں گے۔ اتفاق سے آج صبح ہی پیڑ تلے کچھ آم ٹپکے تھے'' شاہ عنایت نے ایک سپاہی سے کہا ''عزیزم! وہ سامنے آم کا درخت ہے۔ اپنے بادشاہ کیلئے چند آم لے آؤ''۔

سپاہی واپس آیا تو اس کی جھولی آموں سے بھری ہوئی تھی۔ اور چہرے پر حیرت کے آثار تھے ''حضور! میں شجر تلے گیا تو......تو ڈھیر سارے آم شاخوں سے ٹپکنے لگے'' سپاہی نے صورت حال کی وضاحت کی۔

''اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے۔'' درویش نے مسکرا کر کہا ''من و سلویٰ بھی تو بغیر سبب کے نازل ہوا کرتا تھا''

بادشاہ نے جو کچھ دیکھنا تھا دیکھ لیا اور دست بستہ بیعت کی درخواست کی۔ درویش نے جانے کیا سوچ کر شہنشاہ کی درخواست قبول کر لی۔ عجیب اتفاق ہے ۱۷۱۹ء میں فرخ سیر قتل ہوا۔

Marfat.com

یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، شاہ جہان ثانی تخت دہلی پر متمکن ہوئے۔ پھر اسی برس روشن اختر محمد شاہ کی باری آئی۔ مگر اس پرآشوب زمانے میں بھی وہ اٹھائیس برس حکومت کر گیا۔ یعنی احمد شاہ ابدالی کی آمد تک......اس سے بڑھ کر حصار عافیت اور کیا ہوسکتا تھا۔ شہنشاہ نے ایک اور درخواست بھی پیش کی تھی "یعنی اندرونِ بھاٹی گیٹ اُچی مسجد کی امامت قبول فرمائی جائے۔"

اس مسجد کی کرسی زمین سے بہت زیادہ اونچی ہے۔ اسی بنا پر یہ اُچی مسجد کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ مسجد آج بھی مختلف وجوہات کی بنا پر لاہور شہر میں موجود ہے۔......شاہ عنایت کے عقیدت مندوں میں اہل ہنود کی بھی کافی تعداد تھی۔ درویش نے بے شمار کتب تصنیف فرمائیں۔ تنقیح الحرام، لطائف غیبیہ، اذکار قادریہ، ملتقط الحقائق، دستور العمل وغیرہ، سولہ کتب کافی مشہور ہیں۔ اظہار فارسی، پنجابی دونوں زبانوں میں کیا۔ وصال ۱۱۴۱ھ بمطابق ۱۷۲۸ء میں ہوا۔ لاہور شاہراہ فاطمہ پرآسودہ خاک ہیں......مزار میں تربت کے دائیں بائیں ان کے دو فرزند بھی دفن ہیں۔

بلھے شاہ کو بیعت کے بعد شاہ عنائت نے کندن بنانے کا آغاز کیا۔ ارتکاز کیلئے دریائے چناب کے کنارے قیام کا حکم ملا۔ چشم بینا کیلئے دریا کی روانی میں گہرے مفاہیم پائے جاتے ہیں۔ نظریہ زمان و مکان، وقت کا دھارا، وقت جو آفات کے تسلسل کا نام ہے۔ ہو بہو رواں موجوں کی طرح اشیاء پر گزرتا ہے۔ لیکن کور چشم حضرات کیلئے اس کی کوئی وقعت نہیں ہوا کرتی۔ اس زمانے میں سید زادے کو بھوک پیاس کی بھی پروا نہیں ہوا کرتی تھی۔ درختوں کے پتوں اور خوش ذائقہ تر لقموں میں امتیاز نہ رہا۔ داستان مرزا صاحباں کے خالق شاعر بے بدل حافظ برخوردار سے ملاقات اسی زمانہ میں ہوئی۔ فکری ہم آہنگی نے دوستی کو دوام بخشا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اپنی ملکیت میں سے کوئی ایسی چیز آپ کی نظر کروں جو عمر بھر میری یاد دلاتی رہے۔" حافظ صاحب نے ایک روز انوکھی خواہش کا اظہار کیا۔

"جو یاد اشیاء کی محتاج ہو وہ پائیدار نہیں ہوسکتی" بلھے شاہ نے جواب دیا۔

"مظاہر قدرت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ قدم قدم پر اس کی یاد کے وسیلے ہی تو ہیں"

بلھے شاہ کو دوست کا جواب پسند آیا "ٹھیک ہے، میں تا حال شادی کے بندھن سے آزاد

Marfat.com

ہوں، مستقبل قریب و بعید میں ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں آپ یوں کریں اپنا ایک لخت جگر عنائت کر دیں"

حافظ صاحب کثیر العیال تھے۔ چھ عدد تو بیٹے ہی تھے۔ انہوں نے فرداً فرداً ہر بیٹے سے پوچھا۔ پانچ بیٹوں نے اس انوکھی طلب و عطا میں عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔ مگر سب سے چھوٹے بیٹے سلطان احمد نے برضا و رغبت اپنے سارے فیصلے بلھے شاہ کے سپرد کر دیئے۔ واپسی کے سفر کا آغاز ہوا۔ لونا نامی گاؤں میں دونوں مسافروں نے قیام کیا۔ وہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

عشاء کی نماز ادا کی جا رہی تھی۔ امامت کے فرائض گاؤں کا متقی پرہیز گار شخص ادا کر رہا تھا۔ بلھے شاہ اپنے منہ بولے بیٹے کے ہمراہ دوسری صف میں شریک تھا۔ اچانک سید زادے نے تنبیہ کرنے والے انداز میں گلے سے آواز خارج کی، پہلی بار تو نمازیوں نے نظر انداز کر دیا، دوسری بار بلھے شاہ نے ویسی ہی آواز نکالی تو چند حضرات نے نماز توڑ ڈالی۔ مسجد میں ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امام نے بھی سلام پھیر دیا۔ اب گاؤں کے لوگ سید زادے کو سرزنش کرنے لگے۔ امام تو آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ "دین کی لٹیا ڈبونے والے ایسے ہی افراد ہوتے ہیں، شکل مومناں کرتوت کافراں"۔ امام صاحب نے جھٹ کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ گاؤں کے لوگ بضد تھے کہ بلھے شاہ نماز میں مداخلت کی وجہ بیان کرے۔

"جو ان وجہ غیر معقول ہوئی تو ہم بھی بری طرح پیش آئیں گے"۔ ایک شخص نے اعلان کیا۔

سلطان نے لب کشائی کی کوشش کی تو سید زادے نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ آتش فساد قابو سے باہر ہونے لگی تو مجبوراً بلھے شاہ کو صورت حال کی وضاحت کرنا پڑی۔

"آپ حضرات امام صاحب سے پوچھ لیں کہ میں نے کیوں مداخلت کی؟"

"وہ تو خشوع و خضوع سے نماز پڑھا رہے تھے۔ ان کو کیا خبر پیچھے کیا ہو رہا ہے" ایک شخص نے امام کا دفاع کیا۔

"جسے پیچھے کی خبر نہ ہو اسے آگے کھڑے ہونے کا حق نہیں۔" سید زادے نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اس معاملے کو یہیں ختم کریں اور نماز از سرِ نو ادا کر لیں، خدا پردہ پوشی کو پسند فرماتا ہے"۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ امام مسجد کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر وہ بہر حال اپنا بھرم قائم رکھنا چاہتا

Marfat.com

تھالہذا خاموش رہا۔لوگ مرنے مارنے پر تل گئے تو سید زادے نے کہا'' امام دوران نماز آوارہ خیالی میں مصروف ہو گیا تھا۔اور یہ ذہنی آوارگی میری نماز کو مجروح کر رہی تھی۔''

یہ ایک بڑی عجیب بات تھی۔لوگ بلھے شاہ سے متعارف نہیں تھے۔ یہ غیب دانی انہیں ہضم نہیں ہو رہی تھی ۔امام صاحب البتہ اچانک چیخنے چلانے لگے'' یہ شخص بہتان طرازی کر رہا ہے۔یہ...... یہ کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو؟''

'' مولوی صاحب اگر آپ اپنے رویے سے باز نہ آئے تو میں گزشتہ رات کی ساری کاروائی بے نقاب کر دوں گا'' سید زادے نے بغور امام کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا'' کمہاروں کی وہ لڑکی اپنی زبان سے گواہی دے گی جو آپ کی زیادتی کا شکار ہوئی۔آپ امامت کے فرائض ادا کرنے کے اہل ہی نہیں۔کرسی دل پر ابلیس بیٹھا ہو تو عبادت نفع کے بجائے نقصان پہنچاتی ہے۔توبہ کا دروازہ البتہ کھلا ہے'دورانِ نماز آپ تلذذ کا شکار تھے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔''

سید زادے نے ہجوم کی پروا کیے بغیر ایک کونے میں جا کر نماز کی نیت باندھ لی۔ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔امام مسجد مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔لوگ عقیدت بھری نگاہوں سے سید زادے کو دیکھ رہے تھے۔دوسرے روز جب بلھے شاہ اس گاؤں سے رخصت ہونے لگا تو اس گاؤں کا ایک باشندہ حافظ جمال راستہ روک کر کھڑا ہو گیا'' جناب! پیاسے کے ہونٹوں سے جامِ شیریں چھین کر الگ کر دینا خدا پرستوں کی ریت نہیں۔ مجھے بھی اپنے غلاموں میں جگہ دے دیں۔''

اس طرح ایک سے دو ہوئے اور دو سے تین۔ بلھے شاہ پانڈو کے واپس آئے تو سلطان مستانہ اور حافظ جمال ان کے ہمراہ تھے۔والد کا انتقال ہو چکا تھا۔والدہ ماجدہ اور دو ہمشیرگان بھی سفر آخرت اختیار کر چکی تھیں۔

اس دور میں پانڈو کے والا سارا علاقہ' سکھا شاہی کے زیر عتاب تھا۔اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ سید کو پانڈو کے سے بھی ہجرت کرنا پڑی۔دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل سکھوں کا ایک جتھا ملتان جا رہا تھا۔متیکے نامی گاؤں کے قریب سکھ سپاہ نے پڑاؤ ڈالا۔گھونڈ نامی گاؤں کا ایک سپاہی سالار لشکر سے اجازت لیکر اپنے عزیزوں سے ملنے چلا آیا۔وہ گھوڑے پر سوار تھا۔راستے میں پانڈو کے پڑتا تھا جہاں کے لوگ حد سے زیادہ مغرور تھے۔کسی کو خاطر میں نہ لاتے

Marfat.com

تھے۔ انہوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو کر ہماری بستی سے گزرنے کی جرأت نہ کرے۔ یہ ایک عجیب وغریب اعلان تھا۔ مگر انسانی کج روی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ سکھ سپاہی بستی کی حدود میں داخل ہوا تو شوریدہ سر نوجوانوں کے ہتھے چڑھ گیا...... سپاہی کو سکھا شاہی کا غرور لے ڈوبا۔ پہلے تو وہ خاموشی سے مار کھاتا رہا۔ پھر اچانک اس نے شور مچانا شروع کر دیا'' اوے ایس وستی وچ کوئی اجیہا رب دا بندہ نہیں۔ جیڑا مینوں انہاں ظالماں کولوں بچائے۔''

یہ دردبھری آواز بلھے شاہ کے کانوں میں پڑی تو وہ بیقرار ہو گئے۔ ''بند کرو یہ ظلم'' سید زادے نے مقام فساد پر پہنچ کر کہا'' مسافر کو دکھ دینے والا سکھ سے محروم ہو جاتا ہے''۔ بلھے شاہ کی للکار میں کوئی ایسی ہی بات تھی کہ فسادی حضرات نے ہاتھ روک لئے۔ مسافر نے سکھ کا سانس لیا اور اپنے محافظ کے حصار میں گاؤں کی حدود سے نکل گیا۔ سیدزادہ واپس آیا تو گاؤں کی فضا ہی بدل چکی تھی۔ پانڈو چوہدری بھی غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ اس کا دست راست اور بھائی سدھا غیظ وغضب میں کھول رہا تھا۔ البتہ چوہدری کا داماد شیخو اپنے بزرگان کو صبر وتحمل کی تلقین کر رہا تھا۔

''شاہ جی! آپ نے ہماری روایت شکنی کی ہے'' پانڈو نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''کمزوروں پر دست درازی اگر روایت میں ہے تو میں اس کو توڑنا پسند کرتا ہوں'' بلھے شاہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''تم ہمارے سردار نہیں ہو...... ہم راجپوت کسی کی بالادستی تسلیم نہیں کرتے'' نوجوانوں نے چوہدری کے ایماء پر تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ شیخو نے حتی الامکان آتش فساد پر قابو پانے کی کوشش کی مگر راہنگو تو بپھرتے چلے گئے۔ اچانک ایک ناہنجار نے کھینچ کر پتھر مارا۔ پہلا پتھر ہی مشکل ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف سے پتھر برسنے لگے۔ اپنوں کے تو پھول بھی برداشت نہیں ہوتے۔ وہاں تو سنگ زنی ہو رہی تھی۔ بلھے شاہ کو امید نہ تھی کہ معاملہ اس حد تک بگڑ جائے گا۔

سر نگوں تھا اس لئے کیسے وہ منظر دیکھتا
تھا ہجوم دوستاں کس کس کا پتھر دیکھتا

والی کیفیت تھی۔ شیخو بھی زخمی ہوا۔ سیدزادہ تو لہولہان ہو رہا تھا۔ ان حالات میں پانڈوکے کی زمین سید پر تنگ ہو گئی اور انہیں قریبی گاؤں دفتوہ جانا پڑا۔ پانڈوکے' سدھار اور دفتوہ تینوں گاؤں قریب قریب آباد تھے۔ چند روز بعد گاؤں کے لوگوں کو ہوش آیا تو وہ کف افسوس ملنے لگے۔ گاؤں کی فضا میں تناؤ سا تھا۔ سیدزادے کے عقیدت مند بھرے بیٹھے تھے۔ ان کا ایک ہی تقاضا تھا کہ درویش کو

Marfat.com

منا کر واپس لایا جائے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ چوہدری پانڈو، سدھار اور شیخو تینوں دفتوہ جائیں اور بلھے شاہ کو ہر صورت منا کر واپس لائیں۔

گاؤں کے یہ تین سرکردہ حضرات روٹھے ہوئے درویش کو منانے دفتوہ پہنچے۔ پانڈو اور سدھار کے دلوں میں کدورت تھی البتہ شیخو صدق دل سے درویش بے ریا کی واپسی کا متمنی تھا۔ پانڈو نے درخواست اس انداز میں پیش کی جیسے بلھے شاہ کی تقصیر معاف کر رہا ہے۔

''کانٹا نکل گیا۔ جاؤ اپنے رسم و رواج کی پابندی کرو'' سید زادے نے ٹکا سا جواب دیا۔ ''مگر یاد رکھو پیڑ جتنا بلند ہوتا ہے اتنے ہی زور سے گرتا ہے۔ بلندی سے گرو گے تو چور چور ہو جاؤ گے۔''

''بلندی کو چھوڑیں اور ہمارے ساتھ چلنے والی بات کریں'' سدھار نے آگے بڑھ کر بلھے شاہ کی کلائی دبوچ لی۔ دوسری کلائی پر پانڈو کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ عجیب انداز تھا روٹھے درویش کو منانے کا۔

''آپ لوگ اتنا عذاب بوئیں جتنا کاٹ سکتے ہیں'' شیخو نے مداخلت کی ''درویش کو منانے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔''

''برخوردار! تم خاموش رہو'' بلھے شاہ نے نرم و ملائم لہجے میں شیخو کو تلقین کی۔ ''خدا جب صحت عطا کرتا ہے تو بندے کے ذہن سے بیماری کا خیال نکل جاتا ہے۔ طاقت دیتا ہے تو ناتوانی کا تصور انسان سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بندہ بغاوت کر بیٹھتا ہے۔''

''اگر آپ ہمارے ساتھ راضی خوشی چلنے پر تیار نہ ہوئے تو ہم آپ کو بزور بازو لے جائیں گے''۔ پانڈو نے واشگاف الفاظ میں کہا۔

''نادانو! یہ تو من چاہنے کا سودا ہے'' سید زادے نے جھٹکے سے اپنی دونوں کلائیاں آزاد کراتے ہوئے کہا ''میری منشاء کے بغیر تم خود بھی واپس نہیں جا سکتے۔ ناپاک نطفے سے پیدا ہونے والے کو غرور و تکبر زیبا نہیں'' شیخو نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ کوئی بڑی خرابی والی بات ہونے کو ہے۔ اس نے منت سماجت سے اپنے بزرگوں کو حد میں رہنے کی تلقین کی۔

''ہم خالی ہاتھ لوٹ کر تو ہرگز نہیں جائیں گے'' پانڈو اپنی ضد سے باز نہ آیا اور حماقت بھرے الفاظ دھرانے لگا۔ ''ہمارے ساتھ جانا پسند نہیں تو اپنی دعا یہ ہے کہ ہمارے ساتھ کر دو'' یہ الفاظ اس نے متکبرانہ لہجے میں ادا کیے۔

Marfat.com

سیدزادہ نیم وا آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔ ''مجھے تمہاری کوئی شرط منظور نہیں''

''یوں کہیے جناب کہ دعا و بدعا کی آپ میں اہلیت ہی نہیں'' پانڈو اور سدھار نے بیک زبان کہا'' یہ گلی کوچوں میں تھرک تھرک کر ناچنا۔ یہ زہد و تقویٰ کا'' فند فریب'' سب ڈھکوسلے ہیں......''

بلھے شاہ کو جلال آ گیا اور انہوں نے وہ تاریخی اشعار کہیے جن کی سچائی کا تماشہ دنیا نے دیکھا ۔

بلھیا جے توں غازی بنائیں لکیں بنھ تلوار
پہلاں رہنگڑ پانڈو ماریں پچھوں کافر مار
اجڑ گئے پانڈو کے تے نکھڑ گیا سدھار
وسدا رہے شیخو پورہ لگی رہے بہار

یہاں شیخو پورہ سے مراد لاہور سے ستائیں میل دور آباد شیخو پورہ شہر نہیں بلکہ وہ بستی ہے جسے شیخو نے آباد کیا۔ یہ پیش گوئی فوراً ہی سچ ثابت ہوگئی۔ زدوکوب کیا جانے والا سکھ سپاہی اپنے لشکر میں پہنچا تو اس نے اپنی داستان غم' سالار لشکر کے گوش گزار کی۔ سالار تو بس آتش زیر پا ہوگیا۔ اس نے سپاہیوں کو فوراً کوچ کا حکم دیا۔ اہل پانڈو کے کو ہوش اس وقت آیا جب سکھ جتھا قہر خداوندی بن کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ اب ہوش و خرد کی باتیں بے کار تھیں اور جوش کو وقت گزر چکا تھا۔ گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ ہر سرِ پرغرور' تن سے جدا کر دیا گیا۔ حملہ آوروں نے گاؤں کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ اسی ویرانے کو پانڈو چوہدری کے داماد شیخو نے آباد کیا۔ آج اسی کی اولاد اس گاؤں میں بس رہی ہے۔

بستی سدھار کا حشر بھی عبرت ناک ہوا مگر اس کی نوعیت قدرے مختلف تھی۔ شب سیاہ کی چادر نے گاؤں کو اوڑھ رکھا تھا۔ اچانک زلزلے کا خفیف جھٹکا محسوس ہوا پھر زمین زیر و زبر ہو گئی۔ بچ جانے والے چند افراد چشمِ بصارت و بصیرت کے لئے سامانِ عبرت تھے۔ آج اسی بستی کے صرف کھنڈرات موجود ہیں۔ کوئی شیخو بھی اس بستی کی روٹھی ہوئی بہاریں واپس نہ لا سکا۔

ان واقعات کی بازگشت اطراف اکناف میں سنائی دی۔ شاہ عنایت نے سر جھکا کر مختصر تبصرہ کیا ''بلھے نے ذرا چھیتی کیتی پر ہونا ایسے طرح سی'' اس کے بعد مرشد نے سیدزادے کو دفتوہ چھوڑ کر قصور جا بسنے کا حکم دیا'' بلھے شاہ نے'' چشم ما روشن دلِ ما شاد'' کہا۔ ایک روایت کے

Marfat.com

مطابق دو بستیوں کی بربادی اور خلقِ خدا کی ہلاکت سے بلھے شاہ بے حد مغموم رہنے لگے۔ لاہور حاضر ہو کر حدیثِ دل مرشد کے گوش گزار کی۔

''پہلے خلقِ خدا کو گزند پہنچایا۔ اب کفِ افسوس مل رہے ہو'' مرشد نے سرزنش کی ''اب قصور جا کر نقصان کی تلافی کرو''۔

''حضور! وہاں کے پٹھان تو واقعی پتھر دل ہیں'' بلھے شاہ نے عرض کی۔

''پتھروں کو موم کرو'' شاہ عنایت نے حکم دیا۔

بلھے شاہ نے عمر بھر کے لئے قصور سے رشتہ جوڑ لیا۔ سلطان مستانہ' حافظ جمال ان کے دست شفقت سے لگائے ہوئے دو پودے جو بعد میں شجر سایہ دار بنے ان کے ہمراہ تھے۔ تیسری ہستی ان کی اپنی ہمشیرہ تھیں۔ شاگردان رشید کی تعلیم بلھے شاہ نے اس انداز میں کی کہ وہ دونوں آگہی کے آفتاب و مہتاب بن گئے۔ سلطان احمد کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ استاد کا جھوٹا پانی پیتا جس روز اس نے پہلا گھونٹ بھرا اسی روز سے سلطان سپردِ عشق و مستی ہو گیا۔ کہتے ہیں بلھے شاہ نے لعاب دہن اس کے منہ میں ٹپکایا تھا.. بہرحال سلطان پر مستی چھا گئی اور وہ عمر بھر کیلئے مستانہ مشہور ہو گیا۔ اس مستی کو حدِ اعتدال میں لانے کیلئے سید زادے نے اسے رشتہ ازدواج میں جکڑ دیا۔ آج اسی مستانے کی اولاد مزار بلھے شاہ کی سجادہ نشین ہے۔

حافظ جمال کو تعلیم و تربیت کے بعد وطن لوٹ جانے کا حکم ہوا تو موصوف کی حالت دگرگوں ہو گئی۔

''او جھلیا! یہ دوریاں' یہ فاصلے' ان کی حقیقت ہی کیا ہے'' بلھے شاہ نے حرف تسلی سے نوازا ''جو شے دل پر نقش ہو وہ اپنے سے دور کیسے ہو سکتی ہے''

''حضور! میں داغ جدائی برداشت نہیں کر پاؤں گا''۔ حافظ جمال نے جواب دیا۔

بلھے شاہ کے جی میں جانے کیا آئی کہ اپنے عاشق زار کو ایسے کلمات تعلیم کر دیئے جو پارس صفت تھے یعنی نسخہ کیمیاء۔

''میں دنیاوی دولت لیکر کیا کروں گا'' حافظ جمال نے دست بستہ عرض کی۔

''اس کی تمہیں اشد ضرورت محسوس ہو گی'' مرشد نے مسکرا کر کہا ''دوسرے بطور تحفہ دی ہوئی شے پر تنقید نہیں کی جاتی خواہ وہ دولت اندوہ ہی کیوں نہ ہو۔''

حافظ صاحب نے عمر بھر کیلئے یہ بات پلے باندھ لی اور اندوہ وفا کا خزانہ لے کر اپنے

Marfat.com

گھر لوٹ گئے۔

بلھے شاہ نے شہر سے باہر ایک جوہڑ کے کنارے بسیرا کیا اور یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے ۔خوشبو پھیلی تو رسوائی کے مانند زمانے کو خبر ہو گئی۔فیض رسانی کا سلسلہ جاری ہوا۔محافل سماع کا آغاز بھی ہوا۔خلق خدا پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑی۔آنے والوں کی مہمان نوازی بھی ہوتی ،لنگر کا انتظام مستانے کی ذمہ داری تھی۔ہر جگہ ہر طرح کے لوگ بستے تھے۔خیر و شر کا ٹکراؤ کب اور کہاں نہیں ہوا۔اسی رطب و یابس کے امتزاج کا نام زندگی ہے۔زندگی کے ہنگاموں کے لئے دونوں کا وجود ایک جیسی اہمیت رکھتا ہے۔لوگوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں......درویشی کی آڑ میں ''کچھ اور'' ہی ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔حیران کن بات یہ ہے کہ اس ''کچھ اور'' کی آج تک وضاحت نہیں ہو سکی۔لوگوں کو انگشت نمائی کا ایک موقع ملتے ملتے رہ گیا۔بلھے شاہ نے اپنی فراست سے دنیا کی زبانیں بند کر دیں۔

قصور پر پٹھان حکمران تھے۔درویش کی شہرت حکام بالا کے محلوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔نواب رانجھے کی بیگم اور ہمشیرہ دونوں بلھے شاہ کی عقیدت مند تھیں۔اس زمانے میں درویش مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔عشق و عقیدت میں حد فاصل قائم کرنا نادانی ہے مگر صنفِ نازک کا معاملہ ہو تو بہت بڑی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ایک روز دونوں خواتین فقیر کی زیارت کو حاضر ہوئیں۔انداز شاہانہ تھا' خدام کا لاؤ لشکر' سجی سجائی پالکی زر و جواہر اور قیمتی تحائف درویش کی نذر کے لئے ان کے ساتھ تھے۔بلھے شاہ کو دیکھتے ہی ہمشیرہ نواب کے دل کی حالت غیر ہو گئی۔نواب کی زوجہ نسوانی فراست سے معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔اس نے چشم تصور سے آنے والے طوفان کو دیکھا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔

''عزیزہ! تم پالکی میں واپس جاؤ'' نواب کی زوجہ نے اپنی نند سے کہا'' درویش کو نذر میں پیش کروں گی۔''

''یہ ناممکن ہے'' پہلی نگاہ میں گرفتارِ عشق ہونے والی خاتون نے دوٹوک الفاظ میں کہا'' میں عمر بھر کے لئے پچھتاوے نہیں خرید سکتی' میں جانتی ہوں' مجھے یہ موقع شاید دوبارہ میسر نہ آ سکے۔

''پگلی' تم اس وقت ایک درویش کے دربار میں کھڑی ہو'' بیگم صاحبہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

Marfat.com

''اس وقت میرے روبرو صرف ایک دلکش جوانمرد ہے'' نواب کی ہمشیرہ نے جواب دیا۔''ایسا رعنا مرد جس کی خاطر طوقِ رسوائی گلے میں سجایا جاسکتا ہے۔ عمر بھر کے لئے چوٹ کھائی جا سکتی ہے۔''

بلھے شاہ کی چشمِ بینا سے خاتون کی کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی اور انہوں نے اپنا رخ روشن دوسری طرف کرلیا۔ صورتِ حال بڑی عجیب سی ہوگئی۔ نواب کی ہمشیرہ تڑپ کر سامنے آگئی اور ملتجی لہجے میں لب کشائی ہوئی ''درویش! اس بے رخی کا سبب؟''

''خاتون محترم! محرم اور مجرم میں صرف ایک نقطے کا فرق ہوتا ہے'' سیدزادے نے جھکی نگاہوں سے جواب دیا ''یہ نقطہ نوری ہو تو سینہ روشن ہو جاتا ہے' اس کے برعکس دل پر سیاہ داغ لگ جاتا ہے۔ میرے مسلک میں داغ لاعلاج ہے'' پھر بلھے شاہ نے اپنی نگہء التفات سے اپنی ''پجارن'' کو دیکھا' گویا سیلاب کا رخ بدل ڈالا۔

''اگر مجھ سے کوئی رشتہ استوار کرنا ہے تو میرے پاس اس کا بھی ایک علاج ہے۔''

''مجھے آپ کا عطا کیا ہوا ہر رشتہ منظور ہے۔'' نواب کی ہمشیرہ نے لرزیدہ لہجے میں کہا اور سرنگوں کھڑی ہوگئی۔

''ماں بیٹے والا رشتہ کیسا رہے گا'' سیدزادے نے گویا بم کا دھماکہ کیا۔ خاتون نے تڑپ کر دیکھا اور رفتہ رفتہ اس کی حالت اعتدال پر آنے لگی۔ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ ساعتِ سعید نور بن کے در پر دستک دے رہی تھی اس نے ایک پل میں عمر بھر کا فیصلہ کرلیا۔

''مجھے یہ رشتہ منظور ہے'' خاتون نے آگے بڑھ کر سیدزادے کے سر پر ممتا بھرا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہاتھ جس میں لرزش تھی مگر یہ لرزش' ہوس کا نتیجہ نہیں تھی' پاکیزہ جذبات کا اظہار تھی۔

نواب رانجھے خاں کی بیگم نے نذر پیش کی تو درویش نے نرم و ملائم لہجے میں کہا'' بیٹے ماؤں سے لیا نہیں کرتے ان کو دیا کرتے ہیں اگرچہ یہ ''دین'' ماؤں کے طفیل ہی ہوتی ہے۔''

''حضور! یہ میری طرف سے ہے آپ کی منہ بولی ماں کی طرف سے نہیں'' بیگم نواب نے اصرار کیا مگر بلھے شاہ نے بڑے احترام سے معذرت کرلی۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ منہ بولی ماں اس عظیم انسان پر اپنے فیصلے مسلط کرنے لگی۔ بلھے شاہ نے بھی ایفائے عہد میں کسر نہ اٹھا رکھی۔

''بیٹا! میرے قریب آبسو یعنی میرے محل میں'' منہ بولی ماں نے اپنی خواہش کا اظہار

Marfat.com

کیا۔ درویش تردد کا شکار ہو گیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ محل کے قریب دو مکان تعمیر کرائے جائیں جو فقیر کے تصرف میں ہوں اور ماں جب چاہے بلا روک ٹوک بیٹے سے ملنے آ جا سکے۔ عالی شان مکانات تعمیر ہوئے تو بلھے شاہ ایک حجرے میں مقیم ہو گیا۔ عمارت کا بقیہ حصہ سلطان مستانے کے استعمال میں آ گیا۔ موجودہ مزار والی زمین بھی نواب موصوف نے فراہم کی تھی جو رشتے میں اب درویش کا ماموں لگتا تھا۔

بلھے شاہ محفلِ سماع کے شوقین تھے۔ عارفانہ کلام پیش کرنے والے قوال درِ دولت پر حاضری دینا باعث افتخار سمجھا کرتے تھے۔ نقش بندی اور قادری سلسلے میں قوالی وغیرہ ناپسندیدہ شمار کی جاتی ہے۔ مگر چشتیہ اور شطاری سلسلے میں محفلِ سماع کا بصد احترام انعقاد ہوتا ہے۔ واضح ہو باوضو ہونا اس محفل کی شرطِ اولیں قرار دی گئی ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا تعلق چشتیہ سلسلے سے تھا' ان کے روحانی فرزند طوطیء ہند امیر خسرو موسیقی کے نائیک تھے۔ شطاری سلسلے کے محمد غوث گوالیاری شہنشاہ موسیقی تان سین کی گائیکی سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اس مغنی کو وصال کے بعد بھی غوث گوالیاری کا قرب نصیب رہا۔ مزار غوث کے احاطے میں تان سین مدفون ہے۔ بلھے شاہ کے مرشد عنایت اگرچہ قادری سلسلے سے تعلق رکھتے تھے لیکن شطاری بھی تھے لہذا محفل سماع کو پسند کرتے تھے اور بلھے شاہ ان کی اتباع میں عارفانہ کلام سماعت فرمانے کے دلدادہ تھے۔ قصوریوں نے آخر کار اسی بات کا بتنگڑ بنالیا نوبت بہ ایں جا رسید کہ لوگوں نے سید زادے کے استاد اول حافظ غلام مرتضی سے ''ممانعت سماع کا'' فتویٰ حاصل کر لیا۔ موصوف اس زمانے میں جامع مسجد قصور کے خطیب تھے۔ بلھے شاہ نے فتوے کی پروا نہ کی تو طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اوباش نوجوانوں کو ہلا شیری دی گئی' وہ لاٹھیاں لے کر آستانے پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت محفل سماع جوبن پر تھی۔ بلھے شاہ پر کیفیت وجد طاری تھی۔ وہ شور و غل سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہ جلتی پر تیل چھڑکنے والی بات تھی۔ ایک فسادی نے چلے پر تیر چڑھا کر سید زادے کو ہدف بنایا۔ تیر دستار مبارک کو چھیدتا ہوا گزر گیا۔ اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ محفل پر اچانک سناٹا چھا گیا۔ بلھے شاہ نے نیم وا آنکھوں سے شرپسندوں کی طرف دیکھا اور حالت کیف میں فی البدیہ کہا۔

کھرکاں چک جلاہے آئے
ہُن کیہ کراں نی میریے مائے

(کھرکاں بہ معنی دانت کا خلال ہندی لفظ کھرکا' بے وزن۔ پنجابی میں ''کانا'' جس سے قلم بنایا

Marfat.com

جاتا ہے۔یوپی میں اسے سیٹھا کہا جاتا ہے۔)

اہل محفل یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ حملہ آوروں کی مضبوط لاٹھیاں کھرکوں میں تبدیل ہوگئیں اور وہ حیران وششدر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگے۔بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی تھی' بلھے شاہ نے حملہ آور جنگجو پٹھانوں کو''جولا ہے'' کہا تھا۔کتنا عجیب اتفاق ہے کہ اس فساد کے چند دنوں بعد قصوری پٹھانوں کی جاگیریں ضبط ہوگئیں اور وہ ''کھڈیاں'' لگا کر بافندے بن گئے۔آج بھی ان کی نسل قصور میں کپڑا بنتی ہے اور وہ لوگ ''جولا ہے'' کہلاتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ حافظ غلام مرتضی کو اس غنڈہ گردی کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے شاگرد سے باقاعدہ معافی طلب کی۔

عشق کا ہر پل ہنگامہ خیز ہوتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عہد وصال سے ہجر کے لمحات زیادہ ہنگامہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔ندی جب تک سمندر تک نہیں پہنچ جاتی اسے قرار نصیب نہیں ہوتا۔ہجر اور ہنگامہ ہائے بے قراری لازم وملزوم قرار دیے گئے ہے۔وصال حسرتیں نکل جانے کا نام ہے۔

اچھا ہوا جو تم نہیں آمادۂ وصال
پھر کیا رہے گا دل میں جو حسرت نکل گئی

یہ عشاق کا عجیب وغریب طرزِ استدلال ہے۔عہد ہجر میں عشاق نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔یہ ایک اور سچائی ہے۔بلھے شاہ کو بھی زیروزبر کردینے والا حادثہ پیش آیا۔اسی عہد ہجراں میں موصوف نے وہ شاعری تخلیق کی جو وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتی ہی چلی گئی اور شاعر عظیم ترین قرار دیا گیا۔بلھے شاہ سے اس کا محبوب مرشد روٹھ گیا' ولایت سلب ہوگئی۔سینہ خلاؤں کے سپرد ہوگیا۔یہ غم کا وہ پہاڑ تھا جس نے بلھے شاہ کو پیس کر رکھ دیا۔بنیاد ہل گئی' وہ تو جانو جیتے جی راکھ ہوگیا۔فصیلِ جاں کی خاکستر میں سے اصل شاعر نے جنم لیا جیسے ققنس اپنی ہی راکھ سے دوبارہ جنم لیتا ہے۔

محبوب کے روٹھ جانے کی پہلی وجہ وہ باغیانہ شاعری ہے جو معروض حالات سے ٹکراتی تھی۔بلھے کے انداز سے بنائے کفر پڑتی تھی۔بے خبر لوگوں نے اسے کفر کا خطاب دیا۔عوام الناس کی اکثریت چونکہ بے وقوف ہوتی ہے لہذا وقوف کی باتیں ان کے پلے نہیں پڑا کرتیں۔حکیم الامت علامہ اقبالؒ کو بھی ان حالات کا سامنا کرنا پڑا مثلاً علامہ رحمہ اللہ نے فرمایا۔

مرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت

Marfat.com

ہزار شکر کہ مُلا ہے صاحب تصدیق
اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافروزندیق

یہ اشعار بے بصیرت لوگوں کو ہضم نہ ہوئے۔ کیونکہ مروجہ قانون یہی ہے کہ زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کی جائے لیکن اگر زبان اور دل میں سر موفرق نہ ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ تصدیق کی ضرورت ہی کیا ہے؟ علامہ موصوف کا بھی یہی مدعا تھا کہ تصدیق وہ کرتا پھرے جس کی زبان اور دل میں اختلاف ہو اور ایسا دکانِ مُلا پر ہوتا ہوگا...... موصوف کے ہاں عشق سے مراد فیصل جاں میں مقید ساری صلاحیتوں 'بصارت و بصیرت' یکجا کر کے ایک ہدف پر نگاہ رکھنا ہے۔ (اور یہ ہدف ظاہر ہے اللہ اور اس کا رسول مقبولؐ ہیں) اس نگاہ کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ صرف ہدف کا اقرار ہو باقی ساری دنیا (ماسوا) کا کفر ہو جائے۔ یہ ہے وہ کفر جو عین مسلمانی ہے۔ یعنی ماسوا کا انکار جو نگہ عشق کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

یہ نکتہ جن لوگوں کی سمجھ میں آ گیا انہوں نے علامہ موصوف کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ بات جن کے سروں کے اوپر سے گزر گئی انہوں نے کفر کے فتاویٰ صادر کیے۔ بلھے شاہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ شاہ عنایت حقیقت حال سے بخوبی واقف تھے مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر بلھے شاہ نے رویہ نہ بدلا تو نا قابل معافی و تلافی نقصان ہو جانے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا وہ اپنے لاڈلے کو حدِ اعتدال میں رہ کر' عوام کے فہم و ادراک کے مطابق باتیں کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔

بلھے شاہ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ محبوب ناراض ہوا تو ہجر کی جو تصویر موصوف نے پیش کی وہ حاصل کلام ہے۔ اگر یہ حادثہ رونما نہ ہوتا تو یقیناً پنجابی شاعری کا دامن ان جواہر پاروں سے خالی رہتا۔ کلام بلھے شاہ میں ''کافی'' سر فہرست ہے۔

کافی پنجابی شاعری کی وہ صنف ہے جس میں شاعر محبوب سے جدائی کا احوال رقم کرتا ہے' اندوہ وفا' ہجر کی تڑپ' حسرت وصال اور لذت دیدار کی لفظی تصویر کھینچتا ہے۔ ''کافی'' عربی کے لفظ ''کافہ'' سے نکلا ہے جس کا مفہوم ''مکمل طور پر'' یا گروہ ہے۔ ہجر و وصال کی مکمل کیفیت کا اظہار یا ہجوم کو اپنے دکھ سکھ بیان کرنا' اس صنفِ سخن کا مفہوم ادا کر دیتا ہے۔ رسم و رواج کے مطابق' کافی گانے میں گروہ کی شمولیت بھی ایک ضروری جزو بن کے رہ گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ''کافی'' تنہائی میں گائی نہیں جا سکتی لیکن عام رواج یہی ہے کہ اسے گروہ کے سامنے یا مل کر گایا جائے۔

Marfat.com

غزل کی طرح کافی بھی صوفی شعرا میں خوب خوب مقبول ہوئی۔ اس کا پہلا یا دوسرا مصرع' یا دونوں مل کر استھائی کا کام دیتے ہیں۔ یہ عموماً نغمہ' نعت اور قوالی کے انداز و لہجے میں گائی جاتی ہے۔ گانے والے بند کے آخر میں استھائی کی تکرار اس انداز میں کرتے ہیں کہ ایک خاص ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ سامعین پر اس کا اثر ہو کر رہتا ہے۔

بلھے شاہ کو جب محبوب نے قبول کر کے سینے سے لگایا تھا تو عالم بے خودی میں شاعر نے کہا تھا۔

ہن میں لکھیا سوہنا یار
جس دے حسن دا گرم بزار
جدوں احد اک اکلاسی نہ ظاہر کوئی تجلاسی
نہ رب رسول نہ اللہ سی جبار تے نہ قہار
بے چون و بے چگونہ سی بے شبہ تے بے نمونہ سی
نہ کوئی رنگ نمونہ سی ہُن ہو گیا گوناگون ہزار
پھر "کن" کہا فیکون کمایا بے چونی توں چون بنایا
"آحد" دے وچ میم رلایا تاہیون کیتا ایڈ پسار
ہن میں لکھیا سوہنا یار
جس دے حسن دا گرم بزار
پیر پیغمبر اس دے بردے اِنس ملائک سجدے کردے
سر قدماں دے اُتے دھردے سب توں وڈی اوہ سرکار
تجوں میت تجوں بُت خانہ برتی رہاں نہ روزہ جاناں
بُھلا وضو نماز دوگانہ تیں پر جان کراں نثار
جو کوئی اُس نوں لکھیا چاہے بے وسیل نہ لکھیا جائے
شاہ عنایت بھیت بتائے تاہیں کھلے سب اسرار
ہن میں لکھیا سوہنا یار

کافی کا یہ انداز ان کافیوں سے بالکل مختلف ہے جو بلھے شاہ نے بعد میں کہیں اور مرشد کی جبینِ ناز پر بل پڑ گئے۔ وہ کافیاں تو ننگی تلوار کے مانند تھیں۔ عوام الناس ان کا مفہوم کر ہی نہیں سکتے

Marfat.com

تھے۔ پیشِ خدمت ہے موصوف کی مشہور و مقبول ترین کافی' اس کافی کو ہر شاعر نے پسندیدہ قرار دیا ہے۔

علموں بس کریں او یار
اکو الف ترے درکار
علم نہ آوے وچ شمار جاندی عمر نہیں اعتبار
پڑھ پڑھ لِکھ لِکھ لاویں ڈھیر ڈھیر کتاباں چار چوفیر
گردے چانن وچ انھیر پچھو راہ تے خبر نہ سار
علموں بس کریں او یار
اکو الف ترے درکار
پڑھ پڑھ نفل نماز گزاریں اچیاں بانگھاں چانگھاں ماریں
منبر تے چڑھ وعظ پکاریں کیتا تینوں علم خوار
علموں پئے قضیے ہور اکھاں والے انھے کور
پھڑ دے سادھ تے چھڈن چور دوہیں جہانیں ہون خوار
علموں بس کریں او یار
پڑھ پڑھ شیخ مشیخ کہاویں الٹے مسلے گھروں بناویں
بے علماں نو لٹ لٹ کھاویں جھوٹے سچے کریں اقرار
پڑھ پڑھ ملاں ہوئے قاضی اللہ علماں باجھوں راضی
ہوئے حرص دنوں دن تازی تینوں کیتا حرص خوار
پڑھ پڑھ مسلے پیا سناویں لھانا شک شبے دا کھاویں
دسیں ہور تے ہور کماویں اندر کھوٹ باہر سچیار
جد میں سبق عشق دا پڑھیا دریا ویکھ وحدت دا وڑیا
گھمن گھیراں دے وچ اڑیا شاہ عنایت لایا پار
علموں بس کریں او یار

اس کافی کا آغاز ''علم سے ہاتھ کھینچ'' سے ہوا' بظاہر یہ اس حدیث شریف کے برعکس ہے جس میں علم کا حصول ہر فرد پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جو راہ راست

Marfat.com

سے بیگانہ کر دے۔ فقہی علم جب کج خلقت لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو بنائے فساد پڑ جاتی ہے۔ ایسے علم کو شاعر نامسعود تصور کرتا ہے۔ عوام کی بے علمی کا ناجائز فائدہ اٹھانا اسے کسی طور گوارا نہیں۔ اس کی ایک متصوفانہ تشریح بھی کی جاسکتی ہے جس کا لب لباب کچھ اس طرح ہے۔ بندے کا علم اس کی قوت ادراک اور تصور تینوں محدود وسائل ہیں اور ان سے لامحدود ذات کا احاطہ امر محال ہے۔ علم جس کا مفہوم جاننا ہے اس ذات کے متعلق جان کاری نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی یہ جان لے کہ خدا کے متعلق وہ کچھ نہیں جان سکتا تو یہ جہالت کا اعتراف بھی سچا علم ہے۔ بلھے شاہ نے گویا کوزے میں دریا بند کرتے ہوئے کہا کہ علم سے ہاتھ کھینچ لو۔ علم کے زور سے ذاتِ باری تعالیٰ سے رشتہ جوڑو گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ باقی ساری کافی میں وہی کچھ دُہرایا گیا ہے جو آپ ہمیں درپیش ہے۔ وہی منافقت وہی پارسائی کی آڑ میں معصوم دل انسانوں کا استحصال۔ اس میں بلھے شاہی طرزِ ادا اپنے جوبن پر ہے۔ چند الفاظ البتہ قدرے تشریح طلب ہو سکتے ہیں مثلاً گھمن گھیر بھنور' گرداب۔ انھیر بہ معنی اندھیر' مشیخ یعنی مشائخ۔ ''اکو الف تیرے درکار'' یعنی ا بہ معنی اللہ تصوف میں ب سے مراد ''ماسوا'' یعنی بندے کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ یہ قرآنی آیت کا سیدھا سادہ ترجمہ ہے۔

چند معرکتہ الآرا کافیاں مع مفہوم پیش کی جاتی ہیں۔

بُلھیا ! کیہ جاناں میں کون
نہ میں مومن وچ مسیتاں نہ میں وچ کفر دی ریت آں
نہ میں پاکاں وچ پلیت آں نہ میں موسیٰ نہ فرعون
بُلھا کیہ جاناں میں کون
نہ میں وچ پلیتی پاکی نہ وچ شادی نہ غم ناکی
نہ میں آبی نہ میں خاکی نہ میں آتش نہ میں پون
بُلھا کیہ جاناں میں کون
نہ میں بھیت مذہب دا پایا نہ میں آدم حوا جایا
نہ کجھ اپنا نام دھرایا نہ وچ بیٹھن نہ وچ بھون
بُلھا کیہ جاناں میں کون
اوّل آخر آپ نوں جاناں نہ کوئی دوجا ہور پچھاناں

Marfat.com

میتھوں ودھ نہ کوئی سیاناں بلھا او کھڑا ہے کون

یہ ''کافی'' سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔الفاظ آسان مگر مفہوم گہرا۔ بھیت بہ معنی بھید۔ پون بہ معنی ہوا بھون بہ معنی گھومنا۔ میتھوں یعنی مجھ سے۔

میں کون ہوں؟ یہ سوال کوئی نیا نہیں' ہر دانش ور نے اس کے متعلق غور کیا ہے۔ نفسِ انساں ذاتِ خداوندی کا پرتو ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بلھے شاہ کی اصلیت کیا ہے۔ پہلے بند کا مفہوم ہے کہ میرا تعلق کسی خاص انسانی گروہ سے نہیں نہ نمازی مومنوں میں نہ ملحد رندوں میں۔ فرعونی' موسوی کسی طریقہء کار کا پابند نہیں ہوں۔ جب اصل ایک ہے تو پھر مذاہب میں اختلاف کیوں ہے؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں اس نسل انسانی ہی سے نہیں جو اختلافات کا شکار ہو چکی ہے میرا تعلق سیار و ثوابت سے بھی نہیں (بیٹھن بھون سے مراد گھومنے پھرنے والے اور ایک جگہ ساکت سیارے) اگر میرا تعلق نسل انسانی یا اربعہ عناصر سے نہیں تو پھر میری ذات ابدی ہو سکتی ہے۔(اول آخر آپ نوں جاناں) اور میں محیطِ کل بھی ہوں (دوجا ہور کوئی نہ جاناں) یہ وہ مقامات ہیں جہاں سے سالک گزرتا ہے۔ آخری مصرے میں گویا بلھے پر ایک ڈرامائی انکشاف ہوتا ہے جیسے کوئی پردہ اٹھ جاتا ہے اور بلھا اپنے وجود سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ حقیقت' مجسم اسے دکھائی دے جاتی ہے جو اس کی ذات سے الگ نہیں ہوتی اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ بلھے شاہ! وہ سامنے کون کھڑا ہے؟

اس کافی کی دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ یہ دیوان شمس تبریز (جو اصل میں مولانا جمال الدین رومی کی تصنیف ہے) کی ایک غزل کے بالکل قریب ہے ملاحظہ فرمائیں۔ رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود رانمی دانم
نہ ترسا' نے یہودم من' نہ گبرم نے مسلمانم

(اے مسلمانو! کیا کیا جائے کہ میں اپنے آپ کو پہچان نہیں پاتا۔ نہ میں عیسائی ہوں نہ یہودی نہ آتش پرست نہ مسلماں)

بلھے شاہ کا پہلا بند اور کافی کی ابتدائی بالکل اسی مفہوم کی ہے۔ رومیؒ فرماتے ہیں۔

نہ از خاکم نہ از آبم نہ از بادم نہ از آتش

(نہ میں خاک سے ہوں نہ پانی ہوا سے اور نہ آگ سے)

Marfat.com

بلھے شاہ نے کہا ''نہ میں آبی ہوں نہ میں خاکی نہ میں آتش نہ میں پون......'' گویا دونوں حضرات کی سوچ ایک تھی۔ اس لیے کہ حقیقت کا رخِ روشن صرف ایک ہوتا ہے جھوٹ کے چہرے البتہ کئی ہزار ہو سکتے ہیں۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ بلھے شاہ اپنی ذات کے متعلق انکاری جملے ادا کرتا ہے یعنی میں یہ نہیں اور وہ نہیں لیکن اس راز سے پردہ نہیں اٹھاتا کہ وہ اصل میں کیا ہے۔ قرآنی الفاظ میں ''اس کی مثل کوئی شے نہیں'' تو بلھا اگر خدا کا پرتو ہے تو اس کی بھی کوئی مثال نہیں ہونی چاہیے۔ اس نکتے کی بات کا اظہار سرِعام نہیں ہونا چاہیے۔

اسی مزاج کی ایک اور مشہور کافی۔

منہ آئی بات نہ رہندی اے

سچ کہواں تے بھانبڑ مچدا اے جوٹھ آکھیاں کجھ نہ بچدا اے
جی دوہاں گلاں توں جچدا اے جچ جچ کے جیبھاں کہندی اے

منہ آئی بات نہ رہندی اے

ایہہ تلکن بازی ویہڑا اے تھم تھم کے ٹرو اندھیرا اے
وڑ اندر ویکھو کیہڑا اے کیوں خلقت باہر ڈھونڈیندی اے

منہ آئی بات نہ رہندی اے

جس پایا بھیت قلندر دا راہ کھوجیا اپنے اندر دا
او واسی ہے سکھ مندر دا جتھے کوئی نہ چڑھدی لہندی اے

منہ آئی بات نہ رہندی اے

اک لازم شرط ادب دی اے ساہنوں بات معلومی سب دی اے
ہر ہروچ صورت رب دی اے کتے ظاہر کتے چھپندی اے

منہ آئی بات نہ رہند ی اے

اساں پڑھیاں علم تحقیقی اے اوتھے اکو حرف حقیقی اے
ہور جھگڑا سب ودھیکی اے ایویں رولا پاپا بہندی اے

منہ آئی بات نہ رہندی اے

سوہ بلھا اساں تھیں وکھ نہیں بن شوہ دے دوجھا لکھ نہیں
پر ویکھن والی اکھ نہیں تہیں جان جدائیاں سہندی اے

Marfat.com

منہ آئی بات نہ رہندی اے

ایک اور خوب صورت انداز ملاحظہ فرمائیں۔ اس کی استھائی ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ کافی کا عنوان ہے "میری بُکل دے وچ چور"

میری بُکل دے وچ چور نی میری بُکل دے وچ چور
سادھو! کس نوں کوک سناواں میری بُکل دے وچ چور
چوری چوری نکل گیا تے جگ وچ پے گیا شور
میری بکل دے وچ چور
جس جاتاں تِس جان لیا تے ہور ہوئے جھرمور
چک گئے سارے جھگڑے جھیڑے نکل پیا کوئی ہور
میری بکل دے وچ چور
عرش منور بانگاں مِلیاں ' سُنیاں تخت لہور
شاہ عنایت گُنڈیاں پایاں 'لُک چھپ کِھدا ڈور
میری بکل دے وچ چور

اس کافی میں استعارے کنائے میں بات کی گئی ہے۔ یہاں چور کا لفظ محبوب' مرشد' ذات باری تعالیٰ کے لئے استعمال کیا گیا۔ محبوب فصیل جاں کے اندر دل میں بستا تھا۔ وہ چوروں کی طرح دل میں چھپا بیٹھا تھا جب وہ کوچ کر گیا تو زمانے بھر میں میری رسوائی ہوگئی۔ تیسرے بند کا مفہوم بہت گہرا ہے صوفیا کے ہاں خدا کی تجلی سوائے پیغمبروں کے کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ پیغمبر اسے اولیا میں اور اولیا اسے اپنے خلفا میں تقسیم کرتے ہیں۔ فیض کا سلسلہ عرش سے چلا اور لاہور شاہ عنایت تک پہنچا جس سے ہم فیض یاب ہوئے

بلھے شاہ نے کافی کے علاوہ سی حرفیاں لکھیں' گنڈھاں' اٹھوارے' دوہڑے اور "بارہ ماہ" میں طبع آزمائی کی۔ اردو اصناف سخن میں گنڈھ بالکل نئی چیز ہے۔ پنجاب میں کسی تقریب کے انعقاد کا فیصلہ ہوتا ہے تو اہل خانہ دھاگے وغیرہ پر گرہیں لگا دیتے تھے۔ ہر روز ایک گرہ کھولتے اور حساب لگا لیتے کہ تقریب میں ابھی کتنے دن باقی ہیں۔ گرہوں کی تعداد اتنی ہوتی جتنے دنوں بعد تقریب کو انعقاد پزیر ہونا ہوتا۔ اس صنف سخن میں عاشق ایک گرہ کھولتا ہے اور یوم وصال کی امید میں اپنی دلی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ (گنڈھ بہ معنی گرہ)

Marfat.com

اٹھوارے بھی اردو شاعری میں نا مانوس صنف ہے۔اس میں ہفتے بھر کے دنوں کی مناسبت سے اظہار خیال کیا جاتا ہے۔یعنی فلاں دن میری یہ کیفیت ہوئی اور فلاں دن یہ۔

بارہ ماہ میں مہینے کی مناسبت سے حال دل سنایا جاتا ہے۔موسم کا ہر مہینا عشاق پر مختلف اثرات مرتب کرتا ہے۔

بلھے شاہ نے چالیس گرہیں لگائیں۔اس جہان رنگ و بو کو وہ مقام "کون وفساد" قرار دیتا ہے بامائیکہ جہاں کڑی (لڑکی) نے سسرال کی تیاری کرنا ہوتی ہے۔دم آخر سے مراد شادی کا دن (یوم وصال) اور آخرت بلھے شاہ کے نزدیک سسرال میں گزاری جانے والی زندگی کا نام ہے۔

ایک دو گنڈوں کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

کہو سرتی گل کاج دی میں گنڈھاں کیتیاں پاواں
ساہے تے جج آوسی ہن چالی گنڈھ گھتاواں
بابل آکھیا آن کے تیں ساہوریاں گھر جاناں
ریت اوتھوں دی اورہے مڑ پیر نہ ایتھے پاناں
گنڈھ پہلی نوں کھول کے میں بیٹھی برلا واں
اوڑک جاون جاوناں ہن میں داج رنگاواں
ویکھوں طرف بازار دی سب رستے لاگے
پلے کجھ نہ روکڑی سب مجھ سے بھاگے
کر بسم اللہ کھولیاں میں گنڈھاں چالی
جس اپنا آپ ونجالیا سو سُرجن والی
عقل فکر سب چھوڑ کے شوہ نال سدھائے
کتنوں بن گل غیر دی اسیاں یاد نہ کائے
ہُن انا اللہ آکھ کے تم کرو نگاہیں
اللہ ہی سب ہوگیا عبداللہ ناہیں

سُرتی عقل والی۔ساہے شادی کا دن۔برلاواں بڑبڑاؤں۔روکڑی مال و دولت۔کنت، مالک سائیں خاوند۔شوہ بہ معنی خاوند، مالک محبوب۔

Marfat.com

۱۔عقل مند سہیلی کام کی بات کر۔شادی والے دن بارات آئے گی۔لہذا چالیس گرہیں لگاؤں۔

۲۔بابل نے کہا تم نے سسرال گھر جانا ہے وہاں کا رواج ہے کہ واپسی نہ ہوگی۔

۳۔پہلی گرہ کو کھول اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہوں کہ اب مجھے جہیز تیار کرنا چاہیے۔

۴۔میں بازار کی سمت دیکھ رہی ہوں۔سب اپنے کاموں میں مصروف ہیں میرے پلے کچھ نہیں لہذا سب مجھ سے کنارہ کش ہوئے۔

۵۔میں نے خدا کا نام لے کر چالیس گرہیں کھول دیں۔جس نے تن من سے محنت کر کے اپنا آپ گنوالیا وہی مالک کی پسندیدہ ہوئی۔

۶۔عقل ودانش کی باتیں چھوڑ کر خاوند کے ساتھ رخصت ہو جانا چاہیے۔اپنے مالک کے بغیر ہمیں کسی دوسرے کی کوئی بات یاد نہیں۔

۷۔حرف انا اللہ کہہ کر ہمیں رخصت کرو۔عبداللہ (بلھے شاہ کا نام) کا وجود ختم ہوا اور اللہ باقی رہ گیا۔یعنی عبد کا اللہ سے وصال ہو گیا۔

اُٹھوارے کا انداز ملاحظہ فرمائیں۔

چھنچھر وار اتاولے ویکھ سجن دی سو
اساں مڑ گھر پھیر نہ آونا جوہونی ہوگ سو ہو
واہ واہ چھنچھر وار وہیلے دکھ سجن دے میں ول پیلے
ڈھونڈاں اوجھڑ جنگل بیلے اوہڑا رین کوڑے ویلے
برہوں گھیریاں
کھڑی تاہنگھ تساڈیاں تانگھاں 'راتیں سترے شیر الاہنگھاں
اُچی چڑھ کے کوکاں چانگھاں 'سینے اندر رڑکن سانگاں
پیارے تیریاں

چھنچھر وار' ہفتہ۔اُتاولے' بے صبر۔سوُ خبر۔وہیلے' زہریلا۔پیلے' بھیجے۔اوجھڑ' ویران۔تاہنگھ 'حسرت۔الاہنگھا' پھاندنا۔چانگھا' چیخوں چلاؤں۔

۱۔بے صبر' بروز ہفتہ ساجن کی خبر لے۔جوہونی ہوگی وہ ہو کر رہے گی لیکن ہم لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

۲۔انتظار کا پہلا دن ہفتہ بھی کس قدر زہریلا ہے ساجن کے سارے دکھ حملہ آور ہو رہے

Marfat.com

ہیں۔جنگلوں ویرانوں میں تلاش کر رہی ہوں رات بھاری (کاٹے نہیں کٹتی) اور دن مشکل تر۔غم ہجراں نے گھیر لیا۔

۳۔حسرتوں کا ہجوم بے کراں ہے۔رات یوں گزرتی ہے جیسے ایک ایک پل سوئے ہوئے درندوں کے اوپر سے پھلانگنا پڑتا ہے۔دیواروں چھتوں بلند مقامات پر چڑھ کر فریاد کرتی ہوں اور سینے میں برچھیاں تیر اُتر رہے ہیں لیکن اے محبوب میں دل و جان سے صرف اور صرف تیری ہوں۔

چند مشہور معروف دوہڑے پیش خدمت ہیں۔

جیسی صورت عین دی ویسی غین دی
اک نقطے دا فرق ہے بھلی پھرے کونین دی

زبان و بیان سادہ ہے لیکن مفہوم بہت گہرا ع سے مراد عین ذات خداوندی اور غ سے مراد غیر ذات۔صوفیا کائنات کو خدا کا مظہر گردانتے ہیں لہذا دونوں میں معمولی سا فرق بیان کیا گیا ہے۔

اسی قبیل کا ایک اور دوہڑا۔

اس کا مکھ اک جوت ہے گھونگھٹ ہے سنسار
گھونگھٹ میں وہ چُھپ گیا' مکھ پر آنچل ڈار
چل بُھلیا! چل اوتھے چلئے جتھے سارے انھے
نہ کوئی ساڈی ذات پچھانے نہ کوئی ساہنوں منّے

انھے بہ معنی اندھے۔باقی دوہڑے میں کوئی الجھن نہیں۔

بھٹھ نمازاں چکڑ روزے کلمے پھری سیاہی
بلھے شاہ شوہ اند ملیا بھلی پھرے لوکائی

اس دوہڑے نے علماء کو ناراض کر دیا۔بلھے کا مفہوم تھا کہ ظاہری عبادت سے نہیں محبوبِ حقیقی مجھے اندر کے عرفان سے ملا۔لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر صرف ظاہری عبادت پر زور دیتے ہیں۔اس انداز کا ایک اور دوہڑا جو درویشوں میں بہت مقبول ہوا۔بے خبر لوگوں نے اس کی آڑ میں نئے نئے گل کھلائے۔

بلھا پی شراب تے کھا کباب ' پر بال ہڈاں دی اگ
چوری کرتے بھن گھر رب دا' اس ٹھگاں دے ٹھگ نو ٹھگ

Marfat.com

شراب سے مراد شراب وحدت اور کباب خودی کے۔اس کے باوجود اس دوہڑے کی زبان نے تہلکہ مچا دیا اور لوگ بلھے پر فتوے لگانے لگے۔

دھرم سال دھڑوائی وسدے ٹھاکر دوارے ٹھگ
وچ مسیت کوسیتے رہندے عاشق رہن الگ

دھڑوائی' ڈاکو لٹیرے۔کوسیتے' جھوٹے لوگ۔

عبادت گاہوں پر ڈاکوؤں لیٹرے اور جھوٹ بولنے والوں کا قبضہ ہے۔ان کے قول وفعل میں تضاد پایا جاتا ہے اس لیے خدا کے سچے عاشق ان سے الگ رہتے ہیں۔

وصل ہوئیاں میں نال سجن دے شرم حیانوں گھرا کے
وچ چمن میں پلنگ وچھایا یار ستی گل لا کے

وہ دوہڑا جو زبان زد خاص و عام ہوا لیکن اکثر لوگ اسے غلط پڑھتے ہیں۔

عاشق ہویوں رب داتے ہوئی ملامت لاکھ
تینوں ''کافر' کافر!'' آکھدے توں آہو آہو آکھ

تُو خدا کا عاشق ہوا اس لیے ہدف ملامت ٹھہرا۔تجھے کافر' کافر کہتے ہیں تو کہہ ''ہاں ہاں'' میں کافر ہوں۔اگر ایک کافر کے بعد ٹھہر کر پڑھا جائے تو دوہڑے کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے یعنی وہ لوگ جو خود کافر ہیں تجھے کافر کہتے ہیں۔تو فوراً اعتراف کرلے اور سچا مسلمان بن جا۔

وارے جایئے اونہاں توں جیڑے مارن گپ شڑپ
کوڈی لبھی دے دیون تے بنچہ گھاؤ گھپ

صدقے جاؤں ان لوگوں کے جو گپ بازی میں اپنا بھرم قائم رکھے ہوئے ہیں ۔معمولی شے مل جائے تو مالک کو لوٹا کر اپنی پارسائی کا سکہ بٹھا دیتے ہیں اور اگر مال بھری گٹھری مل جائے تو اسے غائب کر دیتے ہیں۔یہ دوہڑا ضرب المثل بن چکا ہے۔اب وہ انداز بھی سچائی کا آئینہ دار ہے۔

مُلاں نے مشالچی دوہاں اکو چت
لوکاں کردے چانناں' آپ انھیرے نت

مُلا اور مشعلچی دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں لوگوں کو روشنی عطا کر کے خود اندھیرے میں رہتے ہیں۔(مشعل بردار خود اندھیرے میں ہوتا ہے)

Marfat.com

کنک کوڈی کامنی تینوں کہہ تلوار
آیا سیں جس بات کو بھول گئی وہ یار

کنک، گندم یعنی رزق۔ کوڈی، مال و دولت۔ کامنی، خوب صورت عورت۔
دنیاوی رزق، مال و دولت اور خوشگوار چہرے تینوں نے مل کر تجھے تلوار کی طرح قتل کر دیا جس کام کے لیے تو دنیا میں آیا تھا اسے یکسر بھلا بیٹھا...... یہ دوہڑا سنہرے حروف میں لکھا جانے والا ہے۔

ہور لبھے نیں گلڑیاں اک اللہ اللہ دی گل
کجھ رولا پایا عالماں، کجھ کاغذاں پایا جھل

قابل ذکر بات صرف ذات باری تعالیٰ کی ہے باقی سب باتیں ہیچ ہیں۔ اپنے علم کی دھاک بٹھانے والے علما نے کام خراب کر ڈالا اور باقی حالات کاغذوں پر لکھی تشریحات نے بگاڑ دیے۔ اس طرح زمانہ پاگل ہو گیا۔

ان کو مکھ دکھلائے ہے جن سے اس کی پیت
ان کو ہی ملتا ہے وہ جو اس کے ہیں میت
ایک اور ضرب المثل دوہڑے کے انداز میں۔
وارے جائیے اونہاں توں جیہڑے گلیں دین پر جا
سوئی سلائی دان کرن تے اہرن لین چھپا

صدقے جائیں ان کے جو باتوں سے بہلانے کا فن جانتے ہیں۔ سوئی سلائی خیرات کر دیتے ہیں لیکن سندان (جس پر لوہار لوہا کوٹتا ہے) چھپا لیتے ہیں۔ اب پیشِ خدمت ہے وہ دوہڑا جو قابلِ دست اندازی شریعت ہوا۔

گل سمجھ لئی نے رولا کیہہ
ایہہ رام رحیم نے مولا کیہہ

''سی حرفی'' وہ منظور کلام ہے جس میں شاعر حروف تہجی کی بنا پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ بلھے شاہ کی سی حرفیاں پنجابی ادب میں سرِ فہرست قرار دی جاتی ہیں۔ ان کے پڑھنے کا انداز اردو زبان سے ذرا مختلف ہوتا ہے مثلاً ایک سی حرفی ''ا'' سے شروع ہوتی ہے تو لکھا صرف ''ا'' جائے گا مگر پڑھتے وقت ہم اسے ''الف'' کہیں گے جیسے۔

Marfat.com

آندیاں توں میں صدقڑے ہاں جیویں جاندیاں توں سروارنی ہاں
مٹھی پریت انوکھڑی لگ رہی گھڑی پل نہ یار وسارنی ہاں
کہے ہڈ لکاڈرے پئے مینوں پاوندی آونسیاں کانگ اڈارنی ہاں
بلھا شوہ تے کملی میں ہوئی ستی جاگدی یار پکارنی ہاں

آنے والوں کے صدقے' جانے والوں پر سر نچھاور مجھے ایسا میٹھا پریم ہوا کہ یار کو ایک پل بھلا نہیں سکتی۔ کن مصائب سے پالا پڑا۔ لکیریں کھینچ کھینچ کر فال نکالتی ہوں کبھی کوے اڑاتی ہوں۔ بلھے شاہ میں محبوب کی ایسی دیوانی ہوئی کہ بس سوتے جاگتے اسے ہی پکارتی ہوں۔
ہڈ لکاڈرے' مصیبتیں۔ آونسیاں پانا' لکیریں کھینچ کر فال نکالنا۔

اب پیش خدمت ہے وہ ''کافی'' جس میں بلھے شاہ کا اصل روپ دکھائی دیتا ہے

اُٹھ چلے گوانڈوں یار
ربا ہن کیہہ کریئے
اُٹھ چلے ہُن رہندے نائیں ہویا ساتھ تیار
ربا ہُن کیہہ کریے
چاروں طرف چلن دے چرچے ہر سوپئی پکار
ربا ہُن کیہہ کریے
ڈھانڈ کلیجے بل بل اٹھ دی بن دیکھے دیدار
ربا ہُن کیہہ کریے
بلھا شوہ پیارے باجھوں رہے ارار نہ پار

ساری ''کافی'' میں چند الفاظ تشریح طلب ہیں۔ ڈھانڈ بہ معنی شرارہ۔ ارار' پار کی ضد یعنی اس طرف۔ پیشِ خدمت ہے وہ کافی جس میں بلھے شاہ کی سوچ عروج پر ہے۔

اک نقطے وچ گل مکدی اے
پھڑ نقطہ چھوڑ حساباں نوں
چھڈ دوزخ گور عذاباں نوں
کہ بند کفر دیا باباں نوں
کہ صاف دلے ریاں خواباں نوں

Marfat.com

گل ایسے گھروچ ڈھک دی اے
اک نقطے وچ گل مکدی اے
ایویں متھا زمی گھسائی دا
پالما محراب دکھائی دا
پڑھ کلمہ لوک ہسائی دا
دل اندر سمجھ نہ لائی دا
کدی سچ بات وی لکدی اے
اک نقطے وچ گل مکدی اے
اک جنگل بحریں جاندے نیں
اک دانہ روز دا کھاندے نیں
بے سمجھ وجود تھکاندے نیں
گھر آون ہو کے ماندے نیں
چلیاں اندر جند سکدی اے
اک نقطے وچ گل مکدی اے
کئی حاجی بن بن آئے جی
گل نیلے جامے پائے جی
حج ویچ ٹکے لے کھائے جی
پر ایہہ گل کیہنوں بھائے جی
کتے سچی گل وی رکدی اے
اک نقطے وچ گل مکدی اے

''کافی'' کا صرف لب لباب پیش کرنا کافی ہوگا۔انداز سیدھا سادہ ہے۔دل کی آرزوؤں کا پاک صاف رکھنا ہدایت کی جانب لے جاتا ہے۔اس پاکیزگی کے بغیر طویل سجدے 'فاقے چلے اور حج کی صعوبتیں بے فائدہ ہیں۔عبادت کی ظاہری صورت کے ساتھ اندر کی صفائی 'نیت کا خلوص بے حد ضروری ہے۔

ایک وقت ایسا آیا کہ بلھے شاہ کی زبان شمشیر براں بن گئی تھی۔یہ مغل شہنشاہ اورنگ

Marfat.com

زیب کا زمانہ تھا۔وحدت الوجود اس کی نگاہ میں کافرانہ مسلک تھا۔ان حالات میں شاہ عنایت نے بلھے شاہ کو طریقت کے کھلم کھلا پرچار سے منع کیا مگر سیدّ زادے پر تو عالمِ مستی چھایا ہوا تھا۔لہذا مرشد نے ایک جھٹکے کی ضرورت محسوس کی۔

حافظ غلام مرتضیٰ کی بیٹی کی شادی تھی۔مہمان نوازی کا اہتمام وانصرام بلھے شاہ کے سپرد ہوا۔حافظ صاحب کے احباب کا حلقہ بڑا وسیع تھا لہذا مہمانوں کا تانتا لگ گیا۔بلھے شاہ مہمان نوازی میں ایسے مصروف ہوئے کہ تن من کا ہوش نہ رہا۔اسی دوران شاہ عنایت کے بھتیجے اور داماد بڑے بھرم بھروسے سے بلھے شاہ سے ملاقات کرنے لاہور سے آئے۔مولوی ظہور محمد ان کے پیر بھائی بھی تھے۔بلھے شاہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے ایک خادم کو ان کی خاطر مدارات کی تلقین کی ۔سلطان مستانے کو بھی اس کام پر مامور کیا۔وقت ایسا تھا کہ خود پیر بھائی کے لیے وقت نہ نکال سکے۔مولوی ظہور محمد شب بھر محوِ انتظار رہے۔رفتہ رفتہ ان کے دل میں شکوک وشبہات جڑ پکڑنے لگے۔بلھے شاہ کی غیر حاضری کو موصوف نے تکبر تصور کیا اور الصباح بغیر کسی کو مطلع کیے بوجھل دل سے واپس لاہور چلے گئے۔بلھے شاہ کو دوسرے روز خبر ملی تو وہ دھک سے رہ گئے۔سلطان مستانے سے جواب طلبی ہوئی مگر ہونے والی بات ہو چکی تھی۔

مولوی ظہور محمد لاہور پہنچے تو انہوں نے دکھی دل کے ساتھ مرشد سے شکایت کی کہ بلھے شاہ کو تکبر وغرور کا مرض لاحق ہو چکا ہے۔جانے کون سی گھڑی تھی۔شاہ عنایت جلال میں آگئے" اس کی یہ ہمت !اب گویا چیونٹی کے بھی پر نکل آئے" شاہ عنایت نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا ''"ہم وہ شاخ ہی کاٹ دیتے ہیں جس پر تکبر کا آشیانہ بنا ہے۔"

ادھر بلھے شاہ کو اچانک محسوس ہوا جیسے زمین اپنے مدار سے ہٹ گئی ہو۔سینہ خلاؤں کے سپرد ہو گیا تو سیدّ زادہ بے موتی صدف سا ہو کر رہ گیا۔ولایت سلب ہوگئی۔اب وہ ایک عام سا انسان تھا۔شاعرانہ صلاحیت کا البتہ ولایت سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔بلھے شاہ بھاگم بھاگ لاہور پہنچے مگر مرشد سے ملاقات والا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔محبوب نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔بے نیل ومرام واپس آئے'عہد ہجراں کا آغاز ہوا۔نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔دردِ دل کو الفاظ کا جامہ اس انداز میں پہنایا۔

کیہ بے درداں دے سنگ یاری
روون اکھیاں زارو زاری

Marfat.com

ساہنوں گئے بے دردی چھڈ کے
سینے سانگ ہجردی گڈ کے
جسموں جندنوں لے گئے کڈ کے
ایہہ گل کر گئے ہنیسیاری
کیہ بے درداں دے سنگ یاری
بیدرداں دا کیہ بھروسا
خوف نہیں دل اندر ماسا
چڑیا موت گنوارا ہاسا
مگرو ہس ہس تاڑی ماری
کیہ بیدرداں دے سنگ یاری
آون کہہ گئے پھیر نہ آئے
آون دے سب قول بُھلائے
میں بُھلی بُھل نین لگائے
کیے ملے سُن ٹھگ بیوپاری

بلھے شاہ نے گویا کلیجا نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔اس کی فریاد سن کر پہاڑوں کے پتھر تک موم ہو گئے مگر درد دل دینے والے نے کوئی پروانہ کی۔سید زادے کے سینے میں آتش عشق اور بھڑک اٹھی۔اس کافی میں صرف دو الفاظ محتاج تشریح ہیں سانگ' نیزہ اور ہنیسیاری' بیوپاری۔

بلھے شاہ کو اب یار منانا تھا۔خواہ اس میں اس کی ہستی مٹ جاتی۔طوق رسوائی زیب گلو ہوتا یا سرِ بازار ناچنا پڑتا۔سید زادے کو معلوم تھا کہ محبوب کو موسیقی سے دلچسپی ہے۔لہذا اس نے عجیب وغریب فیصلہ کیا۔اپنے جذبات کو شعر و موسیقی کی سنگت سے محبوب کے حضور پیش کرنا اس کی منزل ٹھہری۔زبان سادہ تو کارگر نہ ہوئی تھی لہذا اب یہی راستہ رہ گیا تھا۔اس طرح گوالیار کا سفر درپیش ہوا۔ہند میں شطاری سلسلے کے بانی شاہ محمد غوث کے مزار پر سید زادے نے حاضری دی۔کہتے ہیں مزار کے خدام نے شب بسری کی اجازت نہ دی اور زر چراغی کا مطالبہ کیا۔درویش تو ہر لحاظ سے بے سروسامان ہو چکا تھا۔''چراغی'' کہاں سے ادا کرتا۔مجبوراً وہ رات ایک قریبی مسجد میں گزاری۔صبح چراغی کا انتظام کر کے مزار پر حاضری دی۔رات عالم خواب میں محمد غوث گوالیاری

Marfat.com

سے ملاقات ہوئی۔

''عزیزم گھبرانے کی کوئی بات نہیں'' بزرگ نے تسلی دی۔ ''تان سین کی قبر اسی مزار کے احاطے میں ہے۔ تربت پر ایک شجر سدرہ (بیری کا درخت) سایہ فگن ہے۔ اس کے پتے چبا کر نگل جاؤ لحن داؤدی کے مالک بن جاؤ گے۔''

بلھے شاہ نے الصباح پہلا کام یہی کیا اور سُروں کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ بے قرار دل کو قرار آیا تو پھر لاہور کا رخ کیا۔

لاہور میں بدنام زمانہ ہیرا منڈی کی اس طوائف کا دروازہ کھٹکھٹایا جو شاہ عنایت کے سامنے عارفانہ کلام پیش کیا کرتی تھی۔

''خاتون! یہ فقیر بے نوا آپ کے طائفے میں شامل ہونا چاہتا ہے'' بلھے شاہ نے درخواست پیش کی۔ وہ طوائف 'سیدزادے' سے بخوبی واقف تھی۔ مقام سے تو اس کی آشنائی تھی مگر حقیقتِ حال کی اسے خبر نہ تھی۔

''شاہ جی! میں تو آپ کے قدموں کی غلام ہوں'' طوائف نے اظہارِ حیرت کیا ''آپ کو ملازمت کی پیش کش کیسے کر سکتی ہوں۔''

''خاتون! میں ایک مصیبت کا شکار ہو چکا ہوں۔'' پھر سید نے آپ بیتی طوائف کے گوش گزار کی اور اس سے وعدہ لیا کہ شاہ عنایت کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہو۔ طوائف نے رازداری کا وعدہ کیا اور درویش نے رقص و موسیقی میں مہارت حاصل کرنا شروع کی۔ پہلے روز جب بلھے شاہ نے تان اُڑائی تو سامعین ورطہ حیرت میں ڈوب گئے۔ طوائف کو تو اپنی سماعت پہ اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور اسکی عبادت و ریاضت میں فرق نہ آیا۔ عبادت کے ساتھ ساتھ ''ریاض'' بھی جاری تھا۔

مجرے کا اہتمام ہوا۔ فنکاروں نے اپنا اپنا فن پیش کیا۔ شاہ عنایت سامعین میں موجود تھے۔ بلھے شاہ نے لباس تبدیل کیا۔ گھنگرو باندھے اور ناچ کر محبوب کو منانے کا آغاز کیا ......در و دیوار وجد میں آ گئے۔

وت نہ کر ساں مان رنجھے یار دا اڑیا
عشق اللہ دی ذات لوکاں دا مہنا
کہنوں کراں پکار کسے نہیں رہنا

Marfat.com

اوسے دی گل اوہو جانے
کون کسے نو ماردا اڑیا
وت نہ کرساں مان رنجھے یار دا اڑیا
جان کراں قربان بعیت نہ دس نا ایں
ڈھونڈاں تکیے دوار تینوں اٹھ نسنا ایں
ہویا وقت بھنڈار دا اڑیا
وت نہ کرساں مان رنجھے یار دا اڑیا

(میں پھر کبھی رانجھے یار کی یاری پر مغرور نہیں ہوں گی۔ عشق خدا کی ذات کا خلا۔ لوگ پھر بھی انگشت نمائی سے باز نہیں آتے۔ فریاد کس سے کروں کہ سب وسیلے ناپائیدار تیر۔ کے بھید وہی جانتا ہے ورنہ کون کسی کو برباد کرسکتا ہے۔ میں جان کا نذرانہ پیش کروں! اس۔ پردہ اٹھادے۔ میں نے تجھے ہر جگہ تلاش کیا مگر ملاقات سے محروم رہی اب دان پن کا وقت آ

اس کے بعد بلھے شاہ نے وہ کلام پیش کیا جو ان کی شاعری کا عروج گردانا جاتا

''کافی'' کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور دن بدن اس کا روپ نکھرتا ہی جارہا ہے۔

بلھے شاہ اور یہ کلام لازم وملزوم قرار دیے گئے۔

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا
تیرے عشق نے ڈیرا میرے اندر کیتا
بھر کے زہر پیالہ میں تاں آپے پیتا
جھب دے بوہڑیں وے طبیبا نہیں تے میں مرگئی
تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا
چھپ گیا وے سورج باہر رہ گئی لالی
وے میں صدقے ہوواں دیویں مڑ جے دکھالی
پیرا! میں بھل گئیاں تیرے نال نہ گئیا
تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا
ایس عشق دے کولوں مینوں ہٹک نہ مائے
لاہو جاندڑے بیڑے کیڑا موڑ لیائے

Marfat.com

میری عقل جو بھلی ناں مھانیاں دے گیا
تیرے عشق نچایا کرکے تھیا تھیا
ایس عشق دی جھنگی وچ مور بولیندا
ساہنوں قبلہ تے کعبہ سوہنا یار دسیندا
ساہنوں گھائل کرکے پھیر خبر نہ لیا
تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا
بلھا شوہ نے آندا مینوں نائت دے بوہے
جس نے مینوں پوائے چولے ساوے تے سوہے
جاں میں ماری اے اڈی مل پیا ہے وہیا
تیرے عشق نچایا کرکے تھیا تھیا

جھب دے' جلدی۔ قوال اس کی جگہ لفظ "چھیتی" استعمال کرتے ہیں جو بہ آسانی ادا ہو جاتا ہے اور مفہوم میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔

تھیا تھیا' طبلے کی تھاپ ۔ ہٹک' ہٹانا روکنا۔ لاہو' سیل رواں ۔ مہانے' مانجھی کشتی بان ۔ اڈی مارنا بمعو رقص ہونا۔ وہیا' وہی۔ نائت سے مراد شاہ عنایت۔

اس "کافی" کی تشریح کے لیے دفتر درکار ہیں۔ لہذا مشکل الفاظ کی تشریح پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بلھے شاہ تان پر تان اُڑا رہے تھے۔ ماحول پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ سامعین داد و تحسین وغیرہ سب کچھ بھول کے صرف جھوم رہے تھے۔ کہتے ہیں سید زادہ ناچتے ناچتے چکرا کر گر گیا ۔ محبوب صورتِ حال سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دیوانے پرستار کو خود سہارا دے کر اٹھایا اور اس شعر کو غلط ثابت کر دکھایا۔

بسوں تو آنکھ میں ایسے کہ وہ گرا نہ سکے
گروں تو ایسے زمیں پر کہ وہ اٹھا نہ سکے

"اوئے! توں بلھا ایں؟" شاہ عنایت نے زیر لب مسکرا کر پوچھا۔
"حضور بلھا نہیں "بُھلا" ہوا ہوں" (بھولا ہوا) بلھے شاہ نے دست بستہ عرض کیا۔
مرشد نے لپک کر سینے سے لگا لیا' سارے گلے شکوے جاتے رہے۔ بلھے شاہ کی روٹھی

Marfat.com

ہوئی بہاریں لوٹ آئیں۔ سینہ از سرِ نو منور ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بلھے شاہ نے سر بازار رقص کر کے یار کو منایا لیکن ہمارے خیال میں ایسا ہرگز نہیں تھا۔ سید زادے نے عشق کو رقص پر مجبور کر دیا اور یہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ عشق کو بلھے شاہ کی ذات پر ہمیشہ فخر رہے گا۔

بلھے شاہ کی ایک اور مشہور مگر مختصر کافی جو زبان زد خاص و عام ہوئی ہے۔

"کتے تیتھوں اُتے"

راتیں جاگیں کریں عبادت
راتیں جاگن کتے تیتھوں اُتے
بھونکن توں بند مول نہ ہوندے
جا روڑی تے سُتے تیتھوں اُتے
خصم اپنے دا در نہ چھڈ دے
بھانویں وجن جتے تیتھوں اُتے
بلھے شاہ! کوئی رخت ویہاج لے
نہیں تے بازی لے گئے کتے

اس میں چونکہ ان انسانوں کو ہدف ملامت بنایا گیا جو دکھاوے کی عبادت کرتے ہیں لہذا ہر سیدھی مت والے نے اسے پسند کیا۔

بلھے شاہ منازل عشق طے کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے کلام سے دنیا کی بے ثباتی سے خلق خدا کو آگاہ کرتا جا رہا تھا۔ انداز عام فہم اور سادہ تھا۔ اصطلاحیں وہ استعمال ہو رہی تھیں جو سب کے سامنے تھیں مثلاً چرخے اور کاتنے کے عمل سے یہ کلام مشہور ہوا۔

کر کتن ول دھیان کڑے
نت متیں دیندی ما دھیا
کیوں پھرنی ایں ایوں آ دھیا
نہ شرم حیانوں گوا دھیا
توں کدے تان سمجھ نداں کڑے
کر کتن ول دھیان کڑے
نت متاں دیاں والی نوں

Marfat.com

اس بھولی کملی جھلی نوں
جد پوسی وخت اکلی نوں
تد ہا! ہا! کرسی جان کڑے
کر کتن ول دھیان کڑے

اج گھروچ نویں کپاہ کڑے
توجھب جھب ویلنا ڈاہ کڑے
روں ویل پنجاوَن جاہ کڑے
پھر کل نہ تیرا جان کڑے
کر کتن ول دھیان کڑے

اک اوکھا ویلا آوے گا
سب ساک سین رہ جاوے گا
کر مدد پار لنگھاوے گا
او بلھے داسلطان کڑے

یہ کافی بہت مشہور ہے مگر بطورِ نمونہ صرف چار بند پیش کیے گئے ہیں۔ شاعر نے اس کلام میں جانی پہچانی علامات کا استعمال کیا ہے۔ ایک کنواری دوشیزہ کو کاتنے بیلنے کی جانب توجہ دلانے کا مفہوم نیک اعمال کی تلقین کرنا ہے۔ ایک ہمدرد ماں اپنی بے پرواہ بیٹی کو نصیحت کر رہی ہے۔ اس سے ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے کہ بلھے شاہ خلق خدا سے ایک ماں کی طرح پیار کرتے تھے۔

بلھے شاہ نے اپنے کلام میں پنجاب کی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر بھی کیا ہے۔ ۱۷۱۰ء سے ۱۷۵۰ء کے دور کی طرف واضح اشارہ اس کی بات کی دلیل ہے کہ شاعر ہر زمانے میں معروضی حالات سے بیگانہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ صوفی رندکی اس میں کوئی قید نہیں انداز بیاں ملاحظہ فرمائیں۔

کدی آمل یار پیاریا
درکھلا حشر عذاب دا
برا حال ہویا پنجاب دا
وچ ہادیئے دوزخ ساڑیا

Marfat.com

کدی آمل یار پیاریا
ترے دکھاں ساہنوں ماریا
منہ بارہویں صدی پساریا
کدی آویں وڈھ پرواریاں

''وڈ پرواریا' بڑے گھر والے۔

بارہویں صدی کے آغاز میں وہ کون ساعذاب تھا جس کا ذکر بلھے شاہ نے اپنے کلام میں کیا۔عذاب حشر کا وہ کون سا در تھا جو اچانک رفتہ رفتہ کھل گیا تھا۔اس کی تفصیل کے بغیر کلام بلھے شاہ کا ادراک بے حد دشوار تھا۔حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ ایک بار قصور کے گرد و نواح کا سارا علاقہ قحط کی زد میں آ گیا۔قحط بھی ایسا شدید کہ لوگ عشق کرنا تک بھول گئے۔ایک تو پنجاب بیرونی حملہ آوروں کی گزرگاہ تھا۔حملہ آور افواج کھڑی فصلوں کو برباد کر دیتے تھے۔دہقانوں سے بیج تک چھین لے جاتے تھے۔کسانوں نے فصلیں بونا ہی ترک کر دیں اور سارا پنجاب قحط کی لپیٹ میں آ گیا اور لوگ بے سروسامان ہو گئے۔بلھے شاہ صرف ایک فرد اور وہ بھی شاعر تھا۔حاکم وقت تو تھا نہیں۔بہر حال سیدزادے سے جو کچھ بن پڑا کر گزرا۔

ایک روز گلی کوچوں میں ڈھولچی اعلان کرتا پھر رہا تھا'' بلھے شاہ اپنے ڈیرے کا فرش اونچا کروانا چاہتے ہیں۔ہر کارکن کو دو آنے یومیہ مزدوری دی جائے گی'' بس پھر کیا تھا مزدوروں کا اک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔غروب آفتاب سے پیشتر بلھے شاہ مصلے پر بیٹھ جاتے اور کونے تلے دونیاں نکال نکال کر مزدوروں کو اجرت ادا کرتے جاتے۔ایک روز دو مزدوروں کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ شاید درویش کے پاس کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔اس رات انہوں نے خزانہ ہتھیانے کا منصوبہ بنایا۔نصف شب کے قریب مصلے گاہ کی کھدائی کا آغاز ہوا مگر گہری کھدائی کے باوجود خزانے کا نام ونشان تک نہ ملا۔دن بھر کی مشقت کے بعد رات کی کھدائی نے چوروں کو نڈھال کر دیا۔

دوسرے روز اجرت وصول کرنے کا وقت آیا تو بلھے شاہ نے ان کو دگنی مزدوری دی اور زیر لب مسکرا کر کہا'' ان حضرات نے دگنی محنت کی ہے۔بے چارے رات کو بھی کھدائی کرتے رہے ہیں لہٰذا دہری اُجرت کے حق دار ہیں۔''

دونوں مزدور حیا سے زمین میں گڑ گئے اور عمر بھر راہِ راست پر قائم رہے۔

Marfat.com

پیش خدمت ہے اس عذاب حشر کی مختصر تشریح جس کی طرف بلھے شاہ نے اشارہ کیا۔

لاہور پنجاب کا ثقافتی مرکز' دارالحکومت اور دل تھا۔ عہدِ بلھے شاہ میں لاہور کا گورنر ہی پنجاب کا گورنر ہوا کرتا تھا۔ اس شہر بے مثال کو صوبہ لاہور بھی کہا جاتا ہے۔ بلھے شاہ ابھی عالم شباب ہی میں تھے کہ مغل حکمرانوں کی گرفت پنجاب پر ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کا آغاز ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب شہنشاہ کے سفر آخرت اختیار کر جانے کے ساتھ ہی ہو گیا۔ بلھے شاہ نے عمر عزیز میں گیارہ مغل شہنشاہوں کا عروج و زوال دیکھا جو تختِ دہلی پر طلوع و غروب ہوئے۔ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر' شاہ عالم' جہاندار شاہ' فرخ سیر' رفیع الدرجات' نکوسیر' رفیع الدولہ محمد شاہ رنگیلا' محمد ابراہیم' احمد شاہ اور عالمگیر دوم جو ۱۷۵۴ء میں تخت نشین ہوا۔

مغل شہنشاہ حصول اقتدار کے لیے خون کی ندیاں بہاتے رہے۔ اقتدار کی منتقلی لہو کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر اُبھرتی رہی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ مغل خاندان کا مزاج ہی ایسا تھا۔ اس کا خمیازہ عوام الناس کو بھگتنا پڑا۔ بلھے شاہ کے زمانے میں تو پنجاب بغاوتوں کا مرکز بن گیا۔ بندہ بیراگی' ادینہ بیگ' مغلانی بیگم کیسے کیسے کرداروں نے خلق خدا کا جینا حرام کیا اور لہو رنگ داستانیں چھوڑ کر مٹی ہو گئے۔ پیشِ خدمت ہے بندہ بیراگی کی داستان خونچکاں۔

بلھے شاہ ابھی عالم کون و فساد میں تشریف نہیں لائے تھے۔ ریاست پونچھ (کشمیر) کے قصبہ راجوری میں ایک متعصب ڈوگرہ رام دیو رہائش پذیر تھا۔ ۱۶۷۰ء میں اس کے ہاں ایک ایسے بچے نے جنم لیا جس نے قتل و غارت گری اور سفاکی کو زندگی بھر اپنا شعار بنائے رکھا۔ اس کا نام لچھمن دیو رکھا گیا۔ بچپن میں جب اس کے دندان ہلاکت ابھی نمودار نہیں ہوئے تھے تو وہ ایک عام سا کھلنڈرا سا لڑکا تھا جسے پڑھنے لکھنے سے کوئی رغبت نہ تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ لچھمن دیو لڑکپن میں رحمدلی کے نام سے بھی آشنا تھا۔ گھڑ سواری تیر اندازی اور شکار اس کے تین شوق تھے۔ ایک روز اس نے ایک خوب صورت ہرنی شکار کی۔ جب وہ ہرنی کے گلے پر خنجر کی دھار آزمانے لگا تو ہرنی نے رحم طلب نگاہوں سے اسے دیکھا۔ شکاری کا دستِ ستم لرزہ ضرور مگر اپنی کاروائی سے باز نہ آیا۔ لچھمن نے ہرنی کا پیٹ چاک کیا تو رحم مادر میں دو چھوٹے چھوٹے بچے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہرنی کی رحم طلب نگاہوں کا مفہوم اس پر آشکار ہوا تو اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ اس حادثے نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا اور کاروبارِ دنیا کو تج کر وہ جنگلوں پہاڑوں کی طرف چل نکلا۔ اسوقت اس کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔

Marfat.com

اس بن باس کے دوران اسکی ملاقات ایک بیراگی جانکی پرشاد سے ہوئی ''بالک !میرے چرنوں میں آجا تجھے سکھ مندر کی سیر کراؤں گا'' بیراگ نے لچھمن کو اپنے چیلوں میں شامل کر کے اس کو ''مادھوداس'' بنادیا۔اب وہ بیراگیوں کے گروہ کے ساتھ نگر نگر گھومنے لگا اور سرزمین قصور سے متعارف ہوا۔بابا رام لچھمن کی سادھ پر میلا منعقد ہوا جہاں جانکی پرشاد سے بڑا بیراگی رام داس اپنے چمتکار دکھا رہا تھا۔مادھوداس بیراگی نے اپنے پرانے تعلقات منقطع کیے اور نئے گورو سے رشتہ جوڑ لیا۔اب وہ تپسیا کی چکی میں پسنے لگا۔آخر کار برصغیر کے مشہور یوگی آگرناتھ نے اسے روحانی دنیا سے آشنا کرایا اور ۱۶۹۱ء میں مرنے سے پہلے بیراگی کو اپنا جانشین مقرر کر گیا۔

اکیس برس کی عمر میں اس کے چمتکاروں کی دھوم مچ گئی۔ ناندیر کے مقام پر اس نے ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی اور یوگا کے ایسے ایسے مظاہرے کرنے لگا کہ سادہ لوح عوام اس کی غلامی پر فخر کرنے لگے۔رفتہ رفتہ اس کا حلقہ ارادت وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی گنبد سر میں فتور بھی پیدا ہو گیا۔اس فتور کا اظہار اس کی زبان سے بھی ہوتا تھا۔عقیدت منداس کی واہی تباہی کا من چاہا مفہوم اخذ کرتے تھے۔ ہر طرف مادھوداس بیراگی کی دھوم تھی۔یہی وہ زمانہ تھا جب اس کا ''ٹکراؤ'' گورو گوبند سنگھ سے ہوا۔

گورو گوبند سنگھ اس زمانے میں شاہ عالم کے ہمراہ دکن میں شہزادہ امام بخش کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھے۔مغل حکومت اور سکھ پنتھ کے تعلقات پر مذکرات بھی جاری تھے جو مختلف وجوہات کی بناء پر بُری طرح ناکام ہو گئے۔گورو جی مغل لشکر سے علیحدگی اختیار کر کے ناندیر پہنچے۔مادھوداس بیراگی کی شہرت سن کر ان کے کان کھڑے ہوئے۔گورو جی زبردست مردم شناس تھے۔بیراگی کی کٹیا میں ملاقات کے لیے گئے تو بیراگی وہاں موجود نہیں تھا۔گورو جی بے تکلفی سے بیراگی کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔بیراگی کے چیلے چیں بہ جبیں ہوئے مگر گورو جی بھی تنہا نہیں تھے بیراگی کی تشریف آوری ہوئی تو وہ اپنی چارپائی پر براجمان ایک اجنبی کو دیکھ کر آتش زیرپا ہو گیا اس طرح چمتکاروں کا ٹکراؤ ہوا۔

بیراگی نے اپنی ودیا کے بل بوتے پر چارپائی اُلٹنے کی کوشش کی مگر گورو جی ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ زیرلب مسکرانے لگے۔ بیراگی کو یقین ہو گیا کہ ہاتھی پہاڑ تلے آ گیا ہے۔اس طرح بیراگی نے گورو کی برتری کا صدق دل سے اعتراف کیا۔اب وہ گورو گوبند سنگھ کا بندہ (غلام) تھا۔اس طرح لچھمن داس' بندہ سنگھ بیراگی بن گیا......یہی وہ دور ہے جب گورو جی پر قاتلانہ حملہ ہوا' انہوں

Marfat.com

نے پہلی فرصت میں بندہ بیراگی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اپنے ترکش سے پانچ تیر عطا کیے۔ بہادر کا خطاب عطا کرنے کے بعد اسے فتح ونصرت کی نوید بھی دی۔ گوروجی نے اپنے پانچ وفادار، بنود سنگھ، کاہن سنگھ، باج سنگھ، دیا سنگھ اور ران سنگھ اس کی حوالے کیے اور ''بندہ سنگھ بیراگی بہادر'' کو مغل سلطنت سے ٹکرا جانے کا حکم دیا۔ یہی پانچ افراد جو بندہ بیراگی کی معاونت پر گوروجی نے مقرر فرمائے تھے ''سکھ اتہاس'' میں پانچ پیاروں کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد میں یہ اصطلاح مستقل صورت اختیار کر گئی اور ہر دور میں سکھ پنتھ کے انتظامی امور پنج پیارے سرانجام دینے لگے۔

بندہ بیراگی کے ذہن میں یہ بات نقش ہو کر رہ گئی کہ گورو ارجن، گورو ہر گوبند اور گورو تیغ بہادر کے مصائب کے ذمے دار مغل شہنشاہ تھے۔ گورو گوبند سنگھ کے دو بچوں کے قتل کو تو بندہ بیراگی کسی صورت میں فراموش کرنے کا روادار نہیں تھا۔ خرابی کی جڑ چندو مل کی دشمنی کو اس نے یکسر نظر انداز کر دیا جو ذاتی مخاصمت کی بنا پر گورو یائی کا جانی دشمن تھا۔ (اس قصے کی تفصیل موضوع سے ناانصافی والی بات ہے)

اب بندہ بیراگی ایک مذہبی جنونی تھا اور سکھ پنتھ پر بزعم خویش ڈھائے جانے والے مظالم کا انتقام ہی اس کی زندگی کا نصب العین تھا۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والے ڈوگرہ خون نے آتش انتقام کو ہوا دی۔ عوام الناس میں اس نے یہ بات کو مشہور کر دی کہ وہ مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے۔ اس کے چیلوں نے اس شہرت کو مزید نکھارا ''بندہ بہادر جون بدل کر بلیوں، کتوں اور درندوں کی شکل اختیار کرنے کی قدرت رکھتا ہے'' اس کے لشکر میں راسخ العقیدہ سکھوں کے علاوہ جو مسلمانوں کے قتل کو مذہبی فریضہ گردانتے تھے، جرائم پیشہ افراد بھی شامل ہو گئے۔ ان لوگوں کا مطمع نظر صرف لوٹ مار تھا۔ یہ ایک ایسے درندوں کا گروہ تھا جن کی نگاہ میں ہر ستم روا اور ہر جور جائز تھا۔

''ہم لوگ شوالک کی پہاڑیوں کو اپنی کمین گاہ بنائیں گے'' بیراگی نے پانچ پیاروں کو سمجھایا۔

''پتھروں کی قربت ہمیں دشمنوں کیلئے سنگ دل بنا دے گی۔'' سب نے بیک زبان کہا۔

خون آشامی اس گروہ کے ہاں سرفہرست ہوئی، انسانی مثبت قدریں ثانوی حیثیت اختیار کر گئیں۔ ستلج اور جمنا کا درمیانی علاقہ اس لشکر خوں آشام کی شکار گاہ بنا۔ سادھورام، سمانہ،

Marfat.com

سرہند تباہی و بربادی کی تصویر بنے ۔سمانہ میں گورو تیغ بہادر کا قاتل جلال الدین مقیم تھا۔سکھوں کی نفرت کی ایک اور وجہ گورو گوبند جی کے لڑکوں کو قتل کرنے والے بھی اسی شہر کے باسی تھے۔ نومبر ۱۷۰۹ء میں سکھ ٹڈی دل کی صورت میں اس شہر پر حملہ آور ہوئے ۔اہل سمانہ پر قیامت صغریٰ گزر گئی ۔دس ہزار انسان صرف ایک دن میں لقمہ ءاجل ہوئے ۔شہر کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ یہ بندہ بیراگی کی پہلی ''شاندار فتح'' تھی ۔اس غارت گری کے بعد جمنا پار کے علاقوں کی باری آئی ۔ سہارن پور' گنگوہ' نانوتہ اسلامی بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا' پھر جالندھر دوآب کی باری آئی ۔ ایک فیل مست بے زنجیر تھا شاداب کھیتوں کو اجاڑ رہا تھا۔

بندہ بیراگی کا طریق کار تھا کہ ہر شہر کو تباہ کرنے سے پیشتر اپنی روحانی قوتوں کی دھاک بٹھا دیتا۔اس کے جاسوس اس سے ایسی ایسی طلسمی داستانیں منسوب کرتے کہ اہل شہر ہمت ہار جاتے ۔دوشیزاؤں کی آبروریزی' حاملہ خواتین کا پیٹ چاک کر کے تڑپتے بچوں کا تماشا کرنا ان درندوں کا من پسند مشغلہ تھا۔ بندہ بیراگی کھلے عام اعلان کرتا تھا ''میں محمد بن قاسم سے لے کر اورنگ زیب تک تمام مسلمان بادشاہوں کی فتوحات کا انتقام لے رہا ہوں۔''

جالندھر دوآب کے بعد فیل مستوں نے باری دوآب کا رخ کیا۔بٹالہ کا مردم خیز خطہ برباد ہوا۔مدارس اور کتب خانے نذر آتش ہوئے پھر اس ٹڈی دل نے لاہور کا رخ کیا اور شالا مار کے مضافات تک کا علاقہ لوٹ لیا گیا.... مشرقی پنجاب پر اب سکھوں کا قبضہ تھا۔

لاہور کا حاکم معزالدین جہاندار شاہ تھا' شاہ عالم بہادر کا یہ بیٹا بس نام ہی کا حاکم تھا۔امورِ سلطنت کی دیکھ بھال اس نے اپنے نائب اسلم خان کے حوالے کر رکھی تھی ۔ یہ شخص پانچ برس تک لاہور کے سیاہ و سفید کا مالک رہا جس میں سیاہی زیادہ اور سفیدی برائے نام تھی۔

بندہ بیراگی کو مقامی سکھوں کی حمایت بھی حاصل تھی ۔دوانہ باری کے سکھ جتھے ہر لحاظ سے منظم تھے اور تنی کمانوں پر تیروں کی طرح بیٹھے تھے ۔ادھر جہاندار کو شبنمی چہروں ہی سے فرصت نہ تھی۔

یہ واقعات بلھے شاہ کے عہد شباب میں پیش آئے ۔وہ مجذوب' صوفی' شاعر جو کچھ بھی تھے' حالات حاضرہ سے بے خبر نہ تھے ۔یہ الگ بات کہ کسی قلم کار نے ان کی زندگی کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور بوقت قیام بھی ان کو سر بہ سجود ہی ثابت کیا۔ایک گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والا صوفی محض ۔ یہ موصوف کے ساتھ پرلے درجے کی ناانصافی ہے۔

Marfat.com

''جناب سکھ تو بے لگام ہو چکے ہیں'' ایک خادم نے ایک روز سید زادے سے اظہارِ تشویش کیا'' حاکمِ لاہور بھی عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہے۔''

''ہر سگ دنیا ہوس کو عشق کا نام دیتا ہے'' بلھے شاہ نے اپنے عقیدت مند سے کہا'' وہ طوائف زاری لال کنور کی زلفوں کا اسیر اپنے فرائض سے غفلت برت کر گناہوں کی گٹھڑی بوجھل کر رہا ہے۔ لاہور کی حفاظت کوئی اور کرے گا۔''

''کیا اسلم خاں؟'' عقیدت مند نے سوال کیا۔

''بندہ بیراگی کو نتھ ڈالنے والا تو ابھی منظر عام پر آیا ہی نہیں لیکن لاہور کی حفاظت اس علاقے کے عوام کریں گے۔''

بلھے شاہ کے ان الفاظ کا مفہوم بعد میں آشکار ہوا۔ لاہور کی نیابت کرنے والا تو کنی کترانے لگا لیکن اچانک ایک روز لاہور اور اس کے گرد و نواح میں یہ خبر عام ہوگئی کہ سکھوں کے خلاف اعلان جہاد ہو گیا ہے۔ وہ عوام جو بھیگی بلی بنے بیٹھے لرزہ براندام تھے برق رفتاری سے گویا کروٹ لے کر بیدار ہو گئے۔ آناً فاناً شہری افراد پر مشتمل ایک فوج تشکیل دی گئی جس کا نام ''حیدری فوج'' رکھا گیا۔ اس رضا کار فوج میں امن پسند ہندو بھی شامل تھے۔ وہ ہندو جو بندہ بیراگی کی مقامِ انسانیت سے خارج قرار دے چکے تھے۔

اس فوج کا باقاعدہ ایک علم تھا جسے علم حیدری کا نام دیا گیا۔ یہ علم عید گاہ میں نصب کر دیا گیا۔ یہ عید گاہ موجودہ پل گڑھی شاہو کے قریب تھی اور اس کا سنگ بنیاد عہد جہانگیری میں رکھا گیا۔ اس مسجد کے قریب ایک بازار بھی تھا جسے بازار ''ترپولیہ'' کہا کرتے تھے۔ حیدری فوج کا نعرہ جہاد ''فضل پنج تن یا علی'' تھا۔

سکھ فوج اور شہری رضا کاراؤں پر مشتمل مجاہدین کی فوج میں کوٹلہ بیگم کے قریب گھمسان کا رن پڑا۔ ایک طرف منظم فوجی تجربہ تھا دوسری طرف جوشِ جہاد، حیران کن بات یہ ہے کہ سکھ فوج محصور ہوگئی۔ اب دونوں افواج کے حوصلے کا امتحان تھا۔ محاصرہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ اچانک ایک روز غروب آفتاب سے پہلے طوفان باد و باراں نے تباہی مچا دی۔ شہری ماحول کے پروردہ ان صعوبتوں کے عادی نہ تھے۔ رضا کاروں کی فوج رفتہ رفتہ منتشر ہونے لگی۔ سکھ فوج محاصرہ توڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس معرکے کا صرف ایک فائدہ ہوا کہ بندہ بیراگی لاہور پر حملہ کرنے سے باز رہا۔ مسلح مزاحمت کی موجودی میں فتح مہنگی پڑتی ہے۔ اس فوج کے بہت سے

Marfat.com

محاذ ایسے تھے جہاں مزاحمت برائے نام ہوا کرتی تھی۔ بندہ بیراگی اس نوعیت کی جنگی فراست سے مالا مال تھا۔

بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کے چار بیٹوں میں جنگ تخت نشینی کا آغاز ہوا۔ لاہور دربار کے اُمرا روٹی بوٹی کے لالچ میں اپنے اپنے پسندیدہ شہزادے کی بادشاہی کا دم بھرنے گئے۔ جہاندار شاہ اپنوں کو زیرِ زمین سلا کر زمین پر اترانے لگا مگر ایک برس بھی دستارِ فضیلت سنبھال نہ سکا۔ اسے فرخ سیر نے محبوبۂ دل نواز لال کنور کی آغوشِ عشرت سے جدا کیا اور ساتھ ہی اس کا سرِ پُرغرور بھی تن سے جدا کر دیا۔

اس دوران بندہ بیراگی اپنے آپ کو مضبوط سے مضبوط تر بناتا رہا۔ وہ حسبِ عادت پہاڑوں میں مقیم تھا اور آندھی طوفان کی طرح اچانک حملہ آور ہو کر آپس میں دست و گریباں مغلوں کا کانٹا نکال دینا چاہتا تھا۔ فرخ سیر نے عبدالصمد خان کو صوبہ لاہور کا حکمران بنا کر بھیجا۔ یہ ۱۷۱۳ء کا واقعہ ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بلھے شاہ کی ملاقات شاہ عنایت سے ابھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں تھے۔ بندہ بیراگی مغل دشمنی میں درندگی پر اتر آیا تھا۔ اس کا ''مقام بندگی'' یہی تھا کہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ لاہور اور قصور کی درمیانی ''رکھ'' (گھنا جنگل) کے درمیانی مغل سپاہیوں کا قافلہ تزک و احتشام سے آرہا تھا۔ ان کی منزل لاہور تھی۔ اچانک درختوں کے جھنڈ میں سے بیس پچیس گھڑ سوار نکلے اور قافلے پر ٹوٹ پڑے۔ قافلے کا سالار حملہ آوروں کی جرات پر حیران رہ گیا۔ وہ خود بہادر تھا اور بہادروں کی صدق دل سے قدر کرتا تھا۔ لیکن یہ حملہ جوانمردی کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ بہرحال جنگی قوانین کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی تھی۔ جنگ میں ہر ہتھیار اور ہر حربہ جائز تصور کیا جاتا ہے۔ قافلے والے بھی غافل نہیں تھے۔ سالار نے اپنے چند ساتھیوں کو ''بزن'' کا حکم دیا اور اپنی شمشیر خارا شگاف بے نیام کی۔ یہ نہایت مختصر مگر ایک خون ریز معرکہ تھا۔ حملہ آوروں کی تعداد اگرچہ دگنی تھی مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تعداد کی برتری اختتام پذیر ہونے لگی۔ سالار کا دستِ راست نوجوان تو زخمی چیتے کے سے انداز میں حملہ آوروں کے پرخچے اڑا رہا تھا۔ اچانک درختوں میں چھپے ہوئے ایک شخص نے چلے پر تیر چڑھایا اور سالار کے فراخ سینے کو ہدف بنایا۔ یہ ہدف چونکہ ساکن نہیں تھا لہٰذا تیر انداز کو دشواری پیش آرہی تھی۔ مناسب موقع میسر آتے ہی اس نے تیر آزاد کر دیا مگر اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ لاٹھی کا وار اتنا

Marfat.com

شدید تھا کہ تیر انداز کا سر تربوز کی طرح پھٹ گیا اور اس کا نشانہ چوک گیا۔ تیر زن سے سالار کے قریب سے گزرا تو اس نے جائے فساد کی طرف چونک کر دیکھا۔ ایک درویش صفت انسان ہاتھ میں لٹھ لیے قہر آلود نگاہوں سے زخمی تیر انداز کو گھور رہا تھا۔ حملہ آور منہ کی کھا کر راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔ سالار اور اس کا دستِ راست نوجوان لپک کر درویش کے قریب آئے۔ پہلی نگاہ ہی میں وہ صورتِ حال سے آگاہ ہو چکے تھے۔

''درویش مجھے مہلک زخم سے بچا کر آپ نے احسانِ عظیم کیا ہے'' سالار نے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔

''عبدالصمد خان! دشمنی کے چند اصول ہوتے ہیں'' درویش سالار کا نام لے کر لب کشا ہوا۔ ''میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ ایک درندے کے شکاری کو بچایا ہے اور وہ درندہ جو پاگل ہو چکا ہے'' پھر درویش نے سالار کے دستِ راست کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا ''نواب زکریا خان! عیش میں یادِ خدا اور طیش میں خوفِ خدا کا دامن تھامے رکھنا' تم ایک عظیم باپ کے بیٹے ہو۔ کرسی انصاف پر بیٹھو تو بلا امتیاز مذہب وملت عدل کرنا۔ انصاف اور عدل میں فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ عدل انصاف کی انتہا ہے۔''

زکریا خان نے چونک کر اپنے باپ عبدالصمد خان کی طرف دیکھا۔

''بیٹا! اس میں اظہارِ حیرت کی کون سی بات ہے'' سالار نے مسکرا کر اپنے جواں مرد بیٹے کی طرف دیکھا ''میں اس صاحبِ نظر درویش کے الفاظ کا مفہوم سمجھ چکا ہوں...... میرے بعد تم عوام الناس کے رکھوالے بنو گے۔ تمہارے سامنے اس وقت ایک عظیم انسان کھڑا ہے ...... میرا اندازہ ہے جو بہت کم غلط ہوا کرتا ہے کہ میری جان بچانے والی شخصیت کا نام عبداللہ ہے جسے دنیا بلھے شاہ کے نام پکارتی ہے......'' عبدالصمد حاکم لاہور نے درویش کو بھی حیران کر دیا۔

''تو میری رسوائی کا چرچا گویا جگہ جگہ ہو رہا ہے'' درویش نے سوئے آسمان دیکھا ''مولا میں نے شہرت تو طلب نہیں کی تھی۔ میں نے تو صرف ایک چٹکی عشق کا سوال کیا تھا اور عشق تو گوشہ گمنامی میں مٹ مٹا جانے کا نام ہے۔''

''مگر محترم! آپ خوشبو کو مقید کر دینا چاہتے ہیں'' سالار نے نکتے کی بات کی ''عشق اور مشک اپنا اعلان خود کرتے ہیں۔''

چل بلھیا! چل اوتھے چلئے جتھے سارے اَنّھے

Marfat.com

نہ کوئی ساہڈی ذات پچھانے 'نہ کوئی ساہنوں منّے

بلھے شاہ نے اپنا مشہور دوہڑا زیر لب دہرایا اور مغل سالار کو حیران و ششدر چھوڑ کر گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

بندہ بیراگی کی خون آشامی حالات اور غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ مغل شہنشاہوں کو گورو بائی کا دشمن تصور کرتا تھا حالانکہ کون نہیں جانتا کہ ہرمندر کا سنگ بنیاد حضرت میرؒ نے رکھا۔ گورو گرنتھ بابا فرید کے اشعار سے مزین ہے۔ گورو ہرگوبند سنگھ پنتھ کے چھٹے گورو مسلم درویشوں کے سچے قدردان تھے۔ لاہور کی نواحی بستی مزنگ میں ان کی رہائش تھی۔ مزنگ تھانے کے قریب بھونڈ پورہ میں وہ بلڈنگ آج بھی قائم دائم ہے جو سکھ پنتھ میں ''۶ وی پادشاہی'' کے نام سے مشہور ہے۔ آج کل اس کا نام پیلی بلڈنگ ہے۔ مزنگ تھانے کے سامنے والی سڑک کا نام ٹمپل روڈ اسی چھٹی پادشاہی کی وجہ سے رکھا گیا۔ مزار ابواسحاق قادری اور اس پیلی عمارت کی دیوار مشترک ہے۔ یہ اشتراک بربنائے دوستی تھا مگر بندہ بیراگی کے ذوگرہ خون نے بزرگان کے تعلقات پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ اب اس پاگل پن کا علاج تو کوئی صمد (بے نیاز) بندہ ہی کرسکتا تھا اور عبدالصمد خان لاہور پہنچ چکا تھا۔ زکریا خان اس کا قابل صد افتخار فرزند بھی اس کے ہمراہ تھا۔ یہ یک نہ شد دو شد والی بات تھی۔ کیسا بیراگ اور کیسا یوگ۔ سب چمتکاروں کے بکھر جانے کا وقت آ پہنچا تھا۔

بندہ بیراگی پہلے سے زیادہ خونخوار' پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور بن چکا تھا۔ اس نے اپنا سکہ بھی جاری کر رکھا تھا جسکی ایک طرف یہ الفاظ کندہ تھے۔

سکہ زد بر ہر دو عالم تیغ نانک واہب است
فتح گوبند سنگھ 'شاہِ شاہاں فضل سچا صاحب است۔

سکے کے دوسری طرف یہ عبارت تھی۔

''ضرب بہ امان الدہر مصورت شہر زینت تخت مبارک تخت''

بیراگی اپنی کمین گاہ سے نکل کر گورداسپور کے قریب ''گورداس ننگل'' میں مقیم تھا۔ (یہ جگہ آج کھنڈرات کی صورت میں موجود ہے۔ پاکستان معرض وجود میں آجانے سے پہلے تک اسے ''بندے والی تھیہ'' کہا جاتا تھا) اس بستی کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کی گئی۔ برجوں میں توپیں نصب ہوئیں۔ اشیائے خورونوش کا ذخیرہ اور وافر مقدار میں گولہ بارود اکٹھا کیا گیا۔ بیرونی

Marfat.com

حملہ آوروں سے ہر طرح محفوظ و مامون ہو کر بندہ بیراگی مستقبل کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گیا۔

صمد خان پوری تیاری اور بزرگان کی دعاؤں کے ساتھ لاہور سے نکلا اور آندھی طوفان کی طرح ناقابل تسخیر قلعے کو اس نے محاصرے میں لے لیا۔ اب گویا چوٹ برابر کی تھی۔ یہ محاصرہ رضا کاروں پر مشتمل فوج کا نہیں تھا ایک تجربہ کار جرنیل کی ذہنی کاوش کا نتیجہ تھا۔ محصورین کی رسد و کمک کے سارے راستے بند کر دیے گئے "میدان جنگ میں نکلو یا غیر مشروط ہتھیار ڈال دو" سالار کی ایک ہی شرط تھی۔ یہ شرط بندہ بیراگی کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ آخر میدانِ جنگ میں نکل کر قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا گیا۔

سکھوں کا پہلا جتھا "ست سری اکال، واہگورو کا خالصہ واہگورو کی فتح" کے نعرے بلند کرتا ہوا میدان جنگ میں اُترا۔

زکریا خان ایک طرف سے، قمرالدین خان دوسری جانب سے حملہ آور ہوئے۔ سامنے عبدالصمد خان اور اس کے سپاہی راستہ روکے کھڑے تھے۔ پہلے جتھے کا پل بھر میں صفایا ہو گیا۔ دوسرے اور تیسرے جتھے کی باری آئی تو ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ سر کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ سربریدہ لاشیں رقصِ بسمل کا نظارہ پیش کرنے لگیں۔ بیراگی افواج کے لیے فرار کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ قلعے کی جن بے جان دیواروں پر انسانوں نے مان کیا تھا وہی قفس کی سلاخیں بن گئیں، ایسی مضبوط اور بے رحم سلاخیں جن میں سے بادِ صبا کا بھی گزر نہیں تھا۔ یہ محاصرہ اس قدر مکمل تھا کہ ایک متنفس تک بیراگی افواج تک...... آسکتا تھا نہ وہاں سے جاسکتا تھا۔ ہوا پر البتہ مغل افواج کا زور نہیں تھا۔

مغل فوج میں ہر طرح کے افراد شامل تھے۔ ثابت قدم رہنے والے 'بوقت آزمائش ریت کی دیوار ثابت ہونے والے' توہم پرست اور توحید پر پختہ یقین رکھنے والے۔ ایک روز لشکر میں افواہ پھیل گئی کہ بندہ بیراگی بلی کتے کی جون میں راہِ افرار اختیار کرنے والا ہے......

صمد خان سالار نے اس بے بنیاد افواہ کا علاج بھی سوچ لیا۔

"گورداس ننگل کے قرب وجوار میں دکھائی دینے والے بلی، کتے، بھیڑ بکری ہر جانور کو مار گرایا جائے۔ ہر جانور کے بدلے شکاری کو ایک روپیہ انعام دیا جائے گا۔"

یہ اعلان تھا تو بڑا عجیب مگر اس کا اثر حیرت انگیز طور پر بے حد خوش گوار ہوا۔ سپاہیوں کو

Marfat.com

تھکا دینے والے انتظار سے نجات مل گئی۔ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا' آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والی بات ہوگئی۔ایک روپیہ دولت کے زمرے میں آتا تھا۔بے چارے جانوروں کو ہلاک کر ڈالا۔سپاہی بلی کتے کا پیچھا کرتے کرتے قلعے کی فصیل تک جا پہنچتے اور تیر برسا کر واپس آ جاتے۔نعرے بازی اور شوروغل کی ممانعت نہیں تھی۔محصور فوج پر اس کا بہت بُرا اثر پڑا۔ان شکاریوں پر توپیں داغی جانے لگیں جو ایک غیر دانش مندانہ اقدام تھا۔گولہ بارود جو پہلے ہی قریب الاختتام تھا بہت جلد ختم ہوگیا۔محاصرہ کرنے والوں کا بال بھی بیکا نہ ہوا پھر ایک نئی مصیبت نے در بیراگی پر دستک دی۔اناج کا ذخیرہ بھی ختم ہوگیا۔

ایک روز انسانی جنگ تاریخ کا عجیب وغریب واقعہ پیش آیا قلعے کی فصیل پر چند سپاہی کھڑے دشمن سے غلہ خریدنے کی درخواست کر رہے تھے۔

''اوئے: جنگ کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم لوگ ہمیں بھوکوں مار دو'' فصیل پر کھڑے سپاہی نے زبردست دلیل پیش کی۔

''میں نے تو سنا ہے کہ بھوکا بٹیر بہتر انداز میں لڑتا ہے'' ایک مغل سپاہی نے بطرز تفنن کہا عجیب صورت حال تھی۔ایک سکھ سپاہی نے فصیل سے کود کر جان دینے کی دھمکی دی۔

یہ معاملہ سالارِ لشکر کی خدمت میں پیش ہوا تو وہ سر جھکا کر غور کرنے لگا۔''دشمن حوصلہ ہارنے کے قریب پہنچ چکا ہے'' صمد خان نے معروضی حالات کے پیش نظر عجیب وغریب فیصلہ سنایا ''بہت قلیل مقدار میں کھانے پینے کی اشیا سپاہیوں کے ہاتھ فروخت کی جائیں مگر ہفتے میں صرف ایک روز غلے کی مقدار اتنی قلیل ہو کہ جسم وجاں کا رشتہ برقرار رہے۔

جنگی وقائع نگاروں نے سالار کے اس فیصلے کو غیر دانش مندانہ قرار دیا ہے مگر بنظر غور دیکھا جائے تو یہ بڑا شاندار فیصلہ تھا۔مسلمانوں کے اس حُسن سلوک کا دشمن فوج کے مورال پر بُرا اثر پڑا۔سکھوں کو اپنے نصب العین کی صداقت پر شک ہونے لگا۔تاریخ کے اوراق میں یہ واقعہ محفوظ ہے کہ سکھ سپاہی اپنی چادریں فصیل سے نیچے لٹکا دیتے اور تین روپے فی سیر کے حساب سے گندم خرید لیتے۔یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ واقعہ ۱۷۱۵ء میں رونما ہوا جب غلہ ٹکے سیر فروخت ہوا کرتا تھا۔محصورین نے فصیل شہر کے اندر ہر حرکت کرنے والی شے گدھے گھوڑے بلیاں کتے وغیرہ ہڑپ کر لئے۔پھر درختوں کے پتوں کی باری آئی مگر یہ اشیا آخر کب تک ساتھ دیتیں۔آخر سکھوں نے غیر مشروط ہتھیار ڈال دیے اور مغل فوج نے ان کا قتل عام شروع کر دیا۔

Marfat.com

بندہ بیراگی کو سات سو چالیس افراد کے ہمراہ زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ زکریا خان گرفتار شدگان کو لے کر دہلی روانہ ہوا جہاں شہنشاہ ہند فرخ سیران کا منتظر تھا۔ یہ خون آشام اسیران آہنی پنجروں میں بند تھے۔ سربراہ خان دہلی کا کوتوال تھا اور ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' پر سختی سے کاربند رہنے والا انسان تھا۔ یہ قیدی بہادر شاہ اول کے مرقد پر لے جائے گئے۔ جس انداز میں بندہ بیراگی بے گناہوں کا خون بہایا کرتا تھا اسی انداز میں اسے بھی ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے سات سو چالیس ساتھیوں کا بھی وہی حشر ہوا۔ قدرت کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے لیکن بیراگی کے سلسلے میں وہ پوری گھن گرج کے ساتھ برسی......

''حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں''

نواب عبدالصمد خان کا عظیم ترین کارنامہ تو بندہ بیراگی کو کیفرِ کردار تک پہنچانا تھا لیکن اس کے علاوہ اس نے عیسیٰ خان منج اور نواب حسین خان خویشگی کی بغاوتوں کو بھی فرد کیا وہی خویشگی جس نے بلھے شاہ کے مرشد شاہ عنایت کو قصور سے بے دخل کیا تھا۔

عبدالصمد خاں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ زکریا خاں لاہور کا حکمران بنا۔ یہ بلھے شاہ کا زبردست عقیدت مند تھا۔ فہم و فراست کے ساتھ ساتھ اس میں عدل و انصاف کا ملکہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ درویش کی نگاہوں کا فیض تھا کہ زکریا خان دورِ انتشار میں بھی ثابت قدمی سے خلقِ خدا کی خدمت میں مصروف رہا۔ لاہور کو شہنشاہِ ایران نادر شاہ کی دست برد سے بچانا زکریا خان ہی کا کارنامہ تھا۔ دہلی دربار تو کدورتوں، رقابتوں اور ریشہ دوانیوں کی زد پہ تھا۔ آوے کا آوا ہی بگڑ چکا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے چوتھے عشرے میں جب نادر شاہ نے کابل فتح کرنے کے بعد پنجاب پر حملہ کیا تو زکریا خان نے دہلی دربار کو جھنجوڑ کر مطلع کیا مگر وہاں محمد شاہ عیش و عشرت میں ڈوب چکا تھا۔ وہ ہنوز دلی دوراست ہی کہتا رہا۔ نواب نے حتی الامکان تیاری کی لیکن جب اسے صاف نظر آنے لگا کہ وہ ایرانی لشکر سے نبرد آزما ہو کر قہر خداوندی کو دعوت دے گا تو اس طوفان سے کترا کر نکل جانے کی تدابیر سوچنے لگا۔

اہل پنجاب اپنوں بیگانوں کی شورشوں سے تنگ آ چکے تھے، نادر شاہی لشکر اگر لاہور میں داخل ہو جاتا تو شرفا کی عزتیں سر بازار لٹ جاتیں۔ نادر شاہ کا لشکر ایک لاکھ پچیس ہزار تجربہ کار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ جمرود اور کابل کو تہ و بالا کر کے اس نے دریائے سندھ عبور کیا، سرزمینِ پنجاب پر قدم رکھتے ہی اس نے اعلان کر دیا ''ہر دکھائی دینے والی شے کو برباد کر دو۔''

Marfat.com

جہلم اور چناب کو ایرانی لشکر ریت کی سلوٹ سمجھ کر عبور کر گیا اور ایمن آباد پہنچ کر شہر کو انہوں نے نذرِ آتش کر دیا۔ زکریا خان کے پاس صرف بیس ہزار افراد پر مشتمل فوج تھی اس نے دریائے راوی عبور کیا اور سیسہ پلائی دیوار کی طرح نادر شاہ کے راستے میں حائل ہو گیا۔ مسلسل تین روز تک وہ اپنے سے سات گنا بڑی اور طاقتور فوج کے ساتھ ٹکراتا رہا۔ نادر شاہ حیران تھا کہ آخر یہ نواب کس مٹی کا بنا ہوا ہے...... تیسرے روز نواب زکریا خان لڑتے لڑتے اپنے دستہ، خاص سے بچھڑ گیا اور دشمن سپاہ کے نرغے میں آ گیا۔ وہ تیغوں کی چھاؤں تلے چومکھی لڑتا ہوا دشمن کا حصار توڑ کر یوں نکلا جیسے بازی گری کے کرتب دکھا رہا ہو۔

نادر شاہ اپنے محافظ دستے کے حصار میں یہ سارا طرفہ تماشا دیکھ رہا تھا' بے اختیار اس کے منہ سے ''آفریں...... آفریں'' نکل گیا۔

''حضور: یہی حاکم لاہور زکریا خان ہے'' محافظ دستے کے سالار نے کہا ''اجازت ہو تو اسے زندہ گرفتار کر لیا جائے۔''

''ہرگز نہیں: تم ہوا کے فرحت بخش جھونکے کو مقید کرنا چاہتے ہو'' نادر شاہ لاکھ شقی القلب سہی مگر بہادروں کا سچے دل سے قدر دان تھا۔ ''ایسے شخص کی دوستی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔''

لاہوری فوج کی ایرانی سپاہ کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ غروبِ آفتاب سے پیشتر نوابی فوج چار و ناچار پسپا ہوئی اور دریائے راوی عبور کر کے شہر پناہ میں داخل ہو گئی۔ نادر شاہ فصیل شہر پر ننگہ غلط انداز ڈالتا ہوا شالامار باغ میں جا ٹھہرا۔ زکریا خاں اپنے اندازِ جوانمردی سے اس کا دل جیت چکا تھا۔

''مابدولت نواب سے ملاقات کے متمنی ہیں'' نادر شاہ نے اپنے مزاج داں سردار کفایت اللہ خان سے سرگوشی کی۔

''لاہور کے متعلق حضور کا کیا فیصلہ ہے؟'' کفایت اللہ نے سوالیہ نگاہوں سے استفسار کیا۔

''فیصلہ نواب سے ملاقات کے بعد کیا جائے گا۔'' نادر شاہ نے جواب دیا۔

نواب کو خبر ہوئی تو وہ پوری تمکنت سے گھوڑے پر سوار ہو کر شالامار باغ پہنچا۔ اس وقت وہ صرف ایک خنجر سے مسلح تھا۔ نادر شاہ فاتحانہ شان سے امرا اور چاق و چوبند محافظ دستے کے جلو میں تخت نما کرسی پر براجمان تھا۔ نواب قریب پہنچا تو وہ اچانک کرسی سے اُٹھ کر اس کے استقبال کو بڑھا...... یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا پھر شاہ

Marfat.com

ایران آگے بڑھ کر نواب سے بغلگیر ہو گیا..... نواب اپنی عزت افزائی پر دنگ رہ گیا۔ اس نے اپنا خنجر دستِ وفا پر سجا کر نادر شاہ کو پیش کیا۔

''اس وقت ہمارے پاس، برادرِ عزیز کو پیش کرنے کے لیے مناسب ترین شے یہی ہے'' نواب نے سنجیدگی سے کہا۔

کچھ لوگ اسے ہتھیار ڈالنا سمجھے، کچھ جنگی فراست، بہر حال انداز تحفے کا سا تھا۔

نادر شاہ نے زیرِ لب مسکرا کر خنجر قبول کر لیا اور لاہور تباہ برباد ہونے سے بچ گیا۔

''ہم چاہتے ہیں، آپ ہماری فوج میں بحیثیت سالار شمولیت فرمائیں'' نادر شاہ نے فراخ دلانہ پیش کش کی۔

''بندہ اس عزت افزائی کا تہ دل سے مشکور ہے'' نواب نے ایک ایک لفظ تول تول کر کہا ''بدقسمتی سے آج کل بندہ ایک زبردست اُلجھن کا شکار ہے ورنہ اس سنہری موقع کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔''

''ایسی کون سی اُلجھن ہے؟''

''ایک مسلمان شہری ایک غیر مسلم شادی شدہ خاتون سے حق زوجیت کا دعوے دار ہے'' نواب نے صورتِ حال کی وضاحت کی ''اس مقدمے کا فیصلہ کیے بغیر بندہ لاہور سے غیر حاضر ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ البتہ اپنا برادرِ خورد آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہے''

نادر شاہ نے نواب کے بھائی حیات اللہ خان کو پنج ہزاری منصب عطا کر کے اپنی فوج ظفر موج میں شامل کر لیا..... اب لاہور کی حفاظت میں شک و شبے کی قطعاً کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ نواب کا اپنا بھائی ایرانی فوج میں پانچ ہزار سپاہ کا کمانڈر تھا۔

نادر شاہ نے دہلی کا جو حشر کیا اس کا زیرِ نظر داستان سے کوئی تعلق نہیں۔

اندازِ انصاف یہ ہونا چاہیے کہ دنیا انصاف کے عمل کو محسوس کر سکے۔

روپا دیوی صرف نام ہی کی نہیں ویسے بھی روپ کی دیوی تھی۔ دولتِ حُسن و جمال سے مالا مال ہونے کے علاوہ وہ سیرت میں بھی بے مثال تھی۔ اس کی گواہی وہ سارا محلّہ دیتا تھا جس میں وہ اپنے خاوند کے ساتھ رہائش پزیر تھی۔ قریبی محلے میں حشمت خاں نامی ایک اوباش نوجوان رہتا تھا۔ لوگ اسے آغا کے نام سے پکارتے تھے۔ آغا صاحب ثروت ہونے کے ساتھ

Marfat.com

ساتھ حسین چہروں کا دلدادہ بھی تھا۔اس نے روپا کے حُسن جہاں سوز کا نظارہ کیا تو اسے اپنے بستر کی زینت بنانے کی تدابیر کرنے لگا۔روپا نے اس کا دستِ ہوس حقارت سے جھٹک دیا تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگا۔ایک روز اس نے ایسی منصوبہ بندی کی کہ شیطان کو بھی مات کر دیا۔اس نے اپنے ہم مشرب احباب کی دعوت کی اور تقریب کی وجہ یہ بیان کی کہ ''روپا دیوی نے مشرب بہ اسلام ہو کر میری زوجیت میں آنے کا اقرار کر لیا ہے۔''

اس تقریب سعید میں اس نے اپنے ہم پیالہ وہم نوالہ دوستوں کے علاوہ چند معززین شہر کو بھی بطورِ خاص مدعو کیا۔وقت مقررہ پر ایک دوشیزہ چادر اوڑھے اور یہ لمبا لمبا سا گھونگھٹ نکالے محفل میں طلوع ہوئی۔ایک دین دار مولانا نے جملہ حاضرین کی موجودی میں خاتون کو کلمہ پڑھایا اور آغا صاحب کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔لوگوں نے ضیافت اُڑائی اور مبارک باد وکامیاب ازدواجی زندگی کی دعائیں دے کر اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔

دوسرے روز آغا صاحب اپنے احباب کو لے کر روپا کے گھر پہنچے اور چیخ چیخ کر دُہائی دینے لگے ''روپا میری شرعی بیوی ہے۔اس نے اُن گواہوں کی روبرو اسلام قبول کیا،ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔میری غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ ایک ہندو کے گھر میں قدم رکھے۔''

خلق خدا اکٹھی ہوئی۔محلے کے لوگ روپا کی عفت مآبی اور نیک چلنی کی قسم کھا سکتے تھے مگر درجن بھر گواہوں کے سامنے اہل محلہ بھی بے بس ہو گئے۔معززین شہر کو دیکھ کر تو حاضرین کانوں کو ہاتھ لگانے لگے ''کل یگ ہے کل یگ۔روپا سے یہ امید نہ تھی۔''

''میں اس بات پر یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں'' روپا کا خاوند عالمِ بے بسی میں روہانسا ہو گیا۔''یہ انیائے ہے۔میں جان دے دوں گا مگر روپا کو اس درندے کے حوالے نہیں کروں گا۔''

''روپا سے پوچھو کہ یہ کیا معاملہ ہے'' ایک شخص نے آبدیدہ لالہ جی سے کہا۔

''میں بھگوان کی سوگندھ کھاتی ہوں کہ کل میں نے اپنے گھر سے باہر قدم تک نہیں رکھا'' روپا نے چلّا کر کہا۔'' یہ بدمعاش جھوٹ بول رہا ہے۔میں جی ہتیا کر لوں گی مگر اس راکھشس کو اپنے قریب نہیں آنے دوں گی۔''

''جھوٹ سچ کا فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے'' آغا نے پینترا بدلا ''آپ حضرات روپا کے سامان کی تلاشی لیں۔اس کے گھر میں وہ عروسی جوڑا برآمد نہ ہوا تو میں آپ حضرات سے معافی

Marfat.com

مانگ لوں گا بلکہ ہر سزا بخوشی بھگت لوں گا'' آغا نے عروسی جوڑے کا رنگ تک بتلا دیا۔ روپا نے لب کشائی کی کوشش کی تو اہل محلّہ نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرا دیا۔

''گھر کی تلاشی لی جائے'' تماشائیوں نے متفقہ فیصلہ سُنا دیا۔ اگر یہ مسلمان جھوٹا ثابت ہوا تو ہم اس کو کڑی سزا دیں گے۔''

''میں بخوشی اپنی گردن تک کٹوا دوں گا'' آغا نے اتنے اعتماد سے کہا کہ خود روپا انگشت بدنداں رہ گئی۔

ایک ہندو اور ایک مسلمان' دونوں گھر کی تلاشی لینے لگے۔ روپا کا صندوق کھولا گیا تو آغا کی سچائی ثابت ہوگئی۔ عروسی جوڑا ساڑھیوں کے نیچے پڑا تھا۔

اہل خانہ دھک سے رہ گئے۔ لالہ جی نے قہر آلود نگاہوں سے اپنی پتنی کو دیکھا'' روپا یہ تُو نے کیا کر دیا'' لالہ جی اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔

روپا نے بھاگ کر باورچی خانے سے چُھری حاصل کی اور اپنی شہ رگ پر رکھ لی'' اگر کسی نے مجھے اس راکھشس کے ساتھ جانے کو کہا تو میں اپنا گلا کاٹ ڈالوں گی'' یہ الفاظ روپا نے اتنی سنجیدگی سے کہے کہ اہل خانہ کو اس کی سچائی کا یقین آ گیا۔

''اگر آپ لوگ اپنی رسوائی چاہتے ہیں تو میں قاضی شہر کا دروازہ کھٹکھٹا تا ہوں'' آغا نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا'' قانون خود آپ لوگوں سے سمجھ لے گا۔''

قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ گواہوں کے بیانات اور واقعاتی شہادتوں کی روشنی میں قاضی صاحب نے مقدمے کا فیصلہ آغا کے حق میں کر دیا اور لالہ جی کو سرزنش کی'' ان گواہوں کے روبرو روپا مشرف بہ اسلام ہوئی۔ عروسی جوڑا تمہارے گھر سے نکلا اب وہ مرتد ہو کے تمہارے ساتھ کیسے جا سکتی ہے؟''

لاہور کے ہندوؤں میں کہرام مچ گیا۔ انہوں نے اس فیصلے کے خلاف صوبے دار کی عدالت میں اپیل دائر کر دی۔ نواب زکریا خان مقدمے کی کارروائی پڑھ کر شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایسی صورت حال سے وہ کبھی دوچار نہیں ہوا تھا...... اس کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ نادر شاہ سے فرصت ملی تو اس نے اس مقدمے کی جزئیات پر غور کرنا شروع کیا۔ یہ تلوار کی دھار پر چلنے والی بات تھی۔ بلھے شاہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے'' ہمیشہ عدل کرنا۔ عدل اور انصاف میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انصاف کی آخری حد عدل ہے''

Marfat.com

نواب کی رہائش اس زمانے میں محلہ بیگم پورہ میں تھی۔ایک روز غروبِ آفتاب کے بعد وہ روپا دیوی کے محلے میں جا پہنچا۔وہاں اکثر لوگ اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔لبّ لباب یہی تھا کہ روپا جیسی پاک دامن دوسرے محلے میں جا کر اتنا بڑا اقدم نہیں اُٹھا سکتی۔
وہاں سے نواب، آغا کے محلے میں پہنچا تو لوگ آغا ہی کے متعلق مصروفِ گفتگو پائے گئے۔

''یہ تو پرلے درجہ کا مکار اور چالباز ہے۔جانے کس عورت کو چادر میں لپیٹ کر مولوی کے سامنے لے آیا۔مولوی صاحب کو تو ٹکے سیدھے کرنا تھے، سو کر لیے۔''

''تو کیا مولوی صاحب نکاح سے پہلے دیدارِ حسن بھی فرماتے'' ایک شخص نے مداخلت کی۔

''مگر کسی ایک نے بھی تو روپا کا دیدار نہ کیا'' مداخلت کرنے والے نے نکتے کی بات کی۔

''اور وہ عروسی جوڑا؟'' کسی دوسرے نے لقمہ دیا۔

''ارے تم آغا کو کیا سمجھتے ہو، اس نے ضرور کوئی بندوبست کر لیا ہوگا'' یہ ایک تیسرے فرد کی رائے تھی''ایسے چٹکارد کھانے کا تو وہ عادی ہے...... یہ تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

نواب واپس آیا تو روپا کی بے گناہی اس پر آشکار ہو چکی تھی۔مگر عروسی جوڑے والا معما اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔کپڑوں کے متعلق غور کرتے کرتے اس کا خیال دھوبی دھوبن کی طرف گیا تو اس کا دماغ گویا روشن ہو گیا۔اس نے ایک پل ضائع کیے بغیر اس دھوبن کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے جو لالہ جی کے کپڑے دھویا کرتی تھی۔سپاہی دھوبن کو لے کر نواب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ ایک قہر آلود نگاہ کی بھی تاب نہ لا سکی اور ریکارڈ کی طرح بجنے لگی۔

''حضور میری خطا معاف حضور میں لالچ میں اندھی ہو گئی تھی۔'' دھوبن گڑگڑانے لگی

''میں نے ہی وہ لباس روپا کے صندوق میں رکھا تھا اور ......اور وہ ...'' دھوبن اس سے آگے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکی۔

دوسرے روز نواب زکریا خان کرسی انصاف پر متمکن ہوا۔قاضی شہر کو بھی عدالت میں مدعو کیا گیا۔مدعی، مدعا علیہ و گواہان سب حاضر تھے۔دھوبن نے بھری عدالت میں قبول کیا کہ وہ خود چادر میں لپٹی مولوی صاحب کے سامنے آئی تھی اور اسی نے کلمہ پڑھا تھا اور اسی کا نکاح مسمی آغا سے پڑھایا گیا تھا۔

ماحول پر سکوتِ مرگ طاری تھا۔مولوی صاحب اور قاضی شہر سر جھکا کر بیٹھے تھے۔

Marfat.com

منصف نے انصاف کرنے میں ایک پل کی دیر نہ لگائی۔ جمہوریت کا ڈھول پیٹنے والے منصفان کی طرح یہ نہ کہا کہ ''مقدمے کی کاروائی فلاں تاریخ تک ملتوی کی جاتی ہے۔''

''ان نانہجاروں نے مذہبی تقدس اور انسانی قدروں کو پامال کیا۔ لہٰذا ان سے زندہ رہنے کا حق چھینا جاتا ہے۔ آغا اور دھوبن کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے'' اور حیران کن بات یہ ہے کہ کسی زردار نے مجرمان کی سفارش بھی نہ کی حالانکہ آغا بڑا دولت مند تھا۔ اتنا دولت مند کہ قانون کو خرید سکتا تھا لیکن زکریا خان کا قانون قابلِ فروخت نہیں تھا اور نہ وہ حکمران برائے فروخت تھا۔

زکریا خان کے عہدِ حکومت میں پنجاب امن و امان کا گہوارہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر دور خرابی کی شدت میں کمی ضرور واقع ہوئی۔

نواب نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو اس کی تین بیٹوں میں سے دو کے درمیان ٹھن گئی ...... یحییٰ خان اور شاہنواز لاہور کی حکمرانی کے لیے میدان میں اُترے۔ یحییٰ خان اپنے ماموں اور سسر کی حمایت سے کامیاب ہوا۔ ماموں قمر الدین دہلی دربار میں اثر ورسوخ کا مالک تھا مگر شاہنواز نے زورِ بازو کے بل بوتے پر حریفین کو شکست دے دی۔ دہلی دربار کا حکم فرماں روائی جو یحییٰ خان کے حق میں تھا دھرے کا دھرارہ گیا۔ بھائی نے سگے بھائی کو زنداں میں ڈالا اور خود تختِ لاہور پر بیٹھ کر اپنے آپ کو بخت آور سمجھنے لگا۔ کرسی اقتدار جانے کیسے جھولے جھلاتی ہے کہ انسان اپنی اوقات کو بھول جاتا ہے۔

مغل فرمانروائی کا طلسم اگرچہ بکھر چکا تھا لیکن دبدبہ تاحال قائم تھا۔ شاہنواز کے سیاسی مشیر ادینہ بیگ نے مشورہ دیا کہ راج سنگھاسن کو بیرونی سپر پاور کی آشیر باد سے بچایا جاسکتا ہے۔ نادر شاہ درّانی تو پُر ہیبت شخصیت کے باوجود قتل کیا جاچکا تھا۔ احمد شاہ ابدالی البتہ نادر شاہ سے زیادہ شان وشوکت سے منظرِ عام پر آچکا تھا۔ یہ جفاکش جنگجو، صوبہ ہرات کے سدوزئی افغان قبیلے کا چشم و چراغ تھا۔ یہ قبیلہ حیدر کرار حضرت علیؓ سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ اظہارِ عقیدت کا یہ عالم کہ قبیلے کا ہر فرد اپنے آپ کو ''عبد علی'' کہلواتا تھا جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ''ابدالی'' بن گیا۔

احمد شاہ ابدالی ملتان میں پیدا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ پیدائشی پنجابی تھا۔ بہرحال نادر شاہ درّانی کے بعد وہ تخت وتاج کا مالک ومختار ہوا۔ وہ مغل حکمرانوں کی رگ رگ سے واقف تھا۔ نادر شاہی افواج کے ہمراہ ہندوستان میں اپنی شمشیر برّاں کے جوہر دکھا چکا تھا۔ پنجاب پر تو وہ حق ملکیت گردانتا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا والی بات ہوگئی۔ شاہنواز حاکم لاہور نے ابدالی کو

Marfat.com

حملے کی خود دعوت دی۔ الفاظ بھی بڑے پُرکشش تھے۔ متن تھا'' میں لاہور اور ملتان کا ناظم آپ کو اپنا حکمران مانتا ہوں۔''

ابدالی نے خیل خوب کہا اور قندھار سے پنجاب کی جانب چل پڑا۔ پنجاب جو ہند کا دروازہ بن چکا تھا اسے کھول کر وہ تخت دہلی پر بھی قبضہ کر سکتا تھا۔

خود غرض، مکار اور فتنہ پرداز ادینہ بیگ نے دُہری چال چلی۔ وہ خود تخت لاہور پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ ادھر تو شاہنواز کو ابدالی کا راستہ دکھایا ادھر دہلی دربار کو مخبری فرمادی'' شاہنواز سلطنت مغلیہ سے بے وفائی کر کے ابدالی سے رشتہ جوڑ چکا ہے۔''

شاہنواز کے ماموں جان نے پند ونصائح سے اپنے منہ زور بھانجے کے خیالات تبدیل کر دیے مگر یہ پس از مرگ واویلا والی بات تھی۔ کیونکہ ابدالی شاہدرے پہنچ چکا تھا۔

لاہور اور ابدالی افواج میں صرف دریائے راوی حائل تھا۔ شاہنواز نے لیت ولعل سے کام لینا شروع کیا تو ابدالی آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے لاہور کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا اعلان کر دیا۔ پھر ایک ایسا دردناک واقعہ رونما ہوا کہ لاہور کی بربادی پر مہر ثبت ہو گئی۔

بلھے شاہ کا ہم عصر صابر شاہ مجذوب لاہور کا وسنیک تھا۔ اس درویش ابن درویش کے سر میں جہاں گردی کا سودا سمایا تو دوران سیاحت مشہد جا پہنچا۔ امام رضا کے صاحب زادے سلطان ابوالحسن علی کا روضہ تھا اور عقیدت مندوں کا ہجوم۔ درویش صابر شاہ ایک کونے میں سرنگوں بیٹھا تھا کہ ایک روشن پیشانی والا نوجوان اپنے ہمراہیوں کے ساتھ روضے کے احاطے میں داخل ہوا۔ مجذوب اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ فاتحہ خوانی کے بعد وہ نوجوان واپس جانے لگا تو مجذوب نے بہ آواز بلند کہا'' نوجوان باہر میرا انتظار کرو۔ مجھے تمہاری رسم تاجپوشی ادا کرنی ہے''

یہ آواز نوجوان کے احباب نے بھی سُنی اور وہ مسکرانے لگے'' احمد مبارک ہو درویش نے تجھے تاج وتخت بخش دیے۔''

احباب اپنے اپنے ظرف وشرف کے مطابق فقرے کسنے لگے کیونکہ وہ سب نادر شاہی فوج کے معمولی سپاہی تھے۔ احمد شاہ البتہ روضے کے باہر درویش کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جو خود اس کے لیے بھی ناقابل فہم سی بات تھی۔

درویش نے احمد کو روضے کی سیڑھیوں کے قدمچے پر بیٹھ جانے کا حکم دیا اور اس کے سر پر سبز پتوں کا بنا ہوا تاج سجا دیا۔ چند پتے درخت کی شاخوں میں یونہی ٹانکے ہوئے تھے۔ احمد

Marfat.com

کے احباب نے تالی بجا کر اس رسم کی تکمیل کی۔ درویش نوجوانوں کے طنز بھرے رویے کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے گرج کر کہا "سوئے ادب احمقو' تمہارا رویہ شہنشاہ کے روبرو گستاخی کے زمرے میں آتا ہے" حاضرین کی مسکراہٹیں دم توڑ گئیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

وقت نے کروٹ بدلی تو مجذوب صابر شاہ کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی تخت شاہی پر متمکن ہوا تو اس نے صابر شاہ کو تلاش کیا۔ مجذوب کو پانے کے بعد ابدالی ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا۔ دنیا احمد شاہ کے اشارہ ابرو پر ناچتی تھی اور ابدالی، شاہ صابر کی عقیدت میں ڈوب چکا تھا۔

ابدالی نے لاہور کو نذر آتش کرنے کا فیصلہ کیا تو اہل دربار نے ہاں میں ہاں ملائی۔ صابر شاہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا "لاہور میرا شہر ہے۔" اس نے ابدالی کو سمجھایا "میں خود جا کر شاہنواز سے بات کرتا ہوں۔"

"محترم شاہنواز لاتوں سے ماننے والا بھوت ہے، باتوں سے نہیں سمجھے گا" ابدالی نے کہا۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے" مجذوب نے یہ جواب دیا اور تنِ تنہا شہر کی طرف چل دیا۔

صابر شاہ لاہور کے مانوس گلی کوچوں کی سیر کرنے لگا۔ چند لوگوں سے اس کی گفتگو بھی ہوئی۔ جانے کس طرح اور کیونکر ہوا، لیکن ہوا یہ کہ بے فکرے لاہوریوں نے بے پر کی اڑا دی۔ ابدالی نے اپنا جاسوس بھیجا ہے۔ دوسری افواہ اس سے بھی دلچسپ مگر خطرناک تھی' ابدالی کا توپ خانہ کم ہے لہٰذا وہ اپنے اس جادوگر کی مدد سے لاہوری توپ خانے کو بے کار کر دینا چاہتا ہے" جادو کے زور سے توپ خانے کی بربادی ہندو ذہن کی اختراع تھی۔

شاہنواز نے جادوگر کو دربار میں طلب کیا اور اسے اپنی ذات کا تعارف کرانے کا حکم دیا۔

"میں تمہیں ایفائے وعدہ کی تلقین کرنے آیا ہوں" درویش نے بے باکانہ جواب دیا اور اپنا تعلق ابدالی لشکر سے ثابت کر دیا "شاہنواز: طوفان کے سامنے اکڑ جانا حماقت ہے۔ دور اندیشی کا ثبوت دو اور لاہور کو بربادی سے بچا لو' درویش کا لہجہ درباریوں کا سا نہیں تھا جو حاکم وقت کی برداشت سے باہر تھا۔ سر دربار اسے احمق قرار دینا درویش کا جرم تھا۔

"اس زبان دراز منگتے فقیر کے گلے میں پگھلی ہوئی کھولتی ہوئی چاندی اُنڈیل دی

Marfat.com

جائے تا کہ اسے گفتگو کا سلیقہ آ جائے'' عاقبت نا اندیش شاہنواز نے فرمان صادر کیا۔
حکم کی تعمیل کی گئی۔ درویش کو گفتگو کا سلیقہ تو نہ آیا طائرِ روح البتہ قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اسی پر بس نہیں کی گئی، مجذوب کی بے گور و کفن لاش کو لب سڑک پھینک دیا گیا۔ اس لاش کو بعد میں افغان فاتح لشکر نے دفن کیا۔ شاہی مسجد اور لیڈی ولنگٹن اسپتال کے درمیان تربت مجذوب آج بھی موجود ہے۔ مزار پر عجیب و غریب نوعیت کی اداسی کا راج ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ صابر شاہ آج بھی حکامِ اعلیٰ و بالا کو زبانِ حال سے نصیحت کر رہا ہے ''اپنے اندرونی معاملات میں کسی سپر پاور کو مداخلت کی دعوت مت دو'' لیکن اس کی یہ نصیحت رائیگاں جا رہی ہے...... نادان افراد پر کلامِ نرم و نازک اس دور میں بھی بے اثر تھا اور آج بھی وہی صورتِ حال ہے۔
ابدالی کو مجذوب کے انجام کی خبر ہوئی تو وہ بیدِ مجنوں کی طرح کانپنے لگا ''میں اس شہر کو وہ سبق سکھاؤں گا جسے دنیا یاد رکھے گی'' ابدالی نے زیرِ لب کہا۔ اس کا لہجہ بے شک پُرسکون ہو چکا تھا لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ اس سکون کے نیچے لاوا کھول رہا ہے
افغان فوج نے شاہدرہ سے شمال کی جانب پیش قدمی کی اور دریا عبور کر کے شالامار باغ کے قریب پڑاؤ کیا۔ شاہنواز نے بیگم پورہ بستی کی فصیلوں پر توپیں نصب کر دیں، مزار شاہ بلاول کے قریب طرفین میں معرکہ آرائی ہوئی۔ (عین اس جگہ جہاں بعد میں شیر سنگھ کی سمادھ بنی) یہ نالائقی اور زیرکی، نااہلی اور جفاکشی کا مقابلہ تھا۔ تعداد کی برتری بھی شاہنواز جیسے نالائق حکمران کو نہ بچا سکی۔ جفاکش ابدالی نے میدان مار لیا۔ دہلی دربار سے کمک کی توقع ہی فضول تھی۔ باشندگان لاہور کو شاہنواز نے سپردِ تقدیر کیا اور جو کچھ ہاتھ لگا وہ لے کر راہِ فرار اختیار کر گیا۔
افغان سپاہ کو بیگم پورہ سے دولت کے وہ انبار ہاتھ آئے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ لاہوری خلقِ خدا پر موت کا دروازہ کھل گیا۔ پری تمثال دوشیزائیں، فاتح لشکر کے رحم و کرم پر ہوئیں تو چشمِ فلک حیا سے بند ہو گئی۔ احمد شاہ کی آتشِ انتقام ٹھنڈی ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میر مومن، سید جمیل الدین، نعمت بخاری، دیوان لکھپت رائے اور دیوان صورت سنگھ اکابر لاہور وفد کی صورت بارگاہِ ابدالی میں حاضر ہوئے اور رحم کی درخواست کی۔ تیس لاکھ نذرانہ بھی پیش کیا۔ افغان سپاہ کو اتنا کچھ مل چکا تھا کہ یہ تیس لاکھ ان کی نگاہ میں کوئی حیثیت ہی نہ رکھتے تھے۔ بہ حال ابدالی کو بس رحم آ گیا اور اہل لاہور کی جان بخشی ہوئی۔
عجیب اتفاق ہے کہ لاہور پر قیامت صغریٰ ڈھا کر ابدالی دہلی کی جانب روانہ

Marfat.com

ہوا۔ سرہند کے قریب میر منو نے اسے شکست دی۔ افغانیوں کو زخموں کا احساس ہوا۔ ابدالی نے سرہند سے لاہور آ کر دم لیا اور واپس کابل چلا گیا۔

احمد شاہ نے پنجاب اور ہند کے دیگر مقامات پر دس حملے کیے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے سکھوں کی طاقت کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ سکھ پر پرُزے نکالتے تو وہ ان کی سرکوبی کو آ موجود ہوتا۔ سکھ راہِ فرار اختیار کر کے جنگلوں پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے لیکن پنجاب کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ ابدالی کے حملوں سے مغل سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ مرکز کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو پنجاب شورشوں کا گڑھ بن گیا۔ سکھ کمین گاہوں سے نکل کر اپنی پٹائی کا بدلہ امن پسند شہریوں سے لیتے۔

مرہٹوں کی طاقت کو کچلنا ابدالی کا عظیم الشان کارنامہ سہی لیکن ان...... حملوں کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ پنجاب گھوڑوں کے سموں تلے روندا جانے لگا۔ اس بدقسمت سرزمین کے نصیب میں امن وامان کا نشان تک نہ رہا۔ عذاب ہی نازل ہوتا رہا۔ کبھی بندہ بیراگی کبھی نادر شاہ، کبھی ابدالی پھر سکھ اور مرہٹے ادینہ بیگ اور مغلانی بیگم کی ریشہ دوانیاں مرتے دموں تک قائم رہیں۔
پھر دوبار قحط پھوٹ پڑا۔ اس تناظر میں بلھے شاہ نے کہا۔

در کھلا حشر عذاب دا
بُرا حال ہویا پنجاب دا
منہ بارہویں صدی پیاریا
ساہنوں ہاویئے دوزخ ساڑیا
کدی آمل یار پیاریا

اس تناظر میں دیکھا جائے تو بلھے شاہ کا پیار ایار، خلق خدا کا سکھ چین اور امن وامان قرار دیا جا سکتا ہے۔ دینی علما نے بھی دردمند شاعر کو مایوس کیا۔ نام نہاد ملاؤں کے متعلق اس نے یہ انداز اختیار کیا۔

تنبا چک چک منڈی جاویں
دھیلا لے کے چُھری چلاویں
کھانا شک شبے دا کھاویں
دسیں ہور تے ہور کماویں

Marfat.com

تنبا بہ معنی شلوار

نام نہاد اہل علم نے جب سادہ لوح انسانوں کو دام فریب میں پھانسنا شروع کیا تو بلھے شاہ نے تنگ آ کر یہاں تک کہہ دیا "اللہ بے علماں توں راضی"

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر حقیقت کو سفر آخرت کی اطلاع مل چکی تھی۔ آخری عمر میں کہے گئے اشعار سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

میرا رانجھا ہُن کوئی ہور
بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں
گور پیا کوئی ہور

میرا محبوب اب کوئی اور ہے۔ بلھے شاہ موت ہمیں نہیں آئے گی قبر میں کوئی اور جائے گا۔ یہ مضمون بعد میں اکثر شعرا نے باندھا۔ ترقی پسند شعرا بھی جب آخری عمر میں تصوف کی طرف مائل ہوئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ موت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی کیونکہ بقا ان کی منزل ہے۔ جب اعضا مضحل ہو جائیں، عناصر میں اعتدال نہ رہے تو شاعر اپنے نور بصیرت سے وہ کچھ دیکھ لیتا ہے جو ایک عام آدمی کے بس میں نہیں ہوتا۔ بلھے شاہ عنفوان شباب میں شوریدہ سر دریا کے مانند تھے۔ آخری عمر کا کلام منفرد انداز کا حامل ہے۔

ڈھلک گئی چرخے دی ہتھی کیتا مول نہ جاوے
تکلے نوں ول پے پے جاون کون لُہار سداوے
تکلے توں ول لائیں لہاراتندی ٹٹ ٹٹ جاوے
گھڑی گھڑی ایہ جھولے کھاندا چھلی اک نہ لاہوے
پتا نہیں جے بیڑی نبھاں، بائٹر ہتھ نہ آوے
چمڑیاں نے چوپڑنا ہیں ماھل پئی بڑلاوے
ڈھلک گئی چرخے دی ہتھی کیتا مول نہ جاوے

بلھے شاہ کے ہاں چرخہ انسانی عمل کا استعارہ ہے۔ ان اشعار میں کاتنے کے عمل میں استعمال ہونے والی اصطلاحوں کو برتا گیا ہے جو اردو زبان میں نامانوس ہیں مثلاً تندی، روئی کا وہ تار جو پونی سے نکلتا ہے۔ چھلی، تکلے پر لپٹا ہوا تندی کا گچھا جو کاتنے کے بعد پٹاری میں ذخیرہ کر لیا جاتا ہے بائٹر چرخے کی تھال نما دو پہیوں کے درمیان تنا ہوا دھاگا جس پر ماھل کسی جاتی ہے اور

Marfat.com

چمڑیاں، چمڑے کے ٹکڑے جن میں سے تکلا گزرتا ہے۔

۱۱۷۲ھ بمطابق ۱۷۵۸ء اگست کا مہینا تھا جب یہ مردِ حقانی سفرِ آخرت کی تیاری کرنے لگا۔

عالمِ بے خودی میں جب بلھے شاہ بے اختیار رقص کرنے لگتے تو علماء دین ناک بھوں چڑھاتے مگران کی یہ ادا بھی اہل دل حضرات کو گھائل کر گئی۔ اس دور کا مشہور طبلہ نواز فقیر بخش المعروف بابا دھنا اپنا طبلہ سنبھالے رقص کے انتظار میں رہتا۔ رقص بلھے شاہ اور بابا دھنا کی سنگت لازم وملزوم ادائیں قرار پائیں...... یہ طبلہ آج بھی بابا دھنا کی چوتھی پشت میں گلزار حسین قصوری کی ملکیت میں ہے۔ دم آخر بلھے شاہ نے بابا دھنا سے کہا "اس رقص میں تم میرا ساتھ نہ دے سکو گے" بابا دھنا نے صوفی شاعری کے آفتابِ عالم تاب کو غروب ہوتے دیکھا۔

حیران کن بات یہ ہے کہ مردِ حقانی کی میت تین روز تک قبرستان میں پڑی رہی۔ کوئی شخص نمازِ جنازہ پڑھانے کا روادار نہیں تھا۔ تدفین تو بعد کی بات تھی۔ حافظ کامل شاہ ہمدانی تین روز بعد سفر سے لوٹے تو یہ سن کر سکتے میں آ گئے۔

"بلھے شاہ کا جنازہ کسی نے نہیں پڑھایا؟" موصوف نے زیرلب کہا پھر مسکرانے لگے "شاید کوئی اس کا اہل ہی نہیں تھا اور یہ سعادت میرے نصیب میں لکھی تھی۔"

نمازِ جنازہ کے بعد تدفین کا مرحلہ طے ہوا۔ یہ مزار کچا تھا۔ کوٹ مراد کی ایک طوائف غائبانہ طور پر بلھے شاہ کی عقیدت مند تھی۔ وہ اپنے پیشے سے تائب ہوئی، سعادت حج کے بعد ۱۹۲۶ء میں اس نے مزار کی ازسرِ نو تعمیر کی۔ مزار بلھے شاہ قصور میں ریلوے روڈ اور کوٹ رکن دین کے درمیان واقع ہے۔ اگست کے آخری ہفتے میں میلہ لگتا ہے۔ موجودہ دور میں قصور کوئی صاف ستھرا شہر نہیں لیکن سارے شہر میں قابل دید شے صرف مزار بلھے شاہ ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے مردِ حقانی کی خلاف کفر کا فتویٰ دیا اور نماز جنازہ تک پڑھنے سے گریز کیا ان حضرات کی اولادیں زرکثیر خرچ کر کے مزار کے قریب دفن ہونے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔

مردِ حقانی لکھ لٹ قسم کی ہستی تھی۔ ایسی ہستیاں بار بار کہاں پیدا ہوتی ہیں۔

O......O......O

Marfat.com

ذاتی خودنوشت

Marfat.com

اختر حسین شیخ، بنیادی طور پر الیکٹرانک انجینئر ہیں۔ حصول تعلیم کے لئے موصوف کو کرہ ارض کے نصف سے زیادہ حصے کی خاک چھاننا پڑی۔ جس میں مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ کا قیام وہ کارنامہ سرانجام دے گیا جس سے موصوف کی سوچ ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی۔ ادبی سفر کا آغاز انہوں نے علامہ اقبالؒ کی طویل نظموں اور غزلیات کو پنجابی کے قالب میں ڈھالنے سے کیا۔ اقبال داشکارا" منظر عام پر آئی تو پنجابی زبان کو درجنوں نئے الفاظ ملے۔ آپ متنوع موضوعات پر اظہار خیال کی استطاعت سے مالا مال ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی باسٹھ عدد کتب سے ملتا ہے، جن میں شاعری (اردو پنجابی اور انگریزی) نثر پارے بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ڈائجسٹوں میں لکھنے کا آغاز ہوا تو ان کے جوہر، حقیقی معنوں میں کھل کر سامنے آئے۔ زبان و بیان کی صحت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ان کا طرہ امتیاز ہے۔ اولیائے اکرام کی حیات بابرکات پر قلم اُٹھایا تو اس کا حق ادا کر دیا۔ اس طویل سلسلے کا آغاز "منصور حلاج" سے ہوا۔ پھر داتا گنج بخشؒ، شاہ حسینؒ، حضرت میاں مہر بالا پیرؒ، بلھے شاہؒ وارث شاہؒ بزرگان دین کی حیات بابرکات اور ان کی تبلیغی ساعی کے وہ گوشے آشکار ہوئے جو وقت کا ضرورت تھے۔ تاہم قلم کاروں کا تساہل پسندی کے باعث منظر عام پر نہیں آسکے تھے۔ زبان و بیاں کی چاشنی تحقیق، محنت، ریاضت اور دیانت کی انتہا دیکھنا مقصود ہو تو زیر نظر کتاب پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ موصوف آج کل قومی ڈائجسٹ کا ایڈیٹر اور روزنامہ پاکستان لاہور کے ڈپٹی ایڈیٹر ہیں۔

طارق عباس درانی پاشان

Marfat.com